

خواتین کی

سوسائٹی

ماہنامہ

داستان

WWW.PAKSOCIETY.COM



خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

بانی و مدیرِ اعلیٰ — محمود ریاض

مدیر — نگارہ خاتون

مدیر — آذر ریاض

نائب مدیر — رضیہ جمیل

مدیرِ خصوصی — امت الصبور

بلیسنگ بھٹی

نفسیات — عدنان

اشرہات — خالدہ جیلانی

رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز
MEMBER
APNS
CPNE

قرس سالانہ بیک کی قیمتیں
پاکستان (سالانہ) — 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ — 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا — 6000 روپے





14 مسیر

کہنی و سنتی،
کرن کرن روٹی،
ہمالے تاہم

15 ادارہ

268 نادرہ خاتون



20 انشائی

کل ٹکا کا



275 امت الصبور

میری ڈائری سے



31 شاہین رشید

سعیم انصاری



28 امت الصبور

انجیز کارنگ

22 شاہین رشید

عید اتی ہے

276 ادارہ

خامشی کو زباں ملے



36 عمیرہ احمد

آب حیات

196 عفت سحر طاہر

بن مائیک ڈراما

62 اسپیہ زلیخا

234 تنزیلیہ ریاض

122 نمر احمد



218 حنا حسین

106 رضوانہ ارشاد

180 محبت ماردی



99 تازیہ جمال

120 مہمونہ صدق

178 سمیرا افضل



262 ادا جعفری

262 شعیب بن عزیز

261 اعتبار ساجد

261 خالد معین

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی وی چینل پر ڈراما ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



پکوان

رنگارنگ پھول

- 277 خالدہ جیلانی عید کے پکوان 263 شگفتہ جاہ رنگارنگ سلسلہ
280 مسرت سلیم آپ کا باورچی خانہ 282 واصفہ سہیل خیریں و خیریں

میرا بیاض

میری بیاض ہے

- 285 ادارہ مہندی کے ڈیزائن 266 خالدہ جیلانی آپ کی بیاض سے
290 نیوٹی ٹیکس کے مشورے امت الصبور

نفسیات

جگاتی 2015
جلد 43 نمبر 3
قیمت 60 روپے

288 عدنان نفسیاتی ازدواجی لکھنیں

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ - 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مہینہ چھٹی

خواتین ڈائجسٹ کا جولائی کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
رمضان المبارک کی پُر نور ساعتیں تیزی سے گزر رہی ہیں۔ یہ شمارہ آپ کو ملے گا تو آخری عشرہ کی عبادتوں کے ساتھ ساتھ عید کی تیاریوں میں مصروف ہوں گی۔ آخری عشرہ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لیے شب قدر کا تحفہ ہے۔ اس عشرے کی طاق راتوں میں قرآن پاک کی تلاوت، نقل، تیسحات، نیکیاں بڑھانے اور قرب الہی حاصل کرنے کا بہترین موقع ہے۔ خصوصاً تلاوت قرآن پاک۔ قرآن پاک ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ ایک بار ضرور سمجھ کر پڑھیں تاکہ جان سکیں کہ اللہ تعالیٰ نے عالم انسانیت کے لیے کیا پیغام بھیجا ہے۔ آج دنیا جن مسائل کا شکار ہے، ان تمام مسائل کا حل قرآن پاک میں ہے۔
پاکستان ہماری جلتے پناہ، ہماری شناخت۔

27 رمضان المبارک کو معرض وجود میں آیا تھا۔ اپنی عبادتوں میں پاکستان کی سلامتی اور امن وامان کے لیے دعا کریں۔ خصوصاً کراچی کے لیے جو اس وقت گرم ترین ہواؤں کی زد میں ہے۔ گرمی کی شدت اس بار جان لیوا ہے۔ بہت سے لوگ جانیں گنوا بیٹھے ہیں۔ کئی سالوں سے یہاں بارش نہیں ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شہر پر کرم اور رحمت کی بارش برمائے۔

عید اجتماعی خوشی کا تہوار ہے۔ عید کی خوشیاں تب ہی تکمیل پاتی ہیں۔ جب سب کے دل خوش ہوں۔ آپ کے ارد گرد کچھ ایسے لوگ ضرور ہوں گے جو اس تہوار کو منانے کی استطاعت سے محروم ہوں گے۔ آپ کی تقویٰ سی توجہ اور اعانت انہیں خوشیاں مہیا کر سکتی ہے۔ خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی ہیں اور حقیقی خوشی دینے میں ہی ہے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے آپ سب کو دلی عید مبارک۔ ہماری دعا ہے صبح عید آپ کے آنکھوں میں خوشیوں کی جھلک کریں لے کر طلوع ہو۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- 6 تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول۔ عہد الہمت تکمیل کے مراحل میں،
 - 6 نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ نمل،
 - 6 آسیہ رزاقی کا مکمل ناول۔ اب سوال یہ ہے،
 - 6 حنا یا سہیل، رضوانہ ارشاد الحق اور فریڈہ فرید کے ناولٹ،
 - 6 نازیہ جمال، میمونہ صدق اور سمیرا افضل کے افسانے،
 - 6 عمیرہ احمد اور عفت سحر طاہر کے ناول،
 - 6 عید کے حوالے سے معروف شخصیات سے سروے،
 - 6 فی ڈی فنکارہ مریم الصاری سے باتیں،
 - 6 کرن کرن روشنی۔ امادیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
 - 6 ہمارے نام، لغنیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
- خواتین ڈائجسٹ کا عید نمبر آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے، سنیق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کون کون سی

ادارہ

آئی ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بے حساب روزی دیتا ہے۔“ (سورۃ آل عمران 37)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”جب تم ان کافروں اور ان کے ان معبودوں سے الگ ہو گئے جن کی وہ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں، تو (اب) غار کی طرف ٹھکانا پکڑو، تمہارے لیے تمہارا رب اپنی رحمت پھیلا دے گا اور تمہارے کام میں آسانی مہیا کر دے گا۔ اور تو دیکھے گا سورج کو کہ جب وہ طلوع ہوتا ہے تو ان کے غار سے داہنی طرف کو ہو کر نکلتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو بائیں طرف کو ان سے کترا کر نکل جاتا ہے۔“ (طلوع و غروب دونوں اوقات میں سورج کی حدت سے وہ محفوظ رہتے ہیں۔) (سورۃ کھف 16-17)

فائدہ آیات : قرآن کریم کی پہلی آیت میں اولیاء اللہ کی پہچان بتلائی گئی ہے کہ ایمان و تقویٰ سے آراستہ لوگ اللہ کے ولی ہیں۔ جب یہ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے تو ان پر خوف و حزن کے آثار نہیں

اولیاء کی کرامات اور ان کے شرف و فضل کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”آگاہ رہو! اللہ کے ولی ان پر خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (ولی کون ہیں؟) وہ جو ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے رہے، ان کے لیے دنیا کی زندگی اور آخرت میں خوش خبری ہے۔ اللہ کی باتوں میں تبدیلی نہیں یہ ہے بڑی کامیابی۔“ (سورۃ یونس 62-63)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (اے مریم!) اس کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلا، تجھ پر تازہ پکی ہوئی کھجوریں گریں گی، چنانچہ کھا اور پی۔ (سورۃ مریم 25-26)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”جب بھی زکریا (علیہ السلام) اس (مریم) کے حجرے میں آتے تو اس کے پاس کھانے کی چیزیں پاتے۔ انہوں نے پوچھا: اے مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آئیں؟ انہوں نے کہا: یہ اللہ کے پاس سے

صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھایا، پھر وہیں ٹھہرے رہے یہاں تک کہ عشاء کی نماز پڑھی، پھر گھر لوٹے۔ جب گھر آئے تو رات کا کچھ حصہ جتنا اللہ نے چاہا، گزر چکا تھا۔ ان کی بیوی نے کہا۔

”آپ کو اپنے مہمانوں (کی خاطر تواضع) سے کس چیز نے روک رکھا؟“ انہوں نے کہا۔

”کیا تو نے ان کو رات کا کھانا نہیں کھلایا؟“

بیوی نے کہا۔ ”انہوں نے آپ کے آنے تک کھانے سے انکار کر دیا، ورنہ گھر والوں نے تو ان کو کھانا پیش کر دیا تھا۔“

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بہت ناراض ہوئے حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ بیان کرتے

ہیں کہ میں جلدی سے چھپ گیا، تو انہوں نے فرمایا۔ ”اوناوان! اور مجھے برا بھلا کہا۔“

پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قسم کھالی کہ وہ کھانا نہیں کھائیں گے اور بیوی نے بھی نہ کھانے کی قسم کھالی اور مہمان یا مہمانوں نے بھی قسم کھالی کہ وہ بھی اس وقت تک کھانا نہیں کھائے گا یا نہیں کھائیں گے، جب تک کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ نہ کھائیں۔

ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ ”یہ (قسم) شیطان کی طرف سے ہے اور کھانا منگوایا اور کھایا اور مہمانوں نے بھی کھایا۔ وہ جو لقمہ بھی اٹھاتے تھے تو نیچے سے وہ کئی حصے بربھ جاتا تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی کو مخاطب کر کے کہا۔

”اے بنی فراس کی بہن! یہ کیا ماجرا ہے؟“

تو انہوں نے کہا ”میری آنکھ کی ٹھنڈک کی قسم! یہ اب یقیناً ہمارے کھانے سے قبل جتنا تھا، اس سے بہت زیادہ ہے۔“

چنانچہ انہوں نے کھایا اور اسے انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بھیجا۔ اور راوی نے بیان کیا کہ آپ نے بھی اس میں سے کھایا۔

ایک اور روایت میں ہے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے (بیٹے)

ہوں گے کیونکہ ایمان و تقویٰ کا زادراہ ان کے پاس موجود ہو گا جو قیامت والے دن انسانوں کی نجات کا ذریعہ ہو گا۔

دوسری آیات میں اولیاء اللہ کی بعض کرامات کا بیان ہے۔ کرامت، خرق عادت واقعے کو کہتے ہیں، یعنی عام عادی اسباب سے ہٹ کر کسی واقعے کا ظہور پذیر ہونا، جیسے آگ کا کام جلانا ہے لیکن وہ نہ جلانے، سوکھے درخت یا غیر موسم میں پھل نہیں ہوتے لیکن ان میں پھل پیدا ہو جائے۔ یہ کرامت ہے۔ یہ کسی انسان کے اختیار میں نہیں کہ جب کوئی ولی اللہ چاہے اس کا اظہار کر دے، بلکہ یہ کلیتاً اللہ کے اختیار میں ہے، وہ جب چاہے اپنے کسی بندے کے ہاتھ سے

اسے ظاہر کروا دیتا ہے۔ کرامات، انبیاء علیہ السلام کے معجزات کی طرح برحق ہیں لیکن یہ کسی کی ولایت کی دلیل یا معیار نہیں جیسا کہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں۔ ایک متقی اور مومن کامل یقیناً ”اللہ کا ولی“ ہے، اس کی ولایت کسی کرامت کی محتاج نہیں ہے۔ کرامت ایک الگ شرف و فضل ہے، اگر اللہ چاہے تو اس سے بھی اسے سرفراز فرما دے، لیکن یہ ولایت کے اثبات کے لیے ضروری نہیں ہے۔

اب اس سلسلے کی چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

برکت

حضرت ابو محمد عبدالرحمن بن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں۔

”اصحاب صفہ غریب لوگ تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا۔

”جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو، وہ تیسرے آدمی کو (اپنے ساتھ) لے جائے۔ جس کے پاس چار آدمیوں کا کھانا ہو، وہ پانچویں، چھٹے آدمی کو لے جائے۔“

چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تین آدمیوں کو لے گئے اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم دس آدمیوں کو لے گئے۔ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے شام کا کھانا نبی

چنانچہ دو سروں نے بھی کہا: اللہ کی قسم! جب تک آپ نہیں کھائیں گے ہم بھی نہیں کھائیں گے۔
تب آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”افسوس ہے تم پر، تمہیں کیا ہے۔ تم ہماری مہمان نوازی قبول نہیں کرتے؟ لاؤ اپنا کھانا۔“

چنانچہ عبدالرحمن کھانا لائے۔ آپ نے اس میں ہاتھ ڈال کر فرمایا: (شروع) اللہ کے نام سے، پہلی حالت (جس میں غصے سے قسم کھائی) شیطان کی طرف سے تھی۔ چنانچہ آپ نے بھی کھایا اور باقی سب نے بھی کھانا کھایا۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : 1 - مدارس و ہنہ اور علوم اسلامیہ کے طلبہ کو اس طرح اپنے اپنے گھروں میں ساتھ لے جا کر کھانا کھلانا جائز ہے، جیسے پہلے بعض علاقوں اور حلقوں میں اس کا رواج تھا اور شاید اب بھی کہیں ہو۔

2 - عورت کا اذن خصوصی کے بغیر مہمان کی خاطر داری کرنا اور اسے کھلانا پلانا جائز ہے۔

3 - باپ کا تادیب کے طور پر اولاد کو برا بھلا کہنا جائز ہے۔

4 - مباح چیز کے ترک پر قسم کھانا جائز ہے۔

5 - بہتر صورت سامنے آجائے تو قسم توڑ کر اسے اختیار کیا جائے، تاہم قسم کا کفارہ دینا ضروری ہوگا۔

6 - اس میں کرامت کا اثبات ہے کہ تھوڑے سے کھانے میں اللہ نے اتنی برکت ڈال دی کہ اہل خانہ مہمانوں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ بارہ عریقوں نے بھی اپنے اپنے رفقاء سمیت اسے کھایا۔ یہ فوائد فتح الباری سے لیے گئے ہیں۔

محدث

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”تم سے پہلے جو امتیں ہوئیں، ان میں کچھ لوگ محدث ہوتے تھے۔ اگر میری امت میں بھی کوئی

عبدالرحمن سے کہا: تم اپنے مہمانوں کی دیکھ بھال کرو میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا رہا ہوں۔ تم میرے آنے تک ان کی مہمان نوازی سے فارغ ہو جانا۔ چنانچہ عبدالرحمن (اندر) گئے اور جو کچھ تھا مہمانوں کے سامنے لا کر رکھ دیا اور عرض کیا: ”کھاؤ۔“ مہمانوں نے کہا: ”ہمارے گھروالے کہاں ہیں؟“ عبدالرحمن نے کہا: ”آپ کھانا کھائیں۔“

انہوں نے کہا ”جب تک گھروالے (ابوبکرؓ) نہ آجائیں ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔“

عبدالرحمن نے کہا: ”آپ لوگ ہماری طرف سے اپنی مہمان نوازی قبول کریں، اس لیے کہ اگر وہ (گھروالے) ابوبکرؓ آگئے جب کہ آپ لوگوں نے کھانا نہیں کھایا ہو گا تو ہمیں ان کا عتاب سہنا پڑے گا۔“

لیکن انہوں نے (کھانے سے) انکار کر دیا۔ میں نے جان لیا کہ وہ (والد صاحب) مجھ سے ناراض ہوں گے۔ چنانچہ جب وہ تشریف لائے تو میں (ڈرتے ہوئے) ان سے ایک طرف ہو گیا۔ انہوں نے پوچھا: تم لوگوں نے کیا کیا؟ تو انہوں نے بتلایا۔ انہوں نے (ابوبکرؓ) نے آواز دی۔

”اے عبدالرحمن!“

میں خاموش رہا۔

انہوں نے پھر آواز دی ”اے عبدالرحمن!“

میں پھر بھی خاموش رہا۔

انہوں نے کہا: ”اے نادان بچے! میں تجھے قسم دیتا

ہوں کہ اگر تو میری آواز سن رہا ہے تو چلا آ۔“

چنانچہ میں نکل کر آیا اور کہا:

”آپ اپنے مہمانوں سے پوچھ لیں۔ کہ ہم نے

کوئی کوتاہی نہیں کی۔“

انہوں نے کہا ”عبدالرحمنؓ نے سچ کہا ہے، یہ

ہمارے پاس (کھانا) لایا تھا۔“

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: ”تو تم میرے انتظار میں

رہے، اللہ کی قسم! میں آج کی رات کھانا نہیں کھاؤں

گا۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اے ابو اسحاق! تمہارے متعلق یہی گمان تھا۔“

اور ان کے ساتھ ایک آدمی یا چند آدمی کو فہم بھیجے تاکہ وہ حضرت سعد کی بابت اہل کوفہ کی رائے معلوم کریں، چنانچہ انہوں نے کوفہ کی ہر مسجد میں جا کر ان کی بابت پوچھا۔ سب نے ان کی تعریف کی، حتیٰ کہ وہ بنو عبس کی مسجد میں آئے تو وہاں کے نمازیوں میں سے ایک شخص کھڑا ہوا۔ اسے اسامہ بن قنابہ کہا جاتا تھا اور اس کی کنیت ابو سعده تھی۔ اس نے کہا:

”جب آپ نے ہمیں قسم دلائی ہے تو عرض یہ ہے کہ سعد لشکر کے ساتھ (جہاد کے لیے) نہیں جاتے تھے۔ (مال غنیمت کی) تقسیم میں برابری نہیں کرتے تھے اور فیصلہ کرنے میں انصاف سے کام نہیں لیتے تھے۔“

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اللہ کی قسم! میں بھی تین باتوں کی دعا ضرور کروں گا: اے اللہ! اگر تیرا یہ بندہ جھوٹا ہے اور ریا کاری اور شہرت کی خاطر کھڑا

ہو اسے تو اس کی عمر لمبی کر، اس کی غربت و ناداری میں اضافہ کر اور اسے فتنوں کا نشانہ بنا دے۔“

(چنانچہ ایسا ہی ہوا) اس کے بعد جب اس سے پوچھا جاتا تو وہ کہتا۔

”بہت بوڑھا اور فتنوں میں مبتلا ہوں، مجھے سعد کی بددعا لگ گئی ہے۔“

حضرت جابر بن سمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے راوی عبد الملک بن عمیر کہتے ہیں کہ

میں نے بعد میں اسے دیکھا تھا، بڑھاپے کی وجہ سے اس کے دونوں ابرو اس کی آنکھوں پر گرے پڑے تھے اور وہ راستوں میں لڑکیوں سے چھیر چھاڑ کرتا اور انہیں

اشارے کرتا تھا۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : 1۔ اس میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا بیان ہے کہ وہ مستجاب الدعوات تھے۔

2۔ کسی کی بابت تحقیق و تفتیش کرنی ہو تو اہل خیر و

محدث ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔“

اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے اور مسلم نے اسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے بیان کیا ہے۔ اور ان دونوں روایتوں میں ہے کہ ابن وہب نے کہا: محدثوں کے معنی ہیں: الہام یافتہ۔

فوائد و مسائل : الہام یافتہ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دلوں میں باتیں ڈال دی جاتی ہیں، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ اگر اندیشہ محسوس ہو تو موسیٰ کو سمندر میں ڈال دیں۔ حضرت مریم کو القا ہوتا رہا۔ یہ بھی کرامت کی ایک صورت ہے۔

یہ حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہا کی فضیلت میں واضح ہے۔

بددعا

حضرت جابر بن سمہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں

کہ اہل کوفہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی شکایت کی۔ چنانچہ حضرت عمر نے انہیں (کوفہ کی گورنری سے) معزول کر دیا اور ان پر حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو گورنر مقرر فرما دیا۔ اہل کوفہ نے حضرت سعد کی شکایت میں یہاں تک بیان کیا کہ یہ تو نماز بھی صحیح طریقے سے نہیں پڑھاتے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف پیغام بھیجا اور کہا۔

”اے ابو اسحاق! (حضرت سعد کی کنیت) یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ تم نماز بھی صحیح نہیں پڑھاتے تھے۔“

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تو اللہ کی قسم! ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی نماز پڑھاتا تھا، میں اس میں کوئی کمی نہیں کرتا تھا۔ میں عشاء کی نماز پڑھاتا تو پہلی دو رکعتوں میں قیام لے کر آتا اور پچھلی رکعتوں میں مختصر۔“

میں موت دے۔“

حضرت عروہ رحمۃ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ مرنے سے پہلے اس کی بینائی چلی گئی اور ایک دفعہ وہ اپنی زمین میں چل رہی تھی کہ ایک گڑھے میں گر گئی اور اس میں مر گئی۔ (بخاری و مسلم)

اور مسلم کی ایک روایت جو محمد بن زید بن عبد اللہ بن عمر سے اسی کے ہم معنی منقول ہے اس میں ہے کہ محمد بن زید (راوی حدیث) نے اس عورت کو نابینا اور دیواریں ٹٹولتے ہوئے دیکھا۔ وہ کہتی تھی۔

”مجھے حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی بددعا لگ گئی ہے۔ اور وہ ایک کنویں پر سے گزری جو زمین کے اسی احاطے میں تھا جس کے پارے میں اس نے جھگڑا کھڑا کیا تھا، چنانچہ وہ اس میں گر (کر مر) گئی اور وہی اس کی قبر بنا۔“

فوائد و مسائل : 1 - حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ حضرت مروان بن حکم کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے۔ یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور

خلافت میں مدینے کے گورنر تھے اور اسی دور کا یہ واقعہ ہے جو روایت میں مذکور ہوا۔ یزید کے بیٹے معاویہ بن یزید کے بعد یہ چند مہینے خلیفہ بھی رہے۔

2 - اس میں حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور استجاب دعا سے ان کی کرامت واضح ہے۔

3 - نیک لوگوں کو ایذا دینے سے بچنا چاہیے تاکہ انسان ان کی بددعا سے محفوظ رہے کیونکہ مظلوم کی بددعا اللہ تعالیٰ بعض دفعہ فوراً قبول فرماتا ہے۔



اہل صلاح سے پوچھا جائے جیسے کوفے کی مساجد میں جا کر نمازیوں سے تحقیق کی گئی۔

3 - عمال حکومت کو مصلحتاً ”بدل دینا بھی جائز ہے“ جیسے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا گیا حالانکہ ان کے خلاف شکایات جھوٹ ربی تھیں پھر بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ ان کی جگہ نیا حاکم مقرر کر دیا جائے۔

4 - اس میں کرامت کا اثبات ہے کہ حضرت سعد کی تینوں بددعا میں قبول ہوئیں۔

قبولیت

حضرت عروہ بن زبیر رحمۃ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ سے اروی بنت اوس نے جھگڑا کیا اور حضرت مروان بن حکم (والی مدینہ) تک اپنی شکایت پہنچائی اور اس نے دعوا کیا کہ۔

”سعید نے اس کی کچھ زمین غصب کر لی ہے۔“ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے کہا: ”کیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (وعید) سننے کے بعد اس کی زمین کا کچھ حصہ غصب کر لیتا۔“

حضرت مروان رحمۃ اللہ نے پوچھا: ”تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا (وعید) سنی ہے؟“ انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

”جس نے ناجائز طریقے سے کسی کی ایک بالشت زمین بھی ہتھیالی تو اسے (قیامت والے دن) سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔“

یہ سن کر حضرت مروان رحمۃ اللہ نے ان سے کہا۔ ”اس کے بعد میں تم سے کوئی دلیل طلب نہیں کروں گا۔“

چنانچہ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے اس عورت کے لیے بددعا فرمائی۔

”اے اللہ! اگر یہ عورت جھوٹی ہے تو اس کی آنکھوں کی بینائی ختم کر دے اور اس کو اس کی زمین ہی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کل کا آج پر گٹالو

انشائی

”اٹمینان رکھیے! ہم بھی ہیں۔“
 ”پھر تو ٹھیک ہے۔ ورنہ بالعموم ہمارے معاشرے میں
 مرد کو اس کا جائز مقام نہیں دیا جاتا، حالانکہ یہ بھی ایک
 خاصی ضروری مخلوق ہے۔“
 ”جی ہاں! ہم جانتے ہیں۔“
 ”اچھی بات۔“

اس وقت تو ہم بہت خوش ہوئے کہ اپنی بات منوالی،
 لیکن اب ہماری مثال ان نو آزاد ملکوں کی سی ہے، جن کو
 آزادی مل جاتی ہے تو سوچتے ہیں کہ اب ہم کیا کریں۔ کم از کم
 لنکا کے ساتھ یہی ہوا کہ انگریز بہادر نے پاکستان اور
 ہندوستان سے رخصت سفر باندھا اور درودیوار پر حسرت کی
 نگاہ ڈالتے ہوئے رخصت ہوا تو لنکا سے بھی کہا کہ ”آج
 سے تم بھی آزاد۔ جب مکان ہی چھوڑ دیا تو اس کا غسل
 خانہ رکھ کر کیا کریں گے۔“ اس پر لنکا والے بہت بھنائے
 کہ ”صاحب! یہ کیا بے مروتی ہے۔ آپ کو ابھی کچھ دن
 اور حکومت کرنا ہوگی۔“ لیکن انگریز نہ مانے۔ جلسے جلوس
 بھی ہوئے، ہڑتالیں بھی۔ حتیٰ کہ کچھ دہشت پسندوں نے
 بم وغیرہ بھی پھینکے اور ”لنکا سے مت جاؤ“ کے نعرے بھی
 خوب لگے، لیکن یہ سامراجی ممالک لاتوں کے بھوت ہیں،
 باتوں کے نہیں اور غریب لنکا کے پاس اتنی طاقت کہاں تھی،
 کہ بزور ان کو روکتا۔ خون کے سے گھونٹ پی کے رہ گیا۔
 ہمارے سامنے بھی اسی قسم کا مسئلہ ہے کہ لکھیں تو کیا
 لکھیں۔ دیکھا جائے تو آخر عورتوں کے کتنے مسائل ہیں،
 جو مردوں سے الگ ہیں۔ کھانا پکانا، بٹن لگانا، موزے سینا،
 بچوں کے منہ دھلانا، کپڑے بدلنا وغیرہ، اکثر گھروں میں بے
 شک مرد کرتے ہیں تاکہ عورتوں کی مجلسی سرگرمیوں میں
 رکاوٹ نہ پڑے اور ہمسایوں سے ان کے میل ملاقات
 میں فرق نہ آئے، لیکن عورتوں کو بھی اس کی کچھ ممانعت
 نہیں۔ فلمیں دیکھنے میں بھی دونوں برابر ہیں۔ اگرچہ اس
 کی اصل صلاحیت اللہ تعالیٰ نے عورتوں ہی کو ودیعت کی
 ہے۔ روپے پیسے کے معاملے میں البتہ مدت سے تقسیم کار
 ہو چکی ہے۔ نہ عورتیں کمانے میں دخل دے سکتی ہیں نہ

جب ہمارے دوستوں کی طرف سے حکم ہوا کہ آپ
 کو خواتین ڈائجسٹ کے لیے کچھ نہ کچھ لکھنا ہوگا، ہر ماہ کی
 پہلی تاریخ کو، تو ہم نے عذر کیا کہ۔
 ”پہلی کو تو ہم کچھ نہیں کرتے۔ بس بال کٹاتے ہیں۔
 مالش کراتے ہیں۔ فلموں، جائیدادوں اور سیکنڈ ہینڈ کاروں
 کے اشتہارات دیکھتے ہیں۔ بہت مصروف دن ہوتا ہے
 ہمارا۔“

”تو کسی اور دن لکھ دیا کیجئے۔ ہمارا پرچا مہینے میں ایک
 روز آئے گا۔“

”کیا نام رکھا ہے آپ نے پرچے کا؟“
 ”خواتین ڈائجسٹ۔“

”اگر میں غلطی پر نہیں تو یہ پرچا آپ عورتوں کے لیے
 نکال رہے ہیں؟“

”آپ بہت ذہین آدمی ہیں۔ آپ نے صحیح سمجھا۔“
 ”لیکن میں تو عورت نہیں ہوں۔“

”ہمیں معلوم ہے۔“

”مجھے کھانا پکانے کی ترکیبیں بھی نہیں آتیں کہ آپ
 کے لیے کزیلوں کے حلوے، بھنڈی کے قورے یا بیٹنگن کی
 کھیر کے موضوع پر کچھ لکھ سکوں۔ انڈا البتہ ”ابال لیتا
 ہوں۔“

”کوئی مضائقہ نہیں۔ ہمارے ہاں دسترخوان یا ہینڈ کلیا
 کا کالم اگر ہوا تو اسے کوئی خانہ دار خاتون لکھیں گی۔“

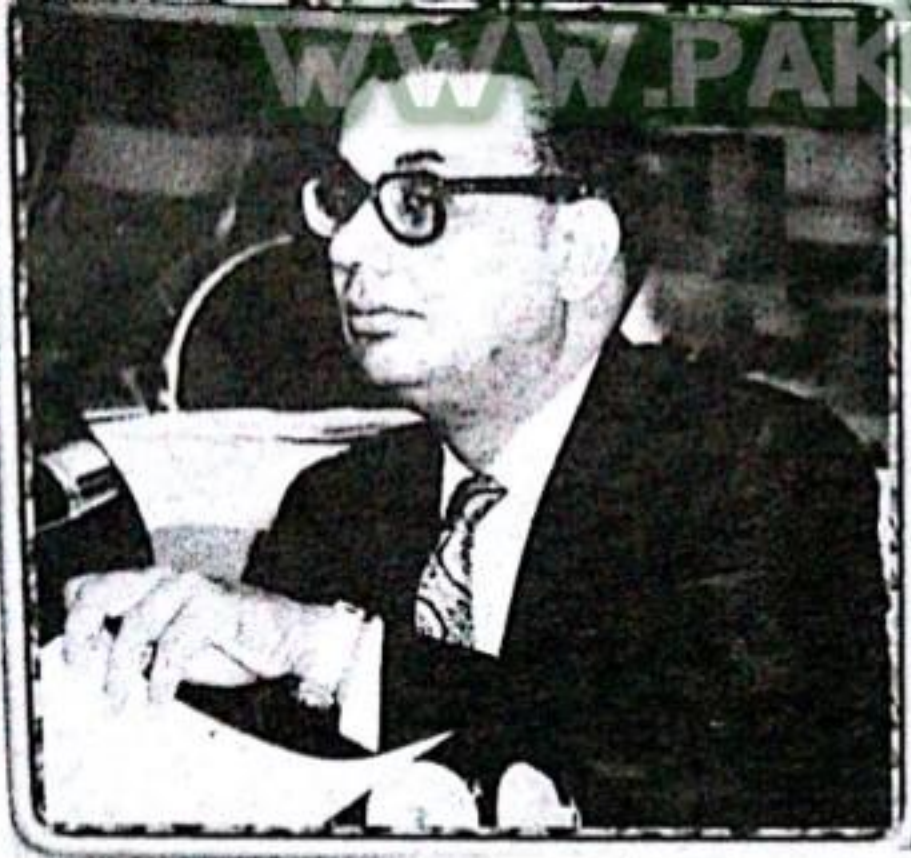
”تو پھر آپ مجھ سے کشیدہ کاری کے نمونوں کی فرمائش
 کریں گے۔ اس میں بھی میں کورا ہوں۔“

”یہ بھی ہمیں معلوم ہے۔“

”اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میں راتوں کی نیند حرام
 کرنے والا کوئی ناول آپ کے لیے قسط وار لکھ سکوں گا۔
 تب بھی آپ غلطی پر ہیں۔“

”آپ کو ایسی کوئی چیز لکھنے کی زحمت نہ دی جائے گی۔“
 اب ہم نے بیچ نکلنے کا آخری حربہ استعمال کیا۔

”آپ سے ہمارا اصولی اختلاف ہو جائے گا، کیونکہ ہم
 مردوں اور عورتوں کے لیے برابر حقوق کے حامی ہیں۔“



مرد خرچ کرنے میں۔ جس کا کام اسی کو سناجھے۔ روپے کمانے کے بارے میں ہمارا ذاتی تجربہ بہت کم ہے۔ یوں بھی بازار میں ایسی کتابیں مل جاتی ہیں جن کی مدد سے انسان راتوں رات لکھ پتی بن سکتا ہے، ہم خود کو روپے خرچ کرنے (یا نہ کرنے) کے موضوع تک محدود رکھیں گے۔ بالخصوص اس لیے کہ ہمارا ذاتی اور طویل تجربہ اسی میدان میں ہے۔

سب سے زرین اصول یہ ہے کہ جو کام کل ہو سکتا ہے۔ اسے آج پر نہ ڈالو اور جو چیز کہیں اور مل سکتی ہے، اسے سامنے کی دکان سے نہ خریدو۔ ہم قلم دیکھنے میں

ہماری ہے۔ ابھی چند سال پہلے تو ہم کبھی کبھار کوئی چیز خرید بیٹھتے تھے اور ظاہر ہے کہ آخر میں پچھتاتے تھے۔ آخر ایک روز اپنے دوست ممتاز مفتی سے، جو ہمارے ساتھ کام کرتے تھے۔ ہم نے گزارش کی کہ ہمارے ساتھ ایک نیکی کیجئے۔

بولے ”کہو کیا بات ہے۔ کچھ قرض چاہیے؟“

ہم نے کہا۔ ”جی نہیں۔ وہ تو روز چاہیے ہوتا ہے۔ آج یہ کہنا ہے کہ ہم بازار میں خریداری کو نکلیں تو ہمارے ہم رکاب رہا کیجئے۔ آپ کا کام فقط ہمیں مفید مشورے دینا ہوگا۔ جہاں آپ دیکھیں کہ ہم کوئی چیز خریدنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آہستہ سے اتنا فرما دیا کیجئے کہ یہ اگلی دکان پر چار

آنے سستی ہے۔“

بولے ”ٹھیک ہے۔“ اب ہوا یہ کہ ہم نے ایک جگہ دو روپے موزوں کے طے کیے۔ (دکان دار تین روپے مانگ رہا تھا) اور بوٹہ نکال کر ادائیگی کرنے کو تھے کہ مفتی جی نے کہا۔ ”یہاں سے مت لو جی۔ فریئر روڈ کے فٹ پاتھ پر یہی چیز ڈیڑھ روپے کی ہے۔“

یوں ہمارے وہ دو روپے بھی بچے اور وہ ڈیڑھ روپے بھی، کیونکہ اس روز فٹ پاتھ پر تلاش بسیار کے باوجود دکان دار ہمیں نہ مل سکا۔ مل جاتا تو مفتی صاحب فرماتے کہ ”ذرا بندر روڈ پر چلو تو یہ موزہ ایک روپے میں دلا دوں۔“

چند روز میں ہم یہ بھول گئے کہ یہ ترکیب مفتی صاحب کو خود ہم نے سمجھائی ہے۔ قارئین کرام بھی یہ نسخہ استعمال کر کے دیکھیں.... اور فائدہ ہو تو اس فقیر کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔

(1970ء میں لکھا گیا)

بالعموم یہی اصول برتتے ہیں۔ شروع کے تین دنوں میں تو ہم رش سے گھبراتے ہیں تاکہ جن کو دیکھنا ہے، دیکھ لیں اور بھڑچھٹ جائے۔ پھر کے بعد ہم حساب لگاتے ہیں کہ ابھی چار روز اور ہیں۔ کسی بھی دن دیکھ لیں گے۔ وہ تین دن ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں لگ جاتے ہیں کہ مینٹی شو دیکھنا مناسب ہو گا یا رات کا۔ حتیٰ کہ اخبار میں قلم اترنے کا اعلان آجاتا ہے۔ شیطان کے جن کاموں کو ہم برا جانتے ہیں، ان میں تعجل بھی ہے۔ قلم اب نہ دیکھی۔ پھر آئے گی تو دیکھ لی جائے گی۔ نتیجہ یہ کہ اس وقت تمام اچھی فلمیں ہمارے ویننگ لسٹ پر ہیں کہ دوبارہ آئیں تو دیکھی جائیں۔ کپڑوں کے بارے میں بھی یہی قیمتی اصول ہمارے پیش نظر رہتا ہے۔ پاکستان میں صنعتیں برابر ترقی کر رہی ہیں۔ ہر سال نئے نئے اور بہتر ڈیزائن کے کپڑے بازار میں آتے ہیں۔ اگر ہم بالفرض گزشتہ سال سلوا لیتے، تو آج افسوس ہوتا۔ آج سلوا لیں تو اگلے برس افسوس ہوگا۔ انسان ایسا کام ہی کیوں کرے، جس میں بعد ازاں افسوس کا اندیشہ ہو۔

1961ء میں کنٹرول ریٹ پر ایک کار مل رہی تھی۔ پھر وہ نہ ملی، کیونکہ دکاندار ہمارے اصول سے واقف نہ تھا۔ اس نے بیچنے میں جلدی کی۔ اگر کہیں اس وقت یہ کار ہم خرید لیتے تو اس وقت چار سال پرانی ہوتی۔ کوئی آدھے داموں بھی نہ پوچھتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کفایت شعاری اور جزری، جسے فضول خرچ لوگ حسرت کا نام دیتے ہیں۔ اللہ کی دین ہے۔ تاہم ایسی مثالیں بھی ہیں کہ انسان کوشش سے یہ ملکہ حاصل کر لیتا ہے۔ ان میں سب سے روشن مثال خود

صبح عید کا تصور ہی جان فزا ہوتا ہے۔ کہیں شیر خور مہ کی خوشبو تو کہیں مہندی کی مہک، تو کہیں چوڑیوں کی کھنک، ہنسی کی گنگناہٹیں تو کہیں نماز عید کی بھاگ دوڑ یہ عید کے دن کا ایک خاص ماحول تقریباً ہر گھر میں ہوتا ہے لیکن ہر عمر کی عید کے مختلف رنگ ہوتے ہیں عید تو وہی ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے اپنے محسوسات بدل جاتے ہیں وقت کے ساتھ تبدیلیاں آتی ہیں تو عید کا تصور بھی بدلتا جاتا ہے۔ کچھ عیدوں کے رنگ ہمارے دلوں میں ہمیشہ کے لیے ایک یاد بن کر محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ہم نے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے لوگوں سے چند سوالات کیے ہیں۔

- 1- عید پر حاصل ہونے والی کوئی سچی خوشی؟
- 2- اپنے یا پرانے لوگوں سے ملنے والی یادگار عیدی؟
- 3- خوشی یا پریشانی کے حوالے سے کوئی یادگار عید؟

عیداتی ہے ہر سال کی طرح

شاہین رشید

سکیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے کچھ خرچ کر کے خوشی ہوتی ہے۔

2 پرانے کی تو بات چھوڑیں۔ اپنے والدین سے ملنے والی عیدی کی ہی نہ صرف خوشی ہوتی ہے بلکہ وہ عیدی یادگار بھی بن جاتی ہے۔ اب عیدی لینے کا مزا نہیں آتا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں چھوٹی تھی تو ابو عید کے لیے نئے نوٹ لے کر آیا کرتے تھے۔ اور عید کی نماز پڑھ کر جب گھر آتے تھے تو وہ نئے نوٹ عیدی کی شکل میں ہمیں دیا کرتے تھے۔ تو بس ابو کے ساتھ گزری ہوئی ساری عیدیں بہت یادگار ہیں۔

3 شادی کے بعد کی ساری عیدیں بہت یادگار ہیں اور پہلی عید تو خاص طور پر بہت یادگار تھی کہ جب میاں صاحب نے سچے سنور نے کو کہا۔ چوڑیاں پہننے کو کہا، مہندی لگانے کو کہا تو مجھے اتنا اچھا لگا کہ میری زندگی میں بھی کوئی ہے جسے میری فکری ہے جسے میرا خیال ہے، میرے میاں بہت روایتی قسم کے ہیں اور عید پر اپنی بیگم کو روایتی انداز میں ہی سچے بنے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور شادی سے پہلے کی عید تو بس سارا دن سو کر ہی

عاصمہ شیرازی — (اینکو)

1 سچی خوشی تو نیکی کا کوئی کام کر کے ہی حاصل کی جا سکتی ہے تو میرا خیال ہے کہ نیکی کے کاموں کو بتایا نہیں جاتا کہ نیکی ضائع ہو جاتی ہے۔ عید مسلمانوں کے لیے ایک تحفہ ہے ہمیں چاہیے کہ ہم عید پر ان لوگوں کا بھی خیال رکھیں جنہیں یہ سہولتیں حاصل نہیں ہیں جن کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے کہ وہ عید کا اہتمام کر



گزرتی تھی۔ تو زندگی میں یہ چیلنج بہت خوب صورت تھا۔

مدیکہ شاہ (ڈراما رائٹر)

1 شادی سے پہلے تو عید پر کبھی کوئی کام نہیں کیا تھا۔ امی رات کو چنے چاٹ، فروٹ چاٹ، شیر خورمہ جو کہ ہماری پوری کالونی میں مشہور ہوتا تھا بنا کر رکھ دیتی تھیں اور دوپہر میں بریانی بناتی تھیں۔ باقی کام گھر کے ملازموں کے سپرد ہوتے تھے۔ ہمارا کام تو بس انجوائے کرنا ہوتا تھا۔ چاند رات اور عید کو ہریات سے بے فکر ہو کر انجوائے کرتے تھے۔ لیکن اب عید پر خوب مہمان ہوتے ہیں اور میں عید پر فروٹ ٹرافل اور چنا چاٹ بناتی ہوں۔ باقی کام کک کرتا ہے ہاں عید پر سب ملازمین کو کپڑے جوتے اور عیدی دیتی ہوں تو بہت خوشی ہوتی ہے پہلے ان باتوں کی خبر نہیں تھی۔ شادی کے بعد ذمہ داری بڑی تو احساس ہوا کہ کسی کے ساتھ کچھ کر کے کتنی خوشی اور اطمینان ہوتا ہے۔

2 اپنے ابو (مرحوم) سے ملنے والی ہر عیدی یادگار عیدی تھی اب تو ہمیں عیدی نہیں ملتی اب تو ہم اپنے بچوں کو عیدی دیتے ہیں۔ عیدی لینے اور عیدی دینے کے بیچ سالوں کا فاصلہ ہوتا ہے۔ آج سوچتی ہوں کہ کاش ابو سے ملنے والی عیدی کو کبھی خرچ نہ کرتی ہمیشہ اپنے پاس رکھتی جانے والے چلے جاتے ہیں مگر ان کی یاد ان کے ساتھ کبھی دفن نہیں ہوتی۔

3 میری مرحومہ نانی مسز خضرہ جیلانی ایک مشہور ماہر تعلیم تھیں اور جو وقار النساء کالج کی پرنسپل (راولپنڈی) اور پھر اسلامیہ کالج کینٹ لاہور کی پرنسپل

رہ چکی تھیں۔ ان کے ساتھ گزارا گئی آخری عید یادگار تھی اور اپنے مرحوم ابو کے ساتھ گزارا ہر عید یادگار تھی کہ ہم نے صرف انجوائے کیا اور کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ کبھی کوئی ذمہ داری نہیں لی۔ ابو کے جانے کے بعد تو عید کا ذرا مزہ محسوس ہوتا ہے نہ لطف۔ جن لوگوں کے والدین اس دنیا سے چلے جاتے ہیں وہ بھی



اسی طرح محسوس کرتے ہوں گے جس طرح میں محسوس کر رہی ہوں یا کرتی ہوں۔

فصیح باری خان (ڈرامہ رائٹر)

1 سچی خوشی سے ہمکنار کرنے والے کام ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ جو انسان خود سے بھی شینر نہیں کرتا یا کر سکتا، اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے کہ ایک ہاتھ سے دو تو دوسرے کو پتلا نہ چلے۔

2 یادگار عیدیاں تو بہت سی ہیں لیکن وہ عیدی بہت خاص تھی جو میں نے اپنے ایک بہت ہی کنبوس رشتے دار سے لڑ جھگڑ کر وصول کی تھی، کبھی نہیں بھولوں گا۔

3 میرے لیے وہ ساری عیدیں خوشگوار اور حسین تھیں اور یادگار ہیں جو میں نے اپنی امی کے ساتھ گزارا تھیں۔

امبرار شد (معروف آرٹسٹ)

1 ہمیشہ سچی خوشی کوئی اچھا کام کر کے ہی حاصل ہوتی ہے۔ تو رمضان المبارک کے آنے سے پہلے ہی میں زکوٰۃ ان ضرورت مندوں تک پہنچا دیتی ہوں بجن کا حکم اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیا ہے تاکہ انہیں بھی وہ سب خوشیاں نصیب ہوں جن پر ان کا حق ہے۔



2 عید پر ملنے والی عیدی تو بچپن میں ہی ملا کرتی تھی اور بچ میں اس وقت کے دو روپے بھی بہت بڑی رقم لگا کرتی تھی اور پھر جب 10 روپے ملنے لگے تو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں کہاں کہاں خرچ کروں کیا کیا کھاؤں۔

3 گزشتہ سال کی عید تو بہت پریشانی میں گزری جب میری والدہ بیمار تھیں اور ”شوکت خانم“ اسپتال میں داخل تھیں۔ ہم نے عید نہیں منائی تھی بلکہ بڑی

سادگی سے دن گزارا تھا اور خوشی کے حوالے سے جو یادگار عید تھی وہ وہ عید تھی جو میں نے اپنے بیٹے ابو بکر کے ساتھ گزاری۔ دنیا میں آنے کے بعد ابو بکر کی پہلی عید تھی ماں مننے کا احساس بہت اچھا لگ رہا تھا اور میں نے بیٹے کے لیے خاصا اہتمام کیا تھا۔

علی ناصر — (اینکو پرسن بزنس پلس)

1 مجھے ہر عید پر عیدی ملنے کی سچی خوشی ہوتی ہے۔ عیدی مجھے ہر سال ملتی ہے خواہ وہ کم ملے یا زیادہ۔ اپنی عمر سے بڑے رشتے داروں کو دیکھتا رہتا ہوں اور وہ اگر میری طرف متوجہ نہ ہوں تو انہیں اپنی طرف متوجہ ضرور کرتا ہوں۔ اور عیدی ضرور لیتا ہوں اور بہت خوش ہوتا ہوں اور عیدی حاصل کر کے مجھے دلی تسکین ملتی ہے۔

2 پورا مہینہ روزے رکھنے کے بعد دل کو بڑی تسکین ہوتی ہے کہ رب کے حضور کچھ اچھا کام کیا ہے۔ عید کے پہلے دن جب کھانے پینے کی چیزیں سامنے آتی ہیں تو میں ایک دم سے بے چین ہو جاتا ہوں اور بڑے شوق سے چیزیں کھاتا ہوں ایک آدھ سال سے تھوڑی احتیاط کر رہا ہوں کیونکہ وزن بڑھ گیا ہے۔ عید کے دن شیر خورمہ بہت اچھا پکتا ہے ہمارے گھر۔ تو عید پر ملنے والی عیدی میرے لیے شیر خورمہ اور اچھے اچھے پکوان ہوتے ہیں۔

3 اب عیدیں یادگار نہیں ہوتیں۔ بس بچپن کی عیدیں ہی یادگار تھیں۔ اب تو چند سالوں سے بہت بوریٹ ہوتی ہے معاشرے میں ملنساری بہت کم ہو گئی ہے۔

شائستہ فرید :- (نیوز کاسٹرز ڈان نیوز)

1 صرف عید کا انتظار نہیں کرتی کہ کچھ اچھا کام کر کے سچی خوشی حاصل کر لوں۔ عام دنوں میں بھی لوگوں کی مدد کر کے مجھے سچی خوشی حاصل ہوتی ہے، لیکن کسی سے ذکر نہیں کرتی بس جو کچھ کرنا ہوتا ہے خاموشی کے ساتھ کر لیتی ہوں۔ دل کو بہت سکون ملتا ہے۔

2 عید پر ملنے والی وہ پہلی عیدی جو ہمارا ریلیفیشن قائم ہونے کے بعد فرید نے دی تھی ہمیشہ یاد رہے گی۔





انہوں نے مجھے 100 روپے عید کی دی تھی جو کہ میں نے ابھی تک سنبھال کر رکھی ہوئی ہے اگرچہ اس کے بعد وہ مجھے ہر سال باقاعدہ عید دیتے ہیں۔ لیکن جو خوشی مجھے ان 100 روپے کی تھی کسی عید کی نہیں ہوگی۔

3 اب تک منائی جانے والی عیدوں میں بچپن کی عیدیں بہت یادگار گزری ہیں۔ بڑے ہونے کے بعد تو اب عید کی کوئی ایکسٹنٹ نہیں ہوتی۔ اور ویسے بھی جب سے نیوز کی فیلڈ میں آئی ہوں ہماری عید آفس میں ہی گزرتی ہے۔ 13 سال ہو گئے ہیں جب کرتے ہوئے اور تیرہ سال سے عید کا دن آفس میں ہی گزرتا ہے۔ رات کو تھکے ہوئے گھر جاتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔

تئویر آفریدی — (معروف گلوکار + کمپوزر)

ہوں کہ میری ماں میرے لیے رور ہی ہوگی میں تو کراچی کام کے لیے آیا تھا مگر مجھے کام ملا نہیں۔ مجھے آپ ٹکٹ دلادیں۔ تاکہ میں پشاور چلا جاؤں۔ اس کے ہاتھ میں سویا پچاس روپے کی کچھ چیزیں تھیں اس نے کہا کہ یہ آپ رکھ لیں۔ میں نے وہ چیزیں اسے واپس کی۔ ٹکٹ دلانی اسے اور جن کو چھوڑنے آیا تھا ان سے درخواست کی کہ اس کو پشاور میں اس کے گاؤں تک پہنچا کر آئے گا۔ تو مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ آج مجھے جو مقام حاصل ہے وہ شاید اس لڑکے کے ساتھ چھوٹی سی نیکی کر کے ہے۔

1 رمضان المبارک ہو یا عید۔ ان دنوں میں دوسروں کی مدد کر کے سب سے زیادہ خوشی ملتی ہے ہم رمضان میں افطار پارٹیوں کا اہتمام کرتے ہیں لیکن درحقیقت ہم ان پارٹیوں میں پیٹ بھروں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ ان پارٹیوں میں کم سے کم دو سے پانچ لاکھ روپے ضرور خرچ ہو جاتے ہیں اور اس رقم میں ہم اگر چاہیں تو 100 گھروں کو ایک ماہ کا راشن دے رکھتے ہیں۔ تو میں تو رمضان میں یہ کارِ ثواب ضرور حاصل کرتا ہوں۔ اور بہت سادگی اختیار کرتا ہوں۔ سچی خوشی لوگوں کے کام آکے ہی ملتی ہے۔ میں ایک واقعہ آپ کو سنا تا ہوں کہ جب میں چھوٹا تھا اور میوزک کا طالب علم تھا تو کسی عزیز کو رمضان کے آخری عشرے میں ٹرین میں بٹھانے کے لیے اسٹیشن گیا تو ایک پٹھان آیا میرے پاس اور چونکہ مجھے پشتو آتی تھی تو اس نے مجھ سے پشتو میں بات کی کیونکہ میرے جو ساتھی اسٹیشن آئے تھے انہوں نے اس لڑکے سے کہا کہ انہیں پشتو آتی ہے تو اس لڑکے نے کہا کہ میں پشاور جانا چاہتا

2 چونکہ میرا تعلق ایک لوئر کلاس فیملی سے تھا اللہ نے مجھے پرموٹ کیا تو عید کی کے حوالے سے حالات ہمیشہ بس ایسے ہی رہے ہیں تو ایسے نامساعد حالات میں کبھی ایسی عید نہیں ملی کہ اسے یادگار کہہ سکوں۔ چھوٹے تھے تو 10 روپے عید ملتی تھی بڑے ہوئے تو 100 200 روپے ملنے لگے اور جب خود بڑے ہوئے تو عید دینے والوں میں شامل ہو گئے۔ اور عید بانٹنے میں مزا آتا ہے۔

3 بہت سی عیدیں یادگار ہیں ایک تو وہ جب اپنے دو تین بھائیوں کو لے کر میں نے کراچی سے پشاور تک کا سفر بائے روڈ 2222 بائیں گھنٹوں میں طے کیا اور عید کے دن والد کی قبر پر گیا۔ اور وہ سری یادگار عیدیں وہ ہیں جو

ازگئے تھے۔
3 ہر وہ عید جو فیملی کے ساتھ گزرے یادگار ہی ہوتی ہے تو سب سے یادگار عید دادی کے انتقال سے پہلے ان کی آخری عید تھی۔ اس عید پر اتفاق دیکھیں کہ تاجا جان اور دیگر لوگ پاکستان آئے تھے عید کرنے اور سب نے ایک ہی جگہ یہ عید کی تھی۔ کیا پتا تھا کہ یہ دادی جان کے ساتھ آخری عید ہوگی۔ اور پھر دادی جان کے بعد جو پہلی عید گزری وہ بہت ہی سوگوار عید تھی۔ اور گزشتہ سال عید کے دن ہی مجھے کام پر جانا پڑا تھا تو وہ عید فیملی کے بغیر گزری تھی تو بہت بور ہوا تھا۔

حامد میر — (اینکر + صحافی جیونیوز)

1 ہر سال عید کے موقع پر مستحق لوگوں کے ساتھ کچھ کرنا اچھا لگتا ہے کہ عید منانے کا حق ان کو بھی اتنا ہی ہے جتنا کہ ہم صاحب حیثیت لوگوں کا۔ اور اس خوشی کے موقع پر سب کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے۔ عید کے دن لاہور میں والدین کی آخری آرام گاہ ضرور جاتا ہوں۔

2 بچپن میں جب والد صاحب عیدی کے طور پر پانچ روپے دیا کرتے تھے تو بہت زیادہ خوشی ہوتی تھی۔ اسے خرچ کرتے تھے تو لگتا تھا کہ خرچ ہی نہیں ہو رہے اتنی ویلیو اور برکت تھی ان پیسوں میں۔
3 دو عیدیں بہت یادگار ہیں میرے لیے۔ ایک



ہم اپنے گھر والوں سے دور دوسرے ملکوں میں جا کر پروگراموں کے ذریعے سیلیبریٹ کرتے ہیں یا اپنے ملک میں پروگرام کرتے ہیں۔

حناجیبیہ — (نعت خواں)

1 آج کی بات نہیں مجھے ہمیشہ سے ہی عید کے موقع پر غریبوں کی مدد کر کے سچی خوشی حاصل ہوتی ہے۔
2 ہماری دادی جان ہم سب سے بہت پیار کرتی تھیں انہوں نے اپنے ہاتھوں سے جو پہلی اور آخری عیدی دی تھی وہ میرے لیے یادگار عیدی تھی۔
3 گزری عید پر میرے پاپا کو بمپرکیش پر اتر ملا تھا۔

علی رحمن — (آرٹسٹ)

1 اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی نعمتوں سے نوازا ہوا تھا تو میں ان نعمتوں کو عید کے موقع پر غریبوں کو تقسیم کر کے بہت خوش ہوتا ہوں۔ اور میرا یہ تجربہ ہے کہ غریبوں کی مدد کر کے دل کو بہت خوشی ہوتی ہے۔
2 عیدی کے حوالے سے مجھے یاد ہے کہ میں شاید پندرہ سال کا تھا کہ عید کے دن والد صاحب کے کچھ دوست آئے ہوئے تھے اور انہوں نے ہمیں 10،10 ہزار عیدی دی وہ وہی سے آئے ہوئے تھے تو پندرہ سال کی عمر میں ہزار روپے ملنا بھی بہت بڑی بات ہوتی تھی تو یہ تو 10 ہزار تھے جس کو پا کر ہمارے تو ہوش ہی



ماہنامہ خانا

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

لاہور

جولائی 2015 کا شمارہ عید نمبر شائع ہو گیا ہے

جولائی 2015 کے شمارے کی ایک جھلک

- ☆ ”عید گنگنا نے لگی“ مصنفین سے عید سروے،
- ☆ ”چاند چاندنی اور چاند رات“ روینہ سعید کا مکمل ناول،
- ☆ ”قسم دے“ سہاس گل کا مکمل ناول،
- ☆ ”دل محبت کا طالب“ شازیہ رفیق کا مکمل ناول،
- ☆ ”چاند گھر کی شہزادی“ سندس جبین کا ناول،
- ☆ ”عید کا پورا چاند“ نائلہ طارق کا ناول،
- ☆ حسین اختر، حمیرا نوشین، حیا بخاری، قرۃ العین خرم ہاشمی اور کلفۃ شاہ کے افسانے،
- ☆ ”پرہت کہہ اُس یاد کھیں“ نایاب جیلانی کا نیا سلسلے وار ناول،
- ☆ ”اک جہاں اور ہے“ سدرۃ المنتہیٰ کا سلسلے وار ناول،



بیادِ نبی ﷺ کی پیاری باتیں، انشاء نامہ اور وہ تمام مستقل سلسلے جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

جولائی 2015ء کا شمارہ آج ہی اپنے قریبی
بک اسٹال سے طلب کریں



2005ء کی عید جو میں نے زلزلہ متاثرین کے ساتھ گزارا تھی اور دوسری 2010ء میں خیبر پختونخواہ میں سیلاب زدگان کے ساتھ عید منائی تھی۔

فرید رئیس — (اینکوڈان نیو)

- 1 عید کا تہوار اس لحاظ سے اہم ہوتا ہے کہ سب سے ایک ہی دن ملنے کا موقع مل جاتا ہے اور سب کے ساتھ عید گزار کر ہی سچی خوشی حاصل ہوتی ہے عام دنوں میں ایسے مواقع ذرا کم ہی میسر آتے ہیں۔
- 2 یاد ہیں بچپن کی وہ تمام عیدیاں جو تالی، داوی اور دیگر رشتے داروں سے ملا کرتی تھیں۔ ان عیدیوں کی نہ صرف بہت اہمیت ہوتی تھی بلکہ خوشی بھی بے انتہا ہوتی تھی۔ اب تو کئی بزرگ ہمارے درمیان نہیں رہے تو بس ان کی یادیں رہ گئی ہیں۔
- 3 وہ تمام عیدیں جو ایک ساتھ اپنوں کے درمیان رہ کر گزاریں یادگار ہیں۔



حرفِ سادہ کو دیباچہ عجاز کارنگ

امت الصبور

میرے روز و شب تھے بندھے ہوئے موسموں کے مزاج سے
کبھی ایک لمحہ بھی سال تھا، کبھی سال پل میں گزر گیا
آپ کی محبتوں کے ساتھ ایک اور سال کا سفر تمام ہوا۔

43 برسوں پر محیط یہ سفر جتنا مشکل تھا، اتنا ہی آسان بھی تھا کہ اس سفر میں لگن اور شوق شامل تھا جس نے
تھکنے نہیں دیا۔

گردش ماہ و سال کی نیرنگیوں میں کئی راستوں سے گزرے، کئی اتار چڑھاؤ دیکھے لیکن قافلہ شوق رکنے نہیں پایا،
وہ شوق وہ جستجو وہ تلاش آج بھی جاری ہے۔

اس طویل سفر میں ہماری مصنفین نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ ان کی سوچ اور فکر کے رنگ لفظوں میں ڈھلے تو
ان میں زندگی کے سارے منظر سمٹ آئے۔ ان کی تحریروں میں عہد حاضر کی کرب ناک حقیقتوں کی آگہی کے
ساتھ ساتھ شگفتگی، دل آویزی اور خوابوں کے دلکش رنگ بھی شامل تھے انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے
لاکھوں قارئین کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی، ان کے دلوں میں امید کے چراغ روشن کیے، یہی وجہ ہے کہ
خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے مصنفین کو اپنی پہچان کے ساتھ ساتھ قارئین کی بے پایاں محبت و تحسین بھی ملی۔
فطری بات ہے ہم جن کو پسند کرتے ہیں، جن سے لگاؤ رکھتے ہیں، ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے
ہیں، ہماری قارئین بھی مصنفین کے بارے میں ان کی ذات کے حوالے سے جاننا چاہتی ہیں۔

سالگرہ نمبر کے موقع پر ہم نے مصنفین سے سروے ترتیب دیا ہے، سوالات یہ ہیں۔

- 1 لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت میں منتقل ہوا؟ یا صرف آپ کو قدرت نے تخلیقی صلاحیت عطا کی۔ گھر
میں آپ کے علاوہ کسی اور بہن بھائی کو بھی لکھنے کا شوق تھا؟
- 2 آپ کے گھر والے، خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں؟ ان کی آپ کی تحریروں کے بارے میں کیا
رائے ہے۔
- 3 آپ کی کوئی ایسی کہانی جسے لکھ کر آپ کو اطمینان محسوس ہوا ہو۔ اب تک جو لکھا ہے، اپنی کون سی تحریر زیادہ
پسند ہے؟

4 اپنے علاوہ کن مصنفین کی تحریروں شوق سے پڑھتی ہیں؟

5 اپنی پسند کا کوئی شعریا اقتباس ہماری قارئین کے لیے لکھیں۔
آئیے دیکھتے ہیں، مصنفین نے ان کے کیا جوابات دیے ہیں۔

سعدیہ حمید چودھری

چند کر دیا۔ بچوں کے ایڈیشن کو بڑھ کر، الفاظ کے جوڑ
توڑ سیکھا کرتی تھی۔ نونہال پھول اور تعلیم و تربیت
سے الفاظ کی بنت کاری سیکھی۔

اپنی عمر سے بڑے الفاظ لکھ کر، اکثر دوسروں کو

1 قلم سے میرا رشتہ۔
اللہ اور میری اماں کا مرہون منت ہے۔ صلاحیت
خدا داد تھی۔ مطالعے سے گہرے شغف نے اسے دو

اس قناعت۔
 کبھی گھٹن بہت بڑھ گئی تو کاغذ سیاہ کر دیے۔ اندر کی
 سیاہی کی دوات باہر کاغذ پہ الٹ دی، مگر اب ایک
 عرصہ ہوا اندر جھانکنے کا وقت نہیں ملا۔

باہر اور باہر والے لوگ زیادہ طاقتور اثر بری رکھتے
 ہیں۔ قلم ہاتھ سے پھسل گیا ہے (دیکھیں کب پکڑتی
 ہوں) کبھی کوئی مصرعہ اودھم مچا دیتا ہے۔ کبھی کسی کی
 نم آلود آنکھیں شور مچانے لگتی ہیں۔ کبھی کسی کی ان
 کسی کہانی دل بو بھل کر دیتی ہے، مگر کہانی لکھنے کا وقت
 نہیں ملتا۔ (نجانے میں اتنی مصروف یا کابل کیوں ہو گئی
 ہوں؟) اچھے دوستوں کی دھونس بھی کام نہیں آتی،
 جانے انجانے اچھے لوگوں کی فرمائشیں سن کر میری
 کابلی دور نہیں ہوتی، کب دور ہوگی؟ یہ کبھی وقت ملا تو
 سوچیں گے۔

2 میرے بہن بھائیوں کو لکھنے کا شوق تھا، بلکہ وہ
 برگد کے درخت ہیں اور میں ان کے نیچے اگا ہوا ایک
 چھوٹا سا ڈیزیز کا پھول۔ میں ان کی تحاریر کے مقابلے
 میں اتنی کوتاہ قامت ہوں، مگر جو بہت دور برگد کے
 درخت ہیں۔ ان کو میں اور میری صلاحیتیں کھل کے
 نظر آتی ہیں اور وہ تعریف کرنے سے بھی نہیں
 چونکتے۔

مجھے بہت اچھے اساتذہ ملے، جنہوں نے مجھے جزوی
 طور پر نہیں بلکہ کاملیت کے ساتھ علم دیا۔ میں نے
 بھی اوک بھر کے نہیں لیا بلکہ اپنا دامن بھر لیا۔
 ابھی بھی سیکھنے کا عمل جاری ہے نا پختگی اور کوتاہ
 قامتی کامل بننے کے احساس کو جنم ہی نہیں لینے دیتی۔
 To be or not to be کا پنڈولم اکثر
 کنفیوژن پھیلاتا رہتا ہے۔ ”میں ہوں“ اور ”میں
 ہی ہوں“ کا فرق دامن گیر رہتا ہے۔

اس ضمن میں الحمد للہ Blessed ہوں۔
 میرے قلم کی کاوشیں میری ماں کے نام ہیں۔ وہ
 بہت خوش ہوتی ہیں۔ یہی میرا اجر ہے آج کل میری

حیران کرتی تھی، نجانے قلم بڑا ہے یا لکھنے والی۔
 ایک بار میری محترم استاد میرے دل کے بہت
 قریب ہستی، رحمانہ عبدالقیوم نے ساری کلاس کو
 اصلاح کی غرض سے کچھ الفاظ لکھ کے دیے۔ میں نے
 وہ الفاظ لکھے تو انہوں نے ایک نظر دیکھا اور کاپی لوٹا
 دی۔ ”تمہیں اصلاح کی ضرورت نہیں“ یہ ایک بیش
 قیمت تعریف تھی۔ جو پہلی بار میرے حصے میں آئی۔

میرے لکھے ہوئے خطوط جو میں اکثر
 Reminder کے طور پر عزیز ہستیوں کو لکھا کرتی
 تھی۔ میرے دوستوں کی من پسند تحریر ہوا کرتی
 تھی۔ مکاتیب غالب تو تھا مکاتیب سعدی بھی کہتے
 تھے سب۔ کہتے ہیں کہ خط آدمی ملاقات ہوتا ہے، مگر
 میری یہی کوشش ہوتی تھی کہ اسے پوری ملاقات ہی
 بنا ڈالوں۔ اب تو میڈیا اتنا مقبول عام اور ذمہ دار ہو چکا
 ہے کہ کاغذ اور قلم کا یہ تعلق اتنی معنی خیزی نہیں
 رکھتا۔

”یار تم لکھا کرو“ اکثر یہ نادر مشورے ملتے تھے سو
 پھر ان پر عمل کرنے کا بھی سوچ لیا۔

قلم در حقیقت مجھے میری ماں سے وراثت میں ملا۔
 وہ کہانیاں لکھا کرتی تھیں۔ حلیل الرحمن اور محمود شام
 کے ساتھ ان کا ادبی تعلق اور راہنمائی کا مضبوط تعلق
 تھا۔ ان کی کچھ ادھوری کہانیاں تھیں۔ جن کو میں نے
 مکمل کیا۔ لفظوں کو قالب میں ڈھالا تو خواتین
 ڈائجسٹ کا پلیٹ فارم ملا۔ امتل کی اپنائیت بھری
 راہنمائی ملی۔ جو الحمد للہ آج بھی ملتی ہے۔ کتنا خوب
 صورت تعلق ہے ناکہ زندگی کے برتچ راستوں میں
 کھونے کے بعد بھی آپ کسی کو تلاشیں تو وہ آپ کو

اسی جگہ مل جائے جہاں چھوڑا تھا۔
 پھر مجھے لگا کہ میں لکھ سکتی ہوں۔ میرا مطمع نظر،
 ذات کی شناخت یا نام کمانا نہیں تھا۔ میرے اندر قدرتی
 طور پر ایک بے نیازی اور قلندری ہے جس نے مجھے
 ہمیشہ قانع رکھا ہے جو مل گیا اسے لے لیا۔ جو نہیں ملا

www.PAKSOCIETY.COM
 حسن، سب میرے دل کے قریب ہیں۔ کہیں نہ کہیں
 میری جھلک موجود ہے۔
 5 شاعری۔

میری روح کا حصہ ہے۔ بہت سے شعراء کو بلا
 تخصیص پڑھا۔ فرحت عباس شاہ کی شاعری اور ان کے
 اشعار پہلی مرتبہ پہلی بارش بن کر برسے تھے اور کچی
 مٹی مہکنے لگی تھی۔

بارش ہوئی تو گھر کے درتچے سے لگ کے ہم
 چپ چاپ، سوگوار تمہیں سوچتے رہے

بلا کی افراتفری ہے ہماری ذات میں لیکن
 ہمیں اس بے دھیانی میں بھی تیرے دھیان رہتے

ہیں مقام فیض، راہ میں کوئی جچا ہی نہیں
 جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے
 منحصر ہے کس کی کتاب Bed Back ہے۔ وہ ہی
 اشعار زریب دہرائی ہوں۔ نصیر احمد ناصر کی نظمیں،
 گلزار کی گل و گلزار شاعری، ناصر کاظمی کی اداسی۔ محسن
 نقوی کی گمشدہ محبت۔ احمد فراز کا رومانٹھیزم اور فیض
 کی عظمت، سیکھنے کو بہت کچھ ہے۔

6 آج کل ایک اقتباس پسندیدگی کی سند پا چکا ہے
 بلکہ زندگی کا کلیہ ہاتھ آچکا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ
 آپ کے ساتھ تیسرے کروں۔

”انسان سے بندہ بننے کا نسخہ بہت آسان ہے بس
 کرنا کچھ ایسے ہے کہ جو مل جائے اس پہ شکر کر لو، جو
 چھن جائے اس پہ افسوس نہ کرو، جو مانگ لے اسے
 دے دو۔ جو بھول جائے اسے بھول جاؤ۔ دنیا میں خالی
 ہاتھ آئے تھے، خالی ہاتھ ہی جانا ہے بس جتنی ضرورت
 ہو اتنا ہی رکھو، ہجوم سے پرہیز کرو۔ تنہائی کو اپنا سا تھی
 بناؤ۔ مفتی ہو تب بھی فتوے جاری نہ کرو، جسے خدا نے
 ڈھیل دی ہو اس کا احتساب کبھی نہ کرو۔ بلا ضرورت

سچ فساد ہوتا ہے۔ کوئی پوچھے تو سچ بولو اور نہ چپ رہو۔
 بس ایک چیز کا دھیان رکھنا کسی کو خود ہمیں چھوڑنا
 جو جا رہا ہے اسے جانے دو، لیکن اگر کوئی واپس آئے تو
 اس کے لیے دروازے کھلے رکھو۔ یہ اللہ کی صفت ہے۔“

کتاب ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی، جو تقاریر
 پر مشتمل ہے، زیر طباعت ہے۔ اس کا انتساب بھی
 انہی کے نام ہے۔

3 مجھے ہر وہ کہانی اچھی لگتی ہے۔ جس میں بے
 ساختگی ہو، پروفیشنلزم کم ہو، جو اپنی اپنی سی لگے۔ جس
 نے بھی لکھی ہو۔ میں نے بلا تفریق سب کو پڑھا ہے،
 بہت اچھے لکھاری ہیں سب، جو آج کل لکھ رہے ہیں۔
 رضیہ بیٹ کو میں نے نہیں پڑھا (اماں کی طرف
 سے پابندی تھی) مگر آج کل مجھے لا بیری سے ان کی
 آب بتی ملی ہے، پچھڑے لمبے، نایاب تصاویر سے مزین۔
 میرے زیر مطالعہ ہے۔ قبل از پاکستان کا طرز رہن
 سن اور بااخلاق عام سے لوگوں سے ملاقات کرنی ہے
 تو اس کتاب کو پڑھیں۔ رومانٹھیزم ایک خوب صورت
 ذائقہ ہے۔ کھٹی میٹھی مٹھاس لیے۔

مگر ہم اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ نفرت اور
 انہستی جو Attitudes کہلاتے ہیں۔ ان کا معزز
 مقام، معاشرتی لحاظ سے متعین ہو چکا ہے۔ جب
 قدرتی چشمے کا راستہ روکا جاتا ہے۔ تو وہ پتھر کی چٹانوں
 سے ٹکرا کے اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے۔ جس کے
 اثرات اکثر منفی بھی ہوتے ہیں۔

4 ہر کہانی جب مکمل ہوتی ہے تو اطمینان کا تسلی
 بخش احساس ہوتا ہے۔ آج بھی کسی کہانی پر کچھ دل
 کے قریب لوگ تبصرہ کرتے ہیں تو پروا کی ہوا چلنے لگتی
 ہے۔

یہی لوگ اندھیروں میں چمکنے والے جگنوؤں کی
 مانند ہیں جو آپ کی کہانیوں کو سند قبولیت بخشتے ہیں،
 آپ کو پڑھتے ہیں اور آپ سے محبت کرتے ہیں۔
 مختلف سوالات پوچھتے ہیں۔ زیادہ سوالات، سب مایا
 ہے، من بوٹو، پروانہ، دیا اور جگنو، ساحر آنکھیں اور کچی
 عمر کے دکھ، کچھ پرانے راستے، فرہاج، ماہا اور عید کا چاند
 کے متعلق پوچھے جاتے ہیں۔

سب مایا ہے کی مہریال، من و تو کی زینب۔۔۔
 پروانہ، دیا اور جگنو کی دیا احمد، کچھ پرانے راستے کی سارہ



- 1 "اصلی اور پورا نام؟"
- "مریم کمال انصاری۔"
- 2 "پیار سے کیا پکارتے ہیں؟"
- "ابو چاچا اور بھائی "میمو" اور امی "بے بی"
- 3 "جنم سال / شہر؟"
- "یکم مارچ 1991ء / سعودی عرب۔"
- 4 "ستارہ؟"
- "-Pices"
- 5 "بہن بھائی آپ کا نمبر؟"
- "ایک بڑا بھائی ہے پھر میں۔"
- 6 "تعلیمی ڈگریاں؟"
- "A لیول کر لیا ہے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے نیویارک جاؤں گی۔"
- 7 "شادی؟"
- "ابھی تو بالکل بھی نہیں کچھ بن جاؤں گی پھر کروں گی۔"
- 8 "شادی اپنی پسند سے یا والدین کی پسند سے؟"
- "دونوں کی پسند سے ماں باپ کا زیادہ تجربہ ہوتا ہے۔"
- 9 "شوہز میں متعارف کرانے کا سہرا؟"

مریم انصاری سے باتیں

شاہین رشید

- 13 "10 سال کی عمر میں کیا کمایا؟"
- "ایک پروگرام کے 1000 روپے ملتے تھے۔ مہینے میں چار پروگرام تو چار ہزار۔"
- 14 "شوہز کے بارے میں تاثرات؟"
- "اب تو ہماری انڈسٹری بہت "ہوم" کر رہی ہے الحمد للہ اس لیے نئے لوگوں کو آنا چاہیے۔"
- 15 "صبح کب اٹھتی ہیں؟"
- "جب میرا Call ٹائم ہو اور رات جب میرا "بیک اپ" ہو۔"
- "میرے بھائی علی انصاری کے سر جاتا ہے۔"
- 10 "پہلا سیریل؟"
- "بٹی آئی لویو" اور اس سے شہرت بھی ملی۔"
- 11 "پہلی فلم؟"
- "سرمد کھوسٹ کی فلم آئینہ۔"
- 12 "پریکٹیکل لائف میں کب آئیں؟"
- "10 سال کی عمر سے 'شوقیہ آئی ریڈیو' اور کمائی کا عمل بھی شروع ہو گیا۔ پریکٹیکل لائف نہیں کہہ سکتے 'فیلڈ کہہ سکتے ہیں۔"

16 ”صبح کی پہلی خواہش؟“

”کہ جلدی سے تیار ہو کر شوٹ پہ جاؤں اور اپنا کام جلدی ختم کرادوں۔“

17 ”گھر میں کس کی بات بری لگتی ہے؟“

”گھر میں تین ہی تو لوگ ہیں۔ کسی کی بات بری نہیں لگتی۔ سب پیار کرتے ہیں۔“

18 ”پاکستان کے لیے کیا کہیں گی؟“

”قانون کی پاسداری نہیں اور شکایات کی فہرست لمبی ہے۔“

19 ”جسمانی طور پر کیا آپ ایک مکمل انسان ہیں؟“

”الحمد للہ اور اللہ نے جیسا بنایا ہے اس پر خوش رہنا چاہیے۔ ہاں اپنے آپ کو فٹ رکھنا ہمارا اپنا کام ہے۔“

20 ”محنت کرو، حسد نہ کرو اس پر عمل کرتی ہیں؟“

”بالکل کرتی ہوں۔ محنت کرو اپنے آپ کو فٹ رکھو۔ کوئی آپ کی جگہ نہیں لے سکے گا۔“

21 ”تیز بھوک میں کیفیت؟“

”آج کل تو ڈائٹ پی ہوں۔ ویسے کنٹرول کرتی ہوں۔“

22 ”دھوپ میں نکلنا کیسا لگتا ہے؟“

”کوئی مسئلہ نہیں۔ سن بلاک لگا کر نکلتی ہوں۔“

23 ”کس دن کاشدت سے انتظار کرتی ہیں؟“

”وہ ایک دن.... بتانے والا نہیں ہے۔“

24 ”کب گھر سے باہر نہیں نکلتیں؟“

”جب بہت تھکی ہوئی ہوتی ہوں۔“

25 ”کب بہت خوش ہوتی ہیں؟“

”میں تو ہمیشہ ہی خوش رہتی ہوں اور امی کو دیکھ کر تو بہت ہی خوش ہوتی ہوں کہ وہ میری سب کچھ ہیں۔“

26 ”طبیعت میں ضد ہے یا اچھی پنچی ہیں؟“

”طبیعت میں ضد تو ہے۔ بہت ضدی ہوں کوئی چیز چاہیے تو بس چاہیے چاہیے اور ضرور چاہیے۔“

27 ”غصہ آتا ہے؟“

”میں شارٹ نمپر نہیں ہوں، لیکن جب کوئی مجھے تیلی لگا دے تو بس پھر میرا غصہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔“

28 ”غصے میں کیفیت؟“

”دروازہ پٹخنا.... کیونکہ منہ کا تیر واپس نہیں آتا بس پاؤں

لینگوٹیج۔“

29 ”مردوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے کیا بری؟“

”مرد بہت Arrogant ہوتے ہیں۔ اچھی؟.... اچھی تو کوئی بھی نہیں لگتی۔“

30 ”کوئی نوجوان مسلسل گھورے تو؟“

”تو نزدیک جا کر کہوں گی کہ بھی کیا مسئلہ ہے۔“

31 ”پرائز بانڈ لیتی ہیں؟“

”ہاں جی لیتی ہوں، مگر نکلا نہیں آج تک۔“

32 ”گھر میں کون غصے کا تیز ہے؟“

”بھائی.... بہت ڈرتی ہوں ان کے غصے سے۔“

33 ”کیا منہ سے نکلی فرمائش پوری ہوتی ہے؟“

”بالکل ہوتی ہے اور میری فرمائشیں میری امی پوری کرتی ہیں اور میرے بولنے سے پہلے پوری کرتی ہیں۔“

34 ”محبت کا اظہار آسانی سے کر لیتی ہیں؟“

”ہرگز نہیں.... بہت مشکل ہوتی ہے۔ الفاظ نہیں ملتے؛“

35 ”کس ملک میں ہمیشہ رہنا چاہتی ہیں؟“

”صرف اور صرف اپنے پاکستان میں.... بہت خوش ہوں۔“

36 ”شاپنگ پہ پہلی خریداری؟“

”پہلے پورا مال گھومتی ہوں۔ پھر اگر کچھ پسند آئے تو خرید لیتی ہوں۔ میرے ساتھ تو جو شاپنگ جائے گا وہ پتلا ہو کر آئے گا۔“

37 ”انسان کا دنیا میں آنے کا مقصد؟“

”ایک ہی مقصد ہے کہ یہ زندگی ایک امتحان ہے، جو اللہ ہمارا لے رہا ہے اور ہمیں یہ امتحان پاس کرنا ہے۔“

38 ”پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتی ہوں؟“

”کہ ان پیسوں کا کچھ خرید لوں یا کھانا کھا لوں۔“

39 ”کوئی وقت جو کرائسز میں گزارا؟“

”بالکل گزارا ہے۔ لیکن بُرا وقت بھی گزر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اتنا مہربان ہے کہ بُرا وقت دکھا کر پھر اچھا وقت بھی لے آتا ہے۔“

40 ”اللہ کا دیا بہترین تحفہ؟“

”والدین۔“

41 ”گھر کی ایک شخصیت جن کے ساتھ ایک شام گزارنا چاہتی ہوں؟“

”اپنے ابو کے.... ابو سعودی عرب میں ہیں تو صبح اٹھتے ہی ان کو sms کرتی ہوں۔“

53 ”فون نمبر آسانی سے دے دیتی ہیں؟“

”ہرگز نہیں۔“

54 ”گھر میں گھریلو لڑکی ہیں یا رعب ہے؟“

”بالکل گھریلو لڑکی، گھر میں مہمان آجائیں تو خود میزبانی کرتی ہوں چائے کافی، کولڈ ڈرنک، کھانا وغیرہ سب کچھ خود کرتی ہوں۔“

55 ”کثرت سے جمع کرتی ہیں؟“

”تصادیر۔“

56 ”انسان کی زندگی کا سب سے اچھا دور؟“

”بچپن، خوب صورت اور حسین دور۔“

57 ”برامان جاتی ہیں؟“

”برامانا.... میری فطرت میں ہی شامل نہیں ہے۔“

58 ”وقت کی پابندی کی قائل ہیں؟“

”بالکل ہوں اور کرتی بھی ہوں۔“

59 ”سب کچھ لٹانے کو دل چاہتا ہے؟“

”اپنی فیملی اور اپنی دوست فیملی۔“

61 ”کھانا کہاں کھانا پسند کرتی ہیں؟“

”مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کہیں پہ بھی بٹھادیں میں کھانا کھا لوں گی۔“

62 ”ہاتھ سے کھانے میں مڑا ہے یا چھری کانٹے سے؟“

”ہاتھ سے.... کون اتنی محنت کرے چھری کانٹے سے کھانے کی ہاں ابو کے سامنے چھری کانٹے سے ہی کھاتی ہوں۔“

63 ”کوئی کردار جو آپ کی شخصیت سے میچ کرتا ہو؟“

”سسرال میرا“ میں میرا پہلا پورشن جس میں میں نے پوزیٹو رول کیا تھا وہ میچ کرتا ہے۔“

64 ”انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟“

”میں تو فیس بک کنگ ہوں۔ فری ٹائم میں فون اور فیس بک یہ ہی ہوتی ہوں۔“

بقیہ صفحہ نمبر 287

42 ”موڈ فریش ہو جاتا ہے؟“

”جب کوئی مجھ سے اچھی طرح بات کرے کہ کیا کیا پورا دن گھر آؤں تو میرے لیے کھانا تیار ہو، سب کھانے پر میرا انتظار کر رہے ہوں۔“

43 ”آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتی ہیں؟“

”ہاں چھوڑ دیتی ہوں۔ بس اٹھ گئی تو اٹھ گئی۔“

44 ”پر خلوص کون لوگ ہوتے ہیں؟“

”اپنے اور کبھی کبھی پرانے بھی، آپ کو کبھی پتا ہی نہیں ہوتا کہ کوئی دور سے آپ کے لیے دعا مانگ رہا ہوتا ہے اور وہ دعا قبول ہو جائے تو انسان خود حیران ہوتا ہے کہ کس کی دعا لگی ہے۔“

45 ”چھٹی کا دن کہاں گزارتی ہیں؟“

”میری بہترین دوست فیملی ہے اس کے ساتھ گزارتی ہوں یا اپنے گھر والوں کے ساتھ۔“

46 ”فرصت کے اوقات؟“

”امی کے ساتھ ڈاک پہ جاتی ہوں یا پھرٹی وی دیکھتی ہوں۔“

47 ”شوٹ یہ جاتی ہیں تو کیا چیز ضرور لے جاتی ہیں؟“

”کوئی نہ کوئی کتاب کہ شوٹ کو دیر ہو تو پڑھ لوں۔“

48 ”لباس میں کیا چیز پسند ہے؟ مشرقی یا مغربی؟“

”سب پہن لیتی ہوں۔ مغربی اور مشرقی بھی۔“

49 ”اپنی شخصیت کے لیے ایک لفظ؟“

”Loving“

50 ”عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟“

”دونوں ہونی چاہیے۔“

51 ”گھر کے کس کونے میں زیادہ وقت گزارتا ہے؟“

”اپنے گھر کے باغ میں، بہت بڑا باغ ہے۔ پھول لگے ہوئے ہیں۔ بہت سکون ملتا ہے۔“

52 ”کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتی ہیں؟“



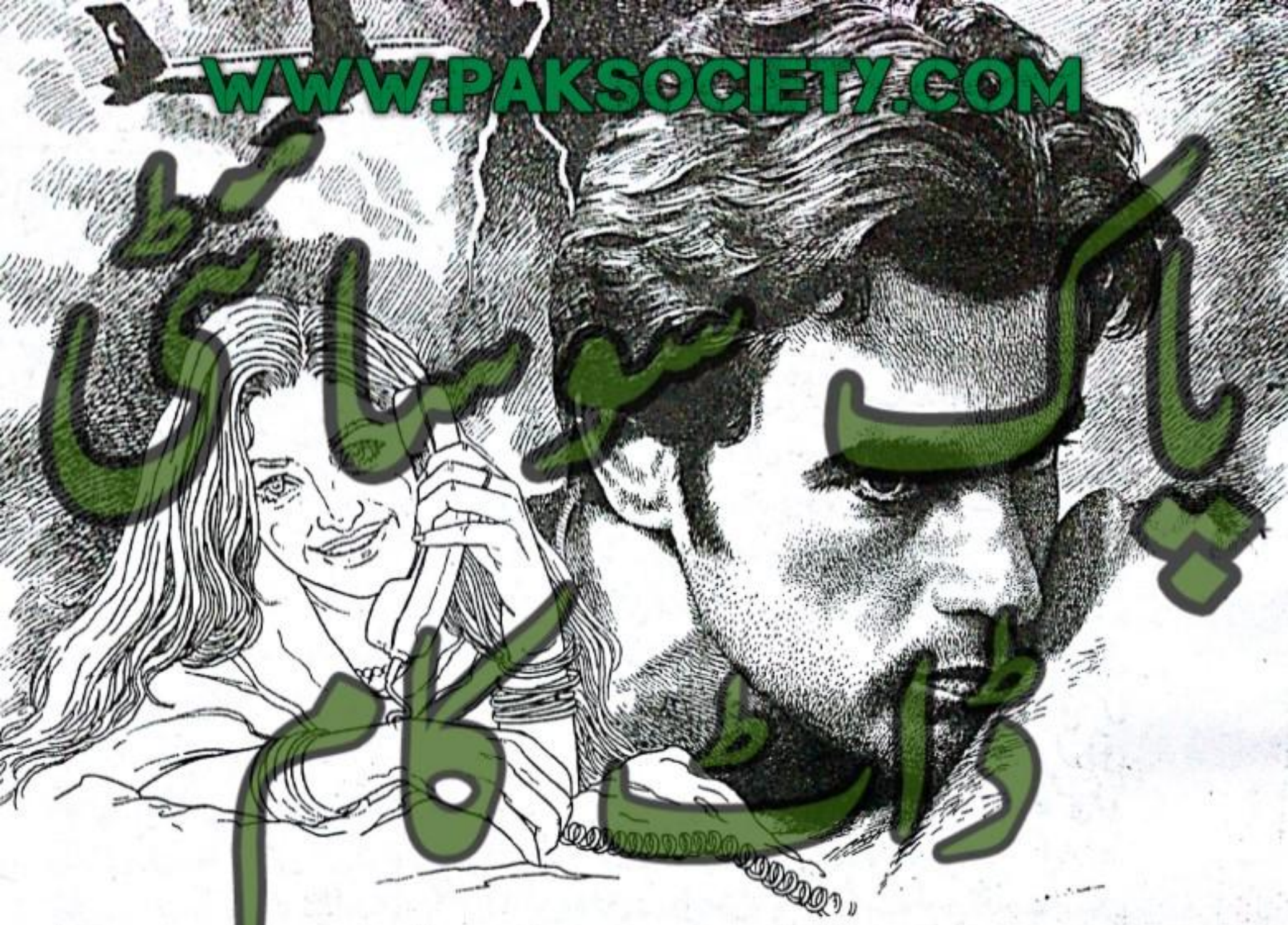
عمیرہ احمد



آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کر دیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایرنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سرا مل جاتا ہے۔



- 3- وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون اور ادویات کے بغیر سو نہیں پارہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔
- 6- اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ ہینسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست بچے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔
- A- وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔
- 7- وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔
- 4- وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

لوں قسٹ

افریقہ کا دوسرا سب سے بڑا ملک کانگو پھلی کئی دہائیوں سے دنیا میں صرف پانچ چیزوں کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ خانہ جنگی۔ جس میں اب تک 45 لاکھ لوگ جان گنوا چکے تھے۔ غربت کے لحاظ سے یو این کے اکنامک انڈیکس میں کانگو یو این کے 188 ممالک کی فہرست میں 187 ویں نمبر پر تھا۔ معدنی وسائل کے ذخائر کے لحاظ سے کانگو دنیا کا امیر ترین ملک تھا۔ گھنے جنگلات سے بھرا ہوا جہاں پر کثرت سے بارشیں ہوتی تھیں۔ اور (Pygmy people) پتہ قامت 'سیاہ قام لوگ کانگو کے ان جنگلات میں صدیوں سے پائے جانے والی انسانوں کی ایک ایسی نسل جو مہذب زمانے کے واحد غلام جنہیں غلام بنانا قانوناً جائز تھا۔

اور یہ پہچان صرف کانگو کی نہیں تھی، افریقہ کے ہر ملک کی پہچان کم و بیش ایسی ہی چیزیں بن چکی ہیں۔ ایک چھٹی شناخت جو ان سب ملکوں میں مشترک ہے وہ مغربی استعماریت کی نئی شکل ہے۔ ورلڈ بینک۔ جو ان تمام ملکوں میں غربت کو ختم کرنے اور بنیادی انسانی ضروریات کی فراہمی کے لیبل کے نیچے ان تمام ممالک میں امریکا اور یورپی ممالک کو اپنی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعے افریقہ کے قدرتی اور معدنی وسائل کو گنے کے رس کی طرح نچوڑنے کا موقع فراہم کر رہا ہے۔ کانگو میں بھی یہی ہو رہا تھا اور پھلی کئی دہائیوں سے ہو رہا تھا۔

1960 میں بیلجیم کی استعماریت سے نجات حاصل کرنے کے بعد کانگو نے تیس سال میں کم از کم بیس بار اپنا نام بدلا تھا۔ ساری جنگ نام رکھنے اور نام بدلنے کے بڑے مقصد کے حصول تک ہی محدود رہی اور بڑی عالمی طاقتوں امریکا اور فرانس کی پشت پناہی سے خانہ جنگی میں تبدیل ہوتی گئی۔ ایک ایسی ہولناک خانہ جنگی جس میں کانگو نے اپنی آزادی کے 55 سالوں میں تقریباً 45 لاکھ لوگوں کی جان گنوائی۔ ساڑھے چھ کروڑ کی آبادی والے اس ملک میں کوئی گھر اور خاندان ایسا نہیں بچا جو اس خانہ جنگی سے متاثر نہ ہوا ہو جس کے کسی فرد نے اس قتل و غارت میں جان نہ گنوائی ہو یا جسم کا کوئی حصہ نہ کھو بیٹھا ہو یا جس کے خاندان کی عورتوں کی عزت یا مال نہ ہوئی ہو جس کے بچے اور بچیاں جنسی زیادتیوں کا شکار نہ ہوئی ہوں یا چائلڈ سولجر کے طور پر متحارب گروپس کے ہاتھوں ایک دوسرے کے خلاف استعمال نہ ہوئے ہوں۔ یہ دنیا کی مہذب تاریخ کی وہ پہلی خانہ جنگی تھی جس میں ایک دوسرے سے لڑنے والے قبیلے، لڑائی کے دوران انسانوں کو قتل کرتے اور ان کا گوشت خوراک کے متبادل کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ خانہ جنگی 'دریائے کانگو کے گرد بسنے والے اس ملک کے لوگوں کا "کلچر" تھا۔ ایک ایسا "کلچر" جو مہذب دنیا کے مہذب لوگوں نے ان پر تھوپا تھا۔ خانہ جنگی کے ذریعے عالمی طاقتیں کانگو کی زمین اور معدنی وسائل پر قبضہ کر کے وہاں سے اربوں روپے کی معدنیات اپنے ملکوں اور اپنے معاشروں کی ترقی و فلاح و بہبود کے لیے لے جا رہی تھیں اور انہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ افریقہ میں انسانیت کی تذلیل کس کس طرح سے کر رہے تھے اور اس کو فروغ دینے کا بھی ذریعہ بن رہے تھے۔

اگر 45 لاکھ لوگ خانہ جنگی کا شکار ہوئے تھے تو تقریباً اتنی ہی تعداد بھوک، بیماری اور بنیادی انسانی ضروریات کی عدم فراہمی کی وجہ سے لقمہ اجل بن چکی تھی اور یہ سب کچھ اس ملک میں ہو رہا تھا جو معدنی وسائل کے ذخائر کے حساب سے دنیا کا سب سے امیر ترین ملک تھا۔ جس کی زمین کو بالٹ، پلائٹینم، یورینیم جیسی دنیا کی مہنگی ترین دھاتوں سے نہ صرف بھری ہوئی تھی بلکہ بہت ساری کمپنیوں مقامی لوگوں کو خشک دودھ، مسالے اور کھانے پینے کی روزمرہ کی اشیاء فراہم کر کر کے یہ ساری دھاتیں نکال بھی رہی تھیں۔

کانگو صرف ان دھاتوں سے مالا مال نہیں تھا بلکہ اس وقت دنیا بھر میں سب سے زیادہ خام ڈائمنڈ بھی پیدا کر رہا تھا دنیا بھر میں دوسرا سب سے بڑا بارانی جنگلات رکھنے کا اعزاز بھی کانگو کو ہی حاصل تھا جو نہ صرف اربوں ڈالرز کی قیمتی لکڑی کا مالک تھا بلکہ ان ہی جنگلات سے دنیا بھر میں ربر بھی بھیجا جا رہا تھا۔

اور یہ سارے اعزازات کانگو کے سینے پر بالکل اسی طرح لگے ہوئے تھے جس طرح افریقہ کے کسی فوجی ڈکٹیٹر

جنرل کے سینے پر لٹکے ہوئے میڈلز اور رنگ برنگی پٹیوں کی قطار اور اس کے ہولسٹر میں لٹکا خالی ریوالبور اور شاندار وردی کے ساتھ دنیا کے کسی بڑے ملک میں امداد کی بھیک کے لیے اس کا وہ دورہ جس میں ملنے والی زیادہ تر رقم اس کے بیرون ملک اکاؤنٹس میں ٹرانسفر ہو جاتی اور اس کے بدلے کانگو کی زمین کا سینہ کچھ اور خالی ہو جاتا۔

اور کانگو کی اسی زمین پر دنیا کے دو سرے بڑے بارانی جنگلات میں تقریباً پانچ لاکھ کے قریب وہ خستہ حال آبادی رہتی تھی جو اپنی گزر بسر شکار کر کے کرتی تھی جن کے افراد آج بھی اپنے جسم درختوں کی چھالوں پتوں یا جانوروں کی کھالوں سے ڈھانپتے تھے یا پھر وہ برمنہ رہتے تھے۔ پانچ لاکھ کی وہ آبادی چھوٹی چھوٹی لکڑیوں میں فرانس سے دو گنا رقبے پر پھیلے ہوئے ان بارانی جنگلات میں پھیلی ہوئی تھی اس لیے عیدوی اعتبار سے وہ کہیں بھی اس جنگلات کے قریبی آباد قصبوں میں آباد بانٹو قبیلے کے افراد پر غالب نہیں آسکتی تھی جو ہر لحاظ سے ان سے برتر تھے وہ کانگو کے آئینی اور قانونی شہری تھے جن کے پاس بنیادی حقوق بنیادی ضروریات کا سامان اور بہتر زندگی کے وسائل تھے۔

ان بے مایہ پست قامت کے پاس کچھ بھی نہیں تھا ان کے پاس صرف وہ جنگل تھا جس میں وہ رہتے تھے شکار کر کے پیٹ بھر لیتے تھے۔ تالابوں اور جھیلوں میں جمع بارش کے پانی سے پیاس بجھا لیتے تھے۔ درختوں کی لکڑیوں اور خشک پتوں سے جھونپڑیاں بنا کر چھت بنا لیتے تھے یا پھر گھنے درختوں پر مچان بنا کر رہ لیتے تھے۔ آپس میں شادیاں کر لیتے تھے اور ڈائریا، ملیریا جیسی چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا شکار ہو کر مر جاتے۔ ان کی زندگی کا چکر بس یہیں تک تھا۔

جو لوگ زیادہ گھنے جنگلات کے بجائے قصبوں کے قریب جنگلات میں رہتے تھے۔ وہ بانٹو قبیلے کے افراد کے غلاموں کے طور پر جنگل میں کام کرتے۔ ان کے لیے لکڑی کاٹنے، شکار کرتے، کان کنی کر کے مختلف قسم کی دھاتیں بانٹو قبیلے کے اپنے مالکوں کو پہنچاتے جو ان کے لیے بے کار تھیں اور بدلے میں ان کے مالک انہیں روٹی، کپڑا اور ضروریات کی وہ چھوٹی موٹی چیزیں دیتے تھے جو ان لوگوں کے لیے ضرورت سے زیادہ حیرت اور فخر کا باعث ہوئیں۔ انہیں دنیا سے جنگل کے علاوہ اور کچھ چاہیے بھی نہیں تھا، لیکن دنیا کو جنگل نہیں چاہیے تھے۔

2002 میں کانگو کی قائم مقام حکومت نے کچھ عالمی طاقتوں کے دباؤ میں جنگلات سے لکڑی کی کٹائی کا ایک نیا قانون وضع کیا اور اس قانون کے تحت کانگو کی حکومت کے پاس یہ اختیار آ گیا کہ وہ جنگلات میں رہنے والے قبیلوں اور آبادیوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے اپنی مرضی سے جنگل کا کوئی بھی حصہ کسی بھی طریقے سے استعمال کر سکتی تھی۔ ورلڈ بینک اور دوسرے بین الاقوامی مالیاتی اداروں نے نہ صرف اس فریم ورک کو سپورٹ کیا بلکہ کانگو کی حکومت کو مالی وسائل فراہم کیے تاکہ کانگو کے جنگلات کو مختلف زونز میں تقسیم کر کے نشان دہی کی جائے کہ کس زون میں درخت کاٹے جائیں گے اور کس حصے کو صنعتی مقاصد کے لیے جنگلی حیات کی بقا کے لیے استعمال کیا جائے گا اور نیشنل پارک کی صورت میں تبدیل کر کے انسانی رہائش کے لیے ممنوع قرار دے دیا جائے گا۔ ورلڈ بینک نے یو این کی خوراک کے عالمی ادارے کے ساتھ مل کر کانگو میں ان جنگلات کی تباہی کے ایک ”عظیم الشان“ پروجیکٹ کا آغاز کر دیا تھا۔

سالار سکندر جس وقت اس پروجیکٹ کے ہیڈ کے طور پر کانگو پہنچا تب تک اس منصوبے کو تین سال ہو چکے تھے۔ سالار سکندر کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ ورلڈ بینک اسے کس طرح استعمال کرنے والا تھا، لیکن اسے یہ اندازہ بہت جلد ہو گیا تھا۔ ایبا کا سے پہلی ملاقات کے بعد۔



پیسرس ایبا کا سے سالار سکندر کی پہلی ملاقات بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ اسے کانگو میں آئے تقریباً

ایک سال ہونے والا تھا جب لامو کو نامی جگہ کو اپنی ٹیم کے ساتھ وزٹ کرتے ہوئے پٹیس ایبا کا تقریباً دو درجن کے قریب Pygmies (پستہ قد لوگوں) کے ساتھ اچانک وہاں آگیا تھا جہاں سالار اور اس کی ٹیم کے لوگ اپنی گاڑیوں سے اتر کر اس علاقے کا جائزہ لے رہے تھے جسے کچھ عرصہ پہلے ہی ایک یورپین ٹمبر کمپنی کو لیز پر دیا گیا تھا۔ ان کے پاس پرائیویٹ اور گورنمنٹ دونوں کی طرف سے دی جانے والی سیکورٹی موجود تھی اور ان گاڑیوں نے ایبا کا اور اس کے گروپ کے لوگوں کو ایک دم وہاں نمودار ہوتے دیکھ کر حواس باختگی کے عالم میں بے دریغ فائرنگ شروع کر دی تھی۔

سالار نے دو ہگمیز کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا اور باقیوں کو درختوں کی اوٹ میں چھپتے اور پھر بلند آواز میں ایبا کا کو کسی درخت کی اوٹ سے انگریزی زبان میں یہ پکارتے سنا تھا کہ وہ حملہ کرنے نہیں آئے بات کرنے آئے ہیں۔ سالار اس وقت اپنی گاڑی کی اوٹ میں تھا اور اسی نے سب سے پہلے ایبا کا کی پکار سنی تھی۔ چند لمحوں کے لیے وہ حیران رہ گیا تھا کسی ہگمیز کا انگریزی بولنا اس کے لیے یقیناً "حیران کن تھا" لیکن اس سے زیادہ حیران کن وہ امریکن لب و لہجہ تھا جس میں ایبا کا چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ اسے ان سے بات کرنی ہے وہ صرف ملنا چاہتا ہے کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا اور اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔

سالار کی ٹیم کے ساتھ موجود گاڑیوں کا اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے تب تک ٹیم کے تمام افراد کو گاڑیوں میں پہنچا چکے تھے ماسوائے سالار سکندر کے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے گاڑیوں کی رہنمائی میں گاڑی میں سوار ہوتا اور پھر اس کی گاڑی بھی وہاں سے تیز رفتاری سے غائب ہو جاتی سالار نے گاڑیوں سے وہاں کی مقامی زبان کنگالا میں کہا تھا، کہ وہ اس پکارنے والے آدمی سے بات کرنا چاہتا وہ فائرنگ بند کر دیں کیوں کہ یہ ایک طرفہ ہے دوسری طرف سے نہ تو فائرنگ ہو رہی ہے نہ ہی کسی اور ہتھیار کا استعمال۔

اس کے گاڑیوں کو دیر تک اس سے بحث کرتے رہے اور اس بحث کو ختم کرنے کا واحد حل سالار نے وہ نکالا تھا جو اس کی زندگی کی سب سے بڑی بے وقوفی ثابت ہو سکتی تھی اگر دوسرا گروپ واقعی مسلح ہوتا۔ وہ ایک دم زمین سے اٹھ کر گاڑی کی اوٹ سے باہر نکل آیا تھا اس کی سیکورٹی پر تعینات گاڑیوں کے ہگمیز کے سامنے آنے پر اس طرح حواس باختہ نہیں ہوئے تھے جتنے اس کے اس طرح بالکل سامنے آجانے پر ہوئے تھے۔

سالار ان کی حواس باختگی سمجھ سکتا تھا۔ وہ پاکستان نہیں تھا، خانہ جنگی کا شکار کاٹگو تھا، جہاں کسی کی جان لینا مچھر مارنے کے برابر تھا اور یہ فعل و عارت کسی قانونی عدالت میں کسی کو کوئی سزا نہیں دلو سکتی تھی۔ جب جان لے لینا اتنا آسان ہو تو کوئی بھی حواس باختہ ہو کر خوف کی حالت میں وہی کرتا ہے جو اس کے گاڑیوں کے ہگمیز کے سامنے رہتا ہے۔ بہر حال خود مرجانے سے زیادہ بہتر انتخاب تھا اور اس وقت وہ کچھ فاصلے پر دو ہگمیز کی لاشیں دیکھ سکتا تھا اور وہ دور سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ زندہ نہیں تھے۔

فائرنگ اب ختم ہو گئی تھی اس کی تقلید میں اس کی سیکورٹی کے افراد بھی باہر نکل آئے تھے وہاں اب صرف دو گاڑیاں تھیں ٹیم کے باقی سب افراد وہاں سے اپنے اپنے گاڑیوں کی حفاظت میں نکل چکے تھے۔ فائرنگ کے ختم ہونے ہی ایبا کا بھی باہر نکل آیا تھا۔ سالار نے چلا کر اپنے گاڑیوں کو گولی چلانے سے منع کیا تھا پھر وہ اس ساڑھے چار فٹ قد کے بے حد سیاہ چھٹی ناک والے اور موٹی موٹی سیاہ آنکھوں والے آدمی کی طرف متوجہ ہوا، جو اپنے ساتھیوں کے برعکس جینز اور شرٹ میں تھا ان ننگے پاؤں والے پست قامت لوگوں کے درمیان جا کر زپنے بے حد عجیب لگ رہا تھا۔

اسے اب یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ حملہ آور گروپس کے افراد نہیں تھے۔ ورلڈ بینک اور دوسرے بین الاقوامی مالیاتی ادارے اپنی ٹیمز کو ان جنگلات میں کہیں بھی بھیجنے سے پہلے اس گروپ سے اپنی ٹیم کے افراد کے تحفظ اور

سیکورٹی کی ضمانت لیتے تھے جو گروپ اس علاقے پر قابض ہوتا تھا اور اس کے بدلے وہ اس متحارب گروپ کو کچھ نہ کچھ مالی امداد فراہم کرتے تھے۔ اگرچہ وہ علاقہ جس میں سالار کی ٹیم گئی تھی وہ خانہ جنگی سے متاثرہ علاقوں میں سے نہیں تھا اس کے باوجود اس ٹیم کے وزٹ کے لیے بھی تحفظ کی یقین دہانی کرائی گئی تھی اور اس کے باوجود یہ واقعہ ہو گیا تھا۔

”پٹرس ایباکا!“ اس پست قامت شخص نے آگے بڑھ کر تعارف کرواتے ہوئے سالار سے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا جسے تھامنے سے پہلے سالار نے بڑے نپے تلے انداز میں ایباکا کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا تھا وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ بھی ان مفلوک حال لوگوں ہی کی طرح ہو گا جو غیر ملکوں کی گاڑیاں سامنے آنے پر امداد کے لیے ان کے سامنے آجاتے تھے۔ مالی امداد نہ سہی، لیکن خشک خوراک کے ڈبے، دودھ، جو سز بھی ان کے لیے ایک عیاشی ہوتی۔ سالار بھی ایباکا سے ایسی ہی کسی ڈیمانڈ کا انتظار کر رہا تھا، لیکن جواباً ”ایباکا کی زبان سے اپنا نام سن کر وہ حیران ہو گیا تھا۔“

اس نے ایباکا سے اپنا تعارف نہیں کروایا تھا پھر بھی وہ اسے نام سے کیسے جانتا تھا۔ وہ ایباکا سے یہ سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس نے جواباً ”اسے بتایا کہ وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ لوموکا میں ہونے والے وزٹ کے بارے میں بھی اسے بینک کے آفس میں کام کرنے والے کسی مقامی آدمی نے بتایا تھا۔ جس نے ایباکا کی سرٹوژ کوشش کے باوجود سالار سے ملاقات کے لیے اپائنٹ منٹ کے حصول میں اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا اور یہ چند دنوں یا چند ہفتوں کی بات نہیں تھی۔ ایباکا ورلڈ بینک کے کنٹری ہیڈ سے ملاقات کے لیے کئی مہینوں سے کوشش کر رہا تھا۔ وہ سالار کے آفس نمبرز پر ہر روز ڈھیروں کالز کرتا رہتا تھا۔ ویب سائٹ پر موجود اس کے ای میل ایڈریس پر اس نے سینکڑوں ای میلز کی تھیں جن کا جواب ہر بار صرف موصولی ہی کا آیا تھا۔ اس کے بعد آگے کچھ نہیں۔ فون کالز ریسیو کرنے والے سالار کے عملے کے افراد کے پاس بھی ایباکا کے لیے صرف ایک جواب تھا۔ وہ میننگ میں ہیں آپ کا پیغام پہنچا دیا جائے گا۔“

ایباکا کی ملاقات کا مقصد جان کر اسے جواباً ”بڑے نارمل انداز میں ٹالا جاتا۔ اس کی گفتگو سنتے ہوئے سالار اس کی زبان و بیان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اسے اب شبہ نہیں رہا تھا کہ یہ لہجہ کی کالونی ہونے کی وجہ سے جس ملک کی قومی زبان فریچ ہو وہاں اس امریکن لب و لہجے میں انگریزی میں اتنی روانی سے بات کرنے والا جنگلات کا باسی ہونے کے باوجود بیرون ملک کا تعلیم یافتہ ہو گا۔“

یہ ناقابل یقین بات تھی، لیکن اس کے بعد جو کچھ سالار سکندر نے سنا تھا، اس نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ پٹرس ایباکا ہاورڈ بزنس اسکول کا گریجویٹ تھا اور وال اسٹیٹ میں جے پی مارگن گروپ کے ساتھ پانچ سال کام کرنے کے بعد کاٹو آیا تھا۔

اسے والٹ سے نکالے ہوئے کچھ وزٹنگ کارڈز اس نے سالار سکندر کی طرف بڑھادیے تھے اس نے بے حد بے یقینی سے انہیں پکڑا تھا۔ وہ فقیر پست قامت بے مایہ شخص تھا۔۔۔ کاٹو کے جنگلات میں تیروں، نیزوں اور پتھروں سے شکار کر کے پیٹ کی بھوک مٹانے والا ایک جنگلی۔۔۔ وہ ہاورڈ کے کینڈی بزنس اسکول کہاں سے پہنچ گیا تھا اور پھر جے پی مارگن گروپ کے ساتھ منسلک رہنا۔۔۔ تو پھر وہ یہاں کیا کر رہا تھا؟

اور یہ وہ سوال تھا جس کا جواب پٹرس ایباکا نے سالار سکندر کو اس کے آفس میں دوسرے دن اپنی دوسری ملاقات میں کاغذات کے ایک انبار کے ساتھ دیا تھا، جو وہ اس ملاقات میں سالار سکندر کو دینے آیا تھا۔

پٹرس ایباکا دس سال کی عمر میں لوموکا میں ایک بچہ کے طور پر ایک مشنری سے متعارف ہوا تھا، جو اسے اپنے ساتھ کاٹو کے جنگلات میں وہاں کے لوگوں سے رابطہ اور کمیونی کیشن کے لیے ساتھ لے کر پھرتا رہا اور پھر اسے

اس حد تک اس بچے کے ساتھ لگاؤ ہو گیا کہ بیماری کی وجہ سے کانگو چھوڑنے پر وہ ایبا کا کو بھی اپنے ساتھ امریکہ لے گیا تھا جہاں اس نے اسے پیٹرس کا نام دیا۔ ایک نیا مذہب بھی۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے ایبا کا کو تعلیم دلوائی۔ تعلیم کے لیے خیرات سے فنڈنگ دلوائی۔ ایبا کا بے حد ذہین تھا اور ریپورٹرز نے اس کی اس ذہانت کو جانچ لیا تھا، وہ ایبا کا کو اس کے بعد ہر سال کانگولا تا رہا جہاں ایبا کا کا خاندان آج بھی اسی طرح جی رہا تھا۔ دس سالہ ایبا کا نے اگلے پچیس سال امریکہ میں گزارے تھے، مگر اس کے بعد وہ امریکہ چھوڑ آیا تھا۔

وہ اپنے لوگوں کے پاس رہنا چاہتا تھا کیوں کہ انہیں اس کی ضرورت تھی اور انہیں اس کی ضرورت اس لیے تھی کیونکہ ورلڈ بینک کے مالی تعاون سے ہونے والے بہت سے منصوبوں میں سے ایک منصوبہ جنگل کے اس حصے میں شروع ہو گیا تھا جہاں ایبا کا کا قبیلہ آباد تھا۔ اس کا خاندان اور خاندان سے بھی بڑھ کر وہ دس ہزار لوگ جو اب جنگل کے اس حصے سے بے دخل کیے جا رہے تھے جس میں وہ صدیوں سے رہ رہے تھے۔ جنگل کٹنے جا رہا تھا، وہ ساری زمین صاف ہوتی پھر اس کے بعد وہاں ان معدنیات کی تلاش شروع ہوتی جو اس منصوبے کا دوسرا حصہ تھا اور ایبا کا مسئلہ اس کا اپنا خاندان نہیں تھا۔ ایبا کا کا مسئلہ وہ پورا جنگلات کا حصہ تھا جو اب جگہ جگہ زونز بنا کر کاٹا جا رہا تھا اور کہیں میٹل پارک بنا کر ان لوگوں کو وہاں سے بے دخل کیا جا رہا تھا۔

”ہم پانچ لاکھ لوگ ہیں مگر یہ جنگل تو کانگو کے ساڑھے تین کروڑ لوگوں کو روزگار دے رہا ہے۔ ورلڈ بینک نمبر انڈسٹری کو معاونت دے رہا ہے کیونکہ اس سے ہماری غربت ختم ہوگی۔ جب چند دہائیوں میں جنگل ہی غائب ہو کر یورپ اور امریکہ کی فیکٹریز اور شورومز میں مہنگے داموں بکنے والی لکڑی کی اشیاء میں تبدیل ہو جائیں گے تو کانگو کے لوگ کیا کریں گے۔ تم لوگ ہم سے وہ بھی چھیننا چاہتے ہو جو اللہ نے ہمیں دیا ہے۔ اگر کبھی ہم ویسٹ میں ان سے سب کچھ چھیننے پہنچ گئے تو تمہیں کیسا لگے گا؟“ ایبا کا نے اپنا کیس بہت تہذیب سی پیش کیا تھا مگر بات کے اختتام تک اس کی بے چینی اس کے لب و لہجہ سے جھلکنے لگی تھی۔

سالار سکندر کے پاس اس کے سوالوں کے رٹے رٹائے جوابات تھے۔ اس پروجیکٹ کی طرح کانگو میں ہونے والے اور بہت سے پراجیکٹس کی تفصیلات اس کی انگلیوں پر تھیں وہ وہاں ورلڈ بینک کا کنٹری ہیڈ تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ ان پروجیکٹس کی اہمیت اور فزبیلٹی رپورٹس کے بارے میں اسے پتا نہ ہوتا۔ مگر ایسا پہلی بار ہوا تھا، کہ پیٹرس ایبا کا کے انکشافات اور سوالات اسے پریشان کرنے لگے تھے۔ بہت کچھ ایسا تھا جو اس کی ناک کے نیچے ہو رہا تھا اور اسے پتا نہیں تھا لیکن وہ اس سب کا حصہ دار تھا کیونکہ وہ سب کچھ اس کے دستخطوں کے ساتھ منظور ہو رہا تھا۔ کانگو میں وہ پہلی بار نہیں آیا تھا، یہی افریقہ اور اس کے مسائل اس کے لیے نئے تھے نہ ہی وہاں کے وسائل پر مغرب کی ٹیکٹی ہوئی رال اس کے لیے کوئی پوشیدہ بات تھی لیکن وہ ہمیشہ یہ سمجھتا رہا تھا کہ ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں اور کوئی بھی فلاحی کام کرنے والی بین الاقوامی مالیاتی تنظیم اپنے مفادات کو بالائے طاق رکھ کر کسی ملک اور قوم کے لیے کچھ نہیں کر سکتی اور وہ انہیں اتنی چھوٹ دیتا تھا مگر ایبا کا کے اعتراضات اور انکشافات نے اسے ہلادیا تھا۔ جو کچھ وہاں ہو رہا تھا وہ ورلڈ بینک کے اپنے چارٹر کے خلاف تھا لیکن یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور ورلڈ بینک کی دلچسپی اور مرضی سے ہو رہا تھا۔

ایبا کا کی دی ہوئی فائلوں کے انبار وہ کئی ہفتے بڑھتا رہا تھا۔ کئی ہفتے وہ اپنے آپ سے جنگ کرتا رہا تھا۔ ورلڈ بینک کے ایماء پر وہاں ایسی کمپنیوں کو لکڑی استعمال کرنے کی اجازت دی گئی تھی جن کا ٹریک ریکارڈ افریقہ کے دوسرے بہت سے ممالک میں اسی حوالے سے قابل اعتراض رہا تھا۔ لکڑی کٹ رہی تھی۔ جنگل صاف ہو رہا تھا۔ آبادی بے دخل ہو رہی تھی اور جن شرائط پر ان کمپنیوں کو وہاں لائسنس دیا گیا تھا وہ کمپنیز ان شرائط کو بھی پورا نہیں کر رہی تھیں۔ انہیں لکڑی کے عوض اس علاقے کے لوگوں کی معاشی حالت سدھارنے کا فریضہ دیا گیا تھا اور وہ کمپنیاں

کروڑوں ڈالر کی لکڑی لے جانے کے عوض چند عارضی نوعیت کے اسکولز اور ڈپنٹریز لوگوں کو فراہم کر رہی تھیں۔ خوراک۔ خشک دودھ نمک اور مسالاجات کی شکل میں دی جا رہی تھی۔

اور یہ سب ورلڈ بینک آفیشلز کے نگرانی کے باوجود ہو رہا تھا کیونکہ ہنگامہ کو اس ملک میں اچھوت کا درجہ حاصل تھا وہ ان کمپنیز کے خلاف عدالت میں نہیں جاسکتے تھے۔ حکومتی عہدے داران کے پاس نہیں جاسکتے تھے۔ صرف ایک کام کر سکتے تھے احتجاج۔ این جی اوز کے ذریعے یا پھر میڈیا کے ذریعے۔ اور یہ کام بہت مشکل تھا۔ وہ مہذب دنیا کا حصہ نہیں تھا جہاں پر کسی کے ساتھ ہونے والی زیادتی چار گھنٹے میں ہر بڑے نیوز چینل کی ہیڈ لائن بن جاتی تھی۔ وہ افریقہ تھا جہاں پر ایسی زیادتی تشدد کے ذریعے ہی دبا دی جاتی تھی۔

اگلے دو ماہ سالار کو ایبا کا کے ساتھ اور انفرادی حیثیت میں ان جگہوں کو خود جا کر دیکھنے میں لگے جن کے بارے میں ایبا کا نے اسے دستاویزات دی تھیں۔ اور پھر اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دستاویزات اور ان میں پائی جانے والی معلومات بالکل ٹھیک تھیں۔ صمیر کا فیصلہ بہت آسان تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ غلط تھا اور وہ اس کا حصہ نہیں بننا چاہتا تھا، لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ اب کیا کرے۔ ایک استعفیٰ دے کر اس ساری صورت حال کو اسی طرح چھوڑ کر نکل جاتا۔ اور اسے یقین تھا ایسی صورت میں جو کچھ وہاں چل رہا تھا وہ چلتا ہی رہتا۔ یا پھر وہ وہاں ہونے والی بے ضابطگیوں پر اواز بلند کرتا۔ بے ضابطگی ایک بہت چھوٹا لفظ تھا۔ جو کچھ ورلڈ بینک وہاں کر رہا تھا وہ اخلاقیات اور انسانیت کی دھجیاں اڑانے کے برابر تھا۔

افریقہ میں ایبا کا سے ملنے کے بعد زندگی میں پہلی بار سالار سکندر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے کے ان الفاظ کو سمجھا تھا کہ ”کسی کالے کو گورے پر اور کسی گورے کو کالے پر کوئی سبقت حاصل نہیں۔“ وہ ہمیشہ ان الفاظ کو صرف ذات برادری اور اونچ نیچ کے حوالے سے دیکھتا رہا تھا۔ وہ پہلی دفعہ اس سیاہ فام آبادی کا حال اور استحصال دیکھ رہا تھا جو دنیا کے ایک بڑے خطبے پر بست تھی۔ معدنیات اور قدرتی وسائل سے مالا مال خطہ۔ اور پھر اس گوری آبادی کی ذہنی پسماندگی، ہوس دیکھ رہا تھا جس کا وہ بھی حصہ تھا۔ اور اسے خوف محسوس ہوا تھا۔ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ”آنے والے زمانوں کے حوالے سے اسی خطبے اور اسی سیاہ فام آبادی کے حوالے سے کوئی پیش گوئی تھی۔ یا کوئی تنبیہ جسے صرف سفید فام لوگ ہی نہیں مسلمان بھی نظر انداز کیے ہوئے تھے۔ صدیوں پہلے غلامی کا جو طوق سیاہ فاموں کے گلے سے ہٹا لیا گیا تھا 21 ویں صدی کے مہذب زمانے میں افریقہ میں استعماریت نے وہ طوق ایک بار پھر ڈال دیا تھا۔

اور انہیں سیاہ فام پست قامت لوگوں میں سے ایک پیٹرس ایبا کا تھا۔ جو امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں اپنی زندگی کے 25 سال گزارنے کے بعد بھی وہاں سے ”اس سیاہ دور“ میں لوٹ آیا تھا۔ صرف اپنے لوگوں کی ”بقا“ کے لیے۔ ”بقا“ کے لفظ کا مفہوم سالار سکندر نے پیٹرس ایبا کا سے سیکھا تھا اور اس بقائے باہمی کے لیے کیا کیا قربان کیا جاسکتا تھا وہ بھی وہ ایبا کا سے ہی سیکھ رہا تھا۔

زندگی میں اسے تقویٰ کا مطلب بھی اسی شخص نے سمجھایا تھا جو مسلمان نہیں تھا۔ وہ تقویٰ جس کا ذکر آخری خطبے میں تھا اور جس کو فضیلت حاصل تھی رنگ، نسل، ذات، یا تہہ اس دنیاوی شے پر جسے برتر سمجھا جاتا تھا۔ پیٹرس ایبا کا کو اللہ کا خوف تھا۔ لادین سے کیتھولک اور کیتھولک سے پھر لادین ہونے کے باوجود اللہ سے ڈرتا تھا۔ اسے مانتا تھا۔ اس کی عبادت بھی کرتا تھا اور اس سے مانگتا بھی تھا لیکن وہ یہ کام کسی گرجے، مندر یا مسجد میں نہیں کرتا تھا کنگوں میں اپنے لوگوں کے ساتھ انسانیت سے گرا ہوا سلوک ہونے کے باوجود وہ انسانیت کا درو رکھتا تھا۔ ایمان دار تھا۔ اخلاقی برائیوں سے بچا ہوا تھا۔ مگر پیٹرس ایبا کا کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ترغیبات کو خدا خونی کی وجہ سے چھوڑتا تھا۔ وہ نفس پرست نہیں تھا۔ وہ طمع زدہ بھی نہیں تھا اور سالار سکندر بہت

بار سے سمجھ نہیں پاتا تھا۔ ایسا کا بلاشبہ غیر معمولی انسان تھا اور وہ اگر سالار سکندر کو متاثر کر رہا تھا تو وہ کسی بھی انسان کو کر سکتا تھا۔

وہ دنیا کے دو ذہن ترین انسانوں کا آمناسامنا تھا یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک متاثر ہوتا دوسرا نہیں۔

”سالار سکندر! میں اپنی زندگی میں تم سے زیادہ قابل اور ذہین انسان سے نہیں ملا۔“

ایسا کانے ایک مہینے کے بعد سالار کے ساتھ ہونے والی کئی ملاقاتوں کے بعد جیسے اس کے سامنے اعتراف کیا تھا۔ سالار صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔

”میں خود انٹرنیشنل آرگنائزیشنز میں کام کر چکا ہوں اور ان میں کام کرنے والے بہت افراد سے ملتا بھی رہا ہوں لیکن تم ان سب میں مختلف ہو مجھے یقین ہے تم میری مدد کرو گے۔“

”تعریف کا شکریہ لیکن اگر تم اس خوشامد کا سہارا میری مدد کے لیے لے رہے ہو اور تمہارا خیال ہے کہ میں تمہارے منہ سے یہ سب سننے کے بعد آنکھیں بند کر کے تمہاری خاطر اس صلیب پر چڑھ جاؤں گا تو میرے بارے میں تمہارا اندازہ غلط ہے۔ میں جو بھی قدم اٹھاؤں گا سوچ سمجھ کر اٹھاؤں گا۔“

ایسا کا کی اس فیاضانہ تعریف کو خوشامد قرار دینے کے باوجود سالار جانتا تھا ایسا کا کو اس کی شکل میں اور اس پوزیشن پر واقعی ایک میجمل گیا تھا۔ میجا بھی وہ جو ورلڈ بینک میں کام کرنے کے باوجود اپنا ضمیر زبردستی بے ہوش تو کر سکتا تھا سلا نہیں سکتا تھا۔

”تمہارا سینیس آف ہومر بہت اچھا ہے“ ایسا کانے جواباً ”مسکراتے ہوئے کہا تھا“ یہ چیز مجھ میں نہیں پائی جاتی۔“

سالار نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ”اور جس صورت حال میں تم مجھے ڈال بیٹھے ہو اس کے بعد تو اگلے کئی سالوں بھی اس کے پیدا ہونے کے کوئی امکانات نہیں۔“

”میں بہت سارے مسلمانوں کے ساتھ پڑھتا رہا ہوں کام کرتا رہا ہوں ملتا رہا ہوں مگر تم ان سے مختلف ہو۔“ وہ عجیب بصرہ تھا یا کم از کم سالار کو لگا تھا۔

”میں کسی طرح مختلف ہوں؟“ وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

”تم ایک اچھے مسلمان ہونے کے ساتھ اچھے انسان بھی ہو۔ جن سے میرا واسطہ پڑا وہ یا اچھے مسلمان ہوتے تھے یا اچھے انسان۔“

سالار کچھ دیر تک بول نہیں سکا بولنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا تھا افریقہ کے اس بے دین انسان نے

”چھا مسلمان تمہاری نظر میں کیا ہے؟“ سالار نے بہت دیر خاموش رہنے کے بعد اس سے پوچھا تھا۔

تمہیں میری بات بری تو نہیں لگی؟ ایسا کا ایک دم محتاط ہوا تھا۔

”نہیں۔ مجھے تمہاری بات انٹرسٹنگ لگی مگر تمہاری زبان سے ادا ہونے والا یہ پہلا جملہ تھا جس میں تمہاری کم علمی جھلکی۔“

اس بار ایسا کا الجھا وہ مذہب ڈسکس کرنے کے لیے نہیں ملے تھے لیکن مذہب ڈسکس ہو رہا تھا۔ وہ مذہب پر بحث نہیں کرنا چاہتے تھے اور مذہب پر بحث ہو رہی تھی۔

”چھا مسلمان۔؟ جو بہت Practising (با عمل) ہے۔ ساری عبادات کرتا ہے۔ پورک نہیں کھاتا۔ شراب نہیں پیتا۔ ٹائٹ کلب میں نہیں جاتا۔ میرے نزدیک وہ ایک اچھا مسلمان ہے جیسے ایک اچھا عیسائی یا ایک اچھا یہودی۔“

ایسا کا کو اندازہ نہیں تھا وہ اپنی کم علمی میں بھی جو باتیں کہہ رہا تھا۔ وہ سالار سکندر کو شرمسار کرنے کے لیے کافی

تھیں۔ رنج اپنے لیے نہیں ہو رہا تھا اپنے مذہب کے پیروکاروں کے تعارف پر ہو رہا تھا۔ یعنی کوئی فرق ہی نہیں رہا تھا صرف عبادات اور باعمل ہونے پر ایک کم علم شخص کے ذہن میں مسلمان کو اور عیسائی یا یہودی میں۔ وہ لمحہ ذاتی حیثیت میں سالار کے لیے سوچنے کا تھا۔ ایبا کا اسے اچھا انسان بھی مان رہا تھا اور اچھا مسلمان بھی۔ مگر کیا واقعی وہ اس معیار پر پورا اترتا تھا کہ ایک باعمل یہودی یا عیسائی سے اپنی شناخت الگ رکھ پاتا۔

کانگو کے اس جنگل میں ایبا کا کے ساتھ بیٹھے سالار نے کبھی مذہب کو اس زاویے سے نہیں دیکھا تھا جس زاویے سے پیٹرس ایبا کا دیکھ رہا تھا۔

”یہ بد قسمتی کی بات ہے یا صرف اتفاق کہ مجھے اپنی زندگی میں کبھی اچھے مسلمان اچھے عیسائیوں یا اچھے یہودیوں سے اچھے تجربات نہیں ہوئے۔ وہ مجھے کبھی متاثر نہیں کر سکے اور جنہوں نے متاثر کیا اور جنہیں میں آج تک اچھے انسانوں کی فہرست میں رکھتا ہوں وہ کبھی مذہبی نہیں تھے۔ باعمل نہیں تھے۔

”ریورنڈ جانسن کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ سالار نے بے ساختہ کہا۔

”ویل!“ ایبا کا کہہ کر مسکرایا تھا۔ ”ان کے مجھ پر بہت احسانات ہیں، لیکن وہ کبھی میرے آئیڈیل نہیں بن سکے۔“

”کیوں؟“ وہ سوال وجواب سالار کو عجیب لطف دے رہے تھے۔

”ان احسانوں کی ایک قیمت تھی وہ مجھے کرسچن بنانا چاہتے تھے۔ جب میں نے وہ مذہب اختیار کر لیا تو پھر انہوں نے وہ سارے احسانات ایک کرسچن بچے پر کیے۔ ایک انسان کے طور پر صرف انسان سمجھ کر تو انہوں نے میرے لیے کچھ نہیں کیا۔ مذہب کسی کے دل اور دماغ میں زبردستی نہیں ڈالا جاسکتا۔ میں یونیورسٹی جانے تک جرح جاتا رہا پھر نہیں گیا۔

ایبا کا مدہم آواز میں کہہ رہا تھا۔ شاید اسے ریورنڈ جانسن کو مایوس کرنے پر افسوس بھی تھا اور پچھتاوا بھی۔

”میں نے تھوڑا بہت سب مذاہب کا مطالعہ کیا ہے۔ سب اچھے ہیں۔ لیکن پتا نہیں جو انسان ان مذاہب کا پیروکار ہو جاتا ہے وہ اپنی اچھائیاں کیوں کھو بیٹھتا ہے۔ تمہیں لگ رہا ہو گا میں فلا سفر ہوں۔“

ایبا کا کوبات کرتے کرتے احساس ہوا تھا۔ سالار بہت دیر سے خاموش تھا۔ اسے لگا وہ شاید اس کی گفتگو میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔

”نہیں اتنا فلا سفر تو میں بھی ہوں۔ سالار نے مسکرا کر کہا۔ ”تم امریکہ سے یہاں واپس کیسے آگئے؟“ سالار نے اس سے وہ سوال کیا جو اسے اکثر الجھاتا تھا۔

”ایک چیز جو میں نے ریورنڈ جانسن سے سیکھی تھی۔ وہ اپنے لوگوں کے لیے ایثار تھا۔ اپنی ذات سے آگے کسی دوسرے کے لیے سوچنا۔ امریکہ بہت اچھا تھا وہاں میرے لیے مستقبل تھا۔ لیکن صرف میرا مستقبل تھا۔ میری قوم کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں کانگو کا پست قامت حقیر سیاہ فام تھا اور میں امریکہ میں بھی کانگو کا وہی رہا لیکن میں کانگو میں کچھ اور بننے کا خواب لے کر آیا ہوں۔“ ایبا کا کہہ رہا تھا۔

”اور وہ کیا؟“ سالار کو پھر تجسس ہوا تھا۔

”کانگو کا صدر بننے کا۔“ سالار کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

”تم ہنسنے نہیں؟“ ایبا کا نے جواباً کہا تھا۔

”تم نے ایسی کوئی بات نہیں کی کہ میں ہنس پڑوں۔ ہارورڈ کینڈی اسکول سے پڑھنے کے بعد تمہیں اتنے ہی بڑے خواب دیکھنے چاہئیں۔“ ایبا کا اس کی بات پر مسکروا تھا۔

وہ مہینے سالار کے لیے بے حد پریشانی کے تھے۔ کیا کرنا چاہیے اور کیا کر سکتا تھا، کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔

وہ ایبا کا کی مدد نہ بھی کرتا تب بھی۔ وہ جتنی جانفشانی سے وہ اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہا تھا۔ سالار کو یقین تھا جلد یا بدیر ورلڈ بینک کے چہرے پر کالک ملنے والا ایک بہت بڑا اسکینڈل آنے والا تھا۔ حفاظتی اقدامات کا وقت اب گزر چکا تھا۔ پیٹرس ایبا کا صرف کنگالا یا سواحلی بولنے والا ایک پست قد سیاہ فام نہیں تھا جسے کانگو کے جنگلات تک محدود کیا جاسکتا۔ وہ امریکہ میں اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارنے والا شخص تھا جس کے کانٹیکس تھے۔ وہ رابطے وقتی طور پر اگر اس کے کام نہیں بھی آرہے تھے تو بھی اس سے ایبا کا کمزور نہیں پڑا تھا بلکہ کئی حوالوں سے وہ زیادہ طاقت ور بن کر ابھرا تھا۔ وہ صرف ہگمیز کی آواز نہیں رہا تھا بلکہ بانٹو قبیلے کے بہت سے افراد کی آواز بھی بن چکا تھا جو ہگمیز کی طرح جنگلات پر انحصار کرتے تھے۔

اگلا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہی ایبا کا کے ساتھ اس کا میل جول ان لوگوں کی نظروں میں آگیا تھا جن کے مفادات ورلڈ بینک کے ذریعے پورے پورے ہو رہے تھے۔

سالار پر نظر رکھی جانے لگی تھی اور اس سے پہلے کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی ہوتی۔ انگلینڈ کے ایک اخبار نے پیٹرس ایبا کا کی فراہم کی گئی معلومات کی تحقیق کرنے کے بعد کانگو کے ہگمیز اور ورلڈ بینک کے کانگو کے بارانی جنگلات میں ہونے والے پراجیکٹس کے بارے میں ایک کورسٹوری کی تھی جس میں ورلڈ بینک کے کردار کے حوالے سے بہت سارے اعتراضات اٹھائے گئے تھے۔

واشنگٹن میں ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹر میں جیسے ہلچل مچ گئی تھی۔ ورلڈ میڈیا میں اس معاملے کی رپورٹنگ اور کوریج کو دبانے کی کوشش کی گئی تھی مگر اس سے پہلے ہی یورپ اور ایشیا کے بہت سارے ممالک کے ممتاز اخبارات اس آرٹیکل کو ری پرنٹ کر چکے تھے اور ورلڈ بینک کے اندر مچی وہ ہلچل اس وقت اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی جب سالار سکندر کی طرف سے ہیڈ آفس کو کانگو میں چلنے والے ان پروجیکٹس کے حوالے سے ایک تفصیلی ای میل کی گئی جس میں اس نے مختلف ماحولیاتی اداروں سے ملنے والا ڈیٹا بھی منسلک کیا تھا جو اس جنگلات کی اس طرح کٹائی کو ایک بڑے ماحولیاتی عدم توازن کا پیش خیمہ قرار دے چکے تھے۔ ایک انسانی المیہ کے علاوہ۔ اس کا وہ خط بینک کے اعلیٰ عہدے داران کے لیے شدید پریشانی کا باعث بنا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب سالار سکندر کو نامعلوم ذرائع کی طرف سے دھمکیوں کا آغاز ہوا تھا۔ وہ پروجیکٹس جو انہیں چلانے والی کمپنیوں کو اربوں ڈالرز کی آمدنی دے رہے تھے بینک کے اپنے کنٹری ہیڈ کی مخالفت کا باعث بنتے تو وہ کمپنیز اور ان کے پیچھے کھڑی بین الاقوامی طاقتیں خاموش تماشائی نہیں بنی رہ سکتی تھیں۔ کوئی عام صورت حال ہوتی تو اس وقت تک سالار سکندر سے استعفیٰ لے کر اسے بڑے ہتک آمیز طریقے سے ملازمت سے فارغ کیا جا چکا ہوتا مگر اس وقت اس کا استعفیٰ ۴ ستمبر نیشنل میڈیا کے تجسس کو اور ابھار دیتا۔ وہ طوفان جو ابھی چائے کے کپ میں آیا تھا وہ اس سے باہر آجاتا۔

اس ای میل کا جواب سالار سکندر کو ایک تنبیہ کی صورت میں دیا گیا تھا جو سادہ لفظوں میں خاموش ہو جانے کی تاکید تھی اور سالار کے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔

بینک نے نہ صرف اس ای میل میں ہونے والے اس کے تجزیے کو ناپسند کیا تھا بلکہ پیٹرس ایبا کا کی فراہم کی جانے والی بنیاد پر گارڈین میں شائع ہونے والی کورسٹوری کا ملبہ بھی اس کے سر ڈالتے ہوئے اسے ایبا کا اور اس کورسٹوری میں استعمال ہونے والی معلومات کا ذریعہ قرار دیا گیا تھا۔

یہ الزام سالار سکندر کے پروفیشنل کام پر ایک دھبے کے مترادف تھا۔ پیٹرس ایبا کا سے ہمدردی رکھنے، متاثر ہونے اور میل جول کے باوجود سالار نے اس سے بینک کی کسی انفارمیشن یا دستاویز کی بات کبھی نہیں کی تھی۔ ایبا کا نے ساری معلومات یا دستاویزات کہاں سے لی تھیں وہ ایبا کا کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس تنبیہ کے جواب میں سالار نے بینک کو اپنے استعفیٰ کی پیش کش کی تھی۔ اسے اب یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اسے مانیٹر کیا جاتا

تھا۔ اس کی فون کالز ٹیپ ہو رہی تھیں اور اس کی ای میلز ہیل ہو رہی تھیں۔ دنوں میں اس کے آفس کا ماحول تبدیل ہو گیا تھا۔ اس نے بینک کی ناراضی اور ہدایات کے باوجود ایسا کیا کہ وہ تو اپنا میل جول ختم کیا تاہم ہی رابطہ ختم کیا تھا۔ استعفیٰ کی پیشکش کے ساتھ اس نے بینک کو جانگو میں چلنے والے جنگلات پروجیکٹ کے خلاف اپنی تفصیلی رپورٹ بھی بھیج دی تھی جو سالار سکندر کی اپنی تحقیقات اور معلومات کی بنیاد پر تھی۔ اور توقع کے مطابق اسے واشنگٹن طلب کر لیا گیا تھا۔

امامہ کو اس ساری صورت حال کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ وہ امید سے تھی اور سالار اسے اس ٹینشن کا حصہ دار بنانا نہیں چاہتا تھا جس سے وہ خوف گھر رہا تھا۔ وہ صرف ایسا کہنے میں جانتی تھی اور اس کی جدوجہد کچھ بارے میں۔ جنگلات کے حوالے سے انٹرنیشنل الیکٹرانک میڈیا پر ہونے والی تنقید اس کی نظر میں بھی آئی تھی اور اس نے سالار سے اس کے بارے میں پوچھا بھی تھا لیکن سالار نے بڑے سرسری انداز میں اس کا ذکر کیا۔ وہ اسے تفصیلات بتانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

امامہ کو صحیح معنوں میں تشویش تب ہوئی تھی۔ جب اس نے اسی میڈیا میں سالار سکندر کا نام بھی نمودار ہوتے دیکھا جس کے بارے میں انٹرنیشنل میڈیا یہ کہہ رہا تھا کہ وہ اس پروجیکٹ کے حوالے سے ہیڈ آفس کو اختلافی رپورٹ دے چکا تھا۔ اس رپورٹ کے مندرجات ابھی کسی رپورٹر تک نہیں پہنچے تھے۔ اور ان ہی حالات میں واشنگٹن سے اچانک اس کا بلاوا آیا تھا اور وہ یہ وزٹ تھا جس پر امامہ نے بالآخر اس سے پوچھا ہی لیا تھا۔

”سب کچھ ٹھیک ہے سالار؟“ وہ اس رات سالار کی پیکنگ کر رہی تھی جب پیکنگ کرتے اس نے اچانک سالار سے پوچھا تھا۔ وہ اپنا بریف کیس تیار کر رہا تھا۔

”ہاں ہاں۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ سالار نے اس سے جواباً پوچھا۔

”تم واشنگٹن کیوں جا رہے ہو؟ وہ اپنے خدشوں کو کسی مناسب سوال کی شکل میں نہیں ڈھال سکی تھی۔

”میںنگ ہے اور میں تو اکثر آتا جاتا رہتا ہوں کہیں نہ کہیں۔ اس بار تمہیں اس طرح کے سوال کیوں پوچھنے پڑ رہے ہیں؟“ اپنا بریف کیس بند کرتے ہوئے اس نے امامہ سے کہا تھا۔

”پہلے کبھی تم اتنے پریشان نہیں لگے۔“ وہ اس کی بات پر چند لمحے بول نہیں سکا۔ کوشش کے باوجود اس کا چہرہ اس کی ذہنی کیفیت کو امامہ سے پوشیدہ نہیں رکھ سکا تھا۔

”نہیں۔ کوئی ایسی بڑی پریشانی نہیں ہے۔ بس شاید یہ ہو گا کہ مجھے اپنی جاب چھوڑنی پڑے گی۔“ امامہ کے کندھے پر ہاتھ رکھے اس نے اپنے الفاظ اور لہجے کو ممکن حد تک رکھنے کی کوشش کی۔ اس بار بھونچکا ہونے کی باری امامہ کی تھی۔

”جاب چھوڑنی پڑے گی؟ تم تو اپنی جاب سے بہت خوش تھے۔“ وہ حیران نہ ہوتی تو کیا ہوتی۔

”تھا۔ لیکن اب نہیں ہوں۔“ سالار نے مختصراً کہا تھا۔ ”کچھ مسئلے ہیں۔ تمہیں واپس آکر بتاؤں گا۔ تم اپنا اور بچوں کا خیال رکھنا۔ کہاں ہیں وہ دونوں؟“

سالار نے بات بڑی سہولت سے بدل دی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے اس وقت اسے خیال آیا تھا کہ ان حالات میں اسے اپنے بچوں اور امامہ کو کنشاسا میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔ لیکن حل کیا تھا اس کے پاس۔ امامہ کی پریگنٹسی کے آخری مہینے چل رہے تھے۔ وہ ہوائی جہاز کا سفر نہیں کر سکتی تھی اور وہ واشنگٹن میں ہونے والی اس میٹنگ کو موخر یا کینسل کرنے کی صوابدید نہیں رکھتا تھا۔

”تم اپنا اور بچوں کا بہت خیال رکھنا۔ میں صرف تین دن کے لیے جا رہا ہوں، جلدی واپس آ جاؤں گا۔“ وہ اب

بچوں کے کمرے میں بستر پر سوئے ہوئے جبریل اور عنایہ کو پار کر رہا تھا۔ اس کی فلائٹ چند گھنٹوں بعد تھی۔
 ”ملازمہ کو اپنے پاس گھر پر رکھنا میری غیر موجودگی میں اس نے امامہ کو ہدایت کرتے ہوئے کہا تھا۔
 ”تم ہماری فکر مت کرو۔ تین دن ہی کی تو بات ہے۔ تم صرف اپنی میٹنگ کو دیکھو۔ آئی ہوپ وہ ٹھیک
 رہے۔“ امامہ کو واقعی اس وقت تشویش اس کی میٹنگ کی ہی تھی۔

سالار اس دن آفس سے خلاف معمول جلدی آیا تھا اور پھر وہ سارا دن گھر میں ہی رہا تھا۔ اس دن معمول کی
 طرح عشاء کے لیے بھی کوئی مصروفیات نہیں رکھی تھیں اور نہ ہی گھر آکر لیپ ٹاپ لے کر بیٹھا تھا نہ کارڈیس
 فون ہاتھ میں لیے آفس کے معاملات گھر میں پنپاتا پھرا تھا۔

وہ بس لان میں ان سب کو کھیلتے دیکھ کر خود بھی وہاں آگیا تھا۔ اس کال کو ریسو کرنے کے بعد۔ اس نے امامہ کو
 بتایا تھا کہ اسے ایمر جنسی میں تقریباً ”دس گھنٹے کے بعد رات کے پچھلے پہر واشنگٹن کی فلائٹ پکڑنی تھی۔ یہ بھی
 ایک معمول کی بات تھی۔ سالار کی مصروفیات اور سفر اسی طرح آتے تھے۔ اچانک۔ بن بتائے۔
 پھر وہ بچوں کے ساتھ لان میں کھیلتا رہا تھا امامہ کے ساتھ گپ شپ لگاتا رہا تھا۔ یہ خلاف معمول تھا۔ معمول
 میں ایسا صرف ویک اینڈز پر ہوتا تھا وہ بھی ہر ویک اینڈ پر نہیں۔

سالار گھڑی دیکھ کر زندگی گزارنے والا شخص تھا۔ آج اگر وہ وقت کو بھولا تھا تو کہیں کچھ تو غلط تھا۔ اس کی
 پریشانی کی نوعیت کیا تھی اور اس کا لیول کیا تھا۔ امامہ اس کا اندازہ تو نہیں لگا پائی تھی، لیکن اسے یہ احساس ضرور
 ہو گیا تھا کہ سب کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ شادی کے چھ سال کے بعد وہ سالار کو اتنا تو پڑھ ہی سکتی تھی۔ اور اب یک دم
 اس کا یہ اطلاع دینا کہ مسئلہ جو بھی تھا اسے شاید اپنی جاب چھوڑنی پڑے۔ وہ پریشان ہوئی تھی تو اس لیے کیونکہ
 ایک جی جمائی زندگی پھر منتشر ہو رہی تھی۔ امامہ ہاسٹم کی زندگی میں ہمیشہ یہی ہوتا تھا جب سب کچھ ٹھیک ہونے لگتا
 تو سب کچھ خراب ہو جاتا تھا۔ اسے زندگی میں بہت تبدیلیاں پسند نہیں تھیں سالار سکندر کی طرح اور دونوں بچوں
 نے جیسے اس کی اس عادت کو کچھ اور پختہ کر دیا تھا۔

اسے آدھے گھنٹے میں نکلنا تھا۔ اس کا سامان پیک تھا۔ وہ دونوں چائے کا ایک آخری کپ پینے کے لیے لاؤنج
 میں ساتھ بیٹھے تھے اور اس وقت چائے کا پہلا گھونٹ پینے سے پہلے سالار نے اس سے کہا تھا۔
 ”میں تم سے محبت کرتا ہوں اور میں تم سے ہمیشہ محبت کرتا رہوں گا۔“
 امامہ اپنی چائے اٹھاتے ہوئے ٹھنکی پھر ہنسی۔ ”آج بہت عرصے کے بعد تم نے کہیں جانے سے پہلے ایسی کوئی
 بات کہی ہے۔ خیریت ہے؟“

وہ اب اس کا ہاتھ تھپک رہی تھی۔ سالار نے مسکرا کر چائے کا کپ اٹھا لیا۔

”ہاں خیریت ہے، لیکن تمہیں اکیلا چھوڑ کر جا رہا ہوں اس لیے فکر مند ہوں۔“

”اکیلی تو نہیں ہوں میں۔ جبریل اور عنایہ ہیں میرے ساتھ۔ تم پریشان مت ہو۔“

سالار چائے کے گھونٹ بھر رہا امامہ بھی چائے پینے لگی لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس سے کچھ کہنا
 چاہتا تھا۔

”تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟“ وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی وہ چائے پیتے ہوئے چونکا پھر مسکرایا۔ وہ ہمیشہ اسے
 بوجھ لیتی تھی۔ ہمیشہ۔

”ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں لیکن ابھی نہیں کروں گا، واپس آکر کروں گا۔“ اس نے چائے کا کپ رکھتے
 ہوئے کہا۔

”مجھے تمہاری یہ عادت سخت ناپسند ہے، ہر دفعہ کہیں جاتے ہوئے مجھے الجھا جاتے ہو میں سوچتی رہوں گی کہ پتا

نہیں کیا اعتراف کرتا ہے۔“ امام نے ہمیشہ کی طرح بُرا مانا تھا اور اس کا گلہ غلط نہیں تھا وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا۔ اور جان بوجھ کر کرتا تھا۔ ”اچھا دوبارہ کبھی نہیں کروں گا۔“ وہ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ بازو پھیلائے وہ ہمیشہ کی طرح جانے سے پہلے امام سے آخری بار مل رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح ایک ایک گرم جوش معانقہ۔

”آئی دل مس یو جلدی آتا۔“ وہ ہمیشہ کی طرح جذباتی ہوئی تھی اور وہی کلمات دہرائے تھے جو وہ ہمیشہ دہراتی تھی۔

پورچ میں کھڑے ایک آخری بار اس کو خدا حافظ کہنے کے لیے اس نے الوداعیہ انداز میں سالار کی گاڑی کے چلتے ہی ہاتھ ہلایا تھا۔ گاڑی تیز رفتاری سے طویل پورچ کو عبور کرتے ہوئے کھلے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گئی تھی۔

امام کو لگا تھا زندگی اور وقت دونوں ختم گئے تھے۔ وہ جب کہیں چلا جاتا وہ اسی کیفیت سے دوچار ہوتی تھی آج بھی ہو رہی تھی گاڑی نے اب گیٹ بند کر دیا تھا۔

شادی کے چھ سال کے بعد بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ زندگی جیسے ایک پنسز پر چلنے لگتی ہے۔ روز مرہ کے معمول کی پٹری پر نہ چاہتے ہوئے بھی انسان دائروں میں سفر کرنے لگتا ہے۔

دو بچوں کی آمد سالار اور امام کی زندگی کو بھی بڑی حد تک ایک دائرے کے اندر لے آئی تھی۔ جہاں اپنی ذات پیچھے چلی جاتی ہے۔ سینٹر اسٹیج بچوں کے پاس چلا جاتا ہے۔ وہ خدشات توقعات اور غلط فہمیوں کا وہ جال جس میں ایک نیا شادی شدہ جوڑا شادی کے شروع کے کچھ عرصہ میں جکڑا رہتا ہے۔ وہ ٹوٹنے لگتا ہے۔ اعتماد لہجہ بھر میں بد اعتمادی میں نہیں بدلتا۔ بے اعتباری مل بھر میں غائب ہونا سیکھ جاتی ہے۔ گلہ گونگا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ بندھن عادت میں بدلنے لگتا ہے اور زندگی معمول بنتے ہوئے یوں گزرنے لگتی ہے کہ انسان دنوں ہفتوں مہینوں کی نہیں سالوں کی گنتی بھول جاتا ہے۔

امام بھی بھول گئی تھی۔ پیچھے پلٹ کر وہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ پیچھے پادیں تھیں اور پادیں آکٹوپس بن کر لپٹ جانے کی خاصیت رکھتی تھیں۔ پیچھے اب کچھ رہا بھی نہیں تھا اور جو رہ گئے تھے ان کے لیے وہ کب کی مرچکی تھی۔



کسی اپنے کی موت انسان کو پل بھر میں کس طرح خاک کر دیتی ہے یہ کوئی امام سے پوچھتا۔ بیس سال کی عمر میں گھر سے نکلتے ہوئے اس کو یہی لگا تھا وہ تو مر ہی گئی تھی۔ جیتے جی۔ کسی کا کوئی تعلق ایک رشتہ ختم ہوتا ہے اس کے تو سارے ہی تعلقات ایک ہی وقت میں ختم ہوئے تھے۔ اسے لگا تھا ایسا صدمہ ایسی تکلیف تو کوئی اور شے اسے پہنچا ہی نہیں سکتی تھی۔

جلال انصر کو کھو دینا اس کی زندگی کا دو سرا سب سے بڑا صدمہ تھا۔ وہ نو عمری کی محبت تھی۔ محبت نہیں باگل پن تھا جس میں وہ مبتلا ہوئی تھی۔ عشق نہیں تھا عقیدت تھی جو وہ اس شخص کے لیے پال بیٹھی تھی۔ ساری زندگی اس کے ساتھ گزارنے کے خواب خواہش اور امید ایک ہی وقت چکنا چور ہوئے تھے اور ایسے چکنا چور ہوئے تھے کہ اس کا پورا وجود کئی سال انہیں کرچیوں سے اٹا رہا تھا۔ تب اسے لگا تھا یہ تکلیف موت جیسی تھی ایسی بے بسی اور بے توقیری زندگی میں بس ایک ہی بار محسوس کرتا ہے انسان اور صرف محبت کے کھو دینے پر ہی کرتا ہے۔

کوئی اور چیز کہاں ایسے مارتی ہے انسان کو۔
وسیم اور سعد کی موت نے اسے بتایا تھا کہ مارتی تو موت ہی ہے اور جیسی ماروہ انسان کو دیتی ہے کوئی اور تکلیف
نہیں دیتی۔ اب حیات پی کر بھی انسان اپنی موت ہی روک سکتا ہے پر ان کو جانے سے کیسے روک سکتا ہے جو جان
سے بھی پیارے ہوتے ہیں۔

وہ اس وقت نیویارک میں تھی۔ اس کے ہاں پہلا بچہ ہونے والا تھا۔ وہ ساتویں آسمان پر تھی کیونکہ جنت پاؤں
کے نیچے آنے والی تھی۔ نعمتیں تھیں کہ گنی ہی نہیں جا رہی تھیں۔ تیسرا مہینہ تھا اس کی پریگنٹسی کا۔ جب
ایک رات سالار نے اسے نیند سے جگایا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ اسے نیند سے جگا کر کیا بتانے کی کوشش
کر رہا تھا۔ اور شاید ایسی ہی کیفیت سالار کی تھی کیونکہ اس کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کن الفاظ میں اتنے
بڑے نقصان کی اطلاع دے۔ اس سے پہلے سکندر عثمان اور وہ یہی ڈسکس کرتے رہے تھے کہ امامہ کو اطلاع دینی
چاہیے یا اس حالت میں اس سے یہ خبر چھپانی چاہیے۔

سکندر عثمان کا خیال تھا امامہ کو یہ خبر بھی نہیں پہنچانی چاہیے، لیکن سالار کا فیصلہ تھا کہ وہ اس سے اتنی بڑی خبر
چھپا کر ساری عمر کے لیے اسے کسی رنج میں مبتلا نہیں کر سکتا۔ وہ وسیم سے فون اور مسیج کے ذریعے ویسے بھی
رابطے میں تھی یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اسے ایک آدھ دن میں اس کے بارے میں اطلاع نہ مل جاتی۔
وہ دونوں قادیانیوں کی ایک عبادت گاہ پر ہونے والی فائرنگ میں درجنوں دوسرے لوگوں کی طرح مارے گئے تھے
اور امامہ چند گھنٹے پہلے ایک پاکستانی چینل پر یہ نیوز دیکھ چکی تھی وہ اس جانی نقصان پر رنجیدہ بھی ہوئی تھی ایک
انسان کے طور پر۔ مگر اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان لوگوں میں اس کے دو اتنے قریبی لوگ بھی شامل
تھے۔ اسے شبہ ہوتا بھی کیسے۔ وہ اسلام آباد کی عبادت گاہ نہیں تھی ایک دوسرے شہر کی تھی۔ سعد اور وسیم وہاں
کیسے پہنچ سکتے تھے اور وسیم تو بہت کم اپنی عبادت گاہ میں جاتا تھا۔

بے یقینی اس لیے بھی تھی کیونکہ ایک ہفتے کے بعد وہ اور سعد نیویارک آنے والے تھے اس کے پاس 'تقریباً'
دس سالوں کے بعد وہ سعد سے ملنے والی تھی۔ بے یقینی اس لیے بھی تھی کیونکہ وسیم نے اس سے وعدہ کیا تھا وہ
اپنے عقائد سے تائب ہو جائے گا۔ اور وہ سعد کو بھی سمجھائے گا جو اس سے زیادہ کڑ تھا اپنے مذہبی عقائد میں اور
بے یقینی اس لیے بھی تھی کیونکہ ایک دن پہلے تو اس نے وسیم سے بات کی تھی اسے ان کچھ چیزوں کی فہرست ای
میل کی تھی جو اسے پاکستان سے چاہیے تھیں۔

اور سالار... وہ کیا کہہ رہا تھا۔ کیا وہ پاگل ہو گیا تھا۔ یا وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی۔ ایک بار پھر سے۔ جیسے
وہ نو سال ڈاکٹر سبط علی کے گھر دیکھتی رہی تھی۔

وہ صبر نہیں تھا وہ شاک بھی نہیں تھا۔ وہ بے یقینی تھی۔ سالار کو اندازہ تھا مگر وہ یہ نہیں سمجھ پارہا تھا کہ وہ اب
اس انکشاف کے بعد اس سے کیسے نکالے۔

وہ اگلے کئی گھنٹے گم صم آنسو بہائے بغیر سالار کے کسی سوال اور بات کا جواب دیے بغیر ایک بت کی طرح وہیں
بستر پر بیٹھی رہی تھی۔ یوں جیسے انسان نہیں برف کی سل بن گئی تھی۔ اور برف کی سل نہیں جیسے ریت کی دیوار
تھی جو ڈھے گئی تھی۔ اسے لگا تھا وہ اب کبھی زندگی میں اپنی انگلی تک نہیں ہلا سکے گی۔ پاؤں پر کھڑی نہیں ہو سکے
گی۔ سانس نہیں لے سکے گی۔ جی نہیں سکے گی۔ کوئی ایسے تو نہیں جاتا۔ ایسے... اس کی حالت دیکھ کر سالار کو
شدید پچھتاوا ہوا تھا اس نے سکندر عثمان کی بات نہ مان کر کتنی بڑی غلطی کی تھی اسے اب سمجھ میں آیا تھا۔ سالار نے
اپنے ایک ڈاکٹر کزن کو بلایا تھا گھر پر ہی اسے دیکھنے کے لیے۔

اس کے بعد کیا ہوا تھا امامہ کو ٹھیک سے یاد نہیں تھا۔ سالار کو لمحہ لمحہ یاد تھا۔ وہ کئی ہفتے اس نے اسے پاگل پن

کی سرحد پر جاتے اور وہاں سے پلٹتے دیکھا تھا۔ وہ چپ ہوئی تو کئی کئی دن چپ ہی رہتی میوں جیسے اس گھر میں موجود ہی نہیں تھی۔ روتی تو گھنٹوں روتی۔ سوتی تو پورا دن اور رات آنکھیں نہیں کھولتی اور جاگتی تو دو دو دن بستر پر چند لمحوں کے لیے بھی لیٹے بغیر لاؤنج سے بیڈ روم اور بیڈ روم سے لاؤنج کے چکر کاٹتے کاٹتے اپنے پاؤں سجالتی۔ یہ صرف ایک مجزہ تھا کہ اس ذہنی حالت اور کیفیت میں بھی جبریل کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ جیسے یہ فراموش ہی کر بیٹھی تھی کہ اس کے اندر ایک اور زندگی پرورش پا رہی تھی۔ ذہن یا دلوں سے نکل پاتا تو جسم کو محسوس کرتا۔ اور وحشت جب کچھ کم ہوئی تھی تو اس نے سالار سے پاکستان جانے کا کہا تھا۔ اسے اپنے گھر جانا تھا۔ سالار نے اس سے یہ سوال نہیں کیا تھا کہ وہ کس گھر کو اپنا گھر کہہ رہی تھی۔ اس نے خاموشی سے دو سیٹیں بک کروالی تھیں۔

”مجھے اسلام آباد جانا ہے۔“ اس نے سالار کے پوچھنے پر کہا تو۔ سالار نے بحث نہیں کی تھی اگر اس کے گھر والوں سے ملاقات اس کو نارمل کر دیتی تو وہ اس ملاقات کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتا تھا۔

ہاشم مبین ان کے ہمسائے تھے۔ ان کے گھر میں آنے والی قیامت سے سالار سکندر کا خاندان بے خبر نہیں تھا۔ مذہب کا فرق تھا۔ خاندانی اختلافات تھے دشمنی تھی۔ اور نفرت بھی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی یہ خواہش کبھی نہیں تھی کہ ہاشم مبین کے ساتھ وہ ہوتا جو ہوا تھا۔ برہا پے میں جوان اولاد اور وہ بھی دو بیٹوں کو گنونا کیسا صدمہ تھا سکندر عثمان اندازہ کر سکتے تھے۔ وہ خود باپ تھے۔ انہوں نے ہاشم مبین کے گھر جا کر ان سے دوسرے بہت سے لوگوں کے ساتھ تعزیت کی تھی۔ اس صدمے میں بھی ہاشم مبین نے بے حد سرد مہری کے ساتھ ان کی تعزیت قبول کی تھی۔

سکندر عثمان کو امید نہیں تھی کہ وہ امامہ سے ملیں گے۔ انہوں نے سالار سے اپنے خدشات کا ذکر ضرور کیا تھا، لیکن امامہ کو جس حالت میں انہوں نے دیکھا تھا وہ سالار کو ایک کوشش کر لینے سے روک نہیں سکے تھے۔ انہیں امامہ کو دیکھ کر دلی رنج ہوا تھا۔

ہاشم مبین نے نہ صرف فون پر سکندر عثمان سے بات کرنے سے انکار کیا تھا، بلکہ سالار کو ان کے گھر پر گیٹ سے اندر جانے نہیں دیا گیا۔ سکندر عثمان اور وہ دونوں مایوسی کے عالم میں واپس آگئے تھے۔ امامہ کی سمجھ میں ان کی مایوسی اور بے بسی نہیں آئی تھی وہ یہاں باپ کے گھر کے برابر والے گھر میں بیٹھ کر سب حالات سے واقف ہونے کے باوجود یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اگر وہ اس کے گھر جاسکتے تھے تو وہ کیوں نہیں جاسکتی تھی۔ گیٹ کے اندر نہ جاسکتی گیٹ تک تو چلی جاتی۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا تھا وہ اس کی جان لے لیتے۔ بس جان ہی تو جاتی تا۔ وہ تکلیف اور اذیت تو ختم ہو جاتی جس میں وہ تھی۔

سالار اس کے سامنے بے بس تھا، لیکن وہ پہلا موقع تھا جب اس نے امامہ کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ اس نے امامہ کو اس کے گھر جانے کی کوشش بھی نہیں کرنے دی تھی۔

”تمہیں اگر گھر جانا ہے تو پہلے اپنے باپ سے بات کرو۔ وہ اجازت دیں تو پھر میں تمہارے ساتھ چلوں گا، لیکن میں تمہیں بغیر اجازت کے وہاں گیٹ پر گارڈز کے ہاتھوں ذلیل ہونے کے لیے نہیں بھیج سکتا۔“

اس کے رونے اور گڑ گڑانے کے باوجود سالار نہیں پکھلا تھا۔ امامہ نے اپنے باپ سے فون پر بات کر کے اجازت لینے کی ہامی بھری تھی۔ مگر اس فون کال نے سب کچھ بدل دیا تھا۔ جو چیز سالار اسے نہیں سمجھا سکا تھا وہ اس فون کال میں ہاشم مبین نے سمجھا دی تھی۔

”یہ جو کچھ ہوا ہے تمہاری وجہ سے ہوا۔ تم جن لوگوں کے ساتھ جا بیٹھی ہو ان ہی لوگوں نے جان لی ہے میرے دونوں بیٹوں کی۔ اور تم اب میرے گھر آنا چاہتی ہو۔ قاتلوں کے ساتھ میرے گھر آنا چاہتی ہو۔“ وہ ہدیائی انداز میں

”تم لوگ۔“ اور ”ہم لوگ“ فرق کتنا بڑا تھا امامہ کو یاد آگیا تھا۔ آج بھی۔ اس سب کے بعد بھی اس غم کے ساتھ بھی اسے پچھتاوا نہیں تھا کہ اس نے وہ مذہب چھوڑ دیا تھا۔ اسے یاد آیا تھا ایک بار اس کے باپ نے کہا تھا وہ ایک دن گڑ گڑاتے ہوئے اس کے پاس آکر معافی مانگے گی۔ اور وہ آج یہی کرنے جا رہی تھی۔ پر کیوں کرنے جا رہی تھی؟۔

خون کا رشتہ تھا۔ تڑپ تھی۔ وہ کھنچی تھی ان کی طرف۔ اب جب اسے ان سے پہلے کی طرح جان کا خوف نہیں رہا تھا۔ پر خون کا رشتہ صرف اسی کے لیے کیوں تھا۔ تڑپ تھی تو صرف اس کو کیوں تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کے پاس ان لوگوں کے سوا اور کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ وہ اپنے لوگوں کے پاس تھے۔ اس کے پاس سالار تھا۔ لیکن وہ خونی رشتہ نہیں تھا محبت کا رشتہ تھا۔ خون جیسی تڑپ پیدا ہونے کے لیے ابھی اس کو کئی سال چاہیے تھے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ماؤف ہونے کے باوجود اسے پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ جو غم اسے وہاں کھینچ کر لایا تھا۔ وہ غم اس گھر میں جا کر پچھتاوے میں بدل جاتا۔

ہاشم مبین کی مزید کوئی بات سننے کے بجائے اس نے فون رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد وہ بلک بلک کر روئی تھی۔ اس گھر میں اور اس دنیا میں اب اس کا خونی رشتہ کوئی نہیں رہا تھا۔ اس گھر میں صرف وہ سیم اس کا تھا۔ اور وہ سیم جاچکا تھا۔ وہ ایک کھڑکی جو پچھواڑے میں کھلی تھی ٹھنڈی ہوا کے لیے وہ آندھی کے زور سے بند ہو گئی تھی۔ اب اس کھڑکی کو دوبارہ کبھی نہیں کھلنا تھا۔

وہ سالار سکندر کے ساتھ واپس نیویارک لوٹ آئی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا وہ نارمل ہو رہی تھی، آہستہ آہستہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ کچھ وقت لگنا تھا۔ امامہ بھی ایسا ہی سمجھتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا وہاں موجود تنہائی نے امامہ کے اعصاب کو ایک بار پھر مفلوج کرنا شروع کر دیا تھا۔ سالار نے ایچ ڈی کر رہا تھا اور ساتھ ایک آرگنائزیشن میں ہفتے میں تین دن کے لیے پارٹ ٹائم کام کرتا تھا۔ وہ صبح پانچ بجے گھر سے نکلتا تھا۔ اور رات کو تیس آٹھ بجے اس کی واپسی ہوتی تھی اور واپسی پر وہ اتنا تھکا ہوا ہوتا تھا کہ ایک دو گھنٹے ٹی وی دیکھ کر کھانا کھا کر وہ دوبارہ سو جاتا تھا۔

امامہ بارہ چودہ گھنٹے ایک بیڈ روم کے آٹھویں منزل کے اس اپارٹمنٹ میں بالکل تنہا ہوتی تھی اور تنہائی کا یہ دورانیہ سالار کے گھر آجانے کے بعد اس کے سو جانے پر اور بڑھ جاتا تھا۔ ایک بیڈ روم ایک لاونج اور کچن ایریا کے علاوہ جہاں کچھ بھی نہیں تھا جہاں وہ جا کر کچھ وقت گزار سکتی۔ گھر کا کام بھی بہت مختصر تھا کیونکہ گھر چھوٹا تھا۔ نیندا سے آتی نہیں تھی۔ اور گھر میں کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ صرف سوچنے کے علاوہ۔ کوئی ٹی وی کہاں تک دیکھ سکتا تھا۔ کتابیں کتنی پڑھ سکتا تھا۔ جب ذہن صرف اپنی زندگی کے سارے بڑے دنوں کو سوچتے ہوئے وہیں اٹکا رہتا تھا۔ کیا ہو سکتا تھا؟۔ کیا کرنا چاہیے تھا؟۔ کیا کر لیتی تو کس چیز سے بچ جاتی۔ کس چیز سے بچ جاتی تو کون سا صدمہ اسے نہ ہوتا۔ زندگی میں کون کون سی غلطیاں ہوئی تھیں اس سے۔؟ کون سے غلطی زیادہ بڑی تھی۔ کون سی چھوٹی؟۔ کس کو نہ کرنے سے کس سے بچ سکتی تھی وہ۔

وہ سالار دن اسی حساب کتاب میں لگی رہتی تھی۔ وہ سیم اس کے ذہن سے نہیں نکلتا تھا وہ روز اپنے فون میں موجود اس کے اور اپنے مسیجز کو جو سینکڑوں کی تعداد میں ہوتے بیٹھ کر پڑھنا شروع کرتی اور پھر گھنٹوں اسی میں گزار دیتی اسے وہ سینکڑوں مسیجز اب جیسے زبانی حفظ ہو چکے تھے، لیکن پتا نہیں خود اذیت کی وہ کون سی سیڑھی تھی جس پر بیٹھی وہ ہر روز ایک ہی کام بھیگی آنکھوں کے ساتھ کرتی رہتی تھی۔ اسے دن میں کب کیا کھانا تھا اسے یاد نہیں رہتا تھا۔ کب کپڑے بدلے تھے اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔ اس کا ذہن جیسے کسی نے قید کر دیا تھا۔ لاکھ کوشش پر بھی وہ اس پنجرے سے آزاد نہیں ہوتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ کوشش نہیں کرتی تھی۔

وہ بے پناہ کوشش کرتی تھی اپنے ذہن کو ان سب چیزوں اور یادوں سے ہٹانے کی۔ وہ قرآن پڑھتی تھی نماز پڑھتی تھی۔ مگر اس کے بعد وہ وحشت کے اسی جنگل میں ایک بار پھر پہنچ جاتی تھی۔ بڑی وجہ شاید یہ تھی کہ وہاں اس سے کوئی بات کرنے والا نہیں تھا۔ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے وہ گونگوں کی طرح چلتی پھرتی اپنے کام میکانیکی انداز میں کرتی تھی۔ سالار کہتا تھا وہ پاکستان فون کر لے۔ وہ پاکستان کس کو فون کرتی وہ یہ نہیں بتاتا تھا وہاں کون تھا ایسا جو اپنے کام چھوڑ کر گھنٹوں فون پر بات کرتا۔ ووسیم کے علاوہ۔ بات جہاں سے شروع ہوتی تھی پھر وہیں آکر رک جاتی تھی۔ اپنے وجود کے ناکارہ پن اور زندگی کی بے معنویت امامہ ہاشم نے جیسے اس دور میں محسوس کی تھی اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ اس کا اپنا وجود اس کے لیے سب سے بڑا بوجھ بن گیا تھا۔ اسے وہ کہاں پھینک آتی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بستر صبح غیند سے آنکھ کھلتے ہی اسے یہ خیال آتا تھا۔ ایک اور دن۔ پھر وہی روٹین۔ پھر وہی تنہائی۔ وہی ڈپریشن۔ وہ آہستہ آہستہ ڈپریشن کی طرف جانا شروع ہو گئی تھی اور سالار ایک بار پھر اپنے آپ کو بے حد بے بس محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ اس کے لیے کیا کرتا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جس سے وہ پھر پہلے جیسی ہو جاتی۔ وہ اپنی ورک روٹین نہیں بدل سکتا تھا۔ وہ نیویارک میں رہ رہے تھے اور ان کے جو اخراجات تھے انہیں پورا کرنے کے لیے اسے کام کرنا ہی تھا۔ وہ پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ اسے گھنٹوں لائبریری میں بیٹھنا پڑتا تھا اپنی ریسرچ کے لیے۔ اور وہ یہ کام بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

چوہہ گھنٹے تک اپنے کاموں اور سفر سے خوار ہونے کے بعد وہ تھکا ہارا گھر آنے پر بھی امامہ کے کہنے پر کہیں بھی چلنے کے لیے تیار رہتا تھا اور کہیں نہیں تو لیا رٹمنٹ کے باہر پارک تک۔ لیکن وہ اس سے کہیں جانے کا کہتی ہی نہیں تھی وہ اس سے معمول کی گپ شپ کرنے کی بھی کوشش کرتا تھا۔ مگر وہ چند جملے بول کر چپ ہو جاتی تھی میوں جیسے اب وہ سالار سے مزید کیا بات کرے اسے یہی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ہونے والی اولاد جوان کی زندگی کا شادی کے بعد سب سے بڑا واقعہ تھا۔ دونوں ہی کے لیے جیسے غیر اہم ہو گیا تھا۔ دونوں کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ وہ بچے کے بارے میں بھی بات کریں تو کیا بات کریں۔ چند جملوں کے بعد ان کے پاس اس کے بارے میں بھی بات کرنے کو لفظ نہیں رہتے تھے۔

تسلی، دلاسا اور دل جوئی کے لیے سالار جو کر سکتا تھا کر چکا تھا۔ وہ اب ووسیم کے بارے میں کسی سے بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ صبح سویرے گھر سے اس کے بارے میں سوچتے ہوئے نکلتا اور رات کو جب گھر واپس آنے کے لیے ٹرین میں بیٹھتا تو بھی اس کے بارے میں سوچ رہا ہوتا تھا۔ امامہ کی ذہنی کیفیت نے جیسے اس کے اعصاب شل کرنے شروع کر دیے تھے۔ جبریل کی پیدائش میں ابھی بہت وقت تھا اور وہ اسے اس جنم سے نکالنا چاہتا تھا جس میں وہ ہر وقت نظر آتی تھی۔

سائیکارٹسٹ اس کی پریگنہنسی کی وجہ سے اسے تیز دوائیں نہیں دے رہے تھے مگر اس کا خیال تھا باقاعدہ علاج کے بغیر وہ بہت جلد نارمل نہیں ہو سکتی تھی۔ فیملی کا خیال تھا وہ اگر اسے ساتھ لے جانے کے بجائے کچھ دیر پاکستان میں ان کے پاس رہنے دیتا تو وہ اب تک نارمل ہو چکی ہوتی۔ وہاں فیملی سپورٹ ہوتی ذہن اور دل کو بہلانے کے لیے وہ اس کے لیے بہت کچھ کر سکتے تھے۔ سات سمندر پار بیٹھے وہ اس کے لیے کیا کرتے۔ سالار کو ان کی بات بھی ٹھیک لگتی تھی لیکن وہ امامہ کے بارے میں خائف تھا کہ اسے اکیلا پاکستان چھوڑ جانے پر وہ کسی نقصان کا شکار نہ ہو جائے۔ لیکن جو کچھ اب ہو رہا تھا وہ بھی اس سے برداشت نہیں ہو پارہا تھا۔

اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے سے پہلے ہی ایک رات امامہ نے کہا تھا۔
”مجھے پاکستان جانا ہے۔“

”کیوں؟“ سالار کو اپنا سوال خود بے تکا لگا۔
 وہ بہت دیر چپ رہی کیوں جیسے اپنے الفاظ جمع کر رہی ہو پھر اس نے جو کہا تھا اس نے سالار کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا۔

”کل میں نے وسیم کو دیکھا۔ وہاں کچن کاؤنٹر کے پاس وہ پانی پی رہا تھا۔ دو دن پہلے بھی میں نے اسے دیکھا تھا“ وہ اس کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ ”بات کرتے ہوئے اس کی آواز بھرائی اور وہ شاید اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کے لیے رکی تھی۔

”مجھے لگتا ہے میں کچھ عرصہ اور یہاں رہی تو پاگل ہو جاؤں گی۔ یا شاید ہونا شروع ہو چکی ہوں لیکن میں یہ نہیں چاہتی۔“

اس نے چند لمحوں کے بعد دوبارہ بات کرنی شروع کی تھی۔ وہ اگر وہاں ہوں گا شکار ہو رہی تھی تو وہ اس بات سے واقف بھی تھی اور اس سے فرار چاہتی تھی تو یہ جیسے ایک مثبت علامت تھی۔

”ٹھیک ہے، ہم واپس چلے جاتے ہیں مجھے صرف چند ہفتے دے دو سب کچھ وائٹ اپ کرنے کے لیے۔“
 سالار نے جیسے لمحوں میں فیصلہ کیا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے امامہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”تم پی ایچ ڈی کر رہے ہو تم کیسے میرے ساتھ جا سکتے ہو؟“

”میں پی ایچ ڈی چھوڑ دوں گا۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری ضروری نہیں ہے۔ تم اور تمہاری زندگی ضروری ہے۔“
 سالار نے جواباً ”اس سے کہا کچھ کہنے کی کوشش میں امامہ کی آواز بھرائی وہ کہہ نہیں پائی۔ اس نے دوبارہ بولنے کی کوشش کی اور اس بار وہ بلک بلک کر رونے لگی تھی۔

”نہیں تم ساتھ نہیں آؤ گے۔ یہ کیوں ضروری ہے کہ ساری زندگی تم قربانیاں ہی دیتے رہو میرے لیے۔“
 اب پی ایچ ڈی چھوڑو۔ اپنا کیریئر چھوڑو۔ تمہاری زندگی ہے۔ قیمتی ہے تمہارا وقت، تم کیوں اپنی زندگی کے اتنے قیمتی سال میرے لیے ضائع کرو۔“

سالار نے کچھ کہنے کی کوشش کی کوئی اور موقع ہوتا تو اس کا یہ اعتراف اس کو خوشی دیتا، لیکن اب اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ روتے ہوئے اسی طرح کہہ رہی تھی۔

”I am not suitable for you“ میں جتنا سوچتی ہوں مجھے یہی احساس ہوتا ہے تمہارا ایک برائٹ فیوچر ہے تم زندگی میں بہت کچھ حاصل کر سکتے ہو لیکن میرا وجود تمہاری ترقی کے راستے میں رکاوٹ بن گیا ہے۔ مجھے احساس جرم ہوتا ہے کہ بار بار میری وجہ سے تمہیں پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔“

وہ چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی اور بول رہی تھی۔ اور وہ چاہتا تھا وہ اور روئے اور بولے۔ وہ غبار جو اس کے اندر سے چھٹتا ہی نہیں تھا وہ کسی طرح تو چھٹے۔

”میں تم سے بہت شرمندہ ہوں، لیکن میں بے بس ہوں میں کوشش کے باوجود بھی اپنے آپ کو نارمل نہیں کرپا رہی۔ اور اب۔۔۔ اب وسیم کو دیکھنے کے بعد تو میں اور بھی۔۔۔ اور بھی۔“ وہ بولتے بولتے رک گئی صرف اس کے آنسو اور ہچکیاں تھیں جو نہیں تھمی تھیں۔

”سالار، تم بہت اچھے انسان ہو۔ بہت اچھے ہو تم بہت قابل ہو۔ تم مجھ سے بہتر عورت ڈیزرو کرتے ہو۔ میں نہیں۔“

Im a worthless woman

I m a nobody

تمہیں ایسی عورت ملنی چاہیے جو تمہارے جیسی ہو۔ تمہیں زندگی میں آگے بڑھنے میں سپورٹ کرے۔

میری طرح تمہارے پیاروں کی بیڑی نہ بن جائے۔“

”اور یہ سب کچھ تم آج کہہ رہی ہو جب ہم اپنا پہلا بچہ expect کر رہے ہیں۔۔۔؟“
”مجھے لگتا ہے یہ بچہ بھی مر جائے گا۔“ اس نے عجیب بات کہی تھی۔۔۔ سالار نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔

”تم کیوں اس طرح سوچ رہی ہو۔۔۔ اسے کچھ نہیں ہو گا۔“ سالار پتا نہیں کس کو تسلی دینا چاہتا تھا لیکن اس وقت امامہ سے زیادہ اس کی اپنی حالت قابل رحم ہو رہی تھی۔
”تم بس مجھے پاکستان بھیج دو۔“ امامہ نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر وہی مطالبہ دہرایا تھا۔

”میں تمہیں اسلام آباد نہیں بھیجوں گا۔“ سالار نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”میں وہاں جانا بھی نہیں چاہتی مجھے سعیدہ اماں کے پاس جانا ہے میں وہاں رہ لوں گی۔“ وہ اس کی بات پر حیران ہوا تھا۔ ”سعیدہ اماں نہیں تم ڈاکٹر صاحب کے پاس چلی جاؤ۔ اگر وہاں رہنے پر تیار ہو تو میں تمہیں بھیج دیتا ہوں۔“ سالار نے یکدم کچھ سوچ کر کہا تھا۔

”ٹھیک ہے مجھے انہیں کے پاس بھیج دو۔“ وہ ایک لمحہ کے بھی تامل کے بغیر تیار ہو گئی تھی۔ ”اگر تم وہاں جا کر خوش رہ سکتی ہو تو ٹھیک ہے میں تمہیں بھیج دیتا ہوں واپس کب آؤ گی؟“

وہ پہلا موقع تھا ساری گفتگو میں جب امامہ نے اس سے نظر ملانی تھی۔۔۔ یہ دل بس خواری کا نام ہے عزت یوں اتار کر رکھتا ہے جیسے عزت کوئی شے ہی نہیں۔۔۔ بے عزتی کو اتنا معمولی کر دیتا ہے کہ انسان آنکھ میں پانی بنا کر رکھنے لگتا ہے۔۔۔ پی جانے لگتا ہے۔ وہ ساری دنیا کو اپنی ٹھوک پر رکھنے والا مرد تھا اور رسی ڈالی تھی تو اللہ نے اس کے گلے میں محبت کی رسی ڈالی تھی۔۔۔ رسی تھی زنجیر نہیں تھی لیکن بیڑی سے زیادہ بڑی اور کڑی تھی۔

امامہ کو لگا تھا وہ اس سے نظر ملانے کے قابل بھی نہیں رہی تھی اور نظریں ملا کے کرنا ہی کیا تھا۔۔۔ کچھ کہنے کے لیے لفظ ہی نہیں تھے۔۔۔ جو بھی گلے تھے اسے اپنی ذات سے تھے۔۔۔ ساری خامیاں اپنے اندر تھیں۔۔۔ سالار کو وہ جیسے بد قسمتی کے اس چنگل سے آزاد کر دینا چاہتی تھی جس میں وہ خود سالوں سے پھنسی ہوئی تھی اور شاید پھنسا ہی رہنا تھا اسے۔۔۔ اس کی بے لوث۔۔۔ بے مول محبت کا وہ اتنا صلہ تو دیتی اسے۔۔۔ کہ اس بد قسمتی میں اسے نہ گھسیٹتی اسے آگے بڑھ جانے دیتی۔

”واپس آ جانا۔“ اس کی لمبی خاموشی کو سالار نے مختصر زبان دی تھی۔۔۔ مشورہ نہیں تھا منت تھی۔۔۔ خواہش نہیں تھی بے بسی تھی۔۔۔ جو ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔۔۔ امامہ نے اس کی بات خاموشی سے سن کر خاموشی سے ہی جواب دیا تھا۔

وہ ایک ہفتے کے بعد پاکستان واپس چلی آئی تھی اور جیسے کسی قید سے چھوٹ آئی تھی۔ امریکہ سے واپس آنے سے پہلے وہ گھر میں پڑی ہوئی اپنی ایک ایک چیز وہاں سے ہٹا آئی تھی یوں جیسے رگڑ رگڑ کر سالار کے گھر اور زندگی سے اپنے وجود اور یادوں کے سارے نقوش کو مٹا دینا چاہتی ہو۔۔۔ جیسے سالار کی زندگی کو ہر اس نحوست سے پاک صاف کر دینا چاہتی ہو جو اس کے ساتھ اس کے گھر اور زندگی میں داخل ہوئی تھی۔

وہ واپس نہ آنے کے لیے جا رہی تھی سالار کو اس کا احساس اس کی ایک ایک حرکت سے ہو رہا تھا لیکن وہ پھر بھی اسے جانے دینا چاہتا تھا۔ اگر فاصلہ اور اس سے دوری اسے صحت یاب کر سکتی تھی تو وہ چاہتا تھا وہ دور ہو جائے لیکن ٹھیک ہو جائے۔ چار مہینے اور گزرتے تو ان کی اولاد اس دنیا میں آجانی اور وہ اس کی بقا بھی چاہتا تھا اور وہ اپنی ہمت بھی جانتا تھا جو اب آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی تھی۔ وہ ڈپریشن امامہ کے وجود سے جیسے اس کے وجود میں

جس شام اس کی فلائٹ تھی وہ ایک بار پھر دل گرفتہ ہو رہا تھا۔ اسے لگا تھا اب وہ گھر ٹوٹنے والا تھا جو اس نے بڑی مشکل سے بنایا تھا۔ امامہ بھی خاموش تھی مگر ہتا نہیں سالار کو کیوں وہ پرسکون لگی تھی۔ پرسکون۔ مطمئن خوش وہ اس کے چہرے کی کتاب پر اس دن یہ نہیں پڑھنا چاہتا تھا۔

”مت جاؤ۔“ وہ ٹیکسی کے آنے پر اس کا بیگ اٹھا کر بیڈ روم سے لاؤنج میں لایا تھا۔ وہ اپنا ہینڈ کیری کھینچتے ہوئے اس کے پیچھے آئی تھی اور اس نے ہینڈ کیری بھی دوسرے سامان کے ساتھ سالار کو تھمانے کی کوشش کی تھی جب سالار نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس نے خلاف توقع ہاتھ نہیں کھینچا تھا بس ہاتھ اس کے ہاتھوں میں رہنے دیا تھا۔ بہت دیر سالار اس کا ہاتھ یونہی پکڑے رہا تھا پھر اس نے بہت دل گرفتگی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

وہ لمس امامہ کے ساتھ آیا تھا۔ اس قید سے آزاد ہونے کے بعد بھی اسے بے قرار کرتا رہا تھا۔ کئی سال بعد وہ ایک بار پھر ڈاکٹر سبط علی کے گھر بناہ کے لیے آئی تھی۔ اور اسے اس بار بھی بناہ مل گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور اس کی بیوی اس کی ذہنی حالت سے واقف تھے اور وہاں ان کے پاس آکر کم از کم کچھ دنوں کے لیے امامہ نے یونہی محسوس کیا تھا جیسے وہ کسی قید تنہائی سے نکل آئی تھی۔ مگر یہ کیفیت بھی وقتی تھی۔ وہ جس سکون کی تلاش میں تھی وہ یہاں بھی نہیں تھا۔ بے چینی اور بے قراری یہاں بھی ویسی ہی تھی اور ڈاکٹر سبط علی ان بیوی اور سعیدہ اماں کی محبت بھی اس کے لیے مرہم ثابت نہیں ہو پارہی تھی۔ سالار اسے روز فون کرتا تھا کبھی وہ کال ریسیو کرتی کبھی نہیں۔ کبھی وہ اس سے لمبی بات کرتی کبھی مختصر بات کر کے فون رکھ دیتی وہ پاکستان آکر بھی کسی سے رابطے میں نہیں تھی۔ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لمبی بے مقصد خوش گپیاں جن کی وہ عادی تھی۔ فرق اگر صرف پڑا تھا تو یہ کہ یہاں وہ پابندی سے اور وقت پر اچھا کھانا کھانے کی عادی ہو گئی تھی کیونکہ یہ اس کی مجبوری تھی ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی اس کا خیال رکھتے تھے اور اتنا خیال رکھتے تھے کہ کبھی کبھی اسے احساس جرم ہونے لگتا کہ اسے ان کے پاس نہیں آنا چاہیے تھا اس نے اس پر بھاری ذمہ داری برہادی تھی۔

پتا نہیں گتے دن تھے جو اس نے اسی طرح گزارے تھے۔ سوتے جاگتے یا پھر کبھی وہ گھر سے بے مقصد نکل پڑتی۔ ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں اور سارے شہر میں گھومتی پھرتی۔ چلتی ہوئی گاڑی سے نظر آنے والے منظر اس کے ذہن کو وقتی طور پر بھٹکا دیتے تھے اس کی سوچ کو اس کی زندگی سے دوسروں کی زندگی پر لے جاتے تھے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ گھر سے نکلی تھی اور نہر کے ساتھ سڑک پر چلتے چلتے وہ شہر سے ہی باہر نکل آئے تھے۔ ایک جگہ گاڑی روکا کروہ نیچے اتر آئی تھی اور نہر کے ساتھ سبزے پر نہر کے پانی پر بہتی بے کار چیزوں کو دیکھتے دیکھتے وہ اس کے ساتھ چلنے لگی تھی یوں جیسے وہ بھی پانی پر بہنے والی کوئی بے کار چیز تھی پتا نہیں وہ کتنی دیر چلتی رہی تھی پھر ایک جگہ کھڑے ہو کر بہتے ہوئے پانی کو دیکھنے لگی۔ گھنے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں موسم سرما میں نہر میں بہتا ہوا وہ پانی برسات کے پانی کی طرح تیز رفتار نہیں تھا نہ ہی پانی اتنا زیادہ تھا لیکن اس لمحے وہ اسے عجیب انداز میں اپنی طرف کھینچ رہا تھا یوں جیسے وہ اسے اپنے اندر اترنے کے لیے پکار رہا ہو۔ چند لمحوں کے لیے وہ اس خنکی کو بھی بھول گئی تھی جو اس کے سویٹر اور شمال کے باوجود اس کے جسم کو شل کرنے لگی تھی۔ نہر کے دونوں کناروں پر لگے ہوئے اونچے لمبے درخت ہوا سے ملتے تو ان کے پتوں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر نہر کے پانی پر پڑتیں۔ لکھ بھر کے لیے اسے روشن کرتیں غائب ہو جاتیں۔

بس صرف ایک لمحہ تھا جس نے اس سے کہا تھا کہ اسے اس پانی میں اترنا چاہیے۔ دیکھنا تو چاہیے وہاں آگے نیچے کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ قدم برہا دیتی کسی عورت کی آواز پر وہ ٹھٹک گئی تھی۔

”یہ ذرا گھٹا تو بند ہوا دے میرے ساتھ بیٹی!“

وہ ایک ستر، اسی سالہ دہلی تیلی سانولی رنگت اور جھریوں سے بھرے چہرے والی ایک بوڑھی عورت تھی۔ جو ایندھن کے لیے وہاں درختوں کی گری ہوئی خشک لکڑیاں چننے کے بعد اب اسے ایک چادر نما کپڑے میں باندھنے کی کوشش میں اسے مخاطب کر رہی تھی وہاں دور دور تک ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا اور وہ بھی کب اور کہاں سے یک دم نمودار ہوئی تھی امامہ کو اس کا اندازہ بھی نہیں ہوا۔ اس نے کچھ کہے بغیر نہر کے کنارے سے مٹے ہوئے اماں کی طرف قدم بڑھادیے تھے۔ گٹھا اتنا بڑا بنا تھا کہ اسے یقین تھا کہ وہ بوڑھی عورت کبھی بھی اس گٹھے کو سر پر نہیں اٹھاپائے گی۔ لیکن اس بڑھیا نے امامہ کی مدد سے بڑے آرام سے وہ گٹھا سر پر اٹھالیا تھا۔

”ذرا میری بکری کی رسی مجھے پکڑانا۔“ اس بوڑھی عورت نے اب دور ایک درخت کے دامن میں اگی گھاس

چرتی ہوئی ایک بکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امامہ سے کہا تھا، امامہ کو ایک لمحے کے لیے تامل ہوا لیکن پھر اس نے جا کر تھوڑی بہت جدوجہد کے بعد اس بکری کی رسی پکڑ لی تھی۔

”آپ چلیں میں ساتھ چلتی ہوں کہاں جانا ہے آپ کو؟“

امامہ کو خیال آیا تھا کہ وہ اتنے بڑے لکڑیوں کے گٹھڑے کے ساتھ بکری کو کیسے تھامے گی۔

”بس یہاں آگے ہی جانا ہے ادھر سڑک پار کر کے دوسری طرف۔“ بوڑھی عورت نے نہر کے سبزے سے

نکل کر سڑک کی طرف جاتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے سمجھایا تھا۔

امامہ بکری کی رسی کھینچتی ہوئی چپ چاپ اس عورت کے پیچھے چل پڑی تھی، جس کے پاؤں ننگے تھے اور

ایڑیاں، کھردری اور پیدل چل چل کر پھٹ چکی تھیں، امامہ اپنی جرابوں کے ساتھ بہت آرام وہ کورٹ شووز پہنے

ہوئے تھی اس کے باوجود وہ اس بوڑھی عورت کی سبک رفتاری کا سامنا نہیں کر پارہی تھی جو یوں چل رہی تھی

جیسے ٹائلز کے فرش یا کسی مٹھلیں قالین پر چل رہی ہو۔

سڑک پار کرتے ہی امامہ کو دس پیس کے قریب وہ جھگیاں نظر آگئی تھیں، جنہیں اماں اپنا گھر کہہ رہی تھی وہ

جھگیاں بس ٹینٹوں پر مشتمل نہیں تھیں۔ لوگوں نے اپنی جھگی کے گرد سرکنڈوں کی دیواریں کھڑی کر کے جیسے

احاطے سے بنا لیے تھے جن کے فرش کو مٹی اور گارے سے لپٹا ہوا تھا۔ وہ کچھ تامل کے ساتھ ایسی ہی ایک جھگی کے

احاطے میں بکری کی رسی پکڑے اماں کے پیچھے چلتی ہوئی داخل ہوئی تھی۔

اس بوڑھی عورت نے احاطے کے ایک کونے میں سر پر لا دا ہوا گٹھرتا پھینکا تھا اور پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھے

جیسے اس نے گہرے سانس لیتے ہوئے اپنی سانس بحال کی تھی۔ بکری تب تک امامہ کے ہاتھ سے رسی چھڑا کر

سرکنڈوں کی دیوار کے ساتھ اس جگہ پہنچ گئی تھی جہاں اسے باندھا جاتا تھا اور جہاں زمین پر کچھ مرجھائی ہوئی

گھاس پھوس پڑی تھی وہ اب اس پر منہ مارنے لگی تھی۔

احاطے کے ایک دوسرے حصے میں مٹی کے ایک چولہے پر مٹی کی ایک ہنڈیا چڑھی ہوئی تھی جس سے اٹھنے

والی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی احاطہ رو پہلی دھوپ سے روشن اور گرمایا ہوا تھا۔ وہاں نہروالی ٹھنڈک نہیں

تھی ایک آسودہ سی حرارت تھی۔ وہ جیسے کسی گرم آغوش میں آگئی تھی۔

بوڑھی عورت تب تک لکڑیوں کا گٹھڑ کھول کر اس میں سے کچھ لکڑیاں نکال کر چولہے کی طرف آگئی تھی۔

”ارے تو کھڑی کیوں ہے اب تک۔۔۔ بیٹھ کر دم تولے۔۔۔ میری خاطر کتنا چلنا پڑ گیا تجھے۔۔۔ میں نے کہا بھی تھا

میں لے جاتی ہوں بکری کو۔۔۔ میرا تو روز کا کام ہے۔۔۔ پیدا ہوتے سے کرتی آئی ہوں محنت مشقت۔۔۔ پر تو تو شہر کی

کڑی ہے۔۔۔ تجھ سے کہاں ہوتی ہے کوئی مشقت۔“

اس نے کہتے ہوئے چولہے سے کچھ فاصلے پر پڑی ایک چوکی کو جیسے اس کے لیے آگے کھسکا دیا تھا۔

”میں بھی مشقت ہی کاٹی آئی ہوں اماں! یہ مشقت تو کچھ بھی نہیں۔“

امامہ اس سے کہتے ہوئے آگے بڑھ آئی تھی۔ اس کا خیال تھا بوڑھی عورت نے اس کی بات نہیں سنی ہوگی لیکن وہ بوڑھی عورت ہنس پڑی تھی۔

”بس مجھے مشقت نہیں لگتی مجھے لگتی ہے یہی تو فرق ہے۔۔۔ پر تیرا قصور نہیں سارا فرق جوانی کا ہے۔۔۔ جوانی میں ہر چیز مشقت لگتی ہے۔۔۔ بڑھاپا خود ایسی مشقت ہے کہ بانی مشقتیں چھوٹی بنا دیتا ہے۔“

اس عورت نے اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر کہا تھا امامہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی وہ اس سے ایلے اور اس جگہ رہنے والی عورت سے ایسی بات کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔

”آپ بڑھی لکھی ہیں؟“ وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

”بہت زیادہ۔“ وہ عورت اس بار بھی چولے ہی کی طرف متوجہ تھی اور اس بار بھی اس نے بات ہنس کر ہی کہی تھی مگر لمبے میں تمسخر تھا اپنے لیے۔ جو امامہ تک پہنچ گیا تھا۔ امامہ نے اگلا سوال نہیں کیا تھا وہ اب اس ہانڈی اور چولے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی جس کے پاس وہ بوڑھی عورت بیٹھی تھی کینوں سے بنے مٹی کے چولے پر رکھی ہوئی پرائی مٹی کی ہنڈیا۔ میں ساگ اپنے پانی میں گل رہا تھا۔ اس بوڑھی عورت نے نہر کے کنارے سے چنی ہوئی جھاڑیاں توڑ توڑ کر چولے میں پھینکنا شروع کر دیا۔ وہ آگ کو اسی طرح بھڑکائے رکھنے کی کوشش تھی۔ امامہ مٹی سے لیے ہوئے گرم فرش پر چولے کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی۔ پاؤں سے جرابیں اور جوتے اتار کر اس نے اپنے سرد اور سو بے ہوئے پیروں کو دھوپ سے گرم فرش پر جیسے کچھ حدت پہنچانے کی کوشش کی تھی۔

اماں اس عمر میں بھی بچوں کے بل بیٹھی لکڑیوں کو توڑ مروڑ کر چولے میں جھونک رہی تھی۔ آگ میں لکڑیوں کے تڑخنے اور چٹخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ساگ کی ہانڈی سے اٹھتی بھاپ اور اس میں پڑتے ابال دیکھتی رہی۔

”آدمی کیا کرتا ہے تیرا؟“ وہ اماں کے اس اچانک کیے ہوئے سوال پر چونکی پھر بڑبڑائی۔

”کیا کرتا ہے؟“ اس نے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی تھی پھر کہا۔ ”کام کرتا ہے۔“

”کیا کام کرتا ہے؟“ اماں نے پھر پوچھا۔

”باہر کام کرتا ہے۔“ وہ ساگ کو دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

”پر دیس میں ہے؟“ بوڑھی عورت نے جواباً کہا۔ وہ بھی اب اسی کی طرح زمین پر بیٹھ گئی تھی اور اس نے اپنے گھٹنوں کے گرد اس کی طرح بازو لپیٹ لیے تھے۔

”ہاں پر دیس میں ہے۔“ وہ اسی طرح ساگ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”تو تو یہاں کس کے پاس ہے؟ سسرال والوں کے پاس؟“

”نہیں۔“

”پھر؟“

”میں کسی کے پاس نہیں ہوں۔“ ساگ پر نظریں جمائے اس نے بے ربط جواب دیا۔

”آدمی نے گھر سے نکال دیا ہے کیا؟“ اس نے چونک کر اس عورت کا چہرہ دیکھا۔

”نہیں!“

”پھر تو کڑ کے آئی ہے کیا؟“

”نہیں۔“ اس نے بے ساختہ سر ہلایا۔

”تو پھر یہاں کس لیے آئی ہے؟“

”سکون کے لیے۔“ اس نے بے اختیار کہا۔

”سکون کہیں نہیں ہے۔“ وہ اس عورت کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”تو جو چیز دنیا میں ہے ہی نہیں اسے دنیا میں کیا ڈھونڈنا؟“ اس نے حیرت سے اس عورت کو دیکھا۔ وہ گہری بات تھی اور اس عورت کے منہ سے سن کر اور بھی گہری لگی تھی اسے جو اس جھگی میں بیٹھی آگ میں لکڑیاں جھونک رہی تھی۔

”پھر بندہ رہے کیوں دنیا میں اگر بے سکون رہنا ہے؟“ وہ اس سے یہ سوال نہیں پوچھنا چاہتی تھی جو اس نے پوچھا تھا۔

”تو پھر کہاں رہے؟“ لکڑیاں جھونکتی اس عورت نے ایک لحظہ کے لیے رک کر اسے دیکھتے ہوئے ڈائریکٹ پوچھا، وہ کچھ لا جواب ہوتے ہوئے دوبارہ ساگ کو دیکھنے لگی۔

”تیرا آدمی کہتا نہیں واپس آنے کو؟“

”ہیلے کہتا تھا۔ اب نہیں کہتا۔“ اس نے خود بھی لکڑیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے آگ میں پھینکنے شروع کر دیے تھے۔

”بے چارہ اکیلا سے وہاں؟“

وہ ایک لمحے کے لیے ٹھکی۔ ”ہاں۔“ اس نے اس بار مدہم آواز میں کہا۔

وہ بوڑھی عورت اب پلاسٹک کے ایک شاپر میں پڑا ہوا آٹا ایک تھالی میں ڈال رہی تھی۔

”تو اکیلا چھوڑ کر آگئی اسے؟“ دھوپ میں پڑے ایک گھڑے سے ایک گلاس میں پانی نکالتے ہوئے اماں نے جیسے افسوس کیا تھا۔ وہ بے مقصد آگ میں لکڑیاں پھینکتی رہی۔

”تجھ سے پیار نہیں کرتا تھا؟“

وہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہوئی۔

”کرتا تھا۔“ اس کی آواز بے حد مدہم تھی۔

”خیال نہیں رکھتا تھا؟“ ساگ سے اٹھتی بھاپ اس کی آنکھوں میں اترنے لگی تھی اسے بڑے برفیے کے بعد پتا نہیں کیا کیا یاد آیا تھا۔

”رکھتا تھا۔“ آواز اور بھی مدہم ہو گئی تھی۔

اماں اب اس کے پاس بیٹھی اس تھالی میں دو روٹیوں کا آٹا گوندھ رہی تھی۔

”روٹی کپڑا نہیں دیتا تھا؟ اس نے چادر سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

”دیتا تھا۔“ وہ اپنی آواز خود بھی بمشکل سن پاتی تھی۔

”تو نے پھر بھی چھوڑ دیا اسے؟ تو نے بھی اللہ سے بندے والا معاملہ کیا اس کے ساتھ۔ سب کچھ لے کر بھی دور ہو گئی اس سے۔“

اماں نے آٹا گوندھتے ہوئے جیسے ہنس کر کہا تھا۔ وہ بول نہیں سکی تھی۔ بولنے کے لیے کچھ تھا نہیں۔ پلکیں جھپکے بغیر وہ صرف اماں کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”تجھے یہ ڈر بھی نہیں لگا کہ کوئی دوسری عورت لے آئے گا وہ؟“

”نہیں۔“ اس بار آٹا گوندھتے اماں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

”تجھے پیار نہیں ہے اس سے؟“ کیا سوال آیا تھا! وہ نظریں چرا گئی۔ اس کی چپ نے اماں کو جیسے ایک اور سوال دیا۔

”کبھی پیار کیا ہے؟“ آنکھوں میں سیلاب آیا تھا۔ کیا کیا یاد نہیں آ گیا تھا۔

”کیا تھا۔“ اس نے آنسوؤں کو بننے دیا تھا۔

”پھر کیا ہوا؟“ اماں نے اس کے آنسوؤں کو نظر انداز کر دیا تھا۔

”نہیں ملا۔“ سر جھکائے اس نے آگ میں کچھ اور لکڑیاں ڈالیں۔
 ”ملا نہیں یا اس نے چھوڑ دیا؟“ اس کے منہ میں جیسے ہرے مرچ آئی تھی۔
 ”اس نے چھوڑ دیا۔“ پتا نہیں ساگ ہانڈی میں زیادہ پانی چھوڑ رہا تھا۔ یا اس کی آنکھیں پر آگ دونوں جگہ تھی۔

”پیار نہیں کرتا ہوگا۔“ اماں نے بے ساختہ کہا۔
 ”پیار کرتا تھا لیکن انتظار نہیں کر سکتا تھا۔“ اس نے پتا نہیں کیوں اس کی طرف سے صفائی دی تھی۔
 ”جو پیار کرتا ہے وہ انتظار کرتا ہے۔“ جواب کھٹاک سے آیا تھا اور اس کی ساری وضاحتوں، دلیلوں کے پر نچے اڑا گیا تھا۔ وہ روتے ہوئے ہنسی تھی یا پھر شاید ہنستے ہوئے روئی تھی۔ کیا سمجھا دیا تھا اس عورت نے جو دل داغ کبھی سمجھا نہیں سکے تھے اسے۔

”اس آدمی کی وجہ سے گھر چھوڑ آئی اپنا؟“ اماں نے پھر پوچھا۔
 ”نہیں۔۔۔ بس وہاں بے سکونی تھی مجھے اس لیے آگئی۔“ اس نے بھیگے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔
 ”کیا بے سکونی تھی؟“ وہ برستی آنکھوں کے ساتھ بتاتی گئی۔

اماں چپ چاپ آٹا گوندھتی رہی اس کے خاموش ہونے پر بھی اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ خاموشی کا وہ وقفہ بڑا طویل ہو گیا تھا۔ بے حد طویل اماں آٹا گوندھنے کے بعد رکھ کر ساگ میں ڈوئی چلانے لگی تھی۔ وہ ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹے ساگ کو گھلتے دیکھتی رہی۔
 ”وہاں نہر کے کنارے کیوں کھڑی تھی؟“ اماں نے یک دم ساگ گھونٹتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس نے سر اٹھا کر اماں کو دیکھا۔

”بہت بزدل ہوں اماں۔۔۔ مرنے کے لیے نہیں کھڑی تھی۔“
 نم آنکھوں کے ساتھ اس نے جیسے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اس بوڑھی عورت سے پوچھا تھا اسے جیسے اب سمجھ میں آیا تھا وہ وہاں سے اسے یہاں تک کیوں لے آئی تھی۔ اس کے ہنسنے پر جیسے وہ بھی مسکرائی تھی اس کے خستہ حال بوسیدہ دانت دکھے تھے۔

”یعنی تو تو بڑی بہادر ہے۔ میں نے بزدل سمجھا۔ تو تو میرے سے بھی بہادر ہے پھر۔“
 ”نہیں آپ سے بہادر تو نہیں ہوں میں میں تو بے حد کمزور ہوں۔ اس بکری سے بھی کمزور جس کو گھیر کے لائی ہوں۔“ اماں نے کہا تھا۔
 ”تجھے اپنی ہونے والی اولاد کا بھی خیال نہیں آتا؟ پیار نہیں آتا اس پر؟“ اس کی آنکھیں ایک بار پھر برسنے لگی تھیں۔

”کوئی اس طرح گھر آدمی چھوڑتا ہے جیسے تو چھوڑ آئی۔ مرجاتے ہیں بڑے بڑے پیارے مرجاتے ہیں پر کوئی ایک پیارے کے مرنے پر باقیوں کو چھوڑ دیتا ہے؟“
 برستی آنکھوں کے ساتھ اماں نے اس کی باتیں سنیں وہ وہی کچھ کہہ رہی تھی جو اس سے کوئی بھی پوچھتا کوئی بھی کہہ دیتا مگر وہ کسی کو وہ جواب نہیں دیتی تھی جو اس نے اس وقت اس عورت کو دیا تھا جس سے اس کی جان پہچان تک نہ تھی۔ بعض دفعہ انسان دل کا وہ بوجھ جو اپنوں کے سامنے بلکا نہیں کرتا غیروں کے سامنے کر دیتا ہے۔ وہ تبھی وہاں جہاں اسے یقین ہو وہ راز دیا رہے گا۔ کبھی نکل کر نہیں آئے گا۔
 ”میں اب کسی سے پیار نہیں کرنا چاہتی اماں۔“

بوڑھی عورت نے ساگ کا ڈھلکا اٹھا کر پھر ڈوئی چلائی۔
 ”مجھے لگتا ہے جس سے بھی میں پیار کرتی ہوں وہ مجھ سے چھن جاتا ہے۔ وہ چیز میرے پاس نہیں رہتی۔ تو پھر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کیوں اس تکلیف سے گزروں میں بار بار کیوں میں زندگی میں ایسے رشتے رکھوں جن سے پھڑنا مجھے اتنی تکلیف دے۔“

اس نے جیسے روتے ہوئے اس بوڑھی عورت کے سامنے سینے کی وہ پھانس نکالی تھی جس نے اس کا سانس روک رکھا تھا۔

”بار بار پیار کروں۔ بار بار گنوا دوں۔ میں اب اس تکلیف سے نہیں گزر سکتی۔“

وہ روئی جا رہی تھی۔ آنسو یوں نکل رہے تھے جیسے آبلوں کا پانی پتا نہیں بوڑھی عورت کی آنکھوں میں ساگ کی بھاپ نے پانی چھوڑا تھا یا اس کے درونے لیکن اس نے بھی اپنی خستہ حال میلی کچیلی چادر کے پلو سے اپنی آنکھیں رگڑنا شروع کر دی تھیں۔

”یہ تو نہیں کر سکتی یہ کوئی انسان بھی نہیں کر سکتا کہ اپنوں کو اس لیے چھوڑ دے تاکہ ان کے پھڑنے کی تکلیف سے بچ جائے ایک ایک کر کے پھڑرہے ہیں تو درد جھیل نہیں پارہی۔ سب کو اکٹھا چھوڑ کر درد جھیل لے گی؟“ اس نے جوابات اس سے پوچھی تھی اس کا جواب امامہ کے پاس نہیں تھا۔ اور اگر تھا بھی تو وہ اس جواب کو دہرانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

”اس جھگی کے اندر میرا 38 سال کا جوان بیٹا ہے۔ ٹھہرو ذرا میں لے کر آتی ہوں اسے تمہاری باتوں میں تو بھول ہی گئی تھی میں اسے۔“

وہ بوڑھی عورت یک دم اٹھ کر اندر چلی گئی تھی چند منٹوں کے بعد وہ ایک ریڑھی نماڑالی کو دھکیلاتی ہوئی باہر لائی جس میں ایک دیلا پتلا مرد ایک بستر پر لیٹا ہوا قہقہے لگا رہا تھا یوں جیسے وہ ماں کی توجہ ملنے پر خوش تھا۔ اس عورت نے اگر اسے یہ نہ بتایا ہوتا کہ اس کی عمر 38 سال تھی تو امامہ اسے 20-18 سال کا کوئی لڑکا سمجھتی۔ وہ ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے معذور تھا۔ بات بھی ٹھیک سے نہیں کر پاتا تھا بس اس بوڑھی عورت کو دیکھ کر نستا تھا اور وہ اسے دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

اس نے ریڑھی لا کر امامہ کے قریب کھڑی کر دی تھی اور خود روٹی پکانے بیٹھ گئی تھی۔

”میرا اکلوتا بیٹا ہے یہ۔ 38 سال میں نے اس کے سہارے گزارے ہیں اللہ کے سہارے کے بعد۔“ وہ پیڑا بناتے ہوئے اسے بتانے لگی تھی۔ ”کوئی اور اولاد نہیں آپ کی؟“ اس کے آنسو تھمنے لگے تھے۔

”پانچ بیٹے پیدا ہوئے تھے سب صحت مند۔ پر دنوں میں حتم ہو گئے پھر یہ پیدا ہوا تو شوہر نے کہا اسے کسی درگاہ پر چھوڑ آتے ہیں میں نہیں پال سکتا ایسی اولاد کو۔ بڑی ذمہ داری ہے پر میں کیسے چھوڑ دیتی اپنی اولاد۔ مجھے تو پیار ہی بڑا تھا اس سے۔“

بوڑھی عورت نے روئی اب اس توے پر ڈال دی تھی جس سے کچھ دیر پہلے اس نے ساگ کی ہڈیا اتاری تھی۔ وہ اب اپنے بیٹے کو یوں پکھا رہی تھی جیسے وہ اڑتیس سال کا نہیں آٹھ ماہ کا تھا اور وہ بھی اس ریڑھی کے اندر ماں کے پکھارنے پر اپنے نجیف، نزار اعضا کو اسی طرح سکیر رہا تھا کھلکھلاتے ہوئے جیسے واقعی کوئی تھا بچہ تھا۔

”شوہر دو چار سال سمجھاتا رہا مجھے پر میں نہیں مانی۔ اللہ نے دی تھی اولاد۔ اللہ کی دی چیز کیسے پھینک آئی۔

انسان کی دی ہوئی چیز ہوتی تو پھینک آئی۔ کوئی اور بچہ نہیں ہوا اس کے بعد میرے ہاں۔ شوہر کو بڑا پیار تھا مجھ سے پر اسے اولاد بھی چاہیے تھی۔ میرا بھی دل چاہتا تھا خود ہی نکل آوں اس کی زندگی سے۔ پر میرے آگے پیچھے کوئی

نہیں تھا اس لیے وہیں بیٹھی رہی دو سری شادی سے دس دن پہلے کھیتوں میں اسے سانپ لڑ گیا۔ لوگ کہتے تھے میری آہ پڑی ہے۔ پر میں نے تو کوئی بد دعا کبھی نہیں دی اس کو۔ میں تو خوش ہی رہی جب تک اس کے ساتھ رہی۔“

اماں کی آنکھوں میں پانی آیا تھا پر وہ دوپٹے سے رگڑ کر۔ توے پر پھولتی ہوئی روٹی سینکنے لگی۔

”وہ مرگیا تو ساری زمین جائید اور شتہ واروں نے چھین لی۔ بس بیٹا میرے پاس رہنے دیا۔ یہ ٹھیک ہوتا تو یہ بھی چھین لیتے وہ۔ پر مولا کا گرم تھا یہ ایسا تھا۔ اڑتیس سال سے اس کا اور میرا ساتھ ہے اس کو شوہر کے کہنے پر درگاہ پر چھوڑ آئی ہوتی تو میرا کیا ہوتا۔“

اماں نے روئی عجیب خوشی اور سرشاری کے عالم میں اس کے سامنے رکھی تھی۔ کوئی بوجھ تھا جو امامہ کے کندھوں سے ہٹ رہا تھا کوئی نفل تھا جو کھل رہا تھا کوئی سحر تھا جو ٹوٹ رہا تھا۔

”جو وہ چھوڑا اللہ دے اس پر صبر کر اور خود کسی کو وہ چھوڑا نہ دے۔ اللہ پسند نہیں کرتا یہ۔“ اس عورت نے روئی پر ساگ ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

”عم بہت بڑا تھا میرا اماں۔“ اس نے کہے بغیر سر جھکائے پہلا لقمہ توڑا۔

”اللہ نے تجھے غم دیا تو نے اپنے آدمی کو۔ تو نے اپنا غم کون سا اپنے اندر رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔“

وہ لقمہ ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی منہ میں نہیں ڈال سکی آنکھیں پھر دھندلائی تھیں۔ اسے سالار یاد آیا تھا۔ ہاتھ پر اس کا محبت بھرا لمس یاد آیا تھا۔ اسکی محبت اس کی عنایات یاد آئی تھیں۔ اور اس اولاد کا خیال آیا تھا جسے اس نے بھی بڑی دعا میں کر کے مانگا تھا اور جب دعا پوری ہو گئی تھی تو وہ کسی بھی چیز کی قدر نہیں کر رہی تھی۔

اس بوڑھی عورت کے احاطے میں بیٹھے اسے پہلی بار وہ سیم پر صبر آیا تھا۔ سعد پر صبر آیا تھا وہ اس دن وہاں سے اٹھ کر بھاگی تھی۔ اسے اب گھر جانا تھا سالار کے پاس اور واپس گھر آکر اس نے خود سالار کو فون کر کے واپس آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ حیران ہوا تھا شاید حیران سے زیادہ پریشان ہوا تھا مگر اس نے اس کی ٹکٹ کنفرم کروادی تھی۔

وہ جانے سے پہلے ایک بار پھر اس بوڑھی عورت سے ملنے آئی تھی اس کے لیے کچھ چیزیں لے کر اسے بے حد کوشش کے باوجود وہ جھکی نہیں ملی تھی۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ آدھا دن نہر کے اس کنارے اس جھکیوں والے علاقے کو ڈھونڈتی رہی تھی۔ ڈرائیور نے وہ علاقہ خود نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ اس دن وہ اسے بہت پیچھے چھوڑ کے نہر کنارے اتری تھی اور پھر وہاں سے پیدل ہی واپس آئی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ جگہ وہیں ہونی چاہیے تھی۔ اسی سڑک پر کہیں۔ مگر وہاں وہ جھکیاں نہیں تھیں نہ وہ بوڑھی عورت جس کے ہاتھ کی روئی اور ساگ کا سوا دا سے ابھی بھی اپنی زبان پر محسوس ہوتا تھا۔ نہ وہ اڑتیس سال کی اولاد کی مشقت جس نے اس بوڑھی عورت کے لیے ہر بوجھ بٹکا کر دیا تھا۔ اور نہ اس بہت زیادہ پڑھی لکھی عورت کی باتیں جس نے چاہیوں کی طرح اس کے وجود کے نفل اور گتھیاں کھول کر اسے آزاد کیا تھا۔

جبریل سکندر اپنی پیدائش سے بھی پہلے اپنی ماں کے بہت سے رازوں کا امین تھا۔

امریکہ کے اس اسپتال کی نیورو سرجری ڈیپارٹمنٹ کے آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹر جس شخص کا دماغ کھولے بیٹھے تھے۔ وہ آبادی کے اس 2.5 فیصد سے تعلق رکھتا جو 150 آئی کیولول رکھتے تھے اور اس آئی کیولول کے ساتھ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔

وہ آپریشن آٹھ گھنٹے سے ہو رہا تھا اور ابھی مزید کتنی دیر جاری رہنا تھا یہ کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر کی اس ٹیم کو لیڈ کرنے والا ڈاکٹر دنیا کے قابل ترین سرجن میں سے ایک مانا جاتا تھا۔ آپریشن تھیٹر سے منسلک ایک کلاس روم میں نیورو سرجری کے ایڈپرنس اس وقت جیسے سحرزدہ معمول کی طرح اس ڈاکٹر کے چلتے ہوئے ہاتھوں کو بڑی اسکرین پر دیکھ رہے تھے جو اس کھلے ہوئے دماغ پر یوں کام کر رہا تھا جیسے کوئی پھانسی کی انگلیاں ایک پانوپر، وہ اپنی مہارت سے سب کو مسماوتز کیے ہوئے تھا سوائے اس ایک شخص کے جس کی زندگی اور موت اس وقت اس کے ہاتھ میں تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں ان شاء اللہ)

مجھے اس کی باتیں عجیب لگتی تھیں۔ بہت گہری اور ابھی ہوئی۔ سمجھنے کے لیے ذہن پر زور دینا پڑتا تھا۔ بہت قابل سمجھتی تھی خود کو ہر کسی پر اپنی قابلیت کا رعب ڈالتی تھی۔ معلومات کافی وسیع تھیں۔ کس شہر کی کیا چیز مشہور ہے۔ کس صوبے کی کیا تاریخ اور کیسی معاشرت اور رسوم ہیں۔ بلکہ ایشیا خصوصاً اسلامی ممالک کی تاریخ بھی ازبر تھی۔

افوہ... میں تو اس سے متاثر ہو گیا۔ کیونکہ تاریخ سے مجھے دلچسپی نہ تھی اور ماموں خود بھی تاریخ کے رسیا۔ انہوں نے بیٹی کو بھی گھٹی میں دنیا کی تاریخ گھول کر پلا دی تھی۔ میں اس سے مرعوب ہو گیا۔ خود کو اس سے کمتر سمجھنے لگا۔ کافی عرصہ میں ماموں کے گھر نہیں گیا تھا۔ ای چاہتی تھیں۔ میں ماموں سے رابطہ تعلق

وہ خاصی چڑچڑی اور بد لحاظ ہو گئی تھی۔ ہر بات کا الٹا جواب دے کر سوال کرنے والے کو شرمندہ کر دیتی۔ مگر امی اسے فوراً دلاسا دے کر بہلا لیتیں۔ مجھے اس کی حرکتیں بری لگ رہی تھیں۔ امی میری ناگواری دیکھ کر چپکے سے کہتیں۔

”بے ماں کی ہو گئی ہے۔ اس لیے اپنا دکھ ظاہر کرتی ہے۔ کوئی بھائی بہن بھی نہیں جو اسے تسلی دیں۔“

”آپ آتو گئی ہیں تسلی دینے۔ کیا یہ کافی نہیں اور بہن بھائی کے نہ ہونے یا ماں کی فوتگی اللہ کی رضا سے ہے۔ دوسروں کو شرمندہ کرنے کا اسے کیا حق ہے۔“

اس دن امی نے اس سے کہا۔ ”تمہاری ماں بہت سلیقہ مند اور منتظم خاتون تھیں۔ دیکھو گھر کی سالی لاش کر رہا ہے۔ سجا بنا۔ بس جو چیز جہاں ہے۔ اسے اسی

آسیہ رزاقی



رکھوں۔ مگر ان کی قابل لائق بیٹی۔ جسے اکلوتا ہونے کا شرف حاصل تھا۔ یعنی اکلوتی واحد اولاد۔ افوہ! ہیرے موتی جڑی۔ چڑی ہو گئی اس کی قابلیت سے۔

پھر عرصہ بعد۔ ممالی کی وفات پر امی کے ساتھ جانا پڑا۔

ماموں بے حد افسردہ تھے۔ بہت اچھی منتظم محبت کرنے والی بیگم تھیں۔ سماں بھی بہت بکھری بکھری اداس مغمزہ تھی۔ چہرہ آنسوؤں میں بھیگا بھیگا رہتا۔ لال آنکھیں ہونٹ بسورنے کو ہر دم تیار۔ امی نے اسے اپنی شفقت بانہوں میں لے کر پیار کیا۔ اس کے ساتھ رو میں۔ سمجھاتی رہیں۔ انہیں اس پر بہت پیار آ رہا تھا۔

طرح سے رکھنا۔ تاکہ تمہارے باپ کو کسی کمی کا احساس نہ ہو۔ پہلے ہی وہ غم زدہ ہے۔

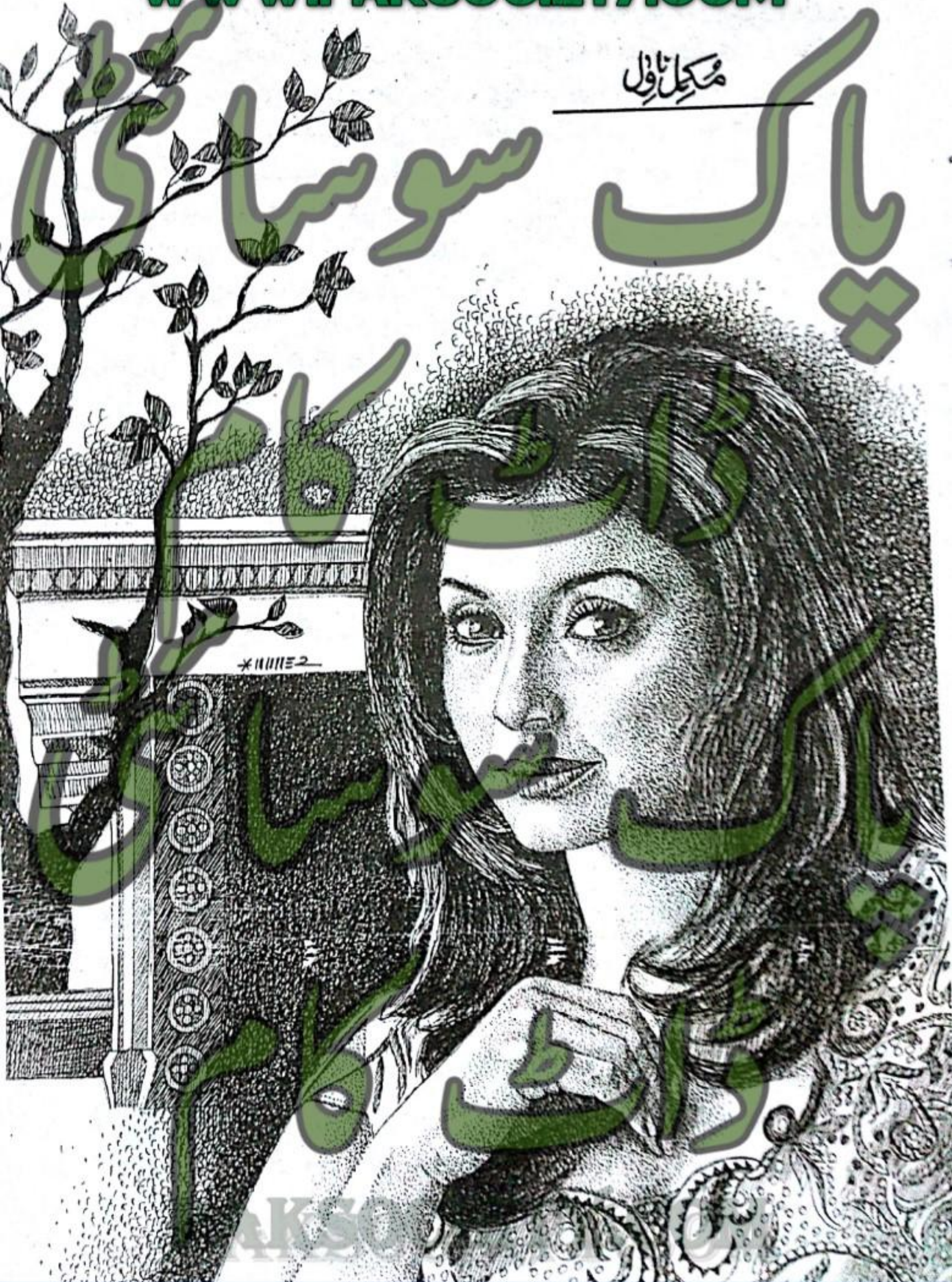
”یعنی۔ ابو امی کو فوراً بھول جائیں۔ یہ چاہتی ہیں آپ۔“ وہ بگڑ کر بولی۔ آنکھیں مزید لال۔

”وہ بھولنے والی ہستی نہیں تھی بیٹا۔ میرا مطلب ہے۔ احد کو گھر اسی طرح نظر آئے جیسے روحانہ کی زندگی میں تھا۔ احد کی محسوس کرے کہ وہ یہیں ہے۔ جدا نہیں ہوئی۔ اس کی سجاویں ہوتی چیزیں اپنی جگہ موجود ہیں۔ جہاں اس نے جو چیز رکھی ہے وہیں ہے۔ احد کو اس سے تسلی ہوگی۔“

”لیکن میں تو چاہتی ہوں ہر چیز گڑبڑ ہو جائے۔“ وہ کچھ سوچ کر بولی ”تاکہ ابو کو امی کی کمی محسوس ہوتی

WWW.PAKSOCIETY.COM

مکتبہ ناول



رہی ہے۔ سمجھ دار ہے۔ میں بھی دکھتا رہوں گا۔
 ”سماں سمجھ دار ہے؟“ مجھے ہنسی آگئی۔ جھکی ڈرامہ باز۔ ہم واپس آگئے اور کافی عرصہ میں تو پنڈی گیا ہی نہیں۔ کبھی کبھار امی ابا چلے جاتے۔ میں نے پوچھا بھی نہیں کہ ماموں کی بیٹی نے اب اور کون سا بہروپ اختیار کیا۔



پھر کافی دن امی بھی نہیں جاسکیں۔ اور ایک دن خبر آئی۔ ماموں نے شادی کر لی۔ جس نے سنا حیرت ظاہر کی۔ یعنی مرحومہ بیوی کی یادوں کو دماغ سے نکال دیا۔ شاید دل سے بھی۔ اور اب۔ وہ پگلوب۔ جھکی لڑکی کسی طرح باپ کو ماں کی محبت کا احساس دلاتی ہوگی۔ امی بہت پریشان تھیں۔ انہیں شکوہ تھا کہ نہ بھائی نے اطلاع دی نہ بیٹی نے۔ کس سے شادی ہوئی۔ کون ہے؟ کیا ہے؟ اتنی رازداری!!

ابا کی بیماری اس کے بعد یک بیک فوننگی کی وجہ سے امی جاسکیں نہ میں۔ ماموں کو فون کیا۔ تو وہ مری بھورن کی سیر کو چلے گئے تھے۔ ہیں؟ ہنی مون۔ بڑھے منہ مہاسے۔ لوگ چلے تماشے۔ ارررے۔ ہنسی آنے لگی۔ وہ جھکی لڑکی موجود تھی بمع اپنی نستعلیق بوا کے۔ بوا ہی لقمے دیتی رہیں۔

”کہہ دو گئے ہیں کہیں کام سے۔ ارے بھئی ہمیں کیا علم کس سے شادی کی۔ کہہ دو ایک ہفتہ بعد فون کریں اور ہاں بتا دو۔ کہ تم پڑھائی میں مصروف ہو۔ فون سننے کی فرصت نہیں۔“

بوا بولتی رہیں وہ دہراتی رہی۔ اس کے علاوہ۔ اوں۔ آں کے گونگے اشارے توبہ۔ امی نے خود بوا سے بات کی ہو تو پتا نہیں پھر۔ وقت تھوڑا اور گزرا۔ اجو بھیا کاٹرا سفر پشاور ہو گیا۔ وہ بھابھی کو لے کر چلے گئے۔ امی کو اب بے چینی شروع ہو گئی۔ ایک تو ماموں نے ایا کے انتقال کے بعد بھی یہاں آنے کی زحمت نہ کی تھی۔ مری سے آکر فون کر لیا اور کوئی مجبوری بیان کر دی۔ فون تو کئی بار آئے مگر بیگم کے سوال پر کچھ

رہے۔ وہ ایک منٹ کو بھی امی کی یاد سے غافل نہ ہوں۔ اگر سب کچھ پہلے جیسا رہا تو قدر ہی نہیں ہوگی امی کی۔ (جھکی نہ ہو تو فضول لڑکی) امی چپ ہو گئیں۔ مگر وقتاً فوقتاً سمجھانے میں کمی نہ کی۔ سخت زہر لگتی تھی مجھے اس کی فضول گوئی اور فضول حرکتیں۔ ماموں کی موجودگی میں کوئی برتن اس کے ہاتھ گر جاتا۔ چھتا کے کے ساتھ اس کی ہائے ہائے۔ کبھی میز پر رکھی فروٹ کی پلیٹ نیچے جا پڑتی۔ خود ہی گرائی خود ہی واویلا کرتی۔ اچھی بھلی چائے کی پیالی میز پر الٹ جاتی۔ چائے میز پر پھیل جاتی اور یہ چوروں جیسی شکل بنائے انگلیاں مروڑ رہی ہوتی۔ امی اور ماموں کی تسلیاں۔ اف! تبھی غم سے لبریز آواز کو مزید موٹی کر کے کہتی۔

”ہائے۔۔۔ اف۔۔۔ امی کو یہ واٹریٹ کتنا پسند تھا۔ گلاس میرے ہاتھ سے پھسل گیا۔ اللہ جی۔۔۔ امی ہو تیں تو ابھی مجھ کو تھپڑ مار تیں اور کہتیں۔ لڑکی کے ہاتھ میں سوراخ ہیں کیا۔ ہائے امی۔ کل پلیٹ بھی میرے ہاتھ سے پھسل کر گر گئی۔ سچ امی مجھے بہت ڈانٹتیں۔ اب بھلا کون ہے جو مجھے ڈانٹے مارے۔ میں تو مری جاتی تو اچھا ہوتا۔“

ماموں فوراً ”اٹھ کر اسے گلے لگاتے پیار کرتے۔ یا باتیں کرتے کرتے اٹھ کر باہر چلے جاتے۔ مجھے اس کی بناوٹی ایکٹنگ پر غصہ آتا تھا۔ مکار لڑکی۔ امی نے اس کے اسکول جانے کے بعد ماموں سے بات کی۔ کہ اب کس طرح گھر چلاؤ گے۔ لڑکی تو گھر سنبھالنے کے قابل نہیں۔ سوچتی ہوں۔ میں رہ جاؤں۔ کچھ دن اسے سنبھالنے میں لگیں گے۔ میری وجہ سے اسے اپنی تنہائی کا احساس نہ ہو گا۔ نوکروں کو بھی سمجھانا ہے۔ تم کیسے پنٹو گے۔ ان معاملات سے۔ مگر ماموں نے انہیں اطمینان دلا دیا۔

”آیا! آپ کب تک اپنا گھریا چھوڑ کر رہ سکتی ہیں نوکروں کو سمجھا دیں۔ ویسے تو سب برانے ہی ہیں۔ بوا موجود ہیں۔ سماں کی دیکھ بھال کر لیں گی۔ اب وہ بڑی ہو

ہچکچاتے رہے بتایا نہیں کہ کس پر یہ چہرہ کوان کی بیگم بننے کا شرف نصیب ہوا ہے۔

امی مجھے لے کر پنڈی پہنچیں۔ ماموں گیٹ پر ہی مل گئے۔ بہت فٹ فٹ۔ چاق چوبند۔ اندر ممانی سے تعارف ہوا۔ نئی ممانی۔ خاصی مایوسی ہوئی۔ کافی عمر کی کچھ زیادہ ہی صحت مند۔ سانولی اور۔۔۔ بھدی روحانہ مامی کے برعکس خیر مجھے کیا۔

امی کا موڈ خراب تھا۔ ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ کچھ عام سے روایتی جملوں کے بعد انہوں نے یعنی ممانی نے با آواز بلند پکارا۔

”سا۔ اوسماں۔ ارے بھئی تمہاری پھوپھی آئی ہیں۔ کچھ چائے پانی بھی لے آؤ۔ ذرا جلدی۔“

پھر امی سے مخاطب ہوئیں ”آپا! پتا نہیں کس قسم کی لڑکی ہے۔ میں مہینوں سے اس کی تربیت کر رہی ہوں۔ مگر پتا نہیں کیا مزاج لائی ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ آتا ہی نہیں۔ نہ جانے کن خیالوں میں گم رہتی ہے۔ آپا! آپ ہی سمجھائیں۔ گھر میں گھر کی لڑکی کی طرح رہنا سیکھے مہمان نہ بنی رہے۔“

منہ بگاڑ کر بڑی بے تکلفی سے کہہ رہی تھیں۔ نہ جانے گھر کی لڑکی سے کیا مراد تھی؟

چند منٹ بعد وہ مہمان لڑکی اندر آئی اور امی سے لپٹ گئی۔ امی نے اسے پاس بٹھالیا۔ بجھی بجھی سی تھی۔ سر نیچا کیے امی سے کچھ کہہ رہی تھی۔ کہ نئی اماں جان نے اپنی کراری گڑکتی ہوئی آواز میں کہا۔

”لو آگئیں اور جو میں نے کہا تھا کہ کچھ چائے پانی لے آؤ۔ اس کا ذکر ہی نہیں۔ لڑکی! میری کوئی بات کبھی تو مان لیا کرو۔“

وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ تو امی نے ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔ اور ترشی سے بولیں۔

”رہنے دو میں چائے پینے نہیں۔ کئی دن رہنے کے لیے آئی ہوں۔ جب جس چیز کا دل چاہے گا۔ مانگ لوں گی۔ مہمان نہیں ہوں۔ تم بیٹھو میرے پاس۔ ہاں اب کس کلج میں ہو؟“

ممانی نے ماموں کو بلایا۔ ہم سب کھانے کے لیے کمرے میں آئے۔ ہم بیٹھ گئے تو سماں گرم گرم روٹیاں لے کر آئی۔ امی نے پیار سے کہا۔

”اوسماں۔ روٹی خانساں لے آئے گا۔ تم کھانا کھاؤ۔“

اس نے گردن جھکا کر کچھ من من کی۔ ممانی نے کرختگی سے ترجمانی کی۔

”آپا! اسے گرم روٹی لانے دیں۔ یہ بعد میں کھالے گی۔“ امی کی تیوری پر مل آگئے۔

”کیوں یہ روٹی کیوں لا رہی ہے؟ خانساں لے آئے گا۔ کیا یہ نوکر ہے کہ بعد میں کھالے گی۔ اور یہ بوا کدھر ہیں۔ نظر نہیں آرہیں۔ کب سے آئی بیٹھی ہوں۔“

”وہ۔۔۔ آپا بہت ضعیف ہو گئی تھیں تو اس لیے ہم

ہستی پلاٹنگ

شہ بخاری

قیمت - 300 روپے

کتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار گراہنی - فون نمبر: 32735021

نے انہیں فارغ کر دیا۔
 ماموں نے کچھ فحاشات سے کہا تو امی جیسے چونک گئیں۔ ہاتھ میں لیا ہوا چھوٹا میز پر رکھ دیا۔
 ”کیوں بھئی اتنی پرانی۔ سماں کے پیدا ہونے سے پہلے کی آئی ہوئی۔ روحانہ کی کس قدر خدمت اس نے کی۔ اس خدمت کا سماں کو پالنے کا یہ صلہ دیا اسے؟ ارے اس بوڑھی کو دو روٹیاں نہیں کھلا سکتے تھے تم؟“
 امی نے ایک ہاتھ سے سر تھام لیا تھا۔

”یہ اس وفادار شریف و وضع دار اور اعلا طرف عورت کو انعام دیا گیا۔ ساری جوانی جس نے تمہارے دروازے پر گزار دی۔ روحانہ کے بعد گھر کا انتظام سنبھالے رکھا۔ کوئی طلب نہ تقاضا خود دار اتنی کہ اپنے دکھ بیماری میں خود علاج کرتی۔ اپنی تنخواہ سے کپڑے بناتی ہر ضرورت خود پوری کی۔ کبھی تم سے سہولت نہیں مانگی۔ احمق! اتنے کم طرف اور خصیص کب سے ہو گئے تم۔ شادی کیا کر لی۔ اپنی فطرت ہی بدل لی اچھا اور وہ خانسلاں بھی کیا بوڑھا ہو گیا تھا۔ کدھر ہے؟“

”وہ۔۔۔ آپا! یہ سماں روٹی بنانا سیکھ رہی ہے تو سوچا اچھا ہے سیکھ لے۔“

”ہمارے گھرانے کی تو کوئی لڑکی۔ خانسلاں مردوٹے سے روٹی بنانا نہیں سیکھتی۔ تم نے نیا قانون بنا لیا۔ خود بناتیں تو وہ سیکھ لیتی۔“

”نہیں آپا۔ خانسلاں نہیں۔ عورت ہے۔ اس کے ہاتھ کی روٹی آپ کے بھائی کو پسند نہیں۔ اس لیے سماں نے کہا۔ کہ وہ روٹی پکالے گی۔“

مولانی چڑچڑناگوار انداز میں بولی چباتے ہوئے کہنے لگیں۔ امی کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے کھانا شروع ہی نہیں کیا تھا۔ ماموں بھی پلیٹ پر نظرس جمائے بیٹھے تھے۔ ممانی مگر سماں کی لائی ہوئی دو عدد گرم روٹیاں کھا چکی تھیں۔ اب بولی اور ہڈی سے نبو آنا تھیں۔

”اچھا۔ میں دیکھتی ہوں۔“ امی نے کہا اور کرسی کھسکائی۔ ماموں نے اشارہ کیا۔ ممانی نے امی سے کہا۔

”ارے ارے آپا! آپ کہاں چلیں۔ کھانا تو

کھالیں۔ گرم روٹی۔“
 ”میں سہمی کے ساتھ کھالوں گی بعد میں ہم کھاؤ۔“
 کہہ کر وہ باہر نکل گئیں۔
 میں نے ماموں کے اشارے پر سالن نکالا اور کھانا شروع کر دیا۔ امی دو روٹیاں لے کر آئیں۔ میز پر رکھ کر جانے لگیں۔ ممانی نے کہا۔
 ”آپا! وہ گھر کی لڑکی ہے۔ اسے کرنے دیں۔ آپ کیوں تھک رہی ہیں۔ آپ سفر کر کے آئی ہیں۔ مہمان ہیں۔ بڑی بہن۔“

”میں کہہ چکی ہوں۔ میں مہمان نہیں ہوں۔ میں روٹی پکا رہی ہوں۔ تم لوگ کھاؤ۔ ویسے بھی تم نے ابھی کھا تھا کہ سماں۔ مہمان بنی رہتی ہے۔ یہی کہا تھا ناں تم نے تو مہمان سے روٹی پکوانے کا شاید تمہارے گھرانے کا رواج ہو گا۔“

اسی وقت سماں روٹی لے کر آئی۔ امی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”چلو بیٹھو۔ اب تم میرا ساتھ دو۔ گوہر کھا چکی ہے۔ باقی روٹیاں وہ پکالے گی۔“ ماموں نے امی کو بتایا۔
 ”آپا! آپ کو بہت فکر تھی سماں کی۔ اب اس نے سب کچھ سیکھ لیا ہے۔ کھانا پکانا اور سلائی وغیرہ۔“

فخریہ انداز تھا۔ امی نے چڑکر ان کا چہرہ دیکھا۔
 ”اچھا! اسے اسی لیے کالج سے اٹھالیا پڑھائی ختم کر دی کہ یہ نوکروں والے کام کرے۔“

ماموں کس کسسا کر بولے۔ ”آپا! اپنے گھر کے کام کر کے کوئی نوکر بن جاتا ہے؟“

”جن کے ماں باپ باحیثیت ہوں اور ان کی اولاد ذہین اور پڑھنے کی شوقین ہو۔ ان کی تعلیم بہ جبر ختم کروا کے۔ خانسلاں کو ہٹا کے، پرانے نوکروں کی چھانسی کر کے۔۔۔ خرچ تو بچا لیا۔ بیٹی کو کچن کے حوالے کر دیا۔ کتنی بچت ہوئی ہوگی احمق! بہت کفایت شعار ہو گئے ہو۔ اب اور کتنی بچت کی اسکیم ہے۔؟“ سماں کا سر نیچے جھکتا چلا گیا۔

”بچت؟ آپا۔ بچت کیسی؟ سماں میری بیٹی ہے۔ اس پر جبر کیوں کروں گا میں۔ اس کا دل پڑھائی سے اچھا

ہو گیا تھا۔ بس۔“ ماموں اندر ہی اندر تلملارہے ہوں گے۔

”اگر بیٹی سمجھتے تو اس سے ایک بار پوچھ لیتے وہ بڑھنا چاہتی ہے یا گھر بیٹھنا۔ اگر اس کا دل اچھا ہو گیا تھا تو ٹیوشن رکھ کر زبردستی پڑھاتے۔ آج کل تو لڑکیوں کی تعلیم پر بہت توجہ دی جاتی ہے سماں کی تو ماں بھی ایم اے پاس تھی۔ جب گوہر کے ذمے بچی کی تربیت ہوگی۔ تو جو اس نے خود کیا ہے زندگی بھر وہی تو اسے سکھائے گی۔ ظاہر ہے کچن سنبھالنا۔ روٹیاں تھوپنا برتن دھونا۔“

ممائی روٹیاں لے آئی تھیں اور انہوں نے سب سن لیا تھا۔ مگر امی۔۔۔ دیکھ نہ سکیں۔ ممائی کے چہرے پر سیاہی دوڑ گئی تھی۔ چہرہ ناگواری کا غماز تھا۔ مگر کہا تو یہ۔۔۔

”آپا! یہ مٹر قیمہ تو چکھیں۔ میں نے خود بنایا ہے۔ کھائیے نا۔ آپ کچھ لے نہیں رہیں۔“

”لوں گی۔ ہاں ہاں لے لوں گی تمہارے ہاتھ کا پہلی پار تو نہیں کھا رہی۔ روحانہ کی زندگی میں دسیوں بار تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھایا ہے۔ نئی کون سی بات ہے۔ غلط تو نہیں کہا کچھ؟“

امی کی فطرت تو ایسی نہ تھی پتا نہیں ممائی سے کس بات کا بدلہ لے رہی تھیں۔ سماں سے تو کھایا ہی نہیں جا رہا تھا۔ امی نے اس کی پلیٹ میں قیمہ ڈالا۔

”کھاؤ بیٹا۔ گرم روٹی لو۔ قیمہ کھاؤ۔ کھانا تو ہمیشہ گوہر اچھا پکاتی تھی۔ روحانہ کو بھی پسند تھا۔ تب ہی۔۔۔“

چپ ہو گئیں۔

خود گو مزید کچھ کہنے سے روک لیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر امی نے ماموں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اچھا میں کل سماں کو لے کر کالج جاؤں گی۔ مس پروین سے بات کرتی ہوں۔ اپنی تعلیم مکمل کرو بیٹا۔“

اب سماں سے مخاطب ہوئیں۔

”کیا میں۔۔۔ پھپھو اب کیا ضرورت ہے۔“ وہ منمنا رہی تھی۔

”تمہیں ضرورت نہ ہوگی۔ ہمیں تو ہے۔ میں تمہیں خاندان کی دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں جاہل

دیکھنا پسند نہیں کروں گی۔ تمہیں احساس ہے کہ اب مقابلے کا دور ہے۔ تعلیم ہی انسان کو عروج پر پہنچاتی ہے۔ تعلیم ہی زندگی کے مقاصد سے آگہی دیتی ہے۔ تعلیم ہی ہے جو آدمی کو انسان بناتی ہے۔ تمہارے باپ کو تو جاہلوں کی صحبت نے بے حس بنا دیا ہے۔ ورنہ اس سے زیادہ تو تعلیم کا حامی کوئی نہیں تھا۔ بھلا بتاؤ! جس کی ماں ایم اے گولڈ میڈلسٹ ہو۔ اس کی بیٹی جاہل رہے۔ ستم ہے کہ نہیں؟ آج کل لوگ خاندان اور تعلیم کو اہمیت دیتے ہیں۔ تم تو ہمیشہ ہر کلاس میں فرسٹ آتی تھیں۔ اسپورٹس میں ‘تقریری مقابلوں میں میڈل ملتے تھے۔ اب کیا ہو گیا۔ یا تم پر بھی جاہل صحبت نے اثر ڈال دیا ہے۔ اپنی عمر کے بچوں میں سب سے زیادہ قابل تھیں تم۔“

امی کی تقریر تو ابھی جاری تھی۔ ماموں اٹھ کر چلے گئے۔ سماں بھی سٹیٹائی ہوئی سی لگی۔ ممائی کے ہاتھوں کی لرزش معاملے کی سنگینی کی خبر دے رہی تھی۔ ان کے چہرے پر مزید سیاہی پھیل گئی تھی۔ مگر وہ میں دیکھ سکتا تھا۔ امی نہیں جوش خطابت اور بھتیجی کی محبت میں انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے امی کے یہ مکالمے ڈانڈلاگ ان کا رویہ پسند نہیں آیا۔ بھتیجی ٹھیک ہے۔ بھتیجی کے مسائل سے آگہی ہے مگر دوسروں کو طنز کا شکار بنانا۔ کمرے میں آئیں تو میں نے برطانو ناگواری کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا۔

”تم کو کچھ علم نہیں۔ تم مت بولنا۔ میں اس بچی کی بھلائی کے لیے جو کچھ ہو سکا۔ کروں گی۔ ضرورت پڑی۔ تو احد کی پٹائی بھی کروں گی۔ ہاں ہاں۔“ بچپن سے ہی مجھ سے پٹا آ رہا ہے۔ اب بڑھاپے میں کیا چھوڑ دوں گی۔ بے وقوف۔“

مجھے ہنسی آئی تو امی بھی ہنس دیں۔ ”امی! ماموں بے وقوف نہیں۔ سیدھے ہیں۔“

”ہاں سیدھے ہیں۔ بلکہ ایسے عقل سے پیدل کہ کوئی بھی الو بنا دیتا ہے۔ اب اسے بھی ٹھیک کروں گی۔“

امی کے ارادے خاصے خطرناک تھے۔



سماں کی امی۔ روحانہ امی کی بچپن کی دوست کلاس فیلو اور اتفاق سے پڑوسن بھی تھیں۔ دونوں میں دوستی محبت بہت تھی۔ پھر ماموں سے ان کی شادی بھی ہو گئی۔ تعلق مزید گہرا ہو گیا۔

امی بتاتی تھیں کہ وہ بچپن میں بہت بیمار ہو گئی تھیں۔ اسکول چھٹ گیا۔ پڑھائی سے دل اچٹ گیا۔ روحانہ نے انہیں اکسایا اور زبردستی پڑھائی پر راضی کیا۔ پھر وہ دونوں ایک کلاس میں داخل ہوئیں۔ امی ان سے عمر میں بڑی تھیں۔ مگر روحانہ ممانی عقلمی میں ان سے زیادہ تھیں۔ اور تعلیم کی افادیت پر یقین رکھتی تھیں۔

امی کی شادی ہو گئی۔ وہ پڑھتی رہیں۔ ہر بار ہر کلاس میں فرسٹ آتی رہیں۔ آخر گولڈ میڈل حاصل کر لیا۔ وہ تو پی ایچ ڈی کرنا چاہتی تھیں۔ مگر والدین کو ان کی شادی کی جلدی تھی۔ ماموں اچھی پوزیشن حاصل کر چکے تھے۔ بہت خوشگوار زندگی تھی۔ خوب صورت اور خوش حال ان کی جواں مرگی کا امی کو بہت صدمہ تھا۔ مگر بچاری نئی ممانی کا اس میں کیا قصور تھا۔ جواں ان کو سار ہی تھیں اپنی ناگواری۔ ماموں کی شادی کا بھی دکھ تھا۔ حالانکہ ماموں کو ضرورت تھی گھر سنبھالنے کے لیے سماں کی دیکھ بھال کے لیے۔ بواجب تک رہیں۔ کام چلتا رہا۔



اگلی صبح وہ سماں کو لے کر کالج چلی گئیں۔ ممانی سخت مضطرب اور طیش کے عالم میں بیڑی پائی رہیں۔ ماموں آفس چلے گئے۔ میں کمرے میں لیٹا ناول پڑھتا رہا۔ پچن سے ممانی کی برتن پینے کی آوازیں آتی رہیں۔

امی آئیں تو بہت خوش تھیں۔ سماں تو سیدھی کمرے میں جا گھسی امی نے بتایا۔ داخلہ ہو گیا ہے۔ بہت آسانی سے۔ پرنسپل حیران تھیں کہ اتنی قابل، لائق ذہین اسٹوڈنٹ نے ایک سخت کالج کیوں چھوڑ دیا۔ ماموں آئے تو انہیں بھی خوش خبری سنائی۔

”میں نے تو مس پروین کی خوب خبر لی کہ ایک ذہین قابل اسٹوڈنٹ کے کالج چھوڑنے کا انہوں نے کیوں نوٹس نہ لیا۔ یہ زمانہ ء جہالت نہیں ہے کہ لاپرواہی برتی جائے۔ وہ بھی کہہ رہی تھیں کہ میں خود حیران تھی کہ وہ کیوں گھر بیٹھ گئی۔ وہ تو کالج کی سب سے بہترین اسٹوڈنٹ۔ کالج کی کریم کہلاتی تھی۔ مگر اس کے والد نے خود کہہ دیا کہ وہ پڑھنا نہیں چاہتی۔ مجھے سخت صدمہ پہنچا تھا۔ لیکن دوسرے کی اولاد پر ہم کیسے اختیار حاصل کر سکتے ہیں۔ اب سماں کو پچن سے چھٹی دلاؤ۔ میں نے کہہ دیا ہے۔ کہ اسے اب صرف پڑھنا ہے اور کمی پوری کرنی ہے اور احد! اب کچھ اپنی عقل اور حق استعمال کرنا سیکھو۔ کچھ دن بعد اسے یونیورسٹی جانا ہو گا۔ تمہاری ذمے داری ہے کہ اسے پہنچاؤ۔ اور لاؤ۔“

میں کسی اور پر بھروسا نہیں کر سکتی۔“
ماموں نے چپکے سے کچھ کہا۔ تو امی بگڑ گئیں۔
”کیا مشکل ہے۔ ساری دنیا میں ماں باپ یہ ذمے داری نبھاتے ہیں۔ ماں اس کی نہیں تو پھر کیا تم بھی اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گئے۔ یاد نہ ہو تو میں یاد دلا دوں تمہاری بیٹی کے لیے کہہ رہی ہوں۔ جس کی ماں ایم اے گولڈ میڈلسٹ تھی جو اپنی بیٹی کو ڈاکٹریا انجینئر بنانا چاہتی تھی۔ وہ بیٹی۔ جو تمہاری اکلوتی بیٹی ہے، کسی اور کی نہیں۔“ امی سخت ناراض تھیں۔
ماموں الجھ کر بولے۔ ”آپا! میرا مطلب ہے مجھے اتنا ٹائم ملتا ہی نہیں پابندی سے۔ کوئی بھی کام کرنا میرے لیے انتہائی مشکل ہے۔“

”اچھا پھر تو کون یہ ذمے داری لے گا؟ کوئی پڑوسی؟ یا پھر تم کہنا چاہتے ہو کہ اس کو کالج میں داخلہ دلانا میری غلطی ہے؟ ٹھیک ہے۔ اب یا تو میں مستقل رہ کر سماں کو کالج لے جانے اور لانے کی ڈیوٹی دوں یا پھر اسے لاہور لے جاتی ہوں۔ بہر حال میں کسی طور اس بچی کو تمہارے جاہلانہ ماحول سے بچانے کی کوشش کرتی رہوں گی۔ اور ہاں۔ آفس کی ذمے داری کے سوا اور کون سی مشقت تم کرتے ہو؟ پہلے تو تمہارے اور روحانہ کے دوست احباب قلعہ باقاعدہ یہاں آیا

بھونٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیراٹل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے ہلکا کاٹا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت - 120 روپے

سوہنی ہیراٹل 12 کی بوتلوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں سوہنی خریدنا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف - 120 روپے ہے دوسرے شہروں کے لئے بھی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے سنی آڈر اس حساب سے بھجائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے _____ 300 روپے
- 3 بوتلوں کے لئے _____ 400 روپے
- 6 بوتلوں کے لئے _____ 800 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پوسٹ چارج شامل ہیں۔

منی آڈر بھجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگز بہار کیت، بیکھڑ طور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
 دستی خریدنے والے حضرات سوہنی بھتر آئل ان چمکوں سے حاصل کریں
 بیوٹی بکس، 53- اورنگز بہار کیت، بیکھڑ طور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
 مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اورنگ بازار، کراچی
 فون نمبر: 32735021

کرتی تھیں۔ اب تو۔۔ میں نے دیکھا اور محسوس کیا ہے کہ روحانہ کے عزیز بھی نہیں آتے۔ کئی کتراتے ہیں۔ ظاہر ہے اس جاہلانہ ماحول میں آکر کون وقت ضائع کرے گا لوگ آتے تھے۔ ادب پر سماجی معاملات اور سیاست پر گفتگو ہوتی تھی۔ ارے احد۔ کیسا دلچسپ دور تھا۔ بہت بر لطف۔۔ وہ تھا۔۔ کمال زاہد کہاں ہے۔ کیسے لطیفے فی البدیہہ سنا تا تھا۔ محفل زعفران زار ہو جاتی تھی۔“

امی کے لیکچر نے ماموں کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ چہرہ کھل گیا۔

”جی آپا! کمال روحانہ کا بھتیجا تھا۔ امریکہ میں ہے۔“

دونوں پرانے وقت میں کھو گئے۔ میں نے شکر ادا کیا کہ ماحول خوشگوار ہو گیا۔ اور دونوں کچھ بہتر گزرے۔ وجہ یہ کہ سماں کلج جانے لگی ماموں نے بخوشی اس کی لے جانے اور لانے کی ذمہ داری نبھائی۔ امی سماں کے کپڑوں، جوتوں کا بھی معائنہ کر کے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتی رہیں۔ شام کو اسے ساتھ لے جا کر بہت اچھے ڈریس بھی لے آئیں۔ اور تاکید کہ کلج میں بد حالی کی تفسیر بن کر جانے کی ضرورت نہیں۔ خوش لباسی خوش پوشاکی سے بھی شخصیت نکھر جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ تین چار دن بعد ہم واپسی کے لیے گھر سے نکلے۔ ماموں چھوڑنے آ رہے تھے۔ امی نے ایک بار پھر ماموں کی کلاس لے ڈالی۔

”سماں کی فکر رہے گی۔ مگر ہر مہینہ آتی رہوں گی۔ تم بھی ذرا بچی کی صحت کا خیال کرو۔ اس کی غذا کی طرف توجہ دو۔ بہت دہلی ہو رہی ہے۔ پتا نہیں تم اتنے لاپرواہ کیوں ہو گئے ہو۔ وہ تمہاری بیٹی ہے۔ تمہیں ہی اس کی فکر ہونی چاہیے۔ مگر۔۔ نہ جانے کیوں اتنے بے نیاز ہو گئے ہو۔ ارے بابا۔ اکلوتی بیٹی۔ کسی کی پالی ہوئی نہیں۔ تمہاری اپنی۔ اس کے سوا اور کون ہے۔ گوہر سے تو امید نہ رکھنا اولاد کی۔ اس قدر چربی چڑھالی ہے۔ وجود پر کھا کھا کر۔ پہلی نظر میں تو میں نے پہچانا بھی نہیں۔ تو بہ۔ گوشت کا پہاڑ بنا لیا خود کو۔“

ماموں شرمائے۔ (میں بھی) امی نے ان کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا کرتی رہیں تقریر۔



لاہور آکر میں نے نورین کو بتایا۔ ”امی ماموں کے پیچ کس کر آئی ہیں خوب۔“
 ”ہائیں۔ ماموں کے پیچ کس نے ڈھیلے کیے تھے؟“
 ”نئی ممانی نے یا شاید پتا نہیں بہت ناراض تھیں۔“

”بھائی! آپ کو پتا ہے امی ماموں سے کیوں ناراض ہیں۔“

”مجھے کیا پتا نہ میں نے پوچھا نہ امی نے کچھ بتایا۔“
 ”افوہ آپ بھی ناں بہت بھولے بادشاہ ہیں یاد ہے روحانہ مامی کی زندگی میں ہم لوگ جب گئے تھے۔ تو ان کے گھر ایک کھانا پکانے والی تھی۔ بہت مزے دار کھانے بناتی تھی۔“ نورین آنکھیں پھاڑ کر حیران کرنے والے لہجے میں بولی۔

”پتا نہیں۔ ہوگی۔“ میں نے بیزاری ظاہر کی۔
 ”بھئی مجھے کیا کھانے پکانے والی سے۔“

”توبہ ہے۔ خیر تو روحانہ مامی نے اس کی ادا میں دیکھ کر۔ اسے جواب دے دیا تھا۔ خانساں رکھ لیا۔ اب وہی خانساں۔۔۔ نئی ممانی کے روپ میں جلوہ گر ہوئی ہیں۔“

میں بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔ ”ہاں بھائی۔ مامی کی وفات کا سن کروہ آگئی۔ اور چھاگئی۔ یعنی کہ۔۔۔ خانساں کا پتا صاف کر کے۔۔۔ اپنی جگہ ہموار کر لی اور پھر کچھ ایسی تدبیر کی کہ ہمارے بے چاری بھولے بھالے ماموں ان کے چکر میں پھنس گئے۔ اور چپکے سے شادی کر لی۔ جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔ اسی لیے امی خفا ہیں کہ کرنی تھی تو کسی اچھے خاندان کی لڑکی یعنی کہ عورت عمل ہی جاتی۔“

نورین مجھے حیران کر کے چلی گئی۔ اب امی کے تمام مکالے میری سمجھ میں آگئے۔ امی نے اب اپنا پروگرام بنا لیا۔ ہر دو ماہ بعد وہ پنڈی چلی جاتیں۔ بھتیجی کے سر پر

دست شفقت پھیرنے اور ماموں کو باور کرانے کہ وہ ابھی اپنی نگرانی سے غافل نہیں ہوئی ہیں۔ یا پھر تصدیق کرنا مقصد ہو۔ کہ بھابھی صاحبہ ان کی بھتیجی پر ظلم کے پہاڑ تو نہیں توڑ رہیں (حسب سابق) مجھے بھی اس لڑکی سے کچھ ہمدردی ہو گئی۔ جو لاڈلی اور اکلوتی تھی۔ ماں کی جدائی میں صدمے سے چور۔ مگر اپنے احساسات کا بھرپور اظہار اوٹ پٹانگ حرکتوں سے کرتی تھی۔ وہ اس کا بچپن یا لڑکپن تھا۔

اب وہ کلج گرل تھی۔ مگر کمزور اور مرجھائی ہوئی۔ ماں کے اس نئے رشتے کو قبول کر سکی یا نہیں۔ یا مجبور کر دی گئی۔ کچھ علم نہ ہوا۔ مجھے تجسس بھی نہ تھا۔ امی کی خفگی نے کچھ ظاہر کر دیا تھا۔ مجھے اس معاملے سے کیا سروکار تھا۔



میں ذرا الگ تھلگ رہنے کا عادی تھا۔ گھر میں بھی بس اپنی پڑھائی سے سروکار تھا۔ کہاں کیا ہو رہا ہے۔ کس طرح امی گھر کے اخراجات کا حساب کرتی ہیں۔ ابا کی کتنی پنشن ہے۔ ہاں ایک بار ابو بھیا آئے تو امی سے ان کا مباحثہ چل رہا تھا۔ وہ اخراجات کی رقم دے رہے تھے امی لیت و لعل سے کام لے رہی تھیں۔
 ”تمہارے بھی گھر کے اخراجات ہیں۔ میں نہیں چاہتی تم تنگی اٹھاؤ۔“

”تو مجھے بھی گوارا نہیں کہ آپ تنگی اٹھائیں۔“ ابو بھیا خاصے سنجیدہ تھے۔

”دیکھو۔ اپنی بیوی بچے کے حق تلفی کر کے۔“
 ”حق تلفی کیسی امی! آخر مجھ پر آپ نے جو خرچ کیا ہے۔ محبت، شفقت، مامتا لٹائی ہے۔ تو کیا آپ کے بچوں کی حق تلفی نہ تھی۔ تب تو آپ نے کنجوسی سے کام نہ لیا۔ اب میں اپنے چھوٹے بہن بھائی کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں تو آپ روک رہی ہیں۔ مجھ پر بھی ان بہن بھائی کا کچھ حق ہے۔ امی پلیز۔ دعا کریں میری ترقی ہو جائے تو پھر مجھے دل کھول کر خرچ کرنے میں ذرا بھی تکلف نہ ہوگا۔ اور ویسے تو اب بھی مجھے کمی نہیں

ہوگی۔ آصفہ بہت سلیقے سے گھر چلاتی ہے۔ بچا بھی لیتی ہے۔

”اور میں نہیں چاہتی۔ آصفہ کو ہم لوگوں کی طرف سے کوئی شکایت ہو اور اسے مزید کفایت کرنی پڑے۔ اخراجات کنٹرول کرنے میں وقت ہو۔“

”اوہ۔ اس کی فکر نہ کریں۔ اسے جو دیتا ہوں۔ ملتا رہے گا۔ اس میں کمی نہیں ہوگی۔ میری کمائی میں میرے بہن بھائی کا بھی حق ہے۔ یہ رقم میرے ذاتی پروگرام کا حصہ ہے۔ جو اس گھر کے لیے آپ کے لیے ہے۔ امی! آپ نے مجھے بیٹا کہا بھی۔ مانا بھی ہے۔ اب بیٹا بنا بھی لیں۔“

ان کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ امی نے انہیں لپٹا لیا۔ اور کچھ منٹ دونوں جذبولوں کے اسیر بنے کھڑے رہے۔ میرا دل بھی اجو بھیا کی محبت کا اسیر ہو گیا۔ وہ واقعی عظیم انسان تھے۔ ہمیشہ ہم بھائی بہن کے لیے بے چین رہتے تھے۔

ابا کی زندگی میں بھی ہماری پر بھائی۔ لباس اور مشاغل کے متعلق دریافت کیا کرتے تھے۔ چپکے چپکے کچھ نہ کچھ ہمیں دے بھی دیتے۔ امی نے بھی ان کا بہت خیال رکھا تھا۔ ہمیشہ انہیں اپنا بڑا بیٹا کہا۔ لیکن آپا! وہ مختلف مزاج کی تھیں گو کہ امی نے ان کے ساتھ بھی بہت اپنائیت برتی۔ ظاہر ہے اجو بھیا کی بہن ہی تھیں۔ ہماری بھی بہن ہیں لیکن وہ ہم سے اتنی بے تکلف کبھی نہیں ہوئیں جیسے کہ اجو بھیا۔

نورین کا خیال تھا کہ ہم سے نہیں مگرایں سے انہیں شکوے ہیں۔ یہ کہ وہ سویلی ماں ہیں۔ (ان کی) اور سویلی کا تو نام برا۔ پھر یہ کہ ابا ان کی مرحومہ ماں کے مقابلے میں۔ ہماری امی سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ ان کی ہر بات مانتے ہیں۔ اور انہیں یعنی آپا کو یہ بات پسند نہیں۔

اس لیے وہ امی سے کبھی بے تکلف نہ ہوئیں۔ نہ ہم سے ویسی محبت کر سکیں۔ جیسی اجو بھیا کرتے تھے۔ اور انہیں بڑی بہن ہونے کے ناتے ہم سے بہر حال محبت ہونی چاہیے تھی۔ بھلا اس میں امی کا یا ہمارا کیا

قصور بس یہ کہ ابا سے وہ کبھی شکایت نہ کر سکیں۔ لیکن ابا کی زندگی میں ان کی شادی ہو چکی تھی۔ اور اس شادی کے لیے آپا کی خالہ نے زور دیا تھا۔ اجو بھیا کی شادی بھی ہو گئی تھی۔ ان ہی کی ننھیال کی لڑکی تھی اور بہت ہی اچھی تھی۔ عین اجو بھیا کے مطابق۔

وہ ایک سال سے پشاور میں تھے۔ مگر اجو بھیا کسی بھی چھٹی پر خود آجاتے۔ کبھی آصفہ بھابھی کو بھی لے آتے۔

میرا زلٹ بے حد شان دار رہا۔ مجھے فوراً ہی بہت اچھی جاب بھی مل گئی۔ میں دل و جان سے اس میں منہمک ہو گیا۔ کئی اچھے دوست بھی مل گئے آفس میں۔

مہرین آپا کے شوہر نام دار جو خاصے اکھڑتھے۔ میرا ان سے بہت کم سامنا ہوتا تھا۔ آپا کے بچوں سے میری البتہ دوستی تھی۔ ان ہی بچوں کی وجہ سے میں ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ ان کے ساتھ کرکٹ کھیلتا۔ لوڈو اور لطیفوں کی محفل جیتی۔ خوب ہنسی مذاق ہلا گلا ہوتا۔ بچے بہت خوش ہوتے تھے۔ میری شکل دیکھتے ہی ان کے دل کی کلی کھل جاتی۔

ان کے ابا جان۔۔۔ بچوں کے لیے کسی ظالم دیو سے کم نہ تھے۔ بلکہ ظالم جن۔۔۔ مجھ سے بھی بہت روکھے لہجے میں مخاطب ہوتے تھے۔ مگر مجھے ان کے رویے کی کبھی پروا نہ ہوئی۔ میں تو اپنی بہن سے ملنے بھانجے بھانجی سے کھیلنے جاتا تھا۔



آپا کی ایک نند بھی تھیں۔ نہ جانے ان کے ساتھ کیا ٹریجڈی ہوئی تھی کہ اب تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ آپا سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ مجھے عجیب سے احساس نے گھیر لیا۔ ہوا یہ کہ میں تو خود بھی کسی سے زیادہ تعلقات کا قائل نہ تھا۔ لوگ بھی مجھ میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ لیکن ہوا یوں کہ میری جاب شروع ہونے کے بعد لوگوں کو نہ جانے مجھ میں کیا خاص نظر آنے لگا۔ عزیز رشتے دار بھی ملنے لگے۔

بعض لوگ تو چائے پر بلواتے۔ کئی لوگوں نے کھانے کی دعوت دی۔ جو میں نے معذرت کے ساتھ لوٹا دی۔ کمال تو جب ہوا جب بھائی جان مجھ سے تپاک برتنے لگے۔ ایک دن کہنے لگے۔

”یار! میں تو تمہاری امی کو کریڈٹ دیتا ہوں۔ انہوں نے تم سب کی تربیت بہت اعلیٰ کی ہے۔ میں جانتا ہوں عمرین تمہاری ماں جانی نہیں ہے۔ اظہر اور مہرین اور تم دونوں میں انہوں نے کوئی فرق نہیں رکھا۔ یہ بہت بڑی خوبی ہے ان میں۔“

”جی جی! بس۔“ میں کچھ کہہ نہ سکا۔ وہ مگر مزید کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے۔

”ایسا ہے میاں عادل کہ میری خواہش یا آرزو ہے کہ ہمارا رشتہ کچھ اور مضبوط ہو جائے اور وہ اس طرح کہ تم میری بہن سے شادی کر لو۔ تمہاری بہن کی خوشیوں کی گارنٹی اسی طرح ہوگی۔“

”بہن؟“ ایک چھنا کا ذہن میں ہوا۔ قریب تھا کہ میں اچھل پڑتا۔ مگر افسوس کامیابی نہ ہوئی۔ میری گود میں ان کا چھوٹا بیٹا تھا۔ حیرانی پریشانی میرے چہرے پر تحریر تھی۔

”اس میں کوئی حرج نہیں۔ بس یہ ہے کہ۔۔۔ میرے دل میں جو تھا۔ وہ میں نے بتا دیا ہے۔ اب تم خود ہی سمجھ دار ہو۔“

بہت مطمئن تھے۔ ان کا بیٹا مگر میری خاموشی سے بے چین ہوا۔ باپ کے سامنے کچھ کہہ نہ سکا۔ اتر کر باہر بھاگ گیا۔ میری گود خالی ہوئی۔ زبان کھل گئی۔

”بھائی جان۔ یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔ میں تو ابھی شادی کے لیے تیار نہیں ہوں اور یوں بھی۔۔۔ وہ مجھ سے بہت بڑی ہیں۔ آ“ آپ نے یہ سوچا بھی کیسے۔“

”اب تم خود سوچ کر جواب دینا۔ تم ذمہ دار ہو اپنی بہن کی خوشیوں کے۔“

اٹھ کر چلے گئے۔ میں نے آپا کو دیکھا۔

”آپا! بھائی جان کو سمجھائیے۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ صاف بلیک میلنگ۔“ وہ نظر چرا کر دوسری طرف مڑ گئیں۔

”ان کا دماغ اسی طرح کی باتوں میں الجھا رہتا ہے۔ جو ذہن میں آجائے۔ اس سے ایک انچ کم پر راضی نہیں ہوتے۔ فائدے نقصان سے کوئی سروکار نہیں۔ اب دیکھو۔“ خاصی فکر مند تھیں۔

”آپا! مزہ آپنی مجھ سے سات سال بڑی ہیں۔ بہت عزت کرتا ہوں میں ان کی۔“

”ہاں تو۔ کرتے رہنا عزت۔ کیا حرج ہے؟“

وہ بالکل لاپرواہ ہو گئیں۔ میں جھلا کر اپنے گھر آ گیا۔ بھلا یہ کیسی خواہش ہے اور میں تو ابھی شادی کے لائق تھا بھی نہیں۔ نہ ہی ابھی گھر میں کوئی ذکر ہوا۔ بھائی جان نے سوچا بھی کیسے؟ اور اگر رشتہ مضبوط کرنا تھا۔ تو چار سال پہلے اجو بھیا سے کیوں نہیں کہا۔ ان کی شادی سے پہلے ایسی خواہش کرتے تو ممکن بھی تھا۔ مزہ آپنی کا ان سے جوڑ بھی تھا اور آپا کی خاطر نہ چاہتے ہوئے بھی۔ اجو بھیا مان جاتے۔ ان پر بھی یہ ظلم ہوتا۔ (نہ چاہنے کا)

مگر میرے اوپر تو ستم در ستم کہ ابھی شادی کرنا نہیں اور مزہ آپنی سے تو ہرگز نہیں۔ شاید آپا کو میں اس حد تک نہیں چاہتا تھا کہ ان کے گھر کی خاطر زہر کا پیالہ چڑھا جاؤں۔ دو دن اس بات سے الجھتا رہا۔ پھر آفس کے کام میں مصروف ہو کر سب کچھ بھلا دیا۔ یورپ سے ایک وفد آنے والا تھا۔ میں اس سلسلے میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ ہمیں ہر قیمت اس وفد سے کامیاب مذاکرات کرتے تھے۔ آرڈر لینے تھے۔ ان کے لیے بہترین ہوٹل کا قیام۔ گاڑیوں کا انتظام۔ کافی ہاپیل تھی آفس میں۔ ایک دن بھائی جان کو اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران ہو گیا۔

”پھر کیا سوچا تم نے؟ کرسی پر سامنے بیٹھتے ہوئے آفس کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں اس وقت فون پر اپنے منیجر کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر جربز ہو گیا۔ سوال سن کر اور بھی۔۔۔

”بھائی جان پلیز۔ بہت کام ہے مجھے۔ آفس میں کسی سے ملاقات بہت مہنگی پڑے گی۔ ٹائم ضائع ہو گا۔ آپ۔۔۔ گھر آجائیں۔“

امی نے مجھے پریشان دیکھ کر کہا۔ میں واقعی پریشان ہو گیا تھا۔

”آپ! آپ ذرا طریقے سے سمجھائیں۔“ میں نے بڑی لجاجت سے آپ سے کہا۔ ”یہ کوئی مذاق نہیں۔ نہ گڈے گڈیا کا کھیل ہے۔ ایسی فضول بات کہتے ہوئے انہیں خود شرم آنی چاہیے۔“

”ہاں۔ کروں گی بات۔ مگر اس آدمی سے تو بات کرنا بھی۔۔۔ جان جو کھوں میں ڈالنے کے برابر ہے۔ جو فیصلہ ایک بار کر لیا۔ پھر۔۔۔ اسے انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔“

آیا متفکر تھیں۔ شام کو گھر چلی گئیں، امی مجھے ڈانٹنے لگیں کہ میں نے بھائی جان سے روکھے لمحے میں بات کی اس لیے وہ خفا ہو گئے۔ میں کیا بتاتا، آفس کا ماحول ان کا بات کرنے کا لوجہ، میری مصروفیت، معقول بات ہوتی۔ تو میں تسلی سے بات کرتا۔

وہ تو شکر ہے کہ بھائی جان کے جانے کے بعد یورپی ڈیلی کیشن کے دورے کا ٹائم آگے بڑھنے کی خبر ملی۔ جس سے سب کو کچھ آرام ملا۔ اب میں دو تین دن چھٹی کر کے آرام کر سکتا تھا۔ بہت محنت کی تھی۔

امی کو پنڈی روانہ کر کے گھر آیا۔ شام کو جی چاہا کہ آپا کے گھر چلا جاؤں۔ بچوں سے ملنے کھیلنے کے لیے وہ منتظر رہتے تھے۔ لیکن بھائی جان کی ناراضی، اور یہ اچھا ہی ہوا کہ میں کہیں نہیں گیا۔ لیوی پر میچ دیکھتا رہا۔



رات کو امی کا فون آ گیا۔

”عادل! تم صبح ہی چھٹی لے کر آ جاؤ۔ بلکہ۔۔۔ ابھی روانہ ہو جاؤ تو بہتر ہے۔ بعد میں بتاؤں گی۔۔۔ نورین کو میں خود سمجھا دوں گی کیا کرنا ہے۔ وہ اپنی دوست شائلہ کو بلا لے گی۔“

مجھے سوالات کرنے کی عادت نہ تھی۔ نورین کو امی نے کچھ سمجھا دیا تھا۔ وہ بے فکر تھی۔ میں نے دو جوڑے بیگ میں ڈالے۔ احتیاطاً ”کیا پتا۔۔۔ رکنا پڑے۔ صبح ہی ماموں کے گھر پہنچ گیا۔

شکر ہے ماموں ٹھیک تھے۔ یعنی میرے اندیشے غلط

”گھر۔۔۔ مناسب نہیں، جواب لینے آیا ہوں۔ وقت ضائع کرنے نہیں۔ ہاں یا ناں۔“

”بھائی جان۔ میرا ابھی چار سال شادی کا ارادہ نہیں۔ امی بھی اگر کہیں گی۔ انہیں بھی یہی جواب دوں گا اور زبردستی تو بالکل نہیں۔ اپنی پسند اور مرضی سے کروں گا۔ یہی جواب امی کو بھی دوں گا۔“ میں نے زیادہ ہی دلیری سے کام لیا تھا شاید۔

”امی سے تم نے بات کی؟“ سنجیدگی۔

”نہیں جب کسی قابل ہو جاؤں گا۔ تب شاید امی سے بات کروں۔ ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”کچھ سوچ رکھا ہے شاید؟“ گہری نظروں سے میری آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔

”جی نہیں۔ ابھی ٹائم نہیں ملا۔ زندگی کا فیصلہ بہت فرصت چاہیے۔ سوچنے اور کر گزرنے کے لیے بہت اہم معاملہ ہوتا ہے۔ آپ تو واقف ہیں۔ جب بھی ایسا کرنا ہو گا۔ صرف اپنی مرضی، خوشی اور پسند سامنے رکھ کر کسی دباؤ میں آکر نہیں۔“

میں نے بہتر سمجھا کہ دو ٹوک جواب دے دوں۔ کام بہت باقی تھا اور بھائی جان کی موجودگی میرے کام میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”ٹھیک ہے پھر۔۔۔ نتیجے کے ذمہ دار بھی۔۔۔ تم ہو گے۔“

کہہ کر چلے گئے۔ شکر کا سانس لیا۔ مگر یہ سکھ کا سانس۔۔۔ بہت مہنگا پڑا۔ شام کو گھر آکر آپا کو دیکھا۔ بہت پریشان تھیں۔

”کیا کہہ دیا تم نے اپنے بھائی جان سے۔ بہت غصے میں تھے۔“ امی بھی بے حد فکر مند سر پکڑے بیٹھی تھیں۔

”لو بھلا اس شخص کے تو مزاج ہی ساتویں آسمان پر ہیں۔ مجھے صبح پنڈی جانا ہے اور یہاں یہ قضیہ شروع ہو گیا۔ اب مہرین کو چھوڑ گئے ہیں کہ تمہیں نفع نقصان سمجھائیں۔ خیر اب پریشان نہ ہو۔ میں دو دن کے بعد وہاں سے آکر مزاج دار داماد سے بات کروں گی۔ شاید کچھ سمجھ میں آجائے۔“

چاہیے۔ نہ کہ عام مہمان۔“ سماں کی آواز میں شوخی
 تھی ”اور میں۔۔۔ اماں کو بتا دینا۔ بیوی پارلر سے تیار
 ہوں گی ہاں۔“

”بیوی پارلر۔ بہت مہنگا ہوتا ہے۔ تمہارے ابا
 انور ڈکریں گے۔“

”ہونے دو مہنگا۔ شادی کوئی مذاق تو نہیں ہے۔
 ایک ہی بار تو ہوتی ہے۔ اسے یادگار ہونا چاہیے۔“

سماں اب کھل کر بول رہی تھی۔ یقین نہیں آیا۔ یہ وہ
 سماں تو نہیں۔

”ہاں مذاق نہیں ہوتی۔ مگر بعض لوگ اسے مذاق
 بنا لیتے ہیں۔“ دو سری لڑکی دھیسے لہجے میں بولی۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب شادی کا مطلب ہے خوشی اور نا سمجھی میں
 بعض لوگ اسے ضد بنا لیتے ہیں۔ اس لیے تم کو خبردار
 کر رہی ہوں۔ تم سوچ سمجھ کر شادی کرنا اور اگر کوئی
 غلط قسم کے لوگ ہوں۔ تو۔ انکار کر دینا۔ مجھے خوف
 ہے کہ۔۔۔ تمہاری اماں کوئی۔۔۔ انتقامی کارروائی میں
 تمہیں بھاڑ میں نہ جھونک دیں۔“

”نہیں۔ ایسا کیسے کر سکتی ہیں وہ۔ ابو بھلا۔۔۔ کیوں
 مانیں گے۔ اور اب تو پھپھو بھی آگئی ہیں۔“

”اچھا خیر گھبراؤ نہیں۔ میں ذرا سن گن لیتی ہوں جا
 کر۔ تمہاری پھپھو سے ہی پوچھ لوں گی اور ہاں۔ ایک
 نصیحت بھی کرنی ہے۔ سسرال کو میاں جی کا گھر سمجھ کر
 رہنا۔ خالہ جی کا گھر نہیں یعنی لاکھ وہ تمہارا گھر ہوگا۔ مگر
 تمہارا وہاں پر کوئی اختیار نہ ہوگا۔ کیونکہ حق تسلیم کیا
 جاتا ہے۔ اختیار نہیں۔“

”اٹو۔ دادی اماں! تم میں یہ بوڑھی روح کہاں سے
 آٹکی۔ ہمیشہ نصیحت کرنی ہو۔ میں کوئی بچہ ہوں۔“

سماں چڑگئی تھی شاید۔

تھے۔ ممانی چڑی ہوئی تھیں اور امی مطمئن۔ ناشتہ کر
 کے میں گیسٹ روم میں جا کر لیٹ گیا۔ ذہن اور جسم کی
 تکان نے بہت جلد مجھے نیند کی وادیوں میں پہنچا دیا۔ نہ
 جانے کتنی دیر سوتا رہا۔ آنکھ کھلی۔ گھڑی پر نظر پڑی اور
 گھبرا گیا۔ کمال ہے کسی نے جگایا بھی نہیں۔

برابر کے کمرے سے آوازیں آ رہی تھیں۔
 کوشش کے بغیر سماعت تک آچھیں۔ اجنبی آواز
 تھی۔ کوئی لڑکی۔۔۔

”سنا ہے تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ میں تو سنتے
 ہی بھاگی بھاگی آئی ہوں۔ کس کے نصیب جگا رہی ہیں
 بنو۔“ اشتیاق کی فراوانی آواز میں رچی ہوئی تھی۔

میں حیران ہو گیا۔ شادی کس کی؟

”پتا نہیں۔“ میں نے سماں کی آواز سنی۔ ”پرسوں
 اماں نے مجھ سے کہا کہ وہ میری شادی کر رہی ہیں۔ تو
 میں چیپ رہی۔“

”تمہارے ابو نے۔۔۔ کچھ تو بتایا ہوگا۔ تم خود ان
 سے پوچھ سکتی تھیں کہ۔۔۔“

”نہ ابو نے کچھ کہا نہ میں نے پوچھا۔ کیا پوچھتی؟“

”بہت ہی نکمی ہو سماں۔ شادی کی تیاری ہوتی
 نظر نہیں آ رہی۔ کیا بوجھ اتارا جا رہا ہے۔“ بہت ہی
 منہ پھٹ لڑکی تھی۔

”شاید۔“ سماں کی بو جھل آواز آئی۔

”تم نہایت فضول لڑکی ہو۔ خیر میں آئی سے خود ہی
 پوچھ لوں گی۔ یہ بتاؤ۔ شادی کے دن کس رنگ کا
 ڈریس پہننا چاہتی ہو۔ میں آئی کو بتا دوں گی۔ وہ لڑکے
 والوں کو تمہاری پسند تا دیں گے۔“

”میں۔۔۔ میں تو سرخ رنگ کا غرار اسوٹ پہنوں
 گی۔ دوپٹے کی پٹی سبز رنگ کی جس پر کام بنا ہو اور۔۔۔
 سرخ یعنی کہ روئی کاسیٹ زیور کا۔“

”رہیں وہی پرانے زمانے کی۔ ارے آج کل تو
 نارنجی مگلائی، زعفرانی، نیلا سفید یا فیروزہ رنگ کا لباس
 پہنتی ہیں لڑکیاں۔ کاسنی بھی ان ہے۔“

”لو یہ تو عام رنگ ہیں۔ سب لوگ ان ہی رنگوں
 کے کپڑے پہنے ہوں گے۔ بھئی دلہن کو دلہن لگانا

”ارے ارے۔۔۔ تمہاری آپا جن کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ کیا ہوا انہیں۔“

”وہی ہوا جو ہوتا رہتا ہے نا سمجھی میں۔ نہ آپا سسرال والوں کی توقعات پر پوری اتر سکیں۔ نہ اپنی منوا سکیں۔ اپنا میاں اپنا گھر سمجھ کر کچھ اصلاحات کی کوشش کر رہی تھیں۔ نا منظور اور پھر نامقبول ہو کر میکے بٹھادی گئیں۔“

”ہائے اللہ تو تمہارے ابا انہیں سمجھاتے۔ ان کے میاں کو بھی۔۔۔“

”وہ کہتی ہیں۔ شادی کی ہے۔ غلامی نہیں کروں گی سسرال والوں کی ضد اور تحکمانہ انداز دیکھ کر میاں سے کہا۔ الگ گھر میں رہوں گی۔ وہ بھی رد ہو گئی۔ اب گھر بیٹھی ہیں۔ جب بھی بہت اچھی مل گئی ہے۔“

”ارے اللہ۔ کوئی انہیں سمجھاتا نہیں۔ گھرتیاہ کرنے سے زندگی بھی خراب ہوتی ہے۔“

”دیکھو سماں! ان کا نظریہ بھی غلط نہیں ہے۔ جہاں عزت نہ ہو۔ وہاں خود پر جبر کر کے رہنا۔ اپنی ذات کی نفی کرنا ہے۔ ہاں یہ کہ اگر ان کے میاں اسے انا کا مسئلہ نہ بنا میں۔ تو شاید مفاہمت ہو بھی جائے۔ ابا کوشش تو کر رہے ہیں۔“

میں اب پوری طرح ہوشیار ہو گیا تھا۔ نیند کی کسل مندی سے جان چھوٹ گئی۔ ہاتھ روم میں گھس گیا۔ نما کر نکلا تو دوسرے کمرے میں سنا تھا۔ ڈرائنگ روم میں امی اور ماموں بیٹھے تھے۔

”آؤ عادل!“ ماموں نے ساتھ والے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ کچھ فکر مند سے تھے۔ امی نے مجھ سے کہا۔

”عادل! میں نے تم سے پوچھے بغیر سماں کے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔ احد کو تو اعتراض نہیں ہے۔ احد کی تسلی کے لیے تم سے پوچھ رہی ہوں۔“

مجھ پر تو حیرت کا پہاڑ آگرا۔ یہ کیا شوشہ چھوڑا ہے امی نے سماں اور میں۔۔۔؟ سچی بات ہے۔۔۔ مجھے سماں کوئی خاص پسند نہ تھی۔ اس نظریے سے نہ دیکھا تھا نہ سوچا تھا۔ امی مجھے متوقع نظروں سے دیکھ رہی

تھیں۔ مجھے اندازہ تھا۔ امی کبھی کوئی کام بلاوجہ بلا ضرورت نہیں کر سکتی تھیں۔ میری زندگی کا فیصلہ امی کریں گی۔ یہ میں نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن ان کی نیت پر شک کرنا بھی گناہ کے مترادف تھا۔ امی کبھی میرے لیے برا نہیں چاہ سکتیں۔ اس کا یقین تھا۔ میں نے امی کے چہرے پر بے چینی دیکھی۔

”میں نے تمہیں اسی لیے بلایا ہے۔ اس سے پہلے کہ سماں کو کسی جاہل شخص سے بیاہ دیا جائے۔ میں کیوں نہ یہ کام کر ڈالوں۔“

”آپا!“ ماموں نے کسمسا کر کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بہت اچھی پوزیشن ہے بہت کمائی ہے۔ شہرت ہے۔ فائو اشار ہوٹلوں میں بہت مانگ ہے۔“

”اچھا اور تعلیم کتنی ہے؟ خاندان کیا ہے۔ ذات کون سی ہے۔ بیٹی بہت قیمتی اثاثہ ہوتی ہے۔ اسے بے مول نہ کرو۔ اور تمہاری بیٹی۔ ہیرا ہے۔ تمہارا خون ہے۔ روحانہ کی لخت جگر۔ اس کے لیے تو بہت اعلا تعلیم یافتہ خاندانی رشتہ بہ آسانی مل سکتا تھا اور تم نے کیا سوچا؟“

امی خاصی مشتعل تھیں۔ ماموں کے بعد میری طرف متوجہ ہو میں۔ ”اب تم جواب دو۔“

میں نے اپنا اعتماد بحال کیا۔ ”آپ نے میرے لیے بہت ہی اچھا سوچا ہوگا امی! میں نے کبھی آپ کی کوئی خواہش رد کی ہے؟ آپ میری بی خواہ ہیں۔ جو فیصلہ کریں گی۔ مجھے منظور ہوگا۔ میں انکار کی جرات کر ہی نہیں سکتا۔“

امی کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ ماموں مسکرائے اور میرے کندھے کو تھپکا۔ اس وقت ممانی کا غضب ناک چہرہ دروازے سے نمودار ہوا۔ بلکہ وہ پوری کی پوری نمودار ہو گئیں۔

”اور میں نے جو رشتہ طے کر دیا ہے۔ اسے کیا جواب دوں گی۔ سوچا ہے آپ نے؟“ وہ تلملا کر امی سے مخاطب ہوئیں۔ ادھر ماموں کا ہاتھ کندھے سے پھسل کر ان کی اپنی گود میں جاگرا۔

”میری بھی کچھ عزت ہے آپا! آپ کے بھائی کے

یہی کر سکتے تھے وہ۔

”ہاں جی۔ ہم تو کم ذات ہیں۔ ہماری عزت ہی نہیں ہے۔ آپ جیسے دولت مند لوگ کچھ بھی کر لیں۔ خاندانی کہلا میں گئے۔ میں نے تو بھلا چاہا تھا۔ مگر میں کچھ بھی کر لوں۔ سوتیلی کہلاؤں گی۔ اب بھلا میں ان لوگوں کو کیا جواب دوں؟“ ممانی جربز ہو گئیں۔

”کہہ دینا تمہیں علم نہ تھا کہ اس کا رشتہ بچپن سے طے ہے۔ یا پھر کہہ دینا۔ پھوپھی کو یہ رشتہ قبول نہیں۔ بلکہ کسی کو بھی قبول نہیں۔“

امی نے مشورہ تو دے دیا۔ مگر ممانی اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ امی نے ماموں کو دیکھا۔

”مجھے گوہر کا بھروسا نہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔“

مگر رات کو امی نے ممانی کو سمجھایا۔ ٹھنڈا کیا۔ اپنائیت کی باتوں سے بہلایا۔ اپنی طرف سے صفائی بھی دی۔ لیکن ممانی کا موڈ آف تھا۔ گو کہ ظاہر کر رہی تھیں کہ سب ٹھیک ہے۔ مگر کسی سوچ میں گم تھیں۔ رات کھانے پر یہاں نہ تھی۔ ممانی حسب عادت خاطر مدارات کر رہی تھیں۔

امی کو شاید فکر کی وجہ سے نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ بہت دیر تک جاگتی اور کروٹیں بدلتی رہیں۔ مجھے سوالات کرنے کی یا جستجو کی عادت نہ تھی۔ پھر بھی معلومات میں اضافہ کے لیے پوچھ لیا۔

”امی! میں یہاں کب تک رہوں گا؟“

”تمہیں کیا جلدی ہے؟“

”میرا آفس میں بہت زیادہ کام ہے۔ میرا مطلب ہے کہ منگنی وغیرہ کرنی ہے تو جلدی سے کر لیں۔ تاکہ میں جاؤں واپس۔ آپ کیا ابھی رکیں گی؟“ عادت کے خلاف کئی سوال کر لیے۔ امی نے مسکرا کر کہا۔ ”اچھا! منگنی کی جلدی ہے۔ خیر اجو کو بلایا ہے وہ آجائے تو پھر۔“

امی ہر مرحلے پر اجو بھیا کو یاد رکھتی تھیں۔ لیکن آپا اور نورین۔ کیا یہ منگنی میں نہیں آئیں گی؟ لیکن اتنے سوالات کر چکا تھا۔ اس اہم سوال کو ٹال گیا۔ ظاہر

طفیل سہی۔ وہ لوگ میری جان کو آجائیں گے۔ اور آپ بھی سن لیں عبدالاحد صاحب۔ اب ان کا سامنا آپ کریں گے۔ آپ ہی جواب دیں گے انہیں کہ اچانک یہ ارادہ کیوں تبدیل ہو گیا۔“ ممانی بہت زیادہ مشتعل تھیں۔

”میں کیوں؟“ ماموں نے بھی حوصلہ دکھایا۔ ”نہ میں نے رشتہ کیا ہے۔ نہ میں جواب دہ ہوں۔ اگر تم نے مجھ سے مشورہ کیا ہوتا۔ تو میں خود دیکھتا۔ تم نے تو اچانک بم دے مارا کہ میں نے رشتہ طے کر دیا ہے اور فلاں دن بارات آئے گی۔ تمہیں یاد ہو گا۔ میں نے تو مخالفت کی تھی کہ کوئی جوڑ نہیں نہ عمر کا نہ تعلیم کا۔“ وہ بھی غصے میں بولے۔

”ہاں۔ مگر اتنی سختی سے نہیں کہا۔ اب جو بہن کو دیکھا۔ تو بیٹی کی محبت پھٹ پڑی۔ کمائی کا سن کر ہی چپ ہو گئے تھے۔ میں نے بھی پوزیشن ہی دیکھی تھی۔ دولت برس رہی ہے۔“

امی ماموں کو دکھی اور شاکی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

”احد! یہ کیا سن رہی ہوں میں۔ کیا تم نے جو کچھ کمایا ہے۔ وہ کم ہے؟ تم ایک خانساماں کی دولت سے مرعوب ہو گئے؟ تمہارے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ یا بیٹی میں کیا نقص ہے۔ خاندان والوں سے کیا کہہ کر تعارف کراؤ گے؟ تعلیم کی اہمیت سے نابلد ہو گئے۔ افسوس ایک خانساماں اور داماد!“

”آپا! خانساماں نہیں ہے۔ بہت بڑے ہوٹل کا شیف ہے۔ ہر طرف مانگ ہے اس کی۔“ ممانی ٹخریہ لہجے میں گل کھلا رہی تھیں۔ ”جاہل نہیں ہے۔ ایف اے پاس ہے۔“

”گوہر! شیف کون ہوتا ہے؟ وہی کھانا پکانے والا ماہر۔ اپنی حیثیت کی پہچان نہیں ہے تمہیں۔ احد مرعوب ہو سکتا ہے۔ خاندان والے شیف سن کر ہی اعتراض کریں گے۔ مجھے تو تم لوگوں کی ذہنیت پر افسوس ہو رہا ہے۔“ امی دکھ سے بولیں۔

ممانی بھی غصے میں آ گئیں۔ ماموں نے سر جھکا لیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
 امی آئیں اور دھماکہ کر کے چلی گئیں۔ اجو بھیا
 مسکرائے از سر نو مجھے گلے لگایا۔ امی بہت مصروف نظر آ
 رہی تھیں۔ نہ مجھ پر نظر ڈالی نہ میری اصلی والی حیرانی پر
 جملہ کسا۔ اللہ! منگنی سے پہلے نکاح یہ ہو کیا رہا ہے۔
 منگنی تو... کچا بندھن ہوتا ہے۔ لیکن... اور میں نکاح
 کے لیے تیار بھی نہ تھا۔

اجو بھائی ہنستے ہوئے مجھے پکڑ کر ڈرائنگ روم میں
 لے آئے۔ جہاں ماموں اور... چند مہمان جمع تھے۔ پھر
 چچا جان آگئے۔ ان کے ساتھ ان کے دونوں بیٹے اور
 ہو میں بھی تھیں اور بھی چند خواتین بلکہ لڑکیاں بھی
 ہنستی کھلکھلاتی آئیں اور امی سب خواتین کو سماں
 کے کمرے میں لے گئیں۔ مولوی صاحب آگئے۔
 میں مٹی کا مادھو بنا سب کو ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ جیسے میں
 بھی مہمان ہوں۔ اجسی انجان ماموں اور چچا جان سر
 جوڑے فارم فل کرنے میں منہمک تھے اور پھر چند
 منٹ بعد مولوی صاحب نے خطبہ شروع کر دیا۔

تین لوگ جن میں اجو بھیا اور چچا جان کے دونوں
 صاحبزادے تھے۔ سماں سے پوچھنے اس کے کمرے میں
 چلے گئے۔ مسکراتے ہوئے واپس آئے۔ اب مجھ سے
 کچھ سوال کیے گئے۔ میں بھی رٹو طوطے کی طرح
 ”قبول ہے قبول ہے“ کہتا گیا۔ پھر نہ جانے کس جہان
 سے چھوہارے برآمد ہوئے اور سب کھانے لگے۔

سب نے مجھے گلے لگایا۔ مبارک باد دی۔ ماموں
 مجھے سننے سے لپٹا کر آبدیدہ ہو گئے۔ ہائے نہ جانے
 کیوں مجھے بھی رونا آگیا۔ پھر نوجوان پارٹی مجھ سے لپٹ
 گئی۔ یعنی چچا زاد بھائی اور ماموں کے کوئی کزن جن
 سے میں بہت کم ہی کبھی ملا تھا۔ سب نے بزور مبارک
 باد دی۔ (ایسی ویسی؟) پسلیاں دکھا دیں۔ ماموں کیرسی پر
 بیٹھے آنکھیں رگڑ رہے تھے۔ اجو بھیا انہیں تھکتے
 ہوئے تسلی دے رہے تھے۔

”ماموں! فکر نہ کریں۔ ان شاء اللہ سماں اپنے
 چاہنے والوں کے گھر جا رہی ہے۔ بہت خوش رہے
 گی۔“

”لو جی۔ میرے ماموں ان پر بھی اجو بھیا کا قبضہ۔ پھر

ہے اجو بھیا آئیں گے تو یہ دونوں بھی آئیں گی۔ چادر
 سر سے تان کر بے خبر ہو گیا۔ صبح ہم ناشتہ کر رہے تھے
 تو میں نے مامی کو عجلت میں کہیں جاتے دیکھا۔ امی نے
 بھی دیکھا مگر کچھ بولیں نہیں۔ پھر وہ سماں کو پکارتی ہوئی
 اس کے کمرے میں چلی آئیں۔ میں بھی ان کے پیچھے
 گیا۔ اندر سے سوال جواب کی آواز آ رہی
 تھی۔

”یونیورسٹی کیوں نہیں گئیں؟“ اماں کا سوال۔
 ”پھپھو اماں نے کہا کہ وہ مجھے مارکیٹ لے کر
 جائیں گی۔ اس لیے آج چھٹی کر لی۔“ سماں کا جواب۔
 لیکن وہ تو کہیں باہر چلی گئی ہے۔ دوپہر ہو گئی ہے۔
 اچھا تم ایسا کرو۔ کہ گوہر آکر تمہیں لے جانا چاہے تو
 کہہ دینا۔ پھپھو نے روکا ہے۔ کوئی کام ہے۔ سنا۔ اصل
 میں میرے سسرال والے مجھ سے ملنے آ رہے ہیں۔ تو...
 تم ذرا چائے وغیرہ کا خیال کر لیتا۔“
 ”جی اچھا۔ پھپھو کتنے لوگ ہوں گے میں رانی کے
 ساتھ مل کر سب کر لوں گی۔“

نہ جانے امی کیا کہہ کر دو سرے کمرے میں آ گئیں
 اور فون اٹھا کر میرے چچا اور ان کے بیٹوں سے بات
 کرنے لگیں۔ کافی دیر ہو گئی۔ ممانی نہیں آئیں البتہ
 ان کا فون ماموں نے سنا۔ وہ دیر سے آنے کی اطلاع
 دے رہی تھیں۔

دوپہر کا کھانا بھی کھالیا گیا۔ معلوم نہیں امی کیا سٹریٹر
 کر رہی تھیں اور معلوم نہیں ممانی کہاں تھیں اور وہ
 وہاں (جہاں بھی گئی تھیں) کیا کر رہی تھیں۔ عجیب
 پر اسرار کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ میں کمرے میں آکر
 لیٹ گیا۔ پھر کچھ آواز آئی۔ مانوس... اور... اجو بھیا
 میں اٹھا تو وہ آکر مجھ سے لپٹ گئے۔

”آپ اجو بھیا یہاں۔“ حیرت کا اظہار کرنا پڑا۔

”پشاور سے۔“

”امی سے ملنے آگیا اور یاد کرو میں تمہارا بڑا بھائی
 ہوں۔ امی نے فون کیا تھا۔“

”آج عادل کا نکاح ہے اور تم اس کے بڑے ہو۔“

نکاح کے وکیل ہو۔“

امی کے ساتھ رانی صاحبہ نمودار ہوئیں۔ چائے کے لوازمات کے ساتھ۔ امی نے بھی اپنے ذہن رسا کی بدولت کیا کیا انتظام کر ڈالا۔ چھوہارے۔ مٹھائی۔ کیک۔ وہی بڑے۔ سموے۔

رانی کی بے پایاں خوشی۔۔ اس کے چمکتے دانت گواہی دے رہے تھے۔ کن اکھیوں سے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھتی پھر شرما کر ہونٹ دانتوں میں دبالتی۔ اف عجوبہ بنا دیا مجھے۔

پھر پڑوس کے کمرے سے لڑکیوں کے پر جوش گانوں نے سماں باندھ دیا۔ ادھر بھی کمی نہ رہی۔ راشد بھائی اجو بھیا اور جمیل زور زور سے گانے لگے۔ ساجد بھائی میز کا طبلہ بجانے لگے۔ کسی نے منہ سے میوزک کی آواز نکالی۔

میرا یار بنا ہے دولہا
اور پھول کھلے ہیں دل کے
ارے میری بھی شادی ہو جائے
دعا کرو سب مل کے

”مولوی صاحب کہئے آئین آئین آئین۔“ ساجد بھائی نے کہا۔

امی مسکراتی ہوئی آئیں تو ساجد بھائی نے فرمائش کی ”چچی آپ ہی میری شادی کرائیں گی۔ میرے ابا کو تو میری فکر نہیں ہے۔ بس اسی طرح فناٹ۔“

امی نے انہیں دعا دی سلی بھی ساتھ اٹکا دی ”ضرور بیٹا ضرور۔“

امی سب سے مبارک باد قبول کر رہی تھیں۔ تو ممانی کی کڑک سنائی دی۔

”یہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔“ دروازے میں کھڑی تھیں۔ پریشان۔

ساجد نے لیک کر ایک چھوہارا ان کے منہ میں ٹھونسنا۔ ”ہو رہا نہیں ہو گیا۔ سماں اور عادل کا نکاح آپ کو مبارک ہو۔“

ممانی حسب توقع آگ بگولہ ہو گئیں۔ چھوہارا الخ تھو کر کے وہیں گر اویا۔ پھر۔

”احد صاحب۔ ذرا ادھر تو آئیے۔“ پکار پڑی۔ مگر

ماموں نے شور میں سنا نہیں وہ گردن نیچی کیے چچا جان سے باتیں کر رہے تھے۔ کرتے رہے۔

”کیا مذاق ہے؟“ ممانی پھر چلا میں اور کوئی شنوائی نہ ہونے پر تن فرین کرتی دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور فوراً ”ان کی چنگھاڑیں ادھر سے ادھر سفر کرتی سب کی سماعت میں گونجنے لگیں۔ امی فوراً ”اٹھ کر چلی گئیں۔ یقیناً“ بیٹھی کی سر برستی کے لیے۔

پھر ماموں بھی اٹھ گئے۔ ممانی کی چیخ پکار نے مجبور کر دیا۔ حالات کا اندازہ کر کے مہمان بھی ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔ امی نے سب کو شکرے کے الفاظ کے ساتھ اللہ حافظ کہا۔ ماموں اندر ممانی کے جوش غضب کو ٹھنڈا کرنے کی سبیل کر رہے تھے۔ رانی کمرے میں آئی۔ مجھے دیکھ کر شرمائی۔ کھلکھلائی۔ اس کے دانت باہر ہی رکھے تھے۔ اندر جانے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ خوشی بے پایاں۔ (بھلا تمہیں کیوں؟)

”خوش ہو؟“ اجو بھیا میرے چہرے پر خوشی کی رمت تلاش کرنے میں ناکام ہو گئے۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سمجھ گئے، سمجھانے لگے ہوتا ہے ایسا ہوتا ہے۔ جب پروگرام کے بغیر زندگی کے فیصلے کیے جائیں۔ لیکن میں مطمئن ہوں میں نے اس لڑکی کے چہرے پر حیا و وفا پائیزگی اور استقلال دیکھا ہے۔ ذہین ہے۔ تم چچھتاؤ گے نہیں۔ ماموں محبت کرنے والے پر خلوص انسان ہیں۔ تمہیں بھی انہیں مطمئن کرنا چاہیے۔ وہ خوش ہیں۔ میں جانتا ہوں۔ امی کبھی کوئی فیصلہ بلا وجہ نہیں کرتیں۔“

وہ میری پیٹھ پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ مجھے ان کی آنکھوں میں کوئی نرم گرم سی کیفیت نظر آئی۔ غم کی نمی ”آواز میں ٹھہراؤ۔ ہاتھوں میں لرزش (کیا اجو بھیا چچھتا رہے ہیں؟)

ماموں کے کمرے سے ممانی کی غراتی آواز۔ ماموں کی معنی خیز خاموشی لاؤنج میں چند لڑکیاں (غالبا ”سماں کی سپہیلیاں) سماں کو گھیرے بیٹھی تھیں۔ سماں نے ہلکے گلابی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ گھٹنوں

ہوئی آکر کرسی پر بیٹھ گئی اور ہاتھ کی انگلیوں پر نظریں جما دیں۔ بغیر مہندی، بغیر کیونکس، بے چاری اس کے تو سارے خواب ادھورے رہ گئے۔ بلکہ چکنا چور ہو گئے۔ امیدوں کی عمارت دھرام... نہ سرخ رنگ کا جوڑا، نہ میک اپ، روئی روئی آنکھیں۔ پھیکا سیٹھا چہرہ...

اجو بھیا چپکے سے باہر نکل گئے۔ میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر بے ساختہ ہنسی آگئی۔
 ”اب تم یونہی بسورتی رہو گی؟ بھئی، میرا تو کوئی قصور نہیں۔ اپنی پھپھو سے کہو۔ ان کی عجلت نے یہ دن دکھایا ہے۔ نہ تمہیں سرخ جوڑا نصیب ہوا۔ نہ بیوٹی پارلر کی نوبت آئی۔“
 وہ تیزی سے میری طرف گھوم گئی۔ ”ہیں؟ کیا؟“
 اس کے منہ سے نکلا۔

”یا تو جذبات کے اظہار کو کنٹرول کرو یا آواز کو قابو میں رکھو کہ دوسرے کمرے والا نہ سن سکے۔ صحیح کہہ رہا ہوں نا۔“ میں نے شوخ لہجہ اختیار کیا۔
 بے چاری، سارے خوابوں کو آگ نہ لگے۔ نہ جانے کتنے خواب بے تعبیر ہو گئے ہوں گے۔
 ”ہائے اللہ!“ کہہ کر دانت زبان میں دبا کر منہ موڑ لیا۔ پھر انگلیاں چٹخانے لگی۔

”خیر، فکر نہ کرو۔ امی کو بھی علم ہے کہ... لال جوڑا کتنا ضروری ہے۔ وہ بنوالیس کی میک اپ بھی بیوٹی پارلر سے ہو جائے گا۔ مگر ابھی نہیں۔ رخصتی کے وقت اور اس میں ابھی دیر ہے۔ وہ ”ہائے اللہ“ کہہ کر پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئی۔ مجھے ہنسی آگئی۔

”اچھا چلو، ابھی چلتے ہیں کسی بیوٹی پارلر۔ اپنا ارمان پورا کر لو۔ لیکن فائدہ ہی کیا ہے؟ میں نے تو تمہیں اس حلیمے میں دیکھ ہی لیا ہے اور اگر دوسروں کو دکھانے کے لیے۔ میک اپ ضروری ہی ہے۔ تو اب تو سب مہمان رخصت ہو چکے۔ کیا بن سنور کر آئینہ دیکھتی رہو گی۔ خوش ہونے کے لیے اس میں بھی حرج تو کوئی نہیں ہے۔ آؤ پھر۔“

وہ بھنا کر اٹھی، چہرے پر غصہ کی علامات تھیں۔

میں سر رکھے بیٹھی تھی۔ پتا نہیں اس کے محسوسات کیا تھے۔ ہمیں دیکھ کر لڑکیاں اٹھ کر آئیں۔ تعارف ”میں شیما ہوں۔ سماں کی کلاس فیلو۔ ہیسٹ فرینڈ۔ میں ارشمن ہوں۔ ہیسٹ فرینڈ۔ میں وہ ہوں۔ میں وہ ہوں۔ ارے۔ میرا تو کوئی فرینڈ نہ تھا۔ تو ہیسٹ فرینڈ کا تو کہیں ذکر ہی نہیں۔“

دوسرے کمرے میں امی متفکر سی بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر کھڑی ہو گئیں۔ گلے لگا کر پیار کیا۔ جذباتی ہو رہی تھیں۔ بلکہ میرے چہرے پر خوشی نہ دیکھ کر پریشان بھی۔

”تمہارا شکریہ۔ اقرار کر کے میری عزت کا ماتا کا بھرم رکھ لیا“ گلو گیلر لہجہ میں بے چین ہو گیا۔
 ”امی، آپ کی عزت میرا ایمان ہے۔ میں بھلا کیسے؟ آپ نے یہ سوچا بھی کیوں کہ میں آپ کو کبھی بھی انکار کروں گا؟“ میں فرماں بردار بیٹا تھا۔ واقعی۔
 ”مگر... یہ تمہاری زندگی... پوری زندگی کا معاملہ تھا۔ تم انکار کر سکتے تھے۔“

”امی پلیز۔ آپ کبھی میرا برا نہیں چاہیں گی۔ یہ یقین ہے مجھ کو۔“ میں نے انہیں یقین دلایا۔
 ”میں جذباتی ہو گئی تھی۔“ امی کھوئے کھوئے لہجے میں بول رہی تھیں۔ ”سماں کی فکر نے مجھے کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہ دی۔ روحانہ کی روح مجھ سے پوچھے گی۔ تم نے میری بیٹی کو اندھیروں سے بچانے کے لیے کیا کیا؟ عادل مجھے اپنی زندگی سے بڑھ کر تم دونوں عزیز ہو۔ خدا میرے ارادوں کو مضبوطی اور خوشنودی عطا کرے اور تم دونوں کی خوشیاں میرے یقین کی ضامن بنی رہیں۔ میرے پاس تم لوگوں کے لیے دعاؤں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔“

وہ بہت سنجیدہ تھیں۔ میں نے ان کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ وہ خوش ہو گئیں شاید پھر کچھ یاد آنے پر بولیں۔

”تم دونوں بیٹھو۔ میں ذرا احد کی خبر لوں۔ گوہر کے سنے پر سانپ لوٹ رہے ہوں گے۔“ وہ اٹھ کر چلی گئیں۔ اجو بھیا باہر جا کر سماں کو پکڑ لائے۔ جھجکتی

واش روم میں گھس کر دروازہ زور سے بند کیا۔ مجھے اس کے غصے پر اور اس حرکت پر زور کی ہنسی آئی۔ اب ہنسی روکی تو نہیں جاسکتی۔

”جائیں یہاں سے۔“ اندر سے اس کی آواز آئی۔

جھلاتی ہوئی۔

مجھے پھر ہنسی آگئی۔ اس کے باہر نکلنے کے آثار نہ تھے۔ اس لیے اسے بتا کر کہ میں جا رہا ہوں۔ باہر نکل آیا۔ ڈرائنگ روم میں امی پریشان سی کھڑی تھیں۔ اجو بھیا سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگیں۔

”عادل تم اور سماں۔ ابھی چلے جاؤ اظہر کے ساتھ لاہور۔“ ان کے انداز میں عجلت اور فکر مندی تھی۔

میں اپنی جگہ ٹھنک گیا۔ ”ابھی؟“

”ہاں ابھی تم نے وعدا کیا تھا کہ میری ہریات مانو گے۔ اب کوئی سوال نہیں کرنا۔ بہتری اسی میں ہے۔ مجھے کچھ خطرہ نظر آ رہا ہے۔“

اجو بھیا نے بھی کہا۔ ”امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ چلو اس سے پہلے کہ۔۔۔“

”کیا اس سے پہلے میں سمجھا نہیں۔ کیا رخصتی اس طرح۔۔۔ امی کو کیا ہو گیا ہے۔“ ہونقوں کی طرح امی کو دیکھنے لگا۔ اجو بھیا نے تیزی دکھائی۔ وہ سماں کو لے کر آگئے نہ جانے اس سے کیا کہا ہو گا۔ امی نے اسے گلے لگایا۔

”بیٹا میری جان! مجھے معاف کر دینا۔ سب کچھ اس طرح نہیں ہو پارہا۔ جیسا میں چاہتی تھی۔ مگر کبھی کبھی حالات ہمیں مجبور کر دیتے ہیں۔ بہتری اسی میں ہے کہ تم لوگ اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے گوہر سے کسی نیک ارادے کی امید نہیں۔“

سماں سٹپٹائی ہوئی تھی۔ ”پھپھو پاپا؟“

”اسے گوہر کمرے میں لے کر بند ہو گئی ہے۔ نہ جانے کیا منصوبے بنا رہی ہے۔ میں اس کی فطرت سے واقف ہوں۔ وہ تمہارے لیے کچھ اچھا نہیں سوچ سکتی نہ اپنی شکست قبول کر سکتی ہے آسانی سے۔ میں بعد میں آؤں گی۔ یہاں حالات کو کنٹرول کرنے کے بعد۔ چلو دیر نہ کرو شاباش۔“

اجو بھیا نے سماں کا ہاتھ پکڑ کر اسے تقریباً دھکا سا دیا۔ دوسرا دھکا مجھے میں تو ہکا بکا۔ معمول بنا ہوا تھا۔

اجو بھیا نے اپنی گاڑی کا اسٹیرنگ سنبھالا۔ اس سے پہلے وہ پچھلی سیٹ پر سماں کو بٹھا چکے تھے۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔ پیچھے سے سماں کی سسکیاں۔ اف کیا یہ واقعی رخصتی ہوئی ہے۔ یا امی کی بدگمانی۔

”پاپا پاپا۔“ سماں کی آواز فریاد کر رہی تھی۔

”سماں بیٹا! روتے نہیں۔“ اجو بھیا نے اسے تسلی دی۔ ”امی تمہارے پپا کو لے کر آئیں گی۔ مل لینا ابھی تم دونوں کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ خاصے فکر مند تھے۔

”اجو بھیا۔ آخر بات کیا ہے۔ مجھے تو امی نے کچھ بتایا نہیں۔“

”بتاتا ہوں۔ امی جو کر رہی ہیں۔ وہ صحیح ہے۔ دراصل۔ تمہاری ممانی کو اپنی ذلت کا دکھ ہے۔ وہ ماموں سے۔۔۔ تم دونوں کی علیحدگی کی بات کر رہی ہیں کہ تم پر دباؤ ڈال کر طلاق دلوائی جائے۔ اور ان کی طے کی ہوئی شادی کو وقت مقررہ پر ہونے دیا جائے۔“

مجھے سکتہ ہو گیا نہ جانے۔۔۔ یہ کہاں تک درست تھا۔

”امی جب ماموں کے دروازے پر دستک دینے لگیں۔ کیونکہ وہ کافی دیر سے اندر تھے۔ تو امی نے ممانی کی آواز سے اندازہ لگایا اور پھر بغیر دستک دیے آ گئیں۔ اور مجھ سے مشورہ کیا۔ کیا یہ غلط فیصلہ تھا؟ تم ہی بتاؤ۔“

اجو بھیا نے مجھے دیکھ کر کہا۔

سماں کی سسکیاں بھی رک گئیں۔

”امی نے صبح ہی ممانی کے گھر سے غائب ہونے پر ان کی نیت بھانپ کر تمہارے نکاح میں عجلت کی۔ دیکھو قدرت کو یہ ملاپ منظور تھا۔ تو سب وقت پر پہنچ گئے۔ اور سب کچھ ہو گیا۔ ورنہ ان کا منصوبہ تو آج رات کو اس شیفت کے ساتھ نکاح اور رخصتی کا تھا۔ ہم ان سے زیادہ تیز نکلے۔ ان ہی کے منصوبے پر۔ اپنا

سورج ڈوب چکا تھا۔ اجو بھیا نے واقعی بہت جلد منزل پر پہنچا دیا تھا۔ گیٹ پر نورین پھولوں کی پتیاں لیے کھڑی تھی۔ (استقبال؟) چند مسہلہاں اور پیچھے آیا بھی موجود۔ ہم گاڑی سے اترے۔ گل پاشی ہوئی۔ انہوں نے چند گانے گا کر ہمیں خوش آمدید کہا۔

اجو بھیا نے دونوں بہنوں کو لپٹا لیا لڑکیوں سے بھی مخاطب ہوئے۔ پھر آیا سے کہا۔

”ارے تمہارے ہاتھوں میں پھول کیوں نہیں ہیں؟“

”میں خود بھی خالی ہاتھ ہوں اجو بھیا۔“ آپا کی آواز رندھ گئی۔

میں نے نورین کے سر پر چپت رسید کی ”یہ کیا ڈرامہ کر رہی ہو تم۔“

”واہ جی۔ ایک تو اس قدر افراتفری میں آپ کی شادی ہوئی۔ ڈراما آپ نے کیا۔ میں تو لگ گئی کام سے۔ سب دوستوں کو بلایا۔ کھانا پکایا۔ آپ کو ایسی کیا آفت تھی۔ یا سماں کہیں بھاگی جا رہی تھی؟ وہ تو سدا آپ کی ہی تھی۔ پھر یہ جو میرے بغیر آپ نے شادی رچالی ہے۔ جرمانہ بہت شدید ہو گا۔ یعنی کہ ہزاروں۔“

”امی سے لینا۔ میرا اس میں کوئی دخل نہ قصور۔“

یہ کہہ کر میں تو اپنے کمرے میں جا گھسا۔ لاؤنج میں لڑکیوں نے محفل جمالی تھی۔ سماں کونج میں بٹھا کر گانے شروع ہو گئے۔ میں نے جھانکا۔ اجو بھیا بھی وہیں کرسی پر براجمان تھے۔ آپا بھی اُترے۔ مگر یہ کیا کیا یہ میرا کمرہ ہے۔ اب غور کیا۔ ہر طرف چمکیلی پتیوں والے مصنوعی پھولوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ گلدانیوں میں بھی نعلی پھولوں کی سوکھی بہار۔ پلنگ پر جو چادر تھی۔ گلابی رنگ کے پھولوں سے مزین۔ درمیان میں ایک لال پری اڑتی نظر آئی۔ افسیہ چادر کہاں سے نکالی گئی ہے اس قدر پھول دار پری سمیت۔

”نورین نورین۔“ میں نے اسے پکارا۔ ”یہ یہ کیا

حشر کیا ہے میرے کمرے کا۔“

”اتنا اچھا تو لگ رہا ہے۔ کس مشکل سے مارا مار جا

اب وہ ہنس رہے تھے۔ ”ہا ہا ہا“ گاڑی کی رفتار کچھ تیز تھی۔ میں نے اس طرف اشارہ کیا تو کہنے لگے۔

”ابھی ہم خطرے سے باہر نہیں نکلے۔ جو عورت

اس قدر سازشی ذہن رکھتی ہو۔ وہ کسی کو ہمارے

تعاقب میں بھی بھیج سکتی ہے۔ ظاہر ہے ہماری منزل

لاہور ہی ہے۔ اب سوچ رہا ہوں۔ لاہور کے بجائے

ہم پشاور کا پروگرام بنا لیتے تو وہ زیادہ محفوظ تھا لیکن اللہ

نے اب تک مدد کی ہے تو آئندہ بھی وہی مدد کرے گا ان

شاء اللہ۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلا شبہ ان کا چچا

جان پر ہو۔ ان کے گھر بھی کسی کو دوڑا دیں۔ تصدیق

کے لیے۔“

”لیکن آخر۔۔۔ وہ اس شیفت سے کس لیے متاثر

ہیں۔ آخر کوئی وجہ یا لالچ یا کوئی اور مقصد، لیکن کیا؟“

”سماں سے ضد یا وہ شخص بڑے خاندان کا داماد بن

کر کوئی مالی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہو یا پھر صرف اعلا یا

رسوخ خاندان کا فرد بننا ہی مقصد ہو۔ کچھ بھی ممکن

ہے۔ بہر حال ہمیں ذہن تھکانے کی ضرورت نہیں۔“

”اجو بھیا آپ کا کل آفس ہے۔ آپ ہماری وجہ

سے اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ہمیں بس میں بٹھا

دیں۔“

”نہیں۔ دیکھوں گا خیر رات میں کسی وقت نکل

جاؤں گا پشاور کے لیے۔“

اصل میں۔۔۔ آصفہ بہت ڈرتی ہے۔ رات میں

تنہائی کے بھوت اسے تنگ کرتے ہیں۔ اس لیے

واپس جانا ضروری ہے۔“

”اسی لیے کہہ رہا ہوں۔ ہم بس سے جا سکتے

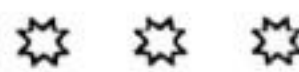
ہیں۔“ میں نے زور دیا۔ لیکن اب پنڈی شہر پیچھے رہ گیا

تھا۔ اور اجو بھیا بہت مگن انداز میں ڈرائیو کر رہے

تھے۔ پچھلی سیٹ پر خاموشی تھی۔ نہ جانے کیا سوچ

رہی ہوگی۔ شیفت سے شادی۔ کھانے تو مزے دار

ملتے۔“



لاہور آگیا۔ ہم اپنے محلے میں داخل ہو گئے۔

پس صوفے پر بٹھالیا اور میری ناگہانی شادی کا حال
سنانے لگے۔ نورین بھی آگئی۔

”اب ایسا ہے کہ۔۔۔ کھانے کے بعد میں چلا جاؤں
گا۔ راشد بھائی سے مل کر آتا ہوں۔ تب تک تم کھانا
لگاؤ۔ مہرین کو بھی چھوڑ دوں گا گھر بچوں سے گپ
شب ہو جائے گی۔“ وہ کھڑے ہوئے تو آپا بھی
کسمساتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔

میں گھر میں بیٹھ کر کیا کروں گا۔“ میں نے کہا۔
”میں بھی چلتا ہوں۔“
”تم؟ کیوں؟ یار! تم تو گھر میں رہو۔“ اجو بھیا نے
کہا۔

”میں بھی بچوں سے مل لوں گا۔ لڑکیوں میں بیٹھ کر
کیا کروں؟“ میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔
”صرف لڑکیاں ہی نہیں ہیں۔ تمہاری ایک عدد
دلہن بھی ہے یہاں۔ اس کو سلی دو۔ دل بہلاؤ۔“
میں جھینپ گیا۔ ”آپ اجو بھیا۔ وہ سوچکی ہے۔“
”بھائی کھانا کھا کر ہی چلے جاتے۔ ابھی لگا دیتی ہوں
آپا بھی کھا لیتیں۔“ نورین نے مشورہ دیا۔

”نہیں میں وہیں کھالوں گی۔ دیر ہو گئی ہے۔ سب
سونہ گئے ہوں۔“ آپا بے چین تھیں بھائی جان گھر پر
ملے۔ جاگ رہے تھے۔ اجو بھیا نے بہت محبت سے
انہیں گلے لگایا۔ میرا مصافحہ گے لیے برنھا ہوا ہاتھ
انہوں نے نظر انداز کر دیا۔ مانی شانی کو پکارنے لگے۔
ساریہ دوڑتی ہوئی آئی۔ آپا سے لپٹ گئی۔ پھر میری
طرف مسکراتی ہوئی آئی۔ انجھی میں نے اس کا ہاتھ پکڑا
ہی تھا کہ بھائی جان نے ناگواری سے کہا۔

”ساریہ! اندر جاؤ۔ بوا سے کہو چائے بنا لیں۔ ماں تو
تمہاری بھائیوں کی خوشی میں آداب میزبانی بھول گئی
ہیں۔ مہمان بن گئی ہیں۔“

ساریہ ڈر کر پیچھے ہٹی اور اندر بھاگ گئی۔ آپا بھی
شرمساری اندر چلی گئیں۔

اجو بھیا کو عجیب سا لگا۔ بولے ”ارے نہیں راشد
بھائی۔ ہم مہمان تو نہیں ہیں۔“ اصل میں دو سال بعد
مہرین سے ملا ہوں میں۔ اس لیے کچھ جذباتی ہو رہی

کر خریدی تھیں یہ لڑیاں۔ اصلی پھول بہت مہنگے تھے
ناں بھئی۔“ بے چارگی کی تفسیر سنی کھڑی تھی۔ اجو بھیا
آگئے۔ مننے لگے۔

”ٹھیک تو ہے۔ اب جلدی کا کام تو ایسا ہی ہوتا
ہے۔“ ذرا سماں کو تو بلا کر لاؤ۔ وہ بھی دیکھے اپنا جملہ
عروسی۔“

میں نے جب تک دو لڑیاں ہی دیوار سے اتاری
تھیں جب سماں کو وہ آفت زدہ لڑکیاں پکڑ لائیں۔ اف
یہ مضحکہ خیز صورت حال۔ میں بھنا کر باہر آ گیا۔ اور
صوفے پر گر گیا۔ اجو بھیا نے آکر کہا۔

”ارے گاڑی جہاز کی رفتار سے میں نے چلائی۔
تھک تم گئے۔ واہ تورین چائے۔“

چند منٹ بعد ہی نورین چائے لے آئی۔ ”کڑک
چائے بنائی ہے۔ ناکہ آپ لوگوں کی تھکن اتر جائے۔
“ وہ اپنی کارگزاری کا ڈھول نہ پیٹے کیسے ہو سکتا تھا۔
”اور سماں کو امی کے کمرے میں لے جا کر لٹا دیا ہے
ناکہ وہ بھی اپنی تکان اتار لے۔ یہاں تو شور ہو رہا ہے
اور بھائی نے اپنے کمرے کو کباڑ خانہ بنا دیا ہے۔“

”صرف دو لڑیاں اتار کر پھینکی ہیں۔ تم انہیں اٹھا
نہیں سکتیں؟ اور ہاں یہ کباڑ آپ کا ہی مہیا کیا ہوا
ہے۔“ میں چڑ گیا۔

”نورین! تم سماں کو بھابھی نہیں کہو گی؟“ اجو بھیا
نے ٹوکا۔

”عمر بھر نام لیا ہے۔ مجھ سے چھوٹی ہیں محترمہ
صاحبہ۔“ منہ بنا کر توجیہ پیش کی۔

لڑکیوں نے پھر ڈھول سنبھال لیا تھا۔ شادی کے گھر
کا ماحول بن گیا۔ آپا خاصی ست سی تھیں۔ مجھے یک
لخت یاد آیا۔

”بھائی جان۔۔۔ انہوں نے یقیناً کوئی فساد برپا کیا
تھا۔ آپا بلا وجہ چیپ نہیں رہ سکتیں۔ ان کو غصہ بھی آتا
تھا۔ اور وہ ہم لوگوں پر بگڑنا اور جھگڑنا اپنا حق سمجھتی
تھیں۔ مگر بھائی جان خود بہت غصے والے تھے۔ خاصے
گستاخ واقع ہوئے تھے۔ لحاظ و مروت سے عاری۔ آپا
ان کے غصے سے ڈر جاتی تھیں۔ اجو بھیا نے آپا کو اپنے

ہے اور آپ عادل کو تو مبارکباد دیں۔ آج ہم نے
آنا فانا ان کو دو لہا بنا دیا۔ بے چارہ پکڑا گیا۔ ”حکم
حاکم مرگ مفاجات“ کی مانند۔“

وہ دانت پیس کر بولے ”ہوں ہوں۔ جانتا ہوں۔
کس لیے آنا فانا“ یہ کام ہوا ہے۔ میری ضد میں۔“
پھر جو شروع ہوئے تو کسی کو بولنے نہ دیا۔ وہی
شکوہ گلہ کہ امی نے محض ان کی ضد میں یہ ڈھونگ رچایا
ہے۔ ورنہ کوئی اس طرح اپنے اکلوتے کلائق فائق
بیٹے کی شادی کر سکتا ہے۔ جس میں کوئی شریک نہ ہو۔
یہ محض داماد کو ذلیل کرنے کے لیے ڈراما کیا ہے۔“

اجو بھیا نے ان کے چپ ہوتے ہی صفائیاں دینا
شروع کیں، نہیں سمجھانا چاہا کہ اس وقت پچویشن ہی
ایسی ہو گئی تھی کہ مجبوراً اس طرح عجلت میں نکاح
کرنا پڑا۔ ورنہ یہ رشتہ تو امی نے بچپن سے ہی ان
لوگوں کا طے کیا ہوا تھا بلکہ اس معاملے کو عادل اور سماں
سے بھی پوشیدہ رکھا تھا۔ کہ جب بڑے ہو جائیں گے
تو ظاہر کیا جائے گا۔ لیکن سماں کو والدہ کی فوتگی اور
دوسری ماں کی کوشش کہ ان کی مرضی سے سماں بیاہی
جائے۔ امی کو مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ عادل کو تو منگنی
کی نیت سے بلایا تھا۔ مجھے بھی مگر۔۔۔ حالات ایسے ہو
گئے۔ میں نے خود عادل کو سمجھا کر فوری نکاح کے لیے
راضی کیا تھا۔“

اجو بھیا تو حقیقت بیان کر رہے تھے مگر بھائی جان
بھلا کس کی سنتے ہیں۔ ضدی اڑیل پھر سے شروع ہو
گئے۔ اور کھل کرتانے لگے کہ وہ عادل سے اپنی بہن
بیاہنا چاہتے تھے۔ اور یہ عمل۔۔۔ اب بھی ممکن ہے۔
اجو بھیا میری طرف دیکھنے لگے۔ میں مجرموں کی طرح
گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ بھائی جان دانت پیس رہے
تھے۔ ہونٹ چبار ہے تھے۔ اجو بھیا نے غور نہیں کیا۔
مگر میں چونک گیا۔ اب بھی ممکن ہے۔ ”کا مطلب کیا
تھا۔ وہ اپنی ضد رازے ہوئے تھے۔“

”اجو بھیا! چلیں۔“ میں نے کھڑے ہونے میں
عافیت سمجھی۔ اجو بھیا کھڑے ہو گئے۔
”جاتے ہوئے اپنی بہن کو ساتھ لے جانا۔ میری

بہن میرے گھر تمہاری بہن تمہارے گھر۔“
اجو بھیا حواس باختہ ہو گئے۔ یہ کیسی جاہلانہ فرمائش
تھی۔ میں تو جانتا تھا اس لیے پرسکون تھا۔
”بھائی! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ تو سراسر نا انصافی
ہے۔“

”ہے تو سہی۔ مگر اس کا یہی نتیجہ نکلتا ہے۔“ وہ
ہٹ دھری سے بولے۔

اب دونوں میں نئے سرے سے بحث شروع ہو
گئی۔ دلیل، تاویل، معذرت، صفائیاں، وضاحتیں،
سب فضول، بیکار۔ ایک ضدی، ہٹ دھرم، جاہل
(میری نظر میں) شخص اڑا ہوا تھا، بچوں، گھر کی تباہی کا
کسی کی اہمیت نہ تھی۔ اہمیت تھی تو اپنی ذات کی اپنے
فرمودات کی۔

”بھائی! خدا کا خوف کریں۔ بے قصور عورت کو
کس بات کی سزا دینا چاہتے ہیں آپ۔ بچوں کو مامتا
سے محروم کر کے گناہ مول لے رہے ہیں۔“ بھیا زچ
ہو کر گڑ گڑانے لگے۔ تقریباً۔“

”تو جس کا قصور ہے۔ اس سے کہو۔ اب بھی وقت
ہے۔ میری بات مان لے۔ میری عزت رکھ لے۔
بہنوئی سمجھتا ہے تو اس کا وقار بھی قائم رکھے۔“
”جی؟ میں سمجھا نہیں۔ کیسے؟ یعنی کہ“ اجو بھیا گڑ
بڑا گئے۔

”ایسے کہ میری بہن سے شادی کر لے۔ ابھی
وقت گزرا نہیں۔“ اجو بھیا بو کھلائے۔ میں تلملایا بلکہ
ہونق بن گیا۔

”صاف بات ہے۔ میری بہن کی عادل سے شادی،
تمہاری بہن کی آبادی۔ اب اجو بھیا ہونق بن گئے۔
پہلے مجھے پھر بھائی جان کو دیکھا۔ بے یقینی سے۔“
”مگر عادل کی تو شادی ہو چکی ہے۔“

”رشتہ تو میں نے پہلے دیا تھا۔ مجھے ذلیل کرنے کے
لیے آنا فانا“ وہاں جا کر رشتہ طے کر دیا۔ کیا قیامت
پچھا کر رہی تھی کہ لڑکی بھاگی جا رہی تھی۔“

”استغفار بھائی کس طرح کی سوچ ہے آپ کی۔
خاندانی معاملے میں ایمر جنسی ہو بھی جاتی ہے۔ بتایا تو

”نہیں رہ سکتی۔ جانے کا حکم ہوا ہے۔“
 ”کچھ دن رہ کر سمجھاؤ تسلی سے مزنہ کو کہو وہ
 سمجھائے۔“

”انہیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں۔ صرف فرشتے
 سمجھا سکتے ہیں اور میں اور مزنہ فرشتے نہیں۔“ عجب سا
 صبر ان کے لہجے میں تھا۔ میں ٹھٹھرنے لگا۔
 ”اچھا رکو۔ میں ایک کوشش اور کر کے دیکھتا
 ہوں۔“

اجو بھیا گھر کے اندر چلے گئے۔ میں اندھیرے کی
 چادر آگے بڑھتا دیکھ رہا تھا۔ آپا شاید کوئی آس کا سرا
 تھا مے کھڑی تھیں۔ میں جانتا تھا۔ بھائی جان اب کوئی
 دلیل نہیں مانیں گے ان کی انادر میان میں تھی۔ وہی
 ہوا صبر آزما چند منٹ جو شاید گھنٹوں پر محیط تھے۔ گزر
 گئے۔

اجو بھیا۔ آگئے تھے۔ سیاہی نے ان کو پوری طرح
 اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے آئے اور
 آگے کوچل پڑے۔ میں نے بیگ آیا سے لے لیا۔ ان
 کا بازو پکڑ کر میں بھی باہر نکل آیا۔ گھر میں۔ اب
 خاموشی تھی۔ نورین نے کھانا میز پر رکھ دیا تھا۔ آپا کو
 بیگ سمیت آنا دیکھ کر کوئی سوال نہیں کیا۔
 ”سماں نے کھانا کھا لیا؟“ اف اجو بھیا کا خیال۔ ان
 حالات میں بھی انہیں سماں کی فکر۔

”جی۔ میں نے سماں نے سب سہیلیوں نے۔ اجو
 بھیا مانی شانی اور ساریہ کو بھی لے آتے۔“
 آپا جو محض اجو بھیا کی خاطر کھانے لگی تھیں میز پر
 سر رکھ کر رونے لگیں۔ سب نے ہاتھ روک لیے۔
 بھیا بے چینی سے ٹھلنے لگے۔

”اف مہرین! میرے ساتھ چلو۔ میں ان حالات
 میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ رک بھی نہیں
 سکتا۔ مجھے آج ابھی روانہ ہونا ہے۔ آصفہ نے ڈرنا
 شروع کر دیا ہو گا۔“

”نہیں بھائی۔“ آپا نے سراٹھا کر کہا۔ ”آپ
 جائیں۔ میں ٹھیک ہوں۔“ ان کی سرخ آنکھیں الفاظ
 کی نفی کر رہی تھیں۔

تھا ابھی آپ کو۔“ سخت حیران تھے اجو بھیا مگر ضدی
 اڑیل ٹٹو ہر گز ماننے پر تیار نہ تھا۔ راشد مسعود نام کا۔
 ”اگر میری بہن کی آبادی کے لیے یہی شرط ہے
 آپ کی۔ تو میں مانے لیتا ہوں۔ میں کر لوں گا آپ کی
 بہن سے نکاح۔“ اجو بھیا پسا ہو گئے۔
 ”چونک گئے۔ کندھے اچکائے۔“ میں تمہارا بسا
 بسایا گھر کیوں اجاڑوں؟ جانتا ہوں تم اپنی بیوی سے
 بہت محبت کرتے ہو۔ عادل نے تو ابھی اسے دیکھا بھی
 نہ ہو گا۔ زبردستی کی شادی ہوئی ہے۔ اسے سمجھا لو۔
 بس۔“

منہ موڑا اور اندر غرا پ۔ سفید چہرہ لیے آپا بھی
 اندر چلی گئیں۔ اجو بھیا سکتے کی سی کیفیت میں کھڑے
 تھے۔ میں کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ جہاں اندھیرے
 کی حکمرانی تھی۔ کوئی جگنو نہ تھا۔ نہ سکھ کا اجالا۔ نہ
 اطمینان کی کرن۔ صرف تاریکی۔ اندیشے اور فکر۔
 میں نے دل کو ٹٹولا کیا مجھے قربانی دینی چاہیے؟ آپا
 کے سکھ کی خاطر۔ بچوں کی خاطر۔ بھائی جان کے وقار
 کے ثبوت کے لیے۔ لیکن کیوں؟ بھائی جان یہ کیوں
 نہیں سوچ رہے۔ اجو بھیا کا بسا ہوا گھر کیوں اجاڑیں۔
 اپنا ہی اجاڑ لیں۔ مقصد؟ فضول۔ بہن کی شادی اب
 سے دس سال پہلے ہو جانی چاہیے تھی۔ نہیں ہو سکی تو
 ہمارا کیا قصور۔ اب ہوش آیا ہے؟ واہ بھئی میں ہی مٹی
 کا مادہ ہوں انہیں۔ کوئی راستہ۔ کوئی حل۔ آسان سی کوئی
 تدبیر کچھ نہیں۔

”چلیں؟“ میں نے خیالوں میں گم اجو بھیا کی آواز
 سنی۔ مڑ کر دیکھا۔ مایوسی اور صدمہ ان کے خوب
 صورت چہرے پر رات کی تاریکی کی طرح پھیلا ہوا تھا۔
 ہم دونوں مڑے۔ پیچھے سے آپا کی آواز آئی۔
 ”ٹھہرو مجھے بھی جانا ہے۔“ اجو بھیا نے مجھے ہمیں
 نے مڑ کر آپا کو دیکھا۔ وہاں وہی تاریکی تھی۔ اندر سے
 بچوں کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ ساریہ بلبلا رہی
 تھی۔ اف۔

”تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ گھر میں رہو۔ بچوں کے
 پاس۔“ اجو بھیا انہیں ڈانٹ رہے تھے۔

نے آیت الکرسی پڑھ کر دم کر دیا بھیا پر بھی گاڑی پر بھی۔ فکر نشستا۔ وہی آکر بتائیں گے آپ کو لاہور آنے کی وجہ۔ اور دیر ہونے کی وجوہات۔ اللہ حافظ۔“

پوری دادی اماں بن جاتی تھی سب کی۔ میں کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی نیند کا حملہ ایسا شدید کہ کچھ ہوش نہ رہا۔ حالانکہ نہ ذہن مطمئن تھا نہ دل پر سکون۔

www.Paksociety.com



صبح ہرے حسب معمول اجلی اور روشن۔ بوانے ناشتہ میز پر رکھ دیا تھا۔ خوشبودار آلیٹ اور پرائٹھے۔ نورین چائے کی کیتلی لیے آرہی تھی۔ حسب عادت کچھ بولتی ہوئی۔ میں نے آپا کے متعلق پوچھا۔ منہ بنانے لگی۔

”انہیں کیا ہونا ہے۔ ٹھیک ہیں۔ چپ چپ سی ہیں۔ اپنی دلہن کے بارے میں تو پوچھیں۔ بے چاری آدھی رات کو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ روتی رہی۔“

”کیوں؟“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”لو۔۔۔ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ بھئی امی کی وجہ سے۔ اپنی بے تکی شادی کی وجہ سے۔ اور آپ نے پلٹ کر خبر تک نہ لی۔“

”میں؟ میں کیا خبر لیتا؟ مجھے تو خود ہی کچھ عجیب عجیب سا لگ رہا ہے۔ بھائی جان نے مجھے چور بنا دیا ہے۔ اجو بھیا کس قدر بریشانی میں گئے ہیں۔ آیا الگ۔۔۔ بلا خطا کے سزا کی مستحق ٹھہرائی جا رہی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے۔ یہ شادی ہی غلط وقت برہوئی ہے اور امی نے اپنی بیٹی کی محبت میں۔۔۔ سب کو امتحان میں ڈال دیا ہے میرے بارے میں تو سوچا ہی نہیں۔“ افوہ میں بھی

”اچھا جی تو شادی کے وقت کیوں چپ رہے۔“

نورین بد مزاج نہ تھی۔ مگر اس وقت وہ بھی اپنی کزن کی حمایت میں بگڑ رہی تھی۔ ”سب کی بے چاری نظر آ رہی ہے۔ وہ بے چاری معصوم بے خطا پڑی ہے ادھر۔ روتی رہی غریب۔“

”تم چلو میرے ساتھ۔ دو تیس دن بعد چھٹی لے کر آجاؤں گا ساتھ آجانا۔ ایک بار اور کوشش کر لوں۔“

مگر آپا نے کچھ سوچ کر فیصلہ کر لیا تھا۔

”نہیں بھیا! میں ٹھیک ہوں۔ آپ جائیں۔“ وہ باہر آمدے میں نکل گئیں۔ اجو بھیا کو ہم نے زبردستی باہر بھیجا۔ میں نے اور نورین نے انہیں گاڑی میں بٹھایا۔

”اجو بھیا! فکر نہ کریں۔ بھائی جان بد مزاج ہیں مگر بچوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ کچھ وقت گزرے گا تو۔ غصہ کم ہو جائے گا۔“

”کاش آپ بھابھی کو بھی لے آتے۔ تو میں کبھی آپ کو آج جانے نہ دیتی۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ امی کو خیال ہی نہ آیا کہ۔۔۔ ایک بڑی بہن ایک چھوٹی بہن ایک اکلوتی بھابھی بھی شادی میں شریک نہ ہوئیں۔ دیکھئے گا۔ میں ان سے کتنا لڑوں گی اس بات پر۔“

سخت خفا تھی۔ اجو بھیا مسکرانے لگے۔ پھر نورین کو گلے لگا لیا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ان کی نظریں نہ جانے مجھ سے کیا کہہ رہی تھیں۔ کوئی سوال کوئی خواہش شاید آیا۔

میں نے انہیں نظروں ہی نظروں میں تسلی دی۔ پھر وہ چلے گئے۔ اور اندر گھر میں آنے تک میں نورین کے سوال کا جواب دے چکا تھا۔ آپا کی بیگ کے ساتھ تشریف آوری۔ نورین جاننا چاہتی تھی۔ ایسا کیا ہوا جو وہ بچوں کے بغیر پہلے بھی اور اب دوبارہ بھی آگئیں۔ آج سے پہلے کبھی ایسا ہوا نہ تھا۔

اور جب میں نے بھائی جان کی فرمائش ضد، حکم سنایا وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر حیرت سے چپ کی چپ رہ گئی۔

اندر آکر اس نے فون اٹھایا اور آصفہ بھابھی سے بات کی انہیں اجو بھیا کی روانگی کا بتا کر تسلی دی۔

”پریشان نہ ہوں بھابھی بس کسی وجہ سے دیر ہو گئی۔ لاہور ہاں ہاں لاہور آگئے تھے نا۔ بہت فاسٹ ڈرائیو کرتے ہیں بھیا۔ ان شاء اللہ جلدی پہنچ جائیں گے۔ آپ تب تک ٹی وی ڈرامے دیکھیں۔ جی میں

”اچھا اچھا آپ کو بلا کر لاؤ اور سماں کو بھی۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

”بلایا ہے۔ آجائیں گی۔ سماں کو امی کی فکر ہے۔ گوہر جان سے کچھ بعید نہیں وہ۔۔۔ کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ ماموں کو مٹھی میں لے رکھا ہے۔“

”امی بہت بہادر اور ہمت والی ہیں۔ انہیں کوئی ڈرا نہیں سکتا۔ میں ماموں کے آفس فون کر کے خیریت پوچھ لوں گا۔ گھر پر شاید ممانی کو اچھانہ لگے۔“

آپ آگئیں۔ سماں کو نورین لے کر آئی۔ آپ کے چہرے پر غصہ کرختی اور بے زاری صاف نظر آرہی تھی۔ وہ سماں کو نظروں سے جلا کر بھسم کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ظاہر ہے انہیں سماں قصور وار لگ رہی تھی۔ سماں سر جھکائے ناشتہ کر رہی تھی۔ نورین اس کی خاطر میں لگی ہوئی تھی۔ اور کچھ دلچسپ فقرے بھی چست کر رہی تھی۔

آپ کو نورین پر بھی غصہ آرہا تھا۔ وہ اسے جھڑک دیتیں۔ مگر نورین کو پروا نہ تھی۔ اسے سماں کو خوش کرنا تھا۔ سماں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ پتا نہیں۔ اسے ہنسی آ بھی رہی تھی یا نورین فضول بول کر۔۔۔ شاید آپ کو ہی غصہ دلا رہی تھی۔ ان کو تو اپنے میاں صاحب پر غصہ آنا چاہیے تھا۔ مگر وہاں تو گم صمم تھیں۔

”آپ! آپ بھائی جان کو سمجھاتیں۔ کتنی غلط ضد اور فضول فرمائش مجھ سے کر رہے ہیں۔ اور آپ کو بھی بے قصور۔۔۔ یہ تو زیادتی ہے۔“

”میں کچھ کر سکنے کی پوزیشن میں ہوتی تو سمجھاتی۔ تم نے مجھے موقع دیا نہ حق۔“ ان کا لہجہ تلخ بیزاری اور شکوے سے پر تھا۔

”آپ۔۔۔ آپ پہلے ہی۔۔۔ یہ موقع آنے ہی نہ دیتیں۔ مزہ آپ مجھ سے کتنی بڑی ہیں۔ اور میں پچھلی بار یعنی جب پہلی دفعہ بھائی جان نے تجویز دی تھی۔ تب ہی انکار کر چکا تھا۔ میں۔۔۔ مزہ آپ کی عزت کرتا ہوں۔ بہن سمجھتا ہوں۔ کتنے غلط موقعے پر انہوں نے یہ شوشا چھوڑا ہے۔ اور اب تو۔۔۔“

”ہاں۔ اب تو تم مجبور ہو۔“ وہ جھلا گئیں۔ ”ایک

بہن کی خاطر کیا یہ کڑوا گھونٹ نہیں پی سکتی تھے۔ اگر میری جگہ نورین ہوتی۔ اس کی خوشی کی خاطر۔۔۔ کیا یہی کرتے؟ نہیں کیونکہ وہ تمہاری سگی بہن ہے۔ میں مجھے بھلا یہ حق کس نے دیا ہے۔۔۔ ماں جانی نہیں ہوں میں اس لیے۔۔۔“ وہ زہریلے لہجے میں بولیں۔

میں دنگ رہ گیا۔

”آپ! خدا کا خوف کریں۔ ہم نے کبھی آپ کو خود سے الگ سمجھا ہے؟ آپ میری بڑی بہن ہیں۔ جیسے نورین چھوٹی۔ امی نے ہمیں یہ تعلیم نہیں دی۔ انہوں نے خود بھی کبھی آپ کو بیٹی کے درجے سے کم نہیں سمجھا۔ کبھی انہوں نے آپ کی حق تلفی کی؟ ہمیشہ یہی سمجھایا کہ آپ ابابکی بیٹی ہیں۔ اجو بھیا بیٹے ہیں جیسے تم دونوں ہو۔ خون کارنگ کیا الگ ہوتا ہے۔ آپ کے دل میں یہ خیال آیا کیسے؟“

میری آواز بھی کچھ بلند ہو گئی۔ نورین اور سماں جا چکی تھیں۔ میں نے آپ کی ہمدردی میں یہ ذکر چھیڑا تھا۔ آپ اجزبز ہو رہی تھیں۔

”اب کیا بتاؤں۔ خیال پر پابندی تو نہیں لگائی جا سکتی۔ کہنے کو الفاظ بھی نہیں رہے میرے پاس۔ میں تو خالی ہاتھ لاوارث ہو گئی۔“ آواز ان کی بھی تھر تھرا رہی تھی۔

”آپ! میرے سوالوں کے جواب دینے کے بجائے خود پر مظلومیت طاری نہ کریں۔ بچے آپ کے بڑے ہو گئے ہیں۔ آپ نے لمبا عرصہ بھائی جان کے ساتھ گزارا ہے۔ پھر بھی آپ ان سے کچھ منوانے میں کامیاب نہیں ہوئیں۔ آپ کو میں ملزم نظر آ رہا ہوں۔ بھائی جان کی ہٹ دھرمی میں اس پر غور کر لیتا۔ اور سوچنے آخر کیوں؟ میں اپنی زندگی کے ایسے اہم موقع پر۔۔۔ اپنی مرضی یا اپنی ماں کی خواہش کے بجائے۔ بھائی جان کی فرمائش کیوں پوری کروں۔ آپ غور کریں۔ ایک سال پہلے تک تو وہ مجھے مخاطب تک نہیں کرتے تھے۔ میں آپ کی اور بچوں کی وجہ سے آپ کے گھر جاتا تھا۔ بھائی جان میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیتے تھے۔ حقارت کی نظر سے دیکھتے اور منہ پھیر کر

الگ بیٹھ جاتے۔ انہوں نے کبھی مجھے اپنے ہم پلہ نہیں سمجھا۔ عزت تو دور کی بات ہے۔ کبھی بات کرنے کے لائق نہیں جانا۔“

میں نے دل کے پھپھولے آج پھوڑ دیے۔ جو حقیقت تھی۔ میرے دل کو اکثر ان کے ناواجب رویے کی چھین اذیت میں مبتلا کر دیتی۔ امی سے میں نے کئی بار کہا۔۔۔ وہ لا پرواہی سے کہہ دیتیں۔

”بعض لوگ سسرال والوں کو اہمیت نہیں دیتے۔ تمہیں ان سے کیا۔ اپنی بہن سے ملنے جاتے ہو۔ بچوں کی خاطر ملتے ہو۔ وہ مخاطب نہ ہوں۔ مگر تم سلام بھی کرو اور مخاطب بھی ہوا کرو۔ بعض گھرانوں میں اب بھی یہ طریقہ ہے۔ اسے نظر انداز کر دینا چاہیے۔ مگر عزت میں کمی نہ ہو۔“

اور اب آپا شاید غور کر رہی تھیں۔ لیکن ان کی ضد اور بدگمانیوں کی حد نہ تھی۔ بچپن سے ہم نے ان کو ہر کسی سے لڑتے۔ روٹھتے دیکھا تھا۔

”اگر بہن سمجھتے میری بربادی کی فکر ہوتی۔ تو کوئی راستہ نکالتے۔ مجھے بے یار و مددگار نہ چھوڑتے۔“

آپا بھائی جان سے کم نہ تھیں۔ انہیں سمجھانا۔ ان سے کچھ منوانا۔ پہاڑ سر کرنے کے برابر تھا۔ ادھر اجو بھیا تھے۔ نرم مزاج، نرم گفتار، صاف دل۔ محبت کرنے والے۔ امی کی تابع داری فرض سمجھتے۔ آپا دراصل اپنی ننھیال کے زیر اثر تھیں۔ جہاں انہیں امی کی طرف سے ورغلا یا جاتا۔ سوتیلی ماں کے ظلم و ستم کی داستانیں سنا کر انہیں نفرت پر مجبور کر دیا جاتا۔ اب بھی وہ اپنی مظلومیت پر قائم تھیں۔ ارے بابا۔ وٹہ سٹہ اور اتنا اٹھل بے جوڑ۔

جھک مار کر میں اٹھا۔ اور آفس کے لیے روانہ ہوا۔ جاتے ہوئے بے ارادہ میری نظر سماں کی طرف گئی۔ وہ برآمدے میں کھڑی تھی۔ ہر اسماں اور پریشان بچاری مجھے غصہ آرہا تھا۔ ہر کسی پر۔ امی، ماموں، سماں بھائی جان کوئی بھی یہ نہیں سمجھ سکے گا۔ کہ سب نے میرے ساتھ کیسی زیادتی کی ہے۔ میں تو باقاعدہ الو بنایا گیا ہوں۔ ظلم ہوا ہے مجھ پر۔ زبردستی ایک زنجیر سے باندھ کر

میرے صبر و ضبط کو آزمایا جا رہا ہے۔ میں کیا اتنا گیا گزرا ہوں۔ شادی۔ افوہ! کسی کی شادی ایسے ہوتے دیکھی نہ سنی۔

اور سماں۔ اس پر سب سے زیادہ غصہ تھا۔ وہ تو کچھ بولتی۔ اپنی خواہش کا اظہار کرتی۔ اکلوتی اولاد تھی۔ وہ ماموں سے کہتی۔۔۔ اسے یہ شادی منظور نہیں، بھئی میں کب اس سے شادی کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ فضول لڑکی امی کی لاڈلی تھی بس۔ پتا نہیں وہ کیا سوچتی ہوگی۔ میری بے اعتنائی آپا کی نفرت۔

افوہ! میں تو امی کی تابعدار اولاد ہونے کے جرم میں سزا بھگت رہا ہوں۔ مجھے امی پر یقین ہے۔ وہ بہت سمجھ دار اور پر شفقت ماں ہیں۔ میرے لیے غلط نہیں سوچیں گی۔ وہ جو اجو بھیا اور آپا کے لیے اتنی مہربان اور شفیق ماں تھیں۔ میں تو پھر ان کی اولاد ہوں۔ انہوں نے یقیناً سماں کے لیے بھی اچھا سوچا ہوگا۔ افراتفری اور عجلت کے اس بندھن کو۔ مضبوط بنانا اب میری ذمہ داری تھی امی نے یہی سمجھایا تھا اور میں۔۔۔ اف میرا ذہن۔۔۔ کس قدر منتشر ہو رہا تھا۔

آفس پہنچتے ہی ماموں کو فون کیا۔ بہت خوش تھے۔ سماں کے بارے میں سوال کیا۔

میں نے امی کا پوچھا۔ انہوں نے بتایا۔

”وہ بہت مصروف ہیں۔ جلد آجائیں گی۔“

”افوہ۔“ کیوں وہاں رکی ہوئی ہیں؟ بے وجہ کوئی کام نہیں کرتیں۔ یہ تو اہم معرکہ سر کر کے آئیں گی ورنہ۔۔۔ لاڈلے سپوت اور جان سے پیاری بھئی کو اس طرح کیسے چھوڑ سکتی ہیں۔ ڈرتے ڈرتے اللہ کا نام لے کر امی کو ماموں کے گھر ہی فون کر لیا۔ شاید فون کے قریب ہی بیٹھی تھیں۔ شکر ادا کیا۔ پھر ناز بھرے شکوے۔

”آئیں کیوں نہیں آپ حد ہو گئی۔ میں لینے آجاؤں؟ اکیلا چھوڑ دیا مجھے۔ یہاں معاملات خاصے گنہگار ہیں۔ آئیں نا۔ آکر سدھاریں۔“ وغیرہ وغیرہ۔

”فضول باتوں کے لیے فون کیا ہے؟ اب تک تو چپ کی مر لگائے بیٹھے تھے۔ بے وقوف وہاں کے

”اچھا؟ بے سکونی کا مداوا۔ ہوں دیکھ رہی ہوں میں مسکراتے ہوئے آتے ہیں آئے کمرہ بند۔ پھر صبح ہی باہر نکلے ناشتہ کیا۔ روانہ کہاں؟ اللہ جانے؟“

میں گڑبڑا گیا نہ تو۔۔۔ بے سکونی کا مداوا نہ کروں۔ بیٹھا رہوں گھر میں؟ فضول۔“

”اچھا اپنی بے سکونی کا مداوا کرنے کا ہفتہ بھر کا شیڈول طے کر لیا۔ یہاں جو گھر میں سب بے سکون ہیں۔ آپ ان کا بھی کچھ خیال کریں۔ سماں کو تو آپ نے بھلا ہی دیا۔ وہ بے چاری۔“

وہ بے چاری ”آپا بے چاری اور میں بے چارہ کیا کروں؟“ تم جو ہو چارہ گر۔ سب کی دادی۔۔۔ بھلا بھائی جان کے غصے کے لیے میں کس طرح جادو کی چھڑی لے کر ان پر اپنا کمال آزماؤں جو وہ خوشی خوشی آپا کو آپ لے جائیں۔“

میرے خیال میں تو یہی علاج تھا بھائی جان کو سیدھا کرنے کا۔ کوئی جادو کی چھڑی۔ آپا کا غم زدہ وجود۔ بچوں سے جدائی کا دکھ گھر سے دور ہونے کا دکھ۔

”پتا نہیں بھائی جان کا غصہ کب ختم ہوگا۔ اس کے ساتھ سب کی پریشانی بھی ختم ہو جائے گی۔“

”بھائی! آپا اسکول گئی تھیں۔“ تورین نے انکشاف کیا ”بچوں سے ملنے۔ وہ اسکول نہیں گئے تھے۔ آپا اپنے پڑوسیوں کے گھر گئیں۔ وہاں پتا چلا بھائی جان بہن کو رائے ونڈ خالہ کے گھر چھوڑ کر بچوں کو لے کر کہیں چلے گئے ہیں۔ گھر بند ہے۔“

میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

”چلے گئے ہیں؟ یہ بھی آپا کو تنگ کرنے کی کوئی ترکیب ہوگی۔ آپا بہت پریشان ہو گئی ہوں گی؟“ مجھے ان پر ترس آ گیا۔ بے چاری۔

”پریشان؟ جی نہیں۔ ان پر جنون طاری ہو گیا۔ غصہ، جلال، آگ بگولہ۔۔۔ نہ کھایا پیا۔ نہ ہمیں کھانے دیا۔ سب بھوکے بیٹھے ہیں۔“

نورین۔۔۔ اس لیے زیادہ مشتعل تھی۔ بھوک کی کچی تھی۔ نہ کہ دن بھر کھانا ہی نہ ملے۔ بے چاری۔

”بچن کی نگرانی کر رہی ہیں۔ کسی کو اندر جانے کی

معاملات کیا ہیں؟ اندازہ ہے مجھے۔ نورین کافی ہے سنبھالنے کے لیے۔“

فون کھٹ یعنی بند، چلو یہ جواب تھا اتنے شکووں کا وہ نورین اسے امی نے اپنی ساس یعنی میری دادی کا درجہ دے دیا۔ واہ، ہم بے وقوف رہے۔ دانت پیس کر دفتر کے رجسٹر کھول لیے۔ اسٹاف کو خوب ڈانٹا۔ دن بھر چرچرے پن کا مظاہرہ کر کے

گھر آیا۔۔۔ یہاں آپا کا موڈ خراب۔ نورین بھی بد مزاجی کے مظاہرے کرتی رہی۔ سماں۔۔۔ اوہ! وہ تو غائب تھی۔ یقیناً ”نورین کی تحویل میں ہوگی۔ نورین کو اللہ موقع دے۔ امی کی کمی پوری کرنے کے لیے ہمہ تن مستعد۔ قائم مقامی میں اس کا مانی ملنا مشکل تھا۔

کھانا کھا کر ایک دوست کی طرف چلا گیا۔ دیر تک وہاں لطیفوں کا مقابلہ ہوا۔ گھر آیا۔ نورین نے غصے سے مجھے دیکھا۔ اس سے زیادہ قہر آلود نظروں سے میں نے اسے گھورا۔ اور بغیر کچھ بولے اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔

بھئی اب دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔ جبکہ۔۔۔ امی کی جواب دہی کا خوف بھی نہ ہو۔ اور دوستوں کی دلچسپ محفل۔



اور یہ دوستوں کی محفل اگلے تین دن رات گئے تک جاری و ساری، جگمگاتی رہی۔ مسائل سے بچنے کا بہترین طریقہ۔ لیکن۔۔۔ تباہ کے۔۔۔ نورین سے بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ (یا میں نے خود نہ دیا) لیکن وہ بھی کم نہ تھی۔ آگئی۔

”بھائی! آپا کا غصہ بڑھ رہا ہے۔ سماں کی مایوسی۔ کچھ آپ بھی اپنا حصہ ڈالیں۔“

”میں؟ میری بے سکونی دیکھ رہی ہو۔ اف امی کہاں رہ گئیں۔“ فون پر بھی نہیں ملتیں۔“ میں بھنا گیا۔

دن بھر فون کر رہا تھا۔ مجال ہے کسی نے اٹھایا ہو۔ ماموں بھی۔۔۔ مصروف تھے۔ یا بات کرنے میں انہیں بے عزتی کا احساس ہو رہا تھا۔ چپ۔

اجازت نہیں ہے۔ کہتی ہیں۔ میں بھوکی مروں تم لوگ کھاؤ۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔ سب مریں گے ساتھ، یہ حال ہے۔“

پلاؤ آپ کی ترکیب اور مسالوں سے پکایا ہے نورین نے آپ نے بھی تو امی سے ہی سیکھا ہے۔ بالکل امی کے ہاتھ کا زائچہ ہے۔“

”ہونا ہی چاہیے۔ تمہاری امی کی بھتیجی نے جو بتایا ہے۔“

”اچھا چلو تم کچن میں میں آیا کو بہلا کر مناؤں گا۔ انہیں سمجھانا مشکل ہے۔ مگر کچھ کرنا پڑے گا۔“

ان کی آواز ٹھٹھری ہوئی تھی۔ ہر لفظ سے تلخی لپٹی ہوئی تھی۔ تمہاری امی اور بھتیجی کے لفظ میں نفرت کا عنصر زیادہ ہی تھا۔ میں نے ٹال دیا۔ نورین سماں کے ساتھ جڑی بیٹھی تھی۔ اس کی پلیٹ میں کبھی راتے، کبھی بوٹی، کبھی سلاد ڈالتی جا رہی تھی۔ روزیسی ہوتا تھا ورنہ وہ بے چاری (بے چاری کیوں؟) بھوکی ہی اٹھ جاتی۔ سر نیچا کیے سستی سے کھا رہی ہوتی تھی۔ پتا نہیں اسے کیسا کھانا پسند آتا ہوگا۔

میں آپا کے پاس آ گیا۔ ان کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہونا پڑا۔ نورین کے لیے راستہ صاف کرنا ضروری تھا۔ اب میں نے... کچھ اداکاری اور زیادہ ولی محبت سے انہیں بہلانا شروع کیا۔ پیار سے لجاجت سے، گڑگڑا کر وہ دن بھر شاید روتی رہی تھیں۔ آنکھیں سو جی ہوئی تھیں منہ لال ہو رہا تھا۔ میری تسلیاں دلا سے مزید دکھی کرنے لگے۔ پھر سے آنسو بہانے لگیں۔

اچھا، اچھا اوہو! کمال ہے۔ سماں! تم اتنا اچھا کھانا پکا لیتی ہو۔ اور پلاؤ تو مجھے بہت پسند ہے۔ اور ہاں تم خود اتنا کم کھاتی ہو بھلا کیوں؟“

گھنٹہ بھر لگا۔ مگر میں نے انہیں کچھ منا ہی لیا۔ نورین کو پکار کر چائے لانے کا کہا۔ خود بھی پی انہیں بھی پلائی۔ بسکٹ کھلائے۔ زبردستی ان کے منہ میں ڈالے۔ غرض کچھ طبیعت بحال ہوئی۔ رات تک ان کے پاس بیٹھا تسلیاں دیتا رہا گو کہ مجھے بھائی جان سے کوئی خاص امید نہ تھی کہ وہ بچوں کا خیال کر کے اپنی ضد سے باز آئیں گے۔ لیکن آپا کو میں یہی باور کر رہا تھا کہ بچوں کے اصرار اور ضد سے مجبور ہو کر وہ آپا کو لینے خود آئیں گے۔ اس میں کوئی دورائے ہو ہی نہیں سکتیں۔

سماں نے خفیف سی گردن اٹھا کر مجھے دیکھنا چاہا۔ یا (شاید) مجھے ایسا ہی لگا۔

ان کا موڈ بحال ہوا۔ پھر نورین نے کھانے کے لیے بلایا۔ تو میں ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر لے چلا۔ ان سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا۔ ساریہ کی۔ مانی شانی کی۔ کھانے میں پلاؤ تھا۔ مجھے پلاؤ بہت پسند تھا بریانی کے مقابلے میں سماں بھی آگئی تھی۔ نورین سلاد راتے اور ٹماٹر کی چٹنی لے آئی۔

”اور کیا۔“ نورین ایک چیخ پلاؤ اس کی پلیٹ میں ڈال کر بولی۔ ”کھاتی کیا ہیں محترمہ؟ سو نکھتی ہیں۔ میں نہ زبردستی کھلاؤں تو چڑیا جیسی ہو جائیں اور خود سارا دن کچن میں گھسی رہتی ہیں۔ کبھی پکا رہی ہیں، کبھی برتن دھو رہی ہیں۔“

”واہ!“ میرے منہ سے نورین کے لیے تعریف نکلی۔ پھر میں نے آپا کی پلیٹ میں بھی سلاد اور راتے ڈال دیا۔

”کون کہہ سکتا ہے کہ یونیورسٹی کی گولڈ میڈلسٹ ہیں۔“ پیار بھرا تھا لہجے میں۔

”کھائیے آپا۔ آپ نے تو کم خوراک میں سماں کو بھی مات دے دی ہے۔ واہ مزے دار ہے۔ لگتا ہے

”اچھا؟ مجھے کسی نے نہیں بتایا۔“ میں حیران ہوا۔

”کھائیے آپا۔ آپ نے تو کم خوراک میں سماں کو بھی مات دے دی ہے۔ واہ مزے دار ہے۔ لگتا ہے

بھی گریز نہ کرتی۔ چیخ چیخ کر محلہ سر پر اٹھالیتی۔ وہ شوہر کو گھر سے نکال دیتی، خود گھر میں جمی رہتی۔ جی، لیکن آپا کو۔ سماں سے کیا کد ہے۔ اس بے چاری نے تو کچھ کیا نہ تھا۔ اور بھی یہ امی آخر کہاں اٹک گئی ہیں۔ ساری خرابی یہ ہے۔

جھلا کر ایک پتھر کو ٹھوکر ماری۔ جو سڑک کے کنارے چپ چاپ بڑا تھا۔ بے چارہ لڑھک کر بیچ سڑک پر جا گرا۔ ہاں اس کا کیا قصور۔ معصوم کنارے پر آرام کر رہا تھا۔ میری پر جلال ٹھوکر نے اس کو کتنی اذیت دی ہوگی۔ ابھی کوئی گاڑی آئے گی۔ اور ظالم پیوں سے کچل دے گی۔ توبہ۔ میں دوڑ کر پتھر کے پاس پہنچا۔ پتھر اٹھا کر اسے ذرا سہلا کر کنارے پر رکھا۔ سوری بھی کہہ دیا۔ ہاں بھی غلطی پر معافی مانگنا چاہیے۔ خاصی واک ہو گئی گھر چلنا چاہیے۔ حیرت۔ کمرے میں نورین سماں کو لیتے بیٹھی تھی۔ باتیں۔ مجھے دیکھ کر کھڑی ہو گئی اور تحکمانہ انداز میں کہنے لگی۔

”تم کو پسند آ رہا ہے۔ تم کھاؤ۔“ کہہ کر باہر نکل گئیں۔ سماں کا رنگ اڑتا ہوا میں نے دیکھا۔ خوف زدہ نظروں سے آپا کو جاتے دیکھ رہی تھی۔ نورین کندھے اچکا کر بولی۔ ”کھاؤ جی کھاؤ ہمیں تو بہت مزا آ رہا ہے۔“

مگر سماں نے چمچہ پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔ وہ گم صم سی ہو گئی تھی۔ پھر اس کی پلکیں بھگنے لگیں اور ٹپاٹپ آنسو ٹپکنے لگے۔ ہائے معصوم دل دکھ گیا۔ (میرا) ”کیا ہے سماں؟“ نورین ہمدرد لہجے میں اسے ڈانٹنے لگی۔ ”کیوں پروا کرتی ہو۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیے۔ مجھے کوئی بلا وجہ بے قصور مجرم سمجھے میں تو اس کا منہ توڑوں سیدھی بات ہے۔ تم اس کان سے سنو۔ اس دوسرے والے کان سے نکال دو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔ کیوں بھائی؟“ داد طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔

”لیکن آپا بھی تو بے قصور ہیں۔ رنجیدہ ہیں۔ بچوں کا کیا قصور ہے؟“

”وہ ان کے میاں کا اور ان کا آپس کا معاملہ ہے۔ خود پنپشیں ہمیں کیوں سزا دے رہی ہیں اور بچے؟ خوہ۔ فضول نکتے بزدل بچے۔ ارے ماں کا ہاتھ تھام کر باپ کی ٹانگ کھینچ لیتے۔ چھوڑتے ہی نہیں۔ پھر دیکھنا تھا تماشا۔ مگر۔“

نورین کے لیے تو ہر بات معمولی سے بھی کم درجے کی ہوتی تھی۔ کم از کم وہ خود اس مشکل مرحلے کو آسان بنانا جانتی تھی۔ بولنے کی بیماری تھی اسے۔

”میں تو بھی ایسا ہی کرتی۔“ وہ مجھے جربز ہوتا دیکھ کر کندھے اچکانے لگی۔ اور کرنا چاہیے بھی۔ ماں کا درجہ باپ سے زیادہ بلند ہے۔ انہیں ماں کے ساتھ ہی آجانا چاہیے تھا۔ بھاگ کر۔“ کچر کچر کھیرا چبار ہی تھی۔

میں چڑ گیا۔ گھر سے باہر آ گیا۔ اف آپا کا بھی کیا قصور ہے۔ بچوں کے بغیر رہنا۔ کتنی اذیت میں تھیں بے چاری مگر نورین کو کیا فکر۔ وہ تو آیا کی جگہ ہوتی تو شاید بھائی جان کو (یعنی اپنے متوقع شوہر کو) مارنے سے

”بھائی! بس بہت ہو گئی مروت۔ سماں آج سے یہیں رہے گی۔ اور سماں! خبردار جو یہاں سے کہیں گئیں۔ یاد رکھو۔ تم اس گھر کی بہو ہو۔ تمہیں یہیں رہنا ہے۔ بھائی کے کمرے میں۔“ سر اٹھائے باہر نکل گئی۔ میں بے بسی سے سر سہلا تارہا۔

”میں تو اصل میں سوچ رہا تھا کہ امی آجائیں۔ وہ رخصتی وغیرہ کے بغیر تو پھر۔“ تقرے ادھورے رہ گئے۔ نورین نے دروازہ کھول کر جھانکا۔ بولی۔ ”اور ہاں خود کو خطا وار سمجھنا چھوڑ دو۔ امی ہیں ہر بات کی ذمے دار۔ آئیں گی تو دیکھنا کیا کرتی ہیں۔“ دھمکی (شاید مجھے)

”میں تو ہوں نا اصل قصور وار۔ میری وجہ سے آپا کے بچے جدا ہوئے۔“ سماں کی دلی ہوئی آواز میں میری سماعت میں آنکرائی۔ اوہو محترمہ بول سکتی ہیں۔

”تو پھر تو بھائی بھی ذمے دار ہوئے۔ انہیں ہی سب بھگتنے دو۔ تم کیوں؟“

کمرہ میں پھر۔ میں اور سماں نورین دروازہ بند کر

کے جا چکی تھی اور وہ انگلیاں مروڑ رہی تھی یا چٹخا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بے بسی تھی۔ شاید ناخوشی یا پتہ نہیں مجھے چہرے پڑھنے سے دلچسپی نہ تھی۔ نہ مجھ میں ایسی کوئی صلاحیت تھی۔

نورین مجھے بدھو کہتی تھی۔ مجھے کچھ بولنا چاہیے۔ شاید سماں منتظر ہو مگر کیا بولوں۔ مجھے سماں سے دلچسپی تھی نہ لگاؤ۔ میں اسے فضول سی جھکی، بے تکی لڑکی سمجھتا تھا۔ یہ معلوم ہی نہ تھا کہ بچپن سے ہی ہمیں۔۔۔ کسی بندھن میں باندھا جا چکا تھا۔ امی کے بقول۔۔۔ اب۔۔۔ ایسا کچھ ہو ہی گیا ہے۔۔۔ تو کچھ اظہار میری طرف سے بھی ہونا چاہیے۔

”وہ سماں۔۔۔“ میں نے خود کو بولتے سنا۔ (حیرت سے) تم یوں کیوں بیٹھی ہو؟ نورین کہہ رہی تھی تم سارا دن کچن میں کام کرتی رہتی ہو۔ تمہیں بھلا کب عادت ہے۔ تھک جاتی ہوگی۔ آرام کرو۔“ روانی سے بات کر کے میں نے تصور میں اپنی پیٹھ ٹھونکی۔ واہ میرے شیر۔

اس کا چہرہ گلاب ہو گیا۔ کھڑی ہو گئی۔ ”میں نماز پڑھ لوں۔“

وہ واش روم میں چلی گئی۔ پھر کچھ دیر بعد آئی۔ جاء نماز کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں گھمائیں۔ میں نے تکیے کے نیچے سے جاء نماز نکال کر اسے پکڑائی اور خود اخبار میں سرگھسالیا۔ اس نے نماز میں کافی دیر لگائی۔ جب وہ جاء نماز پڑھ رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر اس کے ہاتھ سے لے کر تکیے کے نیچے رکھ لی۔ وہ کھڑی رہی۔ پھر ہچکچاتے ہوئے کہنے لگی۔

”میں۔۔۔ یہاں سو جاؤں؟“ اس کی نظریں ٹوسیٹر صوفے پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے ہنسی آگئی۔

”میرا خیال ہے۔ بچوں والی کلا لاکر رکھ دیتا۔ تم اس میں بھی سو سکتی تھیں لیکن یہ صوفہ ناکافی ہے۔ تم کراٹ کے ساتھ نیچے گر جاؤ گی۔ ویسے میرا یہ بیڈ کافی وسیع و عریض ہے۔ کبھی تپا کے ساتھ نیچے آتے ہیں۔ تو تینوں نیچے اور میں بہ آرام اس پر ہی سوتے ہیں۔“

میں نے اسے دیکھا۔ انگلیاں مسل رہی تھی۔ گریز

تکلف یا شرم۔ میں نے کھڑے ہو کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے بیڈ کی طرف لانا چاہا۔ وہ واقعی پریشان سی لگی۔ بے خیالی میں یا اسے تسلی دینے کے خیال سے میرا ہاتھ اس کی کمر پر جا رکھا۔ وہ جیسے کپکپا گئی۔ ”اف۔“ کر کے اس نے کمر اندر کی طرف سمیٹی۔ مجھے عجیب سا لگا۔ کوئی تکلیف؟ اس کے چہرے پر کسی اذیت کے آثار لگے۔ ہاتھ پھر سے کمر پر لگایا تو انگلیوں کو ناہمواری کا احساس ہوا۔ وہ پھر پیچھے کو ہٹی۔ اب مجھے کوئی نئی سی یا عجیب کیفیت کا ادراک ہوا۔

”کمر پر کیا ہوا ہے؟“ میرے منہ سے نکلا۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس کوشش کو ناکام بناتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کی قمیص پیٹھ کی طرف سے اوپر پلٹ دی۔ کمر صاف نظر آ رہی تھی۔ جیسے کسی نے اسے فرش پر گھسیٹا ہو یا ناخنوں سے نوچا ہو۔ سرخ لمبی ابھری ہوئی دھاریاں سفید جلد پر نمایاں تھیں۔

”کیا ہوا ہے؟ یہ زخم کیسے ہیں سماں؟“ میں چیخا تھا۔ اس نے بے بس، زخمی نظروں سے مجھے دیکھا۔ آنکھیں سرخ ہوئیں پھر لبالب پانی سے بھر گئیں۔ اف کس قدر دکھی، فریادی نظریں تھیں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں سماں سے کبھی بے تکلف بھی ہو سکوں گا۔ اتنا قریب یا اس سے ہمدردی، لیکن عجیب لمحہ تھا اور انتہائی قربت کا احساس۔ گرم جذبات اور میرا درد مند دل۔۔۔

میں نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا۔ اور تسلی دینے کے لیے اس کے شانے تھکنے لگا۔ کچھ بولے تو بتائے تو سہی۔ ہوا کیا ہے۔ اتنی تکلیف ہو رہی ہوگی بے چاری۔

”ہاں بولو، کیسے چوٹ لگی یہ۔“ اس کے نرم گرم جسم سے اپنائیت کی مہک میرے جسم میں پوست ہو رہی تھی۔ ہاں تو وہ اپنی تو تھی ہی ماموں زاد۔

”چوٹ نہیں ہے۔“ وہ بول پڑی۔ رندھی ہوئی آواز میں ”آپا نے مارا ہے۔ وہ مجھے روز مارتی ہیں۔ آج آج زمین پر گرا کر چل سے۔ بہت زور سے مارا۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM
 میں مارے حیرت کے مُخمد ہو گیا۔ اپنا ہاتھ ہٹا کر۔
 اسے دور کر کے گھور کر دیکھا۔

”میں چیخی۔ تو زور سے میرا منہ ہتھیلی سے بند کر
 دیا۔ بولیں۔ کسی کو بتایا تو جان نکال لوں گی۔ میں نے
 نورین کو بتا دیا۔ پھر انہوں نے دوبارہ بھی مارا۔“
 ”تم تم۔۔۔ آ۔ آ۔ آ۔“ میں واقعی ہونق بنا کھڑا تھا۔
 ”ہاں جی۔ مارتی جاتی ہیں۔ روتی جاتی ہیں۔ میری
 وجہ سے ان کا گھر اجڑا ہے۔ میری وجہ سے بچے جدا
 ہوئے۔ اس لیے مجھ سے ہی بدلہ لیتی ہیں۔“
 وہ روتی جاتی تھی۔ آنسو دوپٹے سے پونچھتی جا رہی
 تھی۔ عجیب سین تھا۔ مجھے وہ چار سال کی بچی لگ رہی
 تھی۔ جو چوٹ کھا کر روتی ہوئی فریاد کر رہی تھی۔ اس کا
 ہاتھ پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا۔ پھر الماری سے زخم کی ٹیوب
 نکال کر اس کی کمر پر کریم کالیپ کیا۔ جس طرح بن پڑا۔
 اس کی دل جوئی گرتا رہا۔ زبان سے الفاظ سے پیار
 سے محبت سے۔

ارے ہاں مجھے تو خبر نہ تھی کہ۔۔۔ محبت ہوتی کیا
 ہے۔ کیسی ہوتی ہے۔ کیونکر ہوتی ہے۔ لیکن آج لگا
 کہ ہو گئی ہے یا پہلے بھی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا
 کہ ہے۔ وہ بھی سماں سے۔ جو (بظاہر) مجھے خاص پسند
 نہ تھی۔ لیکن آج اس کی فریاد کرتی آنکھیں۔ فریاد
 کرتی زبان۔ اس کی بے خطا ہستی۔ سزا ف آج میں
 نے پہلی بار اس کی قربت پاتے ہی کیسے اس محبت کو
 کھوج نکالا۔ جو میرے سماں خانہ دل میں عرصہ دراز
 سے مل رہی تھی۔

ابھی آج احساس ہوا کہ میں تو اسے ہمیشہ سے ہی
 چاہتا تھا۔ چاہتا ہی رہا ہوں۔ امی کی لاڈلی نہ جانے کب
 میرے دل کی رانی بن گئی تھی۔ اور میں۔ ایک اس قدر
 مضبوط رشتے سے بندھنے کے بعد بھی نظر انداز کرتا
 رہا۔ اپنی محبت شریک حیات کو جائز ملکیت کو خود سے
 دور۔ اف۔ لا پرواہی۔ سزا مجھے ملنے چاہیے تھی یا
 شاید مجھے مل رہی تھی۔ سماں پر ظلم کی صورت۔
 آپا کے خلاف میرا سینہ شعلوں سے بھر گیا۔ داغ
 میں طوفان برپا تھا۔ اب صبح ہوتے ہی آپا کو خمیازہ بھگتنا

بڑے گا۔ میں معاف تو نہیں کروں گا اور اگر امی نے آپا
 کی حمایت میں مجھے کچھ سمجھانا چاہا۔ خون کے رشتے
 مہو مروت کے متقاضی ہوتے ہیں۔ یہی تو نصیحت
 تھی۔ گھٹی میں گھول کر پلایا تھا۔ بس بھائی کی محبتوں کا
 احساس اور یقین۔ ارے تو اگلے کو بھی ایسی نصیحت
 کیوں نہ کی۔ مجھے آج سماں میں اپنا وجود نظر آ رہا تھا۔
 جیسے میں اور وہ۔ وہ اور میں۔ ہم دو نہیں۔ ایک ہو گئے
 ہیں۔ مجھے اتنی ہی اذیت ہو رہی تھی۔ جتنی سماں کو
 ہوئی تھی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ میں تڑپ رہا تھا۔
 اس کی مظلومیت میری محبت بن گئی۔ شاید یہ قدرت
 کی کوئی مصلحت ہو کہ میں اس سچ پر آکر محبت کروں۔
 بس اب امی کی نصیحت بھی نہیں سنوں گا میں۔ اگر
 انہوں نے میل ملاپ کی کوشش کی۔ میں سماں کو لے
 کر چلا جاؤں گا۔ سب سے الگ ہو جاؤں گا۔ مجھے اب
 ہر رشتہ نعلی اور بناؤنی نظر آ رہا تھا۔ سماں میرا سب کچھ
 بن گئی تھی۔ سب کچھ محبت نہیں میں عشق کرنے لگا
 سماں سے۔ وہ جو مجھے کبھی خاص نہیں لگی۔ آج وہ
 خاص الخاص ہو گئی تھی۔ نہ جانے میں نے کتنی بار
 اسے اپنی محبت کا یقین دلایا۔

کس قدر چاہت کا اظہار کیا۔ کتنی ہمت بردھائی۔
 دلا سے دیے۔

صبح صبح ہو گئی۔ ظاہر ہے صبح روشن چمک دار ہوتی
 ہے۔ آج کی صبح حسین تھی۔ مہربان اور پر یقین۔ ناشتہ
 بہت ہی زبردست تھا۔ نورین کی بدولت۔

سماں نے مجھے پر امید نظروں سے دیکھا۔ آیا۔ آ
 گئی تھیں۔ ناشتہ کرنے میں مزے سے ناشتہ کرتا رہا۔
 آپا کو قطعی نظر انداز کر دیا۔ (یہ سزا کافی تھی نا بھئی)
 میں ابھی کچھ کہہ نہیں سکا۔ کہہ سکتا ہی نہ تھا۔
 اتنی بڑی تھیں مجھ سے امی کہتی تھیں۔ بڑی بہن ماں
 جیسی ہوتی ہے۔ تو ماں کو بھلا کوئی کیا کہے گا۔ وہ تو محبت
 اور مامتا سے لبریز ہوتی ہے۔ پتا نہیں آیا بھی محبت مامتا
 کو مانتی تھیں یا نہیں)

لیکن بس اتنا ہوا کہ میں ان کے سامنے سماں پر توجہ
 دے رہا تھا۔ اسے کھانے کی چیزیں دے رہا تھا۔ ”یہ لو

بزدل۔ بدھویا زیادہ ہی شریف ہوں یا سب سے محبت کرتا ہوں۔ کسی کو ناراض نہیں کر سکتا۔ پتا نہیں یہ میری خوبی ہے یا خرابی وقت کے ساتھ غصے کے انکاروں پر نورین ہنسی مذاق کے چھینٹے ڈالتی گئی۔ سب کچھ نارمل ہو گیا۔

آپا کی خاموشی کو نظر انداز کر کے میں سماں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ آہا میرا کمرہ جو پہلے کباڑ خانے کا نمونہ ہوتا تھا۔ آج۔۔۔

کتنا صاف، فراخ اور روشن لگ رہا تھا۔ سماں کی بدولت۔ وہ بھی اس وقت بہت حسین لگ رہی تھی۔ کل سے بھی زیادہ اور کل تک میں نے اسے غور سے دیکھا بھی نہ تھا۔

آج تو۔۔۔ عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شدید مسکراہٹ تھی۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اس وجہ سے (کیا یہ بھی مجھے بدھو سمجھتی ہے؟ پہلا خیال) اس کے کھلتے گندمی رنگ میں ہلکی سی شوخ چمک چہرے کو چمپئی آتشی سا رنگ دے رہی تھی۔ آنکھیں تو جھکی ہوئی تھیں لیکن پلکیں اور نیچے ٹپٹھا رہی تھیں۔ ارے! آج مجھے ہو کیا گیا ہے۔ مجھے تو کبھی کسی رنگ کا فرق تک معلوم نہ تھا۔ یہ آج چمپئی، گندمی، آتشی کیسے تشبیہات سوجھ گئی۔ یہ تو پتا نہ تھا کہ وہ کس رنگ کے لباس میں ہے۔ بھئی ہوگی۔ مجھے اس کے کپڑوں کے رنگ سے کیا لینا دینا۔ خود سماں سے ہی واسطہ ہے۔ اچھی ہے بس کافی ہے اور وہ میرے پارے میں کیا سوچتی ہے؟ اس سے کبھی کچھ لینا دینا نہیں۔ بس وہ میری ہے۔ کچھ بھی سوچتی رہے۔

رات گئے تک میں اس کی دل جوئی کرتا رہا۔ دن بھر اس کے ساتھ تعاون۔ اب کیا یہ کافی نہیں۔ لیکن پھر بھی مجھے اظہار کرنا چاہیے کہ۔۔۔ کہ وہ پہلے نہ سہی۔ اب بہت ہی اچھی لگ رہی ہے اور پہلے کا ذکر بھی کیوں؟ پہلے وہ میری بیگم تو نہ تھی۔ ہیں نا بھئی۔ چلو پھر میاں عادل شروع ہو جاؤ۔ سنا ہے عورتیں (لڑکیاں؟) پتا نہیں اپنی تعریف مردوں کے منہ سے سن کر بہت خوش ہوتی ہیں۔ اور ساری زندگی خوش رہتی ہیں۔ اور

یہ کھاؤ یہ چکھو اور آپا کے خلاف جو رات کو میں شعلوں کی تپش میں جھلس رہا تھا۔ اب بھی اس کی حرارت چہرے پر ضرور تھی۔ اور آپا سے یقیناً "سمجھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر میرے خلاف ناگواری کے جذبات ظاہر ہو رہے تھے۔ میں نے پروا نہ کی۔

یہ حقیقت ہے۔ جواب میری سمجھ میں آرہی تھی کہ میں کسی سے نفرت کر رہی نہیں سکتا تھا۔ کسی اپنے سے بڑے کو۔۔۔ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ ناگواری کے اظہار کے سوا جو چہرے سے ظاہر ہو جائے۔ اتفاقاً" یا ضرورتاً" تو وہ میں کر رہا تھا۔ آفس سے چھٹی لے لی۔ صرف سماں کے لیے۔ اسے آج کے دن آپا کی مار سے بچانے کے لیے۔

میں اسے پورے گھر میں ساتھ لیے گھومتا رہا۔ چھت پر نیچے لان میں۔ ہم دونوں نے مل کر گھر کی صفائی کر ڈالی۔ امی کا کمرہ نورین کا کمرہ۔ چیزیں سمیٹ کر الماریوں میں رکھیں۔ فرنیچر کی ترتیب بدلی۔ گملے ادھر سے ادھر کئے۔

نورین بچن سے ہمیں دیکھ کر مسکراتی اور آنکھوں کے اشارے سے شاباشی دے رہی تھی۔ (چالا کو ماسی) آیا۔ آیا بھی بچن میں مصروفیت ظاہر کر رہی تھیں۔ مگر ان کی آنکھیں۔ ہم دونوں پر جھی ہوئی تھیں۔ اور ایسے دہک رہی تھیں۔ جیسے۔۔۔ شور فل گرم ہونے کے بعد۔ ان کی آنکھوں کے لپکتے شعلے سماں کو بھسم کرنے کے لیے لپک رہے تھے لیکن میری موجودگی ان کو اپنے شکار سے محرومی کا غصہ۔

سماں نے پورا برآمدہ دھو ڈالا۔ میں واپس کرتا جاتا۔ وہ گملوں میں پائپ سے پانی ڈالتی۔ میں تل کھولتا بند کرتا۔ وہ جو رات غصے میں میں سوچ رہا تھا کہ۔۔۔

جیسا کہ میرا خیال تھا۔ میں آپا کی اچھی خبر لوں گا۔ انہیں وارننگ دوں گا کہ اگر آپ نے سماں کو آئندہ کبھی ہاتھ بھی لگایا۔ تو انجام بھی یاد رکھے گا۔ اور اگر امی نے آپا کی حمایت کی تو میں سماں کو لے کر کہیں بھی چلا جاؤں گا۔ کرتی رہیں آپا یہاں حکومت۔

تو وہ سب اس طرح نہیں ہوا۔ میں واقعی بہت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

اجو بھیا ہستے ہوئے آئے اور لیٹ گئے۔ آصفہ بھا بھی نے میرے سر پر چپت رسید کی۔ ارے۔۔۔ آپا کے تینوں بر خوردار ان سے لپٹے بیٹھے تھے۔ آپا کے چہرے پر بھی خوشی کا گلال بکھرا ہوا تھا۔ اور کیا نظار تھا۔ مجھ جیسے انسان کے لیے حواس باختہ ہونے کے مواقع آتے رہتے ہیں۔ بھائی جان راشد خان صاحب کرسی پر براجمان تھے۔ کچھ شرمندہ یا پچھتاوا میں اندازہ ہی نہ کر سکا۔ جادو کی چھٹری کیا کمال ہے۔

سماں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ بس آئی اور امی سے لیٹ گئی۔ اب سب ایک ساتھ بولنے لگے۔ پھر ایک غلغلہ سا اٹھا۔ بھائی جان اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ ساتھ ہی آپا بچے سب کمرے سے باہر آگے پیچھے۔ اس رات چشم فلک نے ایک حیران کن نظارہ ملاحظہ کیا۔ بھائی جان نے مجھے گلے لگا کر کہا۔

”سوری“

”آپا نے کمرے سے لیٹ کر کہا۔ ”سوری عادل!“ اور ساتھ ساتھ آگے بڑھ گئے۔

اجو بھیا نے کہا۔ ”اچھا راشد بھائی۔ کل ان شاء اللہ ملاقات ہوگی صبح آؤں گا آصفہ کو لے کر سب ہو جائے گا انتظام۔“

حیرانی۔ ”بھائی جان مسکرائے۔ پھر دوبارہ مجھے گلے لگایا۔

”ارے۔ واہ بھئی آپا نے بھی میرے ہاتھ پکڑ کر پیار کیا۔ مزید ارے آنسو پونچھتی گھر سے نکل گئیں۔ میں اپنے ہاتھ گھورتا رہ گیا۔ را، را، را۔ یہ میرے ساتھ ہو گیا رہا ہے۔ اور آپا کو کیا ہوا کہ۔۔۔

اجو بھیا انہیں گیٹ تک پہنچا کر آئے۔ مجھے اپنی جگہ کھڑا دیکھ کر میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولے۔

”بس حیرانی کا دورانیہ ختم۔ چلو اندر یہ دنیا عجیب واقعات سے بھری ہوئی ہے اور ہماری زندگی میں اس سے بھی حیران کن واقعات وقوع پذیر ہونے کے امکان ہیں۔ اس لیے کسی بھی انہونی کے لیے خود کو تیار رکھو۔ چلو آؤ۔“

میں کسی معمول کی طرح ان کے پیچھے چلتا ہوا امی

ساری زندگی مرد تعریف کرتا رہا ہے۔ یہ ممکن نہیں کم از کم میں ان مردوں میں شامل ہونا پسند نہیں کروں گا۔ مجھے اور بہت سے ضروری کام۔۔۔ افوہ۔ ابھی تو معاملہ سیٹ کر لے بھائی۔

”آہم سماں! یہ تم نے کس رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ نیلے دیکھو میں رنگوں کے بارے میں ذرا کمزور ہوں۔ مجھے نیلا رنگ اسکول کے بچوں کے یونیفارم میں اچھا لگتا ہے۔ تم اگر یہ آج نہ پہنتیں۔“

”میں یہ کیا کر رہا تھا۔ محبت کے بجائے رعب جمانے کی کوشش ہا میں۔“

”اول تو یہ نیلا نہیں۔ سبزی مائل فیروزی ہے۔“

اس نے ترنت جواب پکڑا یا۔

”دوسرے یہ کہ میرے پاس جو رنگ ہو گا۔ وہی پہنوں گی۔ آپ اپنی پسند کالا کر دیں گے۔ تو وہی پہن لوں گی۔ سرخ، سبز، گلابی۔“

یہ ٹھیک ہے۔ مگر اس کے پاس یہ رنگ کیوں نہیں۔ سوچنے کی بات ہے۔

”رنگوں سے کیا ہوتا ہے۔ انسان کا رنگ اچھا ہونا چاہیے۔ ایمان کا رنگ، ضمیر کا رنگ کپڑے تو پرانے ہو کر بد رنگ ہو جاتے ہیں۔ مگر انسان کی خوبیوں کا رنگ ہمیشہ چمکدار رہتا ہے۔“

یہ سماں تھی۔ بولنے میں خاصی تیز ہے۔ بھاری دلہن بننے اور سرخ رنگ پہننے کی تمنائی تھی۔ لیکن

ماپوس میں آگے بڑھ کر اسے مایوسی سے بچانے کے لیے کچھ کہنے لگا تھا کہ کمرے کے دروازے پر زوردار دستک نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔ اللہ خیر۔ کہیں آپا نے

خود کشی۔

نورین تھی۔ اس نے کہا۔ ”امی آگئی ہیں۔“ اور رفوچکر ہو گئی۔

میں نے سماں سے کہا۔ ”امی آگئی ہیں۔“ اور میں نے سماں کے چہرے پر پھوٹی شفق کا نظارہ کرنے کے

بجائے امی کے کمرے کی طرف دوڑ لگائی۔ امی کے کمرے میں تو محفل جمی ہوئی تھی۔ میں کھلے دروازے

میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ جنبش کیا پلکیں جھپکنا بھول گیا۔

کے کمرے میں آگیا۔ ابھی تک سب کچھ صاف نہ ہوا تھا۔ شک کے بادلوں میں گھرا ہوا۔ چھپا ہوا موسم۔ میں کسی غبار میں چلتا ہوا کمرے میں آیا۔

اندر نورین اپنی پر شور آواز میں کوئی کتھا کہانی لیے بیٹھی تھی۔ آصف بھابھی مسکرا رہی تھیں۔ سماں امی کے بازوؤں میں منمنارہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی امی نے بازو پھیلا دیئے۔ ان کے لبوں پر مشفقانہ تبسم تھا۔ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ میں خفگی سے منہ پھلائے کھڑا رہا۔

اتنی دیر۔ ”بھول ہی گئیں کہ یہاں بھی سب آپ کے اپنے انتظار۔“

امی نے اجو بھیا سے کہا۔ ”سن رہے ہو ایک ہفتہ انہیں اتنی دیر لگ رہا ہے۔“ اتنی دیر نہ لگاتی۔ تو نہ مہرین کا گھرستانہ کسی کو سکون ملتا۔“

”تم نے پوچھا ہی نہیں۔ امی کے ساتھ میں اور آصف کیسے آئے؟“ اجو بھیا میرے ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں دوسری کرسی پر ڈٹ گیا۔

”میں تو حیران ہوں۔ بھائی جان آپ لوگوں کے ساتھ کہاں سے آگئے۔“ میں نے کہا۔

”تو سنو۔ کل شام۔ مزہ کی منگنی ہے۔ جو ممکن ہے نکاح میں بدل جائے۔“

میری کانوں میں کوئی بم دھماکا ہوا۔ ”منگنی۔ کس یعنی کس سے۔“

”گھبراؤ نہیں۔ مجھ سے یا تم سے نہیں یہ کارنامہ امی نے انجام دیا ہے۔ جانتے ہو بھائی راشد خان کو منانا جان جو کھوں کا کام ہے۔ پھر یہ کہ راضی کرنا۔ اف۔“

”لیکن کیسے رشتہ کہاں سے ملا؟“

”اللہ کی طرف سے ہوا یوں کہ میں تم دونوں کو لے کر لاہور کے لیے وہاں سے نکلا۔ ادھر گوہر صاحبہ کے رشتے والے بارات لے کر آگئے۔ یہاں پچھلی اڑ چکا تھا۔ پنجمو خالی تھا۔ گوہر صاحبہ کو بھی ہماری روانگی کی خبر بعد میں۔ بارات کے پہنچنے کے بعد ہوئی نہ پوچھو۔ انہوں نے کیسا شور غل کیا۔ ظاہر ہے۔ یہی ہونا تھا۔“

”میں اندر گئی۔“ امی نے اب بولنا شروع کیا۔

دولہا کو دیکھا۔ اس کے والد سے ملی۔ انہیں حالات سے آگاہ کیا۔ معقول لوگ تھے۔ انہیں بتایا کہ لڑکی اعلا تعلیم یافتہ ہے۔ بچپن سے اپنے کزن سے منسوب تھی۔ گوہر کی جلد بازی یا خود مختاری کہ نہ باپ کی مرضی پوچھی۔ نہ میری غرضیکہ صاف صاف اپنا معاملہ ان کے آگے پیش کیا۔ میں اس نتیجے پر پہنچی کہ ہمیں خود سے کسی کے بارے میں رائے قائم کرنے میں عجلت نہیں کرنی چاہیے۔ نہ ہی کسی کو حقیر سمجھنا چاہیے۔

گوہر جاہل اور بدنیت عورت ہے۔ اسے سماں سے چڑھی۔ بہر حال جو بھی تھا۔ مگر دولہا کے والد بہت سمجھ دار اور شریف آدمی ہیں۔ گوہر کے میکے کے پڑوسی تھے۔ اچھے تعلقات تھے ان کے گوہر نے کچھ ایسی من گھڑت کہانی انہیں سنائی کہ وہ یقین کر بیٹھے یہاں تک کہ دیا کہ باپ لڑکی سے خفا ہے۔ کسی سے بھی شادی کر سکتے ہیں۔ مجھے اختیار دیا ہے لیکن خیر۔ ان کی مہربانی کہ انہیں میری بات معقول معلوم ہوئی۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ چاہیں۔ تو میں ان کے بیٹے کی شادی ایک معزز گھرانے میں کر سکتی ہوں۔ لڑکا بے شک شیف ہے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں اس کے کنٹریکٹ ہیں۔ باہر کے ملک سے ٹریننگ لے کر آیا ہے۔ جاہل نہیں بلکہ بہت سے اعلا تعلیم یافتہ لوگوں سے زیادہ ذہین اور کھلے دل کا شائستہ آدمی ہے۔“

دونوں باپ بیٹے نے میری بات شائستگی سے سنی اور کھلے دل سے مانی۔ میری معذرت پر شرمندہ ہوئے۔

اس وقت تو وہ اپنے آٹھ دس آدمیوں کو لے کر چلے گئے۔ اجو نے مجھے فون پر رات گئے راشد کا غصہ اور ضد کا حال بتایا۔ میں نے گوہر کو اس کے حال پر بکتا جھکتا چھوڑا۔ اور صبح ہی اس لڑکے کے گھر پہنچی۔ دوبارہ معذرت کی اور تلافی کے طور پر اس کا رشتہ کروانے کا وعدہ کر لیا۔ لڑکے کے والد بہت متاثر ہوئے۔ وہیں سے میں نے راشد کو فون کیا۔ انہیں اچھے رشتے کا بتایا۔ بمشکل وہ مانے۔ میں نے لڑکے کے والد کی راشد سے بات کروائی۔ اور گھر آ کر احد کو بتایا۔ راشد کی عقل بھی سیدھے راستے پر آگئی تھی۔ دوسرے دن

کسی بھی شخص کو کمتر سمجھنا۔ کسی کام کو حقیر جاننا۔ انسان کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ وہ شیفت جسے میں معمولی خانسماں کہہ کر حقیر سمجھتی تھی بے حد اعلا طرف اور شریف النفس تھا۔ اس کی شہر میں خاصی عزت توقیر ہے۔ آمدنی کے لحاظ سے بھی کسی سے کم نہیں۔ اپنے گھر کے حالات درست کرنے کی جدوجہد میں اس نے عمر کے بڑھنے کی پروا نہ کی۔ دیکھے جانے بغیر محض قیاس آرائی کرنا بھی غلط ہے۔ کوئی محنت کر کے روزی کماتا ہے۔ کم آمدنی سہی۔ حق حلال کی روٹی بچوں کے پیٹ میں جاتی ہے۔ موچی نہ ہو۔ تو ہم سفید پوش لوگ ننگے پاؤں پھریں گے۔ پالش کرنے والا ہمارے تمہارے جوتے ہاتھ میں پکڑ کر کس محبت اور لگن سے پالش کرتا ہے۔ اس کی روزی اس جوتے سے وابستہ ہے۔ جوتوں کو چکا کر چھوٹے بڑے لوگوں کی عزت بحال کرتا ہے۔ خاکروب بھی کسی سے کم نہیں۔ جو صفائی کے لیے اپنی نیند آرام بچ رہا ہے واقعی محنت میں عظمت ہے۔ اور ہر محنت کش عزت احترام کے لائق ہے۔

”دیکھو امی کی ہفتہ بھر کی کاوش نے کتنے مسائل حل کیے۔ بلکہ اصلاحی پہلو بھی اجاگر ہوا۔ چلو اب

بچوں سمیت آگے۔ مزہ کی تصویر میری فرمائش پر لائے گھوہر کی ناگواری کے باوجود میں نے راشد کو روک لیا۔ احد کے گھر ہی لڑکے اور اس کے والد کو بلا کر بات کروائی۔ آسانی سے ماننے والے تو راشد تھے نہیں مگر لڑکے کے والد سے کچھ جان پہچان نکل آئی۔ دو دن بات چیت میں اور گزر گئے۔ پھر راشد نے مجھے اختیار دیا کہ مزہ کو اپنی بیٹی سمجھ کر اس کے لیے فیصلہ کروں۔ اور فیصلہ تو میں کر چکی تھی۔ ”امی خوش تھیں بہت۔

”واہ امی۔ اپنی بھتیجی کے لیے تو آپ کو وہ خانسماں لگا تھا۔ مزہ پا جی کے لیے آپ راضی ہو گئیں۔ یہ تو اور حیرت کہ بھائی جان مان گئے۔ مگر آپ کا یہ فیصلہ مجھے پسند نہیں آیا۔“ میں اب بھی خفا تھا۔

”تو بیٹا جی! پھر آپ ہی مان لیتے راشد کی بات۔“ امی بھی خفگی سے بویں ”دوسری بات یہ کہ لڑکے کی عمر زیادہ ہے۔ مزہ کے لیے مناسب ہے۔ بھتیجی کے لیے اس لیے مناسب نہ لگا کہ نہ صرف کم تعلیم یافتہ۔ عمر زیادہ سب سے بڑھ کر یہ کہ بچپن سے تمہارا رشتہ طے تھا۔ گوہر تو انتقام میں یہ کر رہی تھی۔ میں نے اجو کو فون کر کے بلایا۔ انہوں نے بھی ان لوگوں سے ملنے کے بعد اس کو پسند کیا۔ راشد کو بھی متا ہی لیا۔ وہ فکر مند تھے کہ اتنی عجلت میں سب کیسے ہو گا۔ تو اجو اور آصفہ مل کر ان کی مدد کریں گے۔ مزہ ہی نہیں میں نے مہرین کے لیے بھی راشد سے وعدے لیے ہیں۔ بہت شرمندہ کیا۔ بہر حال چند دن میں انہیں بھی دن میں تارے نظر آنے لگے تھے۔ مہرین کے بغیر بچوں کی ضدیں۔ ماں کے لیے بھوک ہڑتال اور پتا نہیں کیا کچھ۔ مزہ بھی ان دنوں چپ نہ رہی۔ خیر سب کی مدد شامل رہی ہے تو یہ حل نکلا۔ بس اتنی زیادتی میرے ساتھ ہوئی کہ میں اپنے بیٹے کی شادی چپ چپاتے کرنے پر۔ خود سے اور تم سے شرمندہ ہوں۔ لیکن اس دوران مجھے بہت سے تجربے ہوئے۔ سب کی نیت کا اندازہ ہوا۔ توبہ کرنے کی توفیق نصیب ہوئی۔ اللہ کے سامنے شرمندہ ہوئی۔ اللہ مجھے معاف کرے۔

کے پتے



قیمت - 400 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بلاک، کراچی

سوتے ہیں۔ گھر تو بہت صاف ستھرا چمک رہا ہے۔
کہیں بھی بستر بچھالیں۔

”اچھا جی۔“ نورین چڑ کر چیخی۔ ”آج سماں بیگم نے گھر کی صفائی کر دی تو آپ کو گھر چمکتا ہوا لگ رہا ہے۔ پہلے میں جو اپنی بیڈیاں گھس کر اس پرانے گھر کو اجالنے کی کوشش کرتی تھی۔ تو کسی نے داد نہ دی۔“
نندھالوج کی روایتی چپقلش شروع؟

”اوہو میری محنت کش ننھی منی بہنا! مجھ سے ناراض نہ ہو۔ بے شک بے شک آپ کی محنت بھی کسی سے کم نہیں۔ مگر ہم تو... انجانے میں گھر کی تعریف کر رہے تھے۔ کسی خاص شخصیت کی نہیں۔“
اجو بھیا نورین کو منانے کے لیے اس کی خوشامد کرنے لگے۔

”خیر چلیں۔ میں تو ویسے ہی... آپ نے آخر یہ مان لیا کہ سماں نے آج کی محنت سے گھر کو چمکادیا ہے۔ محنت کش وہ ہے۔ امی آپ کو محنت کش بہو مبارک ہو۔“
نورین کا مزاج پل میں رنگ بدلتا تھا۔

”اچھا۔ ایسا کرتے ہیں۔ کل مہرین کے گھر سماں کو لے جاتے ہیں۔ آصفہ سماں کے ساتھ مل کر گھر کو چمکائے۔ بھئی مزہ کی بارات آتی ہے آخر۔“
اجو بھیا کی تجویز پر نورین نے سماں کو دیکھا۔ دونوں مسکرائیں۔ پراسرار مسکراہٹ۔

میں نے امی سے شکوہ کر ڈالا۔ ”آپ نے مجھ سے پوچھا تک نہیں کہ آپ کے بغیر مجھ پر کیا گزری؟“
میں کب تک چپ رہتا آخر۔ میرا شکوہ بے جا نہیں تھا۔

”خفا ہو؟“ امی نے کس سادگی سے سوال کیا۔ اف امی کی معصومیت۔ جی جل کر خاک ہوا۔
”نہیں جی۔ بہت خوش ہوں۔ اگر آپ دو دن اور نہ آئیں۔ میں تو گھر سے بھاگ جاتا۔“ میں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں غصہ ظاہر کیا۔ آپا کا نام نہ لیا۔

”مجھے لے کر۔“ سماں نے کھلکھلا کر کہا۔
”ہائیں یہ۔“ اس نے میرے دل کا راز کیسے جان

لیا۔ میں نے تو اس سے کچھ کہا نہیں تھا۔
”سن رہی ہیں امی۔ بیٹھے بہو کے ارادے۔“

نورین کو گہرائی میں جا کر راز معلوم کرنا پسند تھا۔ ”چالا کو“ اجو بھیا نورین کے سر پر چیت لگا کر ہنسنے۔ تو مجھے بھی ہنسی آگئی۔ آصفہ بھابھی بھی کھلکھلا کر ہنسیں۔ امی بھی ہنس رہی تھیں۔

”کاش۔ اس وقت آیا بھی ہوتیں۔ پھر مزا آتا۔“
نورین نے شرارت سے آنکھیں گھما میں۔

میری ہنسی بند ہو گئی۔ میں نے منہ پھلایا۔ سماں اور نورین ایک دوسرے کو دیکھ کر قہقہے لگا رہی تھیں۔ یکدم سماں نے امی کے گلے میں بازو ڈال کر شکایتیں شروع کر دیں۔ میں ہکا بکا۔

”پھپھو بہت خراب ہیں آپ کے بیٹے۔ جی... اتنے دن مجھ سے بات نہیں کی۔ میں یہیں آپ کے بیڈ پر سوتی تھی۔ رات بھر روتی تھی۔ سچی۔ بس اب میں آپ کے پاس ہی سوؤں گی۔“ (لاڈو کہیں کی) وہ جو رات میں نے خوشامد میں گزار دی۔ گھر تک چھوڑنے کو تیار ہو گیا۔

زن مرید۔ اف میں زن مرید۔ زن مرید کہیں کا۔ میں بھنا کر اسے کمرے میں آگیا۔ سماں کے بغیر کمرہ اداس اداس کیوں لگ رہا تھا۔ پتا نہیں ظالم جادو گرنی بے مروت۔ وہ تو وہاں ہنسی کے دریا بہا رہی تھی (شکایتیں)

میں چڑ کر سمٹی ہوئی چیزیں ادھر ادھر بکھرا تا رہا۔ تکیہ ادھر، جاء نماز صوفے پر۔ کھڑی کھڑکی پر۔ جوتے دروازے کے باہر۔ آدمی کو غصہ راس نہیں آتا۔ سماں کی جھلک دیکھتے ہی۔ مجھے ساری چیزیں سمیٹنی تھیں۔ انہیں جگہ پر رکھنے کے لیے۔ ہائے دن بھر کی محنت اور پھر از سر نو محنت۔ سماں کو... کوئی چیز بے جگہ دیکھنے سے الجھن ہوتی تھی۔ اس لیے اس کی ترتیب سے سب رکھنا تھا۔ (اگر وہ آتی)

اب پتا نہیں وہ مجھے کس جگہ رکھے گی؟ ناشکری۔ سوال یہ ہے کہ... آئے گی بھی؟ یا انتظار پر ٹر خانے

گھر کی عیسیٰ

چہرے یہ ناگواری چھا گئی تھی۔ چھری رکھ کر لاڈلی بیٹی کے ”دہائی نما شکوے“ کی وجہ کڑے لہجے میں استفسار کی۔

”ناں“ ساتھ والی کبریٰ کے گھر میں من و سلوی اترتا ہے یا خیر دین ڈی سی لگا اپنے بچوں کو نان مرے کھلا رہا ہے جو تجھے اٹھارہ سال بعد اپنا گھر ”کروا“ لگنے

”یا اللہ! تو مجھے ساتھ والی ماسی کبریٰ کے گھر پیدا کر دیتا تو کتنا اچھا ہوتا؟ یا ماسی کبریٰ نہیں تو چاچی حلیمہ، ماما خیر دین کسی کے گھر بھی پیدا کر دیتا، مگر یہ گھر نہ ہوتا۔“

زہبی نے حسرت سے اور دعائے لہجے میں ٹھنڈی سانس بھر کر کہا تو ساتھ بیٹھی کر لیے چھیاتی زاہدہ کے



لگا ہے۔ ”سکون، فراغت، خاموشی اور آرام بھی من و سلویٰ اور نان مرے سے کم نعمتیں نہیں ہیں، جن کا بد قسمتی سے ہمارے گھر میں فقدان پایا جاتا ہے۔“ وہ اب کے کسی قدر طنزیہ انداز میں بولی۔

”صبح سے لے کر شام بلکہ رات نہیں آدھی رات تک پھر کی کی طرح گھومتی کام کرتی رہتی ہوں۔ ایک بل سکون کا نصیب نہیں ہوتا۔ یہ گھر سے یا آزمائش ہے۔ ذرا جو دن کو سر رکھ کر اونگھنے لگوں تو کوئی نہ کوئی بچہ سر پہ آکر بھونپو بجانے لگتا ہے۔“ وہ سخت اکتائے ہوئے انداز میں بولی۔

”تو تمہیں دن کو سونے کی کیا ضرورت ہے۔ رات کس لیے ہوتی ہے؟“ زاہدہ نے کربلوں پر نمک چھڑک کر مسلتے ہوئے آرام سے مشورہ دینے والے انداز میں کہا تو وہ جی جان سے سلگ اٹھی تھی۔

”ساری دنیا دوپہر کو قیلولہ فرماتی ہے۔ آخر گرمیوں کے دن ہوتے کس لیے ہیں؟ اگر میں بھی ذرا استالوں تو آخر کیا برا ہے اور رات کی خوب کنی آپ کے بے ڈھنگے صاحب زادے توحید کو سوتے میں نجانے کیا پیٹ میں مروڑاٹھا تھا کہ میری ساری رات اسے چورن اور ہکھا چناتے گزر گئی۔ داس بھر جاگنے سے میرا سر دکھ رہا ہے، سوچا تھا نیند کی کمی دن میں پوری کر لوں گی۔“ اس کے جذباتی لہجے نے نئی کو غالب آتے دیکھ کر زاہدہ نے تیزی سے بات کاٹ دی۔

”تو آج اسکول نہیں گئی؟“
 ”کل گئی تھی نا۔ تیری بے ڈھنگی ”اولاد“ نے مجھے عزت سے میٹرک پاس نہیں کرنے دینا ہے۔“ وہ ترخ کر بولی۔

”اب ان معصوموں نے تیری کتابیں پھاڑی ہیں، جو یہ الزام بھی ان کے سر پر۔“ زاہدہ برا ماننے ہوئے بولی۔

”پو پھوٹے وقت سے ناشتا بنانا شروع کرتی ہوں۔ پر ات خالی ہو جاتی ہے، مگر یہ ”یا جوج ماجوج“ کی قوم پیٹ بھرنے کا نام نہیں لیتی۔ ان کو نسلادھلا کر اسکول

رخصت کرنے کے بعد خود جب دن چڑھے اسکول پہنچتی ہوں تو چپڑا سی میرا مانا نہیں لگتا جو ہر روز مجھ پہ ترس کھا کر گیٹ کھول دے گا اور نہ ہی کوئی مس میری پھپھی سگی لگتی ہے جو روزانہ پہلے تین سپرڈ چوک جانے پہ مجھے معاف کر دے گی۔ کل تو حد ہو گئی جرمانہ الگ لگا، بے عزتی الگ ہوئی اور نام خارج کرنے کی دھمکی۔۔۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ اپنے علاوہ تیرے چھ کے چھ بچوں کے سر پھاڑوں۔“

وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔
 ”ہاں ایسے آسانی سے پھاڑ دے گی اور میں تجھے معاف کر دوں گی ویسے بھی چھوٹے بہن بھائی تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ کتنا پیار کرتے ہیں تجھ سے۔ کیا ہے جو تو ان کے چھوٹے موٹے کام نمٹا دیتی ہے۔ بڑی بٹی کو ماں کا بازو بننا ہی ہوتا ہے۔ کوئی ساری عمر تجھے تنگ تھوڑی کریں گے۔ ذرا بڑے ہوئے تو سمجھ دار اور باتمیز ہو ہی جائیں گے۔“

زاہدہ نے اب کے نرمی سے اسے ”ٹھنڈا“ کرنا چاہا۔ پھر ہاتھ دھو کر چارپائی کے ساتھ بندھی کپڑے کی جھولڑی میں قلقاریاں مارتے اپنے آٹھ ماہ کے بچے کو نکال کر فیڈ کرانے لگی۔



ظہور احمد نے پانی لینے کی خاطر جستی گلاس مٹکے میں ڈالا تو گلاس خالی پینڈے سے ٹکرا کر زور کی کھنک پیدا کر گیا تھا۔ طیش کی ایسی لہر اندر سے اٹھی کہ گلاس زور سے زمین پہ دے مارا۔

”زیسی! کدھر مر گئی ہے۔ مٹکا کیوں نہیں بھرا تو نے؟“ ظہور احمد نے دھاڑ کر پوچھا تو وہ گھبرا کے کپڑے دھونا چھوڑ کر باپ کے پاس چلی آئی جو سخت تیور لیے کھڑا تھا۔

”ابا! میں نے بیس منٹ پہلے ہی مٹکا بھرا تھا، مگر ان بچوں نے کھڑے کھڑے سارا پانی حتم کر ڈالا۔“ اس نے شرمندگی سے وضاحت دی۔

اوائیل جون کی تیز پتی دھوپ میں دکان سے پیدل چل کر گھر آتے ہوئے حلق میں کانٹے سے اگ آئے

تھے۔ ظہور احمد کا دل چاہا کہ خالی مٹکا ہی اٹھا کر زمین پر دے مارے۔

”یہ گھر ہے یا عذاب ہے۔ جہاں بندے کو ٹھنڈے پانی کا گھونٹ تک نصیب نہیں ہوتا۔“ باقی کا غصہ چھپر تلے بیٹھی شریک حیات زاہدہ پر نکالا۔

”بچوں سے بھرا گھر ہے۔ جلدی ختم ہو جاتا ہے۔ ایسی لڑکی کدھر کدھر جان کھپائے۔ میں نئے کو سنبھالوں یا پانی بھرتی رہوں۔“ بے نیاز انداز۔ ٹھوس جواز۔ ظہور احمد چپ ہو گیا۔ زمہی چاچی بلیقیس سے جا کر ٹھنڈے پانی کا گلاس لے آئی اور لا کر پاپ کو تھمانے کے بعد بچہ پارٹی کی تلاش میں گھر میں نظریں دوڑائیں۔ صرف آم چوستا زیر ہی ہاتھ لگ سکا۔ بازو مروڑ کر کمر سے لگانے کے بعد لگا تار کٹی دھمو کے اس کی کمر پہ جڑے۔

”اب اگر مٹکے کے قریب دکھائی دیا تو جان سے مار دوں گی۔“ وہ غصے و گرمی کی آمیزش سے سرخ چہرے کے ساتھ دھمکاتے ہوئے بولی۔

”زمہی! چھوڑ بھائی کو۔ گرمی کا موسم ہے۔ کون ذی روح پانی نہیں پی رہا۔“ زاہدہ نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے صاحب زادے کی جان بخشی کروائی تھی۔

”اور چاچی! تو اپنی پلٹن کو ادھر اپنے پاس ہی سنبھال کے رکھ تیرا کوئی بچہ ادھر دکھائی دیا تو اس کی ٹانگیں توڑ

دوں گی۔“ وہ بلیقیس کی جانب انگلی اٹھا کر سنگین لہجے میں بولی۔ باپ کی ڈانٹ نے اسے رنجور کر دیا تھا۔

صبح سے لے کر اب تک وہ بلا مبالغہ دسویں بار مٹکا بھر چکی تھی۔ اپنے چھ عدد بہن بھائیوں نے کیا کم دق کیا ہوا تھا جو چاچی کے بھی بلا کے شرارتی و بد تمیز بچوں کو بھی برداشت کر لیتی اور وہ بھی تعداد میں پورے پانچ۔

”تو بہ ہے زمہی! بھلا بچوں کو بھی کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ اپنے چچا زادوں کے بغیر وہ کیسے کھیل کود سکتے ہیں۔“ بلیقیس نے اس کی سنجیدگی سے دی گئی دھمکی کو ”دیوانے کی برد“ سے زیادہ اہمیت نہ دی اور چھپر کے نیچے جا کر جیٹھانی سے باتیں کرنے لگی۔

بے حد پھر تیلی ذمہ دار طبیعت کی حامل زیب النساء، نہ تو کام چور تھی نہ ہی سہل پسند، مگر اس کی گھر کی روٹین صرف اس کی ایک ہی تصویر پیش کرتی۔

بے حد جھنجلائی، چیختی، زبان دراز، ہتھ چھٹ، نالاں، گریزاں، ہمہ وقت شکوہ کنناں۔

گھر میں کسی بہن بھائی کی پیدائش اسے سر تپا خوشی سے معمور کر دیتی۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ ننھے مہمان کو خوب بو سے دے۔ اسے کمر پہ نکا کے محلے کی سیر کرانے لے جائے، اس کی جھولڑی کو لوری دیتے ہوئے خوب جھونٹے دے۔ مگر اس خوشی کو مایوسی بدولی اور دکھ میں تبدیل ہوتے زیادہ دیر نہ لگتی جب زاہدہ اسے پاس بلا کر نرمی سے کہتی۔

”دیکھ زمہی! تو میری پہلی اولاد ہے۔ تجھے میرا سہارا بننا ہے۔ اب میں چار پائی بہ بڑی ہوں تو اچھی بیٹی کی طرح تیرا فرض بنتا ہے کہ تو گھر کا خیال رکھے۔ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی ضرورتوں سے آگاہ رہے۔“ وہ تالیح داری سے سر ہلا دیتی۔

صفائی، دھلائی اور کھانا پکانا یہ سارے کام وہ بے حد چھوٹی عمر میں اس امید پہ کیے جاتی کہ جب اس کا بہن یا بھائی بڑا ہو گا تو اس کی ماں واپس اپنے کاموں پہ آجائے گی اور اتنی مشقت بھری روٹین سے اس کی جان چھوٹ جائے گی۔

مگر اس کی ساری امیدوں پہ پانی پھر جاتا جب ادھر اس کا بھائی پاؤں پاؤں چلنے لگ جاتا اور ادھر اس کی ماں نئے مہمان کی آمد کی تیاریوں میں۔ بچپن کا شیڈول ساری زندگی پہ محیط ہو گیا۔ پھر تو بہن بھائیوں اور کزنز کی ایک تو اتر سے آمد نے اسے بو کھلا کے رکھ دیا تھا۔ چاچا منظور کے بچے بھی گھر ایک ہونے کی وجہ سے ادھر ہی اودھم مچائے رکھتے۔

شور، ہنگامہ، بے ترتیبی، کام کی زیادتی، سکون کی قلت۔ اس لیے تو وہ ہر وقت با آواز بلند شکوہ کنناں رہتی۔

”یا خدا! اگر ادھر پیدا ہونا قسمت میں تھا تو ہاتھ کم از کم آٹھ دے دیتا۔“

صحن میں ٹونٹھی ٹونٹھی کھیلا جا رہا تھا۔ پوری ٹیم موجود تھی۔ بلال کے شائس فیلڈرز کو محلے کے گھروں کی چھتوں سے گیند لانے پر مجبور کر رہے تھے۔

زمی ابھی ابھی نہا کر آئی تھی۔ سفید کڑھائی شدہ پلازو پر پرنٹڈ لان کا دوپٹا اور شارٹ شارٹ میں اس کا اسمارٹ سرپا بے حد نمایاں لگ رہا تھا۔ صحن میں جا بجا پھیلی مرغیوں کی بیٹ سے بچنے کے لیے وہ پلازو کو اڑے ہوئے تھی۔

اب کے بلال کی گیند نے صحن میں لگے انرجی سیور کا نشانہ لیا۔ انرجی سیور چھنا کے کی آواز کے ساتھ زمین پہ آ رہا۔

”بلال کے بچے! یہ کیا کرویا۔“ وہ اس کا کان کھینچتے ہوئے بولی۔ چہرے پہ ایک دم فکر مندی چھا گئی تھی۔ اسی دم دروازے پہ کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تھی۔ چھت پہ بیٹھ کے میچ کی کمٹری کرتے اسد نے اونچی آواز میں مطلع کیا تھا۔

”مہمان آگئے ہیں۔“ اس نے ایک دم سے بلال کا کان چھوڑا اور سیدھی چاچے منظور والی سائیڈ پہ آگئی۔ آج اس کا پہلا پہلا برد کھوا تھا۔ ہتھیاسیاں گرمی سے زیادہ گھبراہٹ سے تپ رہی تھیں اور تیزی سے دھڑکتا دل۔ بلیقیں اس کی حالت سے خوب محفوظ

ہو رہی تھی۔

چند ماہ پہلے خاندان کی تقریب میں ایک خوش پوش باوقار آئی ٹائپ خاتون اس سے بے حد اخلاق سے ملی تھیں۔ ان خاتون کی محبت اور لگاؤٹ بھری گفتگو اسے تو نہیں البتہ زاہدہ کو خوب سمجھ میں آ رہی تھی۔ اکلوتے بیٹے کی وہی میں ملازمت کا تذکرہ خاندانی اوصاف واضح الفاظ میں زمی کے لیے اظہارِ رغبت۔

”میری زمی تو کھڑے کھڑے حسینہ باجی کے دل میں اتر گئی تھی۔ بس کسی دن ان کی بیٹی نے لاہور سے آکر اسے پسند کر کے بات پکی کرنی ہے۔“

تقریب سے واپسی پہ زاہدہ نے خوشی سے کھنکتے لہجے میں ظہور احمد کو بتایا تھا۔

نم بالوں کو سلجھانے کے بعد اس نے کھجور لگا کر کھلا چھوڑ دیا تھا۔ چھوٹے سے ٹوٹے کناروں والے تکنونی شکل کے آئینے میں اسے تیار ہوتے ہوئے کافی مشکل پیش آرہی تھی۔

آنکھوں کے کاجل، ہونٹوں کے گلوں اور ناک کی لونگ کا الگ الگ جائزہ لینا پڑ گیا تھا۔ پورا چہرہ جو آئینے میں نہیں سارہا تھا۔

”اچھا خاصا بڑا شیشہ تھا، مگر ان بچوں نے ٹوٹے ٹوٹے کر دیا۔“ بلیقیں نے الماری سے گلاس اور پلیٹیں نکالتے ہوئے مصروف انداز میں بتایا۔

”صبح سے گھر کا کونہ کونہ چمکانے میں لگی تھی، مگر ان بد تمیز بچوں نے سارا صحن خراب کر دیا۔ اگر یہ بھی خراب نہ کرتے تو اماں کی لاڈلی مرغیاں۔۔۔ ان کی بدبو۔۔۔ اف مہمانوں پہ نجانے کیسا تاثر پڑ رہا ہوگا۔“ وہ دل ہی دل میں خود سے بولتے ہوئے مضطرب ہو رہی تھی۔

”جو لاہور والی باجی ہیں۔ وہ بڑی خوب صورت ہیں۔“

”ان کا بیٹا فر فر انگریزی بولتا ہے، جیسے ٹی وی والے بولتے ہیں۔“

چھوٹیاں حسنه اور فر و وقتاً فوقتاً آکر اسے متاثر کن لہجے میں مطلع کر رہی تھیں۔

اپنے بہترین جوڑے میں ملبوس ہلکا سا میک اپ کے وہ فطری گھبراہٹ اور خود پہ یقین کے ملے جلے احساس میں گھری مہمانوں کو سلام کرنے آگئی۔

صحن میں رات کا اندھیرا پوری طرح اتر چکا تھا۔ سیور ٹوٹنے کے بعد بلال نے ڈیوڑھی کا سو والٹ کا بلب صحن میں لگا دیا تھا۔

گرمیوں کا عام مسئلہ بجلی کے دولٹج کی کمی۔ بے حد مدھم زرد ملکی سی روشنی دیتا بلب اپنی ”متوقع“ نند کا چہرہ دکھانے سے قاصر تھا۔ تاہم اس کے لباس کی خوشبو کے ساتھ ساتھ اس کی محبت، اپنائیت اور گرم جوشی کی مہک نے اسے لمحہ بھر کے لیے دم بخود کر دیا تھا۔

رہیں۔

”بچے تو ہوتے ہی کھانے پینے کے شوقین ہیں۔ انہیں بھلا تکلفات کی کیا پروا۔ ہمارا احزم بھی ہر چیز شوق سے کھاتا ہے۔“ بشری گودی میں بیٹھے اکلوتے بیٹے کے ماتھے پہ پیار سے بوسہ دیتے ہوئے اسے شرمندگی سے نکالنے کی خاطر بولی۔

”احزم اپنے بابا کی طرح چٹورہ اور۔۔۔“

بشری بولتے بولتے ایک دم رک گئی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ پیچھے سے اسے کوئی کھینچ رہا ہے اس کی لینن کی شرٹ کہیں پھنسی ہوئی تھی۔ چھڑانے کی خاطر ہاتھ مارا تو دل دھک سے رہ گیا۔ میدانی بکرا کب سے کھڑا اس کی قمیص چبا رہا تھا۔

”یہ کم بخت مارا، کب کھونٹے سے چھوٹ کر ادھر آن مرا۔“ زاہدہ تیر کی سی تیزی سے اٹھ کر بکرے پر جھپٹی۔ لگاتار کئی تھپڑ جانور کے منہ پہ مارے اور کھینچ کر دوبارہ کھونٹے پہ باندھ آئی۔

پیچھے قمیص کا نصف حصہ تقریباً ”غائب“ تھا۔ اپنے نئے منگے بوتھک سے خریدے سوٹ کا حشر دیکھ کر بشری کو ایک دم چپ لگ گئی تھی۔ پھر زاہدہ کی بار بار معذرت پہ اسے کہنا پڑا۔

”اُس اوکے آئی! جانور سے کیا شکایت۔ آپ پلیز شرمندہ نہ ہوں۔“

احزم کو لمبے لمبے کانوں والا میمنا بہت پسند آگیا

تھا۔ یوں ہی بچوں کے ساتھ کھیلتے کودتے اچانک اس کے حلق سے اذیت سے بھرپور چیخ بلند ہوئی تھی۔ وہ پاؤں پکڑے اونچی آواز سے رورہا تھا۔

”مائی پرنس، میری جان کیا ہوا؟“ بشری اور حسینہ چارپائی سے اتر کر فوراً ”احزم کی طرف آئیں۔ احزم کی نرم و گداز ایریڈی میں کانچ گھس گیا تھا۔ ٹوٹے انرجی سیور کا کانچ۔ جو کسی کو اٹھانا یاد نہیں رہا تھا۔ کانچ کا ٹکڑا نکالتے ہی خون بہہ نکلا۔ اکلوتے، منتوں مرادوں سے پیدا ہونے والے بیٹے کو درد سے بے حال ہوتا دیکھ کر بشری بھی اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔

”میں نے تو جب زیب بٹی کو دیکھا تو اسی وقت میرے دل نے گواہی دی کہ منصور کے لیے اس سے بہتر لڑکی کوئی ہو نہیں سکتی۔“ حسینہ محبت بھرے لہجے میں بولیں۔

”امی نے تو زیب کی اتنی تعریفیں کی ہیں کہ بس۔ زیب کے بال اتنے گھنے ہیں، آنکھیں ایسی گہری۔“ بشری نے مسکراتے ہوئے ماں کے توصیفی انداز کو آگے بڑھایا۔ زاہدہ نے چارپائیوں کے درمیان میز لگا کر لوازمات چن دیے۔ وہ سر جھکا کر سب کاٹتے ہوئے بشری کی باتوں کا مدہم انداز میں جواب دیتی رہی۔ اس کی تعلیم، مشاغل، دلچسپیاں، مگر بشری کی اگلی بات نے اسے سخت دھچکا لگایا۔

”روشنی میں جب تم سے ملوں گی تو یقیناً تمہیں امی کی بتائی ہوئی کوالٹیز کے مطابق پاؤں گی۔ ان شاء اللہ۔“ وائٹ پیٹے ہوئے اس نے فوراً ”ارادہ باندھا کہ ان کے جاتے ہی بلال کی چٹنی بتائے گی۔“

”منحوس! نہ سیور توڑتا، نہ یہ الفاظ مجھے سننے کو ملتے۔ اپنی ساری تیاری یوں ضائع جانے پہ اسے سخت صدمہ ہوا تھا جب وہ مہمانوں کے صرف ہولے دیکھ رہی تھی تو یقیناً انہیں بھی اس کی شبیہ نظر آرہی ہوگی۔“

”آپی! مجھے کیلا دوٹال۔“ پانچ سالہ نصیر اس کے

پاس آکر بولا۔

”میری جان! آپ جاؤ، کھیلو۔“ اس نے محبت بھرے انداز میں اسے وہاں سے ٹھلانا چاہا، مگر اس کا مطالبہ زور پکڑنا گیا۔

”ارے کیوں بچے کو رلا رہی ہو۔ یہ لو۔“ حسینہ نے کیلے کے ساتھ سیب کی ایک دو قاشیں کمال شفقت سے نصیر کو تھمائیں تو وہ خوشی خوشی دوڑ گیا۔

اسے دیکھ کر باقی سب دوڑے چلے آئے اور چارپائی کے گرد گھیرا باندھ لیا۔ زمہی کاغصے اور شرمندگی سے برا حال تھا۔ وہ بشری اور آئی حسینہ کو منع کرتی رہی، مگر وہ مسلسل دائیں بائیں کچھ نہ کچھ بچوں کو اٹھا کر دیتی

”احرم کے پاپا مجھے پھوڑیں گے نہیں۔ وہ تو پہلے ہی کہتے ہیں کہ تم میکے جا کر بیٹے کو ویک کر آئی ہو اب بلیڈنگ کاسٹیں گے تو نجانے کیا حشر اٹھادیں گے۔“ بشری رونے لگی اور ہی تھی۔

”بھئی! حوصلہ کرو۔ کچھ نہیں ہوگا۔ یہاں سے سیدھا ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ میں نے ڈرائیور کو کال کر دی ہے۔ وہ بس آنا ہی ہوگا۔“ حسینہ بیٹی کو تسلی دیتے ہوئے بولیں۔ بشری کی پریشانی کچھ غلط نہ تھی۔ احرم شادی کے سات سالوں بعد کافی دعاؤں اور منتوں سے پیدا ہوا تھا۔ بشری کی اس میں جان تھی تو باپ بھی کم دیوانہ نہ تھا۔ ہلکی سی کھالسی چھینک پہ دونوں ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھتے تھے۔ زائدہ نے خون صاف کرنے کے بعد ہلدی اور سرسوں کا ٹیل ملا کر زخم پہ لگا دیا۔ ساتھ ہی اپنے دوپٹے کو تیزی سے پھاڑ کر پاؤں پہ پٹی باندھ دی۔ احرم کی مرہم پیٹی کی مصروفیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بچہ پارٹی لوازمات پہ ٹوٹ بڑی تھی۔ گاڑی کا ہارن سنتے ہی بشری نے تو سب کو اجتماعی خدا حافظ کہا، مگر حسینہ فردا” فردا“ سب سے ملیں، زہبی کو ساتھ لگا کر خوب پیار کیا اور ہاتھ میں ہزار روپے تھما کر روانہ ہو گئیں۔ ساری رات زہبی کا تکیہ آنسوؤں سے بھیلتا رہا۔



روزے کا مہینہ
بخشش کا بن کے سایہ
تیرے لیے مسلمان
رمضان بن کے آیا

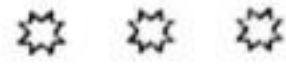
”حق ہا! کیا بات ہوتی تھی۔ سیالوں ”سردیوں کے رمضان کی۔“ چارپائی کی رسی کتے ہوئے بلقیس نے ایک ٹھنڈا ٹھارہ نکارا بھرا تھا۔
”چھوٹے چھوٹے دن، نرم گرم دھوپ میں ذرا دیر کو آرام کرنے کے بعد افطاری کی تیاری۔ پتا بھی نہ چلتا کہ روزہ کھل جاتا۔“

”تو تو ایسے سردیوں کے روزے یاد کر رہی ہے جیسے گرمیوں کے روزوں نے تجھے نڈھال کر رکھا ہو۔“ زائدہ نے ہنستے ہوئے دیورانی پہ چوٹ کی تو وہ کھینسا کر

بولی۔
”بھابھی! یہ ننگے ننگے بچوں کے ساتھ بھلا کیسے روزے رکھ سکتی ہوں۔ اور سے گھر کا کام۔ تمہارے ساتھ تو زہبی لگ جاتی ہے، مگر گرمیوں کے روزے۔ بس اللہ معاف کرے۔ پہلے روزے نے اتنا نچوڑا کہ ابھی تک ناتوانی نہیں جا رہی۔ ان شاء اللہ سردیوں کے پورے روزے رکھوں گی اگر سانسوں نے وفا کی تو۔“
رسی کے آخری سرے کو زور سے گرہ لگانے کے بعد بلقیس تناؤ محسوس کرنے کی خاطر چارپائی پہ آ بیٹھی۔ زہبی عصر ریڑھ کر باہر آئی تو بے ساختہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی تھی۔ بلال اور احمد کنچوں کے ساتھ ساتھ آملوں کو بھی ملا کر کھیل رہے تھے جو اس نے بالوں پہ لگانے کی خاطر خرید کر رکھے تھے۔ روزوں کی وجہ سے آملوں کو نہ پینے کا ٹائم ملانہ ہی سر پہ لگانے کا۔ ان شرارتیوں کے ہاتھ نجانے کیسے لگے تھے۔

”اماں! دیکھ اپنے لاڈلے سپوت کا حال۔ آملوں کو کنچوں کے ساتھ ملا لیا۔ پھر تو کہتی ہے کہ میں خواہ مخواہ ان پہ غصہ ہوتی ہوں۔“ وہ کمزوری آواز میں زائدہ سے شکایتی انداز میں مخاطب ہوئی۔ آج تھیسواں روزہ تھا۔ مسلسل روزوں سے جسم کے ساتھ آواز بھی کمزوری غالب آگئی تھی۔ جولائی کے سخت گرم دن، طویل لوڈ شیڈنگ، پانی کی قلت گویا نفس کو کھینچنے کا مکمل سامان۔ زائدہ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے ہمسائی حلیمہ کی طرف متوجہ تھی جو کوئی برتنے کی چیز لینے آئی تھی۔

”زائدہ! تیری بیٹی کو جو لوگ دیکھنے آئے تھے بڑی لمبی سی گڈی میں۔ سنا ہے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ کیا جواب دیا پھر ان لوگوں نے؟“ حلیمہ کے اپنائیت بھرے انداز میں بختس کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔
”ہاں بس۔ ہم نے انکار کر دیا۔ ظہور کہتا ہے کہ زہبی ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اتنی کم عمری میں ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ڈال سکتے۔“ زائدہ اب اس کے علاوہ اور کیا کہتی۔ حلیمہ والا سوال تقریباً ”خاندان کے ہر فرد نے اس سے کیا تھا۔ اب کیا کہتی کہ اس رات کی ”عزت افزائی“ کے بعد انہوں نے دوبارہ پلٹ کر نہیں



دعا عبادت کا مغز ہے۔ مومن کا ہتھیار ہے۔ زندگی کی تلاطم خیز موجوں میں چلنے والا سفینہ۔ چلتے پھرتے گھر کے کام نمٹاتے اسے یونہی بشری کی قیص کا ستیاناس ہونا، احزم کا زخمی ہونا اور گھر کے بچوں کا شور اور ندیدہ بن یاد آتا تو دل پہ بوجھ سا آن پڑتا، روح بے کیفی کا شکار ہو جاتی، جسم و جاں پہ عجیب سی بے حسی طاری ہو جاتی، مگر یہ ساری کیفیت لمحہ بھر کی ہوتی، خشوع و خضوع سے روزے رکھتے ہوئے دل لگا کر عبادت کرتے ہوئے دل سے پورے یقین کے ساتھ اپنے لیے ”خیر“ کی دعا مانگتے ہوئے یہ سارا اضطراب، سیاری بے کیفی، بے حسی پل بھر میں اڑنچھو ہو جاتی تھی۔

آج چاند رات متوقع تھی۔ یعنی رمضان المبارک کا آخری یوم۔ ظہور سب بچوں کے کپڑے اور جوتے لے آیا تھا اور وہ اپنی سہولت کے لیے مار کر سے واضح نشان بناتی جا رہی تھی کہ کل کہیں عید کے دن سارا سامان گڈڈ نہ جو جائے۔

”یہ نیلا جوڑا نصیر کا، براؤن بلال کا۔“ ایک ایک بچے پہ قیص رکھ کر نشان لگانے کے بعد انہیں کھونٹیوں پہ

لٹکاتی جا رہی تھی۔ صحن سے آتی ٹامانوس آوازوں پہ کام کو روک کر وہ باہر چلی آئی پھر اسے دروازے پہ ہی رکنا پڑ گیا تھا۔ سامنے بشری اور آنٹی حسینہ موجود تھیں۔

”کیسی ہو زیب! بہت کمزور لگ رہی ہو۔ لگتا ہے پورے روزے رکھے ہیں۔“ بشری ہنستے ہوئے اس کے گلے آگئی۔ حسینہ آنٹی بھی اپنے سابقہ پر جوش انداز میں ملیں۔

”ہنسی نے میری بیٹی کی عیدی آخری عشرہ لگتے ہی خریدنا شروع کر دی تھی۔ کل اس کی شاپنگ مکمل ہوئی تو ہم ادھر چلے آئے۔“ حسینہ اس کے شرمگین چہرے کو دیکھتے ہوئے محبت سے بولیں۔

”یا جی! یہ آپ نے اچھا نہیں کیا کہ بخیر اطلاع کے آگئے۔ میری بچی کی پہلی پہلی عیدی آرہی تھی۔ آخر کچھ تو اہتمام کرتی میں۔“ زاہدہ خوشی سے بے قابو ہوتے دل کو سنبھالتے ہوئے عاجزی سے بولی۔

”پہلی عیدی ہی نہیں! بلکہ آخری عیدی بھی دینے آئے ہیں زیب کو۔“ بشری نے ہنستے ہوئے لہجے کی۔ ”مطلب؟“ وہ دونوں نہ سمجھیں۔

”منصور کو وہی سے واپس آئے ہفتہ ہو چکا ہے۔ ہمارا ارادہ عید کے فوراً بعد شادی کرنے کا ہے۔ اگر آپ کا ارادہ ہو تو۔“

زیبی سے وہاں ٹھہرنا محال ہو رہا تھا۔ شرم سے تپتے چہرے کے ساتھ اندر چلی آئی تو نظر بے ساختہ سامنے لگے چارٹ پہ پڑی۔ ”دعا کے فضائل“ وہ قریب چلی آئی۔

”خشوع و خضوع، عجز و انکساری اور خلوص کے ساتھ مانگی ہوئی دعا کبھی بارگاہ الہی میں رد نہیں کی جاتی۔“ وہ نم آنکھوں کے ساتھ بار بار اس سطر کو پڑھ رہی تھی۔

”تم واقعی امی کی بتائی ہوئی خصوصیات پہ پورا اترتی ہو۔ خوب صورت، نازک، من موہنی۔“ عیدی کے ہیگنز اس کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بشری نے اس سے کہا تھا۔ اس کی نگاہیں بے ساختہ اپنی سانولی

کلائیوں پہ اٹھ گئیں۔ بازوؤں پہ موٹے موٹے گرمی دانے تھے۔ صرف بازوؤں پہ کیا موقوف چہرہ گردن گرمی دانوں سے اٹے ہوئے تھے۔ سانولی رنگت موسم کی شدت سے سیاہی مائل ہو چکی تھی۔ تن پہ اس وقت گھسا رانا اڑے رنگوں والا لان کا جوڑا تھا۔ اپنا جائزہ لینا موقوف کر کے وہ انجانے رو پہلے احساس میں گھری ہیگنز کھولنے لگی۔

بے حد قیمتی جوڑے، جوتے، برس، کاسمیٹکس۔ آسورہ، مطمئن اور خوش حال مستقبل کے یقین سے سچی روشن آنکھوں کے ساتھ وہ اپنی پہلی عیدی کو بہت محبت اور احترام سے دیکھنے لگی۔ صرف پہلی نہیں بلکہ آخری عیدی کو بھی۔

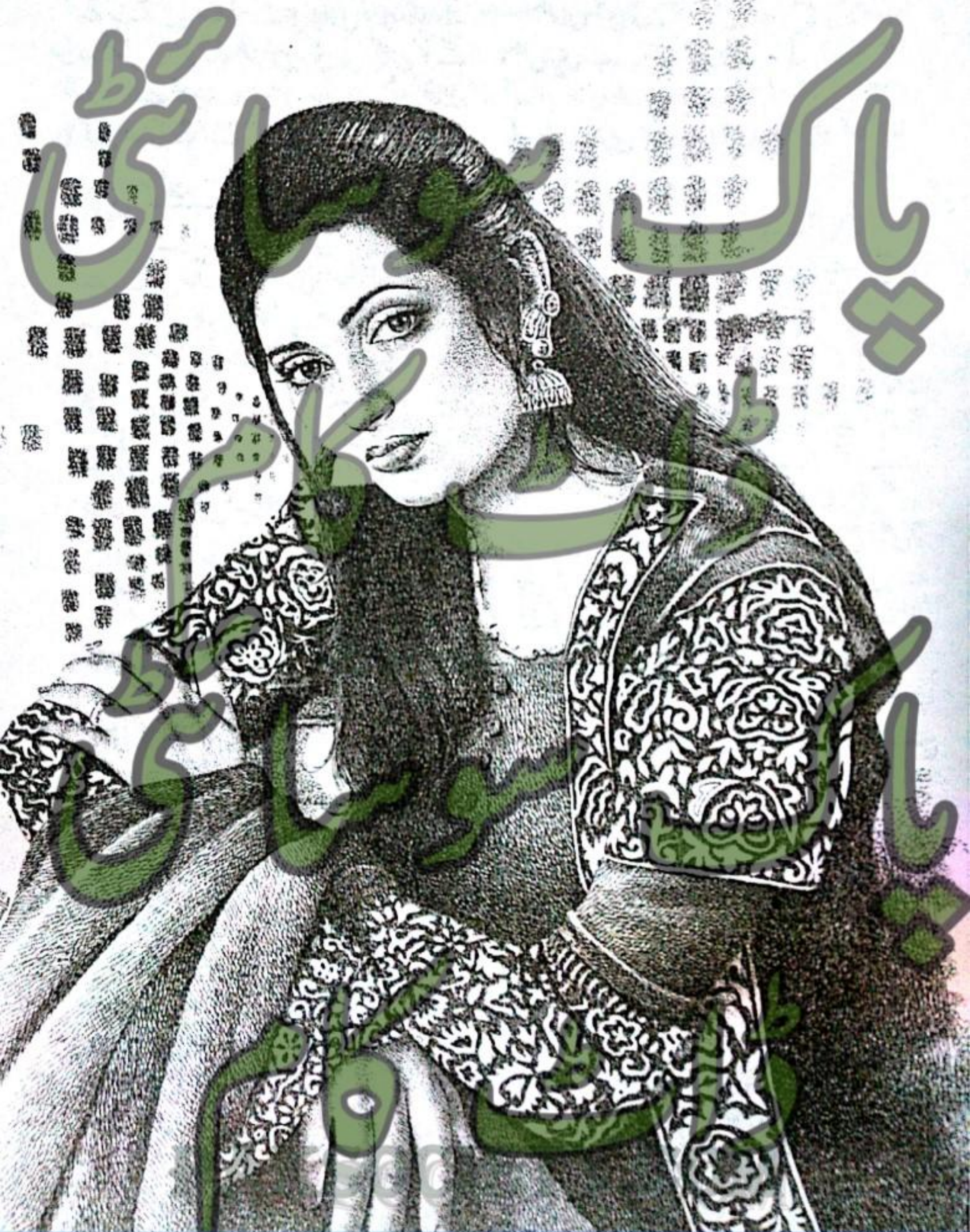
عیدِ حیات

رلے۔۔۔ جس چٹائی کے سٹکھے سے چاچی خود کو ہوا
 جھل رہی ہو تیں وہی پنکھا اسے کھینچ مار میں۔۔۔ صحن
 پر ڈالی مین کی چھت کے نیچے دری پر لینا گرمی کی مار
 سہتا گنگنا تا جاذب سٹکھے کی مار کھا کر بلبلاتا اٹھتا۔۔۔
 ”میں کون سے گناہ کمار ہا ہوں۔۔۔ لائٹ کے
 آجانے کی دعائیں ہی تو مانگ رہا ہوں۔۔۔“
 ”ہرگز نہیں چاچی۔۔۔!“ یہ دراصل لائٹ کے
 بہانے اپنے محبوب گلوکار ہمیش کو یاد کر رہا ہے۔۔۔“
 میں جلے پر نمک چھڑکتی۔ مجھے علم تھا جاذب موٹو کو
 ہمیش رشمیا کی آواز اس کے گائے ہوئے
 چھپھو رے گانے کس قدر پسند تھے۔۔۔ کیوں پسند
 تھے یہ وجہ بھی میں آپ کو بتاتی چلوں۔۔۔
 تو جناب وجہ بھی ہماری اپڑوسن منی خالہ کی گوری

بلا کی گرمی بھرا دن اپنے اختتام کی طرف گامزن
 تھا۔ دھوپ آم کے درخت کی گھنیری شاخوں کے پیچھے
 چھپنے کی سعی کر رہی تھی، مگر جس کا وہ عالم تھا کہ درخت
 کے تے تک ہلنے سے انکاری تھی۔۔۔ اور بجلی صاحبہ
 کے تو کیا ہی کہنے۔۔۔ کسی کرپٹ سیاستدان کی نخریلی
 بیگم کی طرح ہمہ وقت گھر سے غائب رہنے کے بہانے
 ڈھونڈتی تھی۔

کبھی لوڈ شیڈنگ تو کبھی شہارٹ سرکٹ، تو کبھی فیز
 غائب، جب ہی تو اس کے نخرول کا عادی ہونے کے
 باوجود جاذب ہمہ وقت دہائی دیتا پایا جاتا تھا۔
 جھلک دکھلا جا، جھلک دکھلا جا
 ایک بار آجا آجا آجا آجا۔۔۔ جا
 ”کبخت۔۔۔ روزہ دار ہے۔۔۔ کچھ تو شرم





چٹی موٹی بھینس صوجی ہے جو عرف عام میں صبی کہلاتی تھی۔
مجھے تو سو فیصد یقین تھا اس موٹی بھینس نے اپنے بکرارے موٹے موٹے ڈیلوں سے چھت پر آتے جاتے نین مٹکا کر کے ہی جاذی کو پھنسیا تھا۔
ورنہ بقول جاذی کے عمر بچپن کی دل بچپن کا کے مصداق اسے بچپن سے ہی اس موٹی سے عشق تھا اور لڑکھن تک آتے آتے عشق کا بوجھ اتنا بھاری ہو گیا کہ وہ چاچی کے گھٹنے سے چمٹ گیا۔

میں اڑتی نیچے بھاگی۔
”یا رس۔! زندگی کا منکر نکیر زیادہ خوفناک ہوتا ہے یا مرنے کے بعد ملنے والا۔“ جاتے جاتے بھی میں شوشہ چھوڑنے سے باز نہ آئی۔
”کہاں تھی تو۔۔۔؟ ہوش ہے یا نہیں دھوپ ڈھل رہی ہے۔۔۔ افطاری کی تیاری کرنی ہے یہ نہ ہوا کہ دو گھڑی ماں کے پاس بیٹھ کر کچھ کام دھام کر لے۔۔۔ چکی ہوگی اسی ناس پیٹے موبائل فون سے۔۔۔“

”ماں۔۔۔ پیاری اماں۔۔۔ صبی تمہاری بھی تو لاڈلی ہے۔۔۔ منی خالہ سے تمہاری ڈانت کالے کی دوستی ہے اسی دوستی کا پاس رکھ لو۔۔۔ میری محبت رسوانہ ہو اس لیے میں اپنی محبت کو ”منگنی“ کے ڈبے میں بند کرنا چاہتا ہوں، پلیز اماں۔۔۔ پیاری اماں۔۔۔ مان جاؤ نا۔۔۔“
چاچی کی منگیں ترلے کر کے اس موٹو جاذی نے اس موٹی صبی سے منگنی کروا کر ہی دم لیا۔۔۔ چاچی کون سا ظالم سماج تھیں، سیدھی سادھی معصوم سی چاچی کو دنیا کی ہر لڑکی ”پیاری بچی“ لگتی تھی، ظالم سماج تو میں تھی۔

”ماں تم تو اپنی سوتن (اگر ہوتی) سے بھی اتنا خار نہ کھاتیں جتنا میرے بچارے موبائل فون سے۔۔۔ میں بڑ بڑاتے ہوئے آلو پھیلنے لگی۔۔۔ ایک تو روزہ رکھنا مجھے بہت صبر آزما کام لگتا تھا، اس پر گرمی اور بجلی کی لوڈ شیڈنگ نے مت ماری ہوئی تھی۔ اب بچی کھچی ”مت“ کے خزانے اس ”ڈبے“ پر کڑھ کڑھ کر خرچ ہو رہے تھے جس میں موٹی صبی کی محبت بند تھی۔۔۔
روزہ افطار کے بعد نماز مغرب اور پھر بچی کھچی افطاریوں پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد فارغ بیٹھی تو خالی دماغ شیطان کا کارخانہ کے مترادف تیزی سے چلنے لگا۔ سوچا عشاء میں کچھ ٹائم ہے۔ کیوں نہ صدیقہ پھوپھی کی زار سے بات کر لوں۔۔۔
”ہائے زار۔۔۔ کسی ہوس۔۔۔ روزے کیسے جارہے ہیں۔۔۔؟“ میری ہر کسی سے بات چیت عموماً ”مہیج کے ذریعے ہوتی تھی۔

”اریبہ سہیل“ اپنے اماں ابا کی ”اکلوتی“ بیٹی۔۔۔ لاڈلی اس لیے نہیں کہا کہ مجھے تو آج تک کوئی ایسے آثار نہیں دکھے جس سے پتا چلتا ہو میں اپنی اماں کی لاڈلی یا ابا کی دلاری ہوں، ابا بلاشبہ میرے لیے ہٹلر نہیں تھے، مگر اماں ضرور مجھ غریب پر ہٹلر کی جانشین مقرر ہوئی تھیں۔
”اریبہ۔۔۔“ اماں کی دھاڑ پر سب سے نہ نے میرا بازو جھنجھوڑا تھا۔

”کیا بتاؤں یا رس۔۔۔! عید کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہی ہوں۔۔۔ پتا ہے ساحر میرے لیے ”پاری“ سے بہت خوبصورت جوڑا لایا ہے۔ اب ظاہر ہے ”عیدی“ آئے گی تو عید کے جوڑے کے ہمراہ ڈھیر سارا اور سامان بھی تو ہوگا۔ اس پر ساحر سے ”چوری چھپے“ عید ملنے کا سرور۔۔۔ اف تمہیں کیا پتا اریبہ! منگنی ہو جانے کے بعد عید کے دن کا الگ ہی مزہ ہوتا ہے۔۔۔ میں تم سے کیوں یہ سب کہہ رہی ہوں۔۔۔ بندر کیا جانے اور ک کا مزہ۔۔۔“ زارا کا

”بڑی اماں آواز دے رہی ہیں۔۔۔“
”کیا ہوا۔۔۔ لائٹ آگنی کیا۔۔۔؟“ میں کہانی بنتے بنتے ہڑبڑائی۔
”لائٹ نہیں بڑی اماں کا بلاوا آیا ہے۔۔۔“ وہ مسکرائی۔
”یوں کہو منکر نکیر کا بلاوا آیا ہے۔۔۔ میں چپل پیروں

”ماں۔۔۔! دنیا جہاں کی لڑکیوں کا رشتہ آتا ہے اور جھٹ پٹ منگنی شادی ہو جاتی ہے۔ میں بھی کوئی اندھی، کالی لنگڑی لولی تو نہیں ہوں۔ پھر میرا کوئی رشتہ کیوں نہیں آتا۔۔۔ مجھے بھی منگنی کروانی ہے اماں بس۔ میں نے کہہ دیا۔“

اس روز کالج سے آکر میرے صبر کا پیمانہ چھلک چکا تھا۔ کالج کے دوسرے سال سے لے کر اس چوتھے سال کے آخر تک میری تمام کالج فیلوز ٹھکانے لگ گئی تھیں، کسی کی ”ارنج“ ایلیمنٹ تھی تو کسی کی ”لو“ اور اب فیوئل کے بعد سب ایک دوسرے سے جدا ہونے والی تھیں، اپنے اپنے قصوں سمیت، پر میرے پاس میرے مسٹر رائٹ کا کوئی جی کوگرمانے والا قصہ نہ تھا، یوں میں نے افسردگی میں اماں سے شکوہ کر ڈالا تھا۔

”تو لنگڑی اور کالی تو نہیں ہے بیٹا، پر اس سے بھی بڑی خامی ہے تجھ میں کہ۔۔۔ تیرے سر کا تربوز خالی ہے۔“ اماں نے چشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے کچھ اس قسم کا طنز کیا جو میرے سر پر سے گزر گیا تھا۔ جس پر وہ مزید سنجھا ہونے لگیں۔

”شاباش ہے تجھ پر۔۔۔ لوٹھا کی لوٹھا ہو گئی، پر عقل تری گٹوں میں ہی دبی رہ گئی۔ ماں سے ایسی فرمائش کرتے شرم تو نہ آئی ہوگی مجھے۔“

”لو۔۔۔ ایسا کیا غلط کہہ دیا میں نے۔۔۔ جس پر شرم کروں۔“ اپنا کالج بیگ کندھے سے اتار کر پرے پھینکتے ہوئے میں ان کے سامنے صوفے پر پیرپسار کے لیٹ گئی۔

”اب گھر میں آپ کے علاوہ ہے ہی کون۔۔۔ میری کوئی چھوٹی بہن، باجی یا بھائی تو نہیں، جن سے میں اپنی دل کی بات کہوں۔۔۔“

”کرتی ہوں میں ترے دل کی فکر بے حیا۔۔۔“ اماں کی جوتی نے بہت تلملا کر میرا استقبال کیا تھا بہت دیر تک میری پشت جلتی رہی تھی۔ اب میں بھی کیا کروں جو دل میں ہو وہ زبان پر لانے سے ہرگز نہیں رک سکتی تھی، اب تو مسکھوں کی ان کے

طویل مسیج موصول ہوا جسے بڑھ کر میرے پتلے لگ گئے۔ تب کہ میں نے فون ہی آف کر دیا۔

”اس سانولی سلونی، چوہیا جیسی کزن کو ساحر بھائی جیسا ہینڈ سم منگیتر کیا مل گیا۔۔۔ یہ مجھے ”بندر“ کہہ رہی ہے، مزہ نہ چکھایا تو میرا نام اریبہ نہیں۔۔۔ میں نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔



صبح سے بادل چھائے ہوئے تھے، بوندا باندی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اور اتنے خوبصورت موسم میں آم کے پتھر جھولانہ ڈالوں۔ ایسا بھی سڑیل مزاج نہ تھا میرا بس لوگوں کا منگنی نامہ اور محبت نامہ سن سن کر دماغ تھوڑا اپنی جگہ سے کھسک جاتا تھا، مگر دیگر معاملات میں، میں بالکل سیٹ تھی۔ اسی لیے ہلکی ہلکی پیٹنگیں لیتی میں اپنے سیل فون میں آئے ہوئے اجیبی ممبرز کے مسیجز پڑھ رہی تھی، رانگ نمبرز پہ بات کرنا یا انجان نمبرز پر مسیجز کرنا مجھے بالکل پسند نہ تھا۔ اریبہ سہیل بھلا کیوں کسی کی ”دل پشوری“ کا سامان بنے۔

میرے مزار پہ آکے دیئے جلائے گا وہ میرے بعد میری زندگی میں آئے گا میں منتظر تھی تو اسی ایک شخص کی جسے میری زندگی میں آنا تھا، اسی لیے مندرجہ بالا شعر اکثر آہ کی صورت میرے لبوں پہ چکارتا تھا۔

میرے ساتھ کی تقریباً ”ساری سگی سہیلیاں اور کالج کی دوستیں“ منگنی شدہ ”ہو چکی تھیں۔ بس میں ہی کسی ایکس وائی زیڈ کے نام کا لٹھہ لگائے بغیر بے رنگ سی زندگی گزار رہی تھی۔

”کیا بتاؤں۔۔۔ منگنی سے شادی تک کا پیریڈ کتنا رومانٹک ہوتا ہے یا۔۔۔! ایسی لائف کے لیے تو میں اپنی شادی کو دس سال تک ملتوی کرنے کو تیار ہوں۔“ ندا چوہدری نے آنکھیں میچ کر کچھ اتنے سرور سے کہا تھا کہ بے اختیار تب سے ہی مجھے یعنی اریبہ کو ہو کا اٹھا تھا منگنی کروانے کا۔

منگیترا اور لورز سے ہونے والی رومان پرور گفتگو سنتے ہی مجھے طیش آجاتا تھا۔

”کاش! کوئی تو میرا دکھ مٹانے والا آجائے۔۔۔“ دل سے کراہ بھری دعا نکلتی۔ موبائل کی مہسج ٹون نے میرے دل جلے خیالات کا سلسلہ توڑا تھا۔ مہسج کا ”ڈبا“ کھولا۔

”تمہارے سر پر کوئل بیٹھی کوک رہی ہے“ فریاد کر رہی ہے“ یکے ہوئے آم توڑ کر ملک شہک بنانا تو اخلاقاً” جگ بھر کر صبحی کے لیے بھی دے آنا۔ بیچاری روزے رکھ کر۔۔۔ کمزور ہو رہی ہے۔۔۔“ مہسج ڈبو۔۔۔ میرا مطلب ہے منگنی کو ”ڈبا“ بنا کر اپنی موٹی محبوبہ کو رسوائی سے بچانے والے جازی کا تھا۔

”موٹی کے ملک شہک میں نیلا تھو تھا نہ ملاؤں۔۔۔“ زہریلی سوچ کا پُرجی سفر طے کرتے ہوئے میں نے اس کا دوسرا مہسج کھولا۔۔۔ جو ابھی ابھی آیا تھا۔

”مجھے پتا تھا تم میری پیاری سی صبحی کے لیے میری معصوم سی خواہش پر لال پیلی ہو جاؤ گی اس لیے بڑی اماں سے پہلے ہی کہہ دیا تھا وہ ایک جگ میرے لیے اور ایک جگ صبحی کے لیے ضرور بھیجیں گی۔۔۔ ایک ریکویسٹ ہے تم سے“ انظاری کے بعد لڑنے آنا۔۔۔ ابھی میں اور تم دونوں روزہ دار ہیں۔۔۔ بائے۔۔۔“ اس مہسج پر مزید تیج و تاب کھانے لگی تھی۔ ”اس دشمن نمبروں سے تو میں ابھی نبٹ لیتی ہوں“ پھر اللہ میاں سے توبہ کر لوں گی۔“ جھولاروک کر اترنے کا قصد کیا۔

”گلی رہ کبخت۔۔۔ اسی موئے فون پر آنکھ لگائے رکھنا“ یہ بخشش کروائے گا“ یہ نہیں ہونا کہ فارغ وقت میں کام آنے والی پڑھائی کر لے۔۔۔“ ماں کے ایک زبردست دھمو کے نے ہی مجھے جھولے سے اتار کر از خود دفٹ دور لڑھکا دیا۔

”کیا ہے اماں۔۔۔ اسکی بیٹی نہ سہی روزہ دار سمجھ کر

ہی ہاتھ بٹکار کھا کر سیں۔۔۔“ میں بری طرح تلملائی تھی، پیٹ پہلے ہی خالی تھا، سحری میں اماں نے میرے سامنے بھنڈی گوشت رکھا تھا، جو مجھے سخت ناپسند ہے، انڈا سحری میں کھانا ممنوع تھا تو وہی بھی رات گھر کا راستہ بھول گئی تھی، ”مجبوراً“ تھوڑا سا چائے پراٹھا زہر مار کر لیا تھا۔ اور روزے کی نیت میں دن بھر میں اناللہ (بھوک سے) نہ ہو جانے کی دعا بھی کی تھی۔

”جو تیرے کرتوت ہیں نا۔۔۔ تو تیرے کھانے پینے سے فاقہ کرنے کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ دن بھر فاقہ کر کے چند منٹوں کے لیے پانچ وقت جائے نماز پر کھڑے ہو جانے سے روزہ کا حق ادا نہیں ہوتا بیٹا۔۔۔! باز آجا۔۔۔ دن بھر تو اس موئے فون کو خزانے کی طرح منگنی میں دبائے بد روحوں کی طرح پورے گھر

میں بھٹکتی رہتی ہے“ کام کی نہ کالج کی دشمن اناج کی۔۔۔“ ان کی تلملاہٹ کسی طور کم نہ ہو رہی تھی۔ ”اب اور کیا کروں آپ کے لیے۔۔۔ بی اے تک پڑھ تو لیا ہے“ اب پیاہ کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ جس سے پوری طرح چشم پوشی کر رہی ہیں آپ۔۔۔ سچ کہہ رہی ہوں اماں۔۔۔ اس وقت میرا خود کشی کرنے کو جی چاہتا ہے“ جب وہ ڈلی موٹی۔۔۔ میرا مطلب ہے صبحی جازی سے ہونے والی ساری باتیں دوپٹے کا پلو مروڑ کر مجھے سناتی ہے۔“

”میں کہتی ہوں نا۔۔۔ تیری عقل اب تک گھٹنوں میں اٹکی ہے“ مگر اب لگتا ہے حالات زیادہ خراب ہوتے جا رہے ہیں“ تیری عقل گھٹنوں سے بھی نیچے سرک کر ٹخنوں میں آگئی ہے“ علاج ضروری ہو گیا ہے۔ فی الحال جا۔۔۔ جا کر اپنے عقل مند پیروں پر ٹھنڈا پانی بہانا کہ تیرے سر سے گرمی اترے۔۔۔ پھر کچھ کام کالج کر۔۔۔ کرتی ہوں تیرا بھی کچھ۔۔۔“ اماں کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہتی جا رہی تھیں، اور میں سچ سچ صحن میں لگے تل کے نیچے پاؤں رکھے ٹھنڈا پانی بہانے لگی۔



”جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم۔ جب تمہاری منگنی ہو جائے گی تا تب پوچھوں گا۔“
جانب نے ایک دم میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔
”ٹھیک ہے بچہ جی۔ سلواؤ عبایا۔ ایک کے بجائے تین سلوانا وہ بھی اپنی ”پاکٹ منی“ سے۔“
میں نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

آج ماہ مبارک کا تیسرا عشرہ لگ چکا تھا۔ ابا اعتکاف کے لیے مسجد جا چکے تھے۔ چاچی نے اماں سے کہہ دیا آخری دس روزے وہ چاہتی ہیں میں اور اماں ان کی طرف اوپری پورشن میں گزاریں۔ میرے تو مزے ہی ہو گئے تھے، اماں کے تھانیدارلی والے عتاب سے چاچی بارہا مجھے بچا لیتی تھیں۔

دوسرے سببینہ کے ساتھ رات بھر گیس مارنا، سحری تک جاگ کر سحری بنانا، کھانا اور پھر نماز فجر کے بعد جی بھر کر سونا کتنا خوش کن تھا یہ سب۔۔۔ سل میں ایک سے دو بار ہی اماں مجھے سببینہ کے ساتھ سونے کی اجازت دیتی تھیں۔

”سببینہ۔۔۔ سمجھالے اپنے بھائی کو۔ ورنہ یہ میرے ہاتھوں ضائع ہو جائے گا۔!“ لائٹ جانے کے

بعد صحن میں چارپائی پر بیٹھے میں اور سببینہ باتیں کر رہے تھے کہ میں نے جازی کی چوری پکڑ لی وہ ہینڈ فری کان میں ٹھونسنے بڑی دھیمی آواز میں یقیناً ”صبوحی سے باتیں کر رہا تھا، کیوں کہ چھت کی منڈیر پر کہنی رکھ کر باہر جھانکنے کا ڈراما کرتے اس کی والہانہ نگاہ بار بار منی خالہ کی چھت کی منڈیر تک جا رہی تھی۔

”ہاں بھئی میرے ڈبے۔! ہو گئیں اس موٹی سے باتیں کر لیا دیدار؟“ ایک ہی جست میں اس تک پہنچ کر میں نے پہلے اس کے کانوں سے تار کھینچا پھر اس کی کھنچائی کی۔ ہم دونوں میں دو سال کا فرق تھا، مگر اس کی بڑائی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے میں ہمہ وقت اس سے الجھنے کو تیار رہتی تھی، جیسے اس وقت کیا تھا۔

”دیکھ اریب۔! میری صبوحی کی شان میں کوئی گستاخی نہ کرنا ورنہ۔“ وہ فرہی مائل گداز بدن والی صبوحی کو موٹی کہنے پر ہمیشہ کی طرح چڑا گیا۔

”نہ۔۔۔ مجھے بتاؤ۔ تمہیں اس سارے زبانی میں یہی کمرے کے برابر کمر والی موٹی بھینس ملی تھی، جسے پلو موڑ کر اترانے کے سوا کوئی کام آتا ہی نہیں۔ اور یہ تم اتنی چیب قسم کی باتیں اس سے کیسے کر لیتے ہو؟ شرم نہیں آتی تمہیں۔۔۔؟“

یہی تو بات بہت باعث خوشی ہے مجھے وہ آنکھ کتنی محبت سے دیکھتی ہے مجھے
”اللہ نہ کرے جو میں تمہیں محبت سے دیکھوں۔“ میں تلملائی۔
”یا اللہ! کسی طرح اس چڑیل کو بھی منگنی شدہ کر دیں۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر دعا گو ہوا۔۔۔ ”ناکہ میں بھی اس سے گن گن کر اپنی صبوحی کی بے عزتی کا بدلہ لے سکوں۔“ میں اس کی پہلے جملے والی دعا پر آمین کہتی ہاتھ

ابن انشاء کی شخصیت اور علمی و ادبی خدمات پر

ڈاکٹر ریاض احمد ریاض کا تحریر کردہ مقالہ

ابن انشاء

احوال و آثار



قیمت: /- 1200 روپے
ڈاک خرچ: /- 50 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر:
32735021

پاکستان ڈائجسٹ 111 جولائی 2015ء

جھاڑ کرواپس پلٹ آئی تھی۔
 ”یہ عیایا کا کیا قصہ ہے۔“ مسبینہ بے چینی
 سے مجھ سے پوچھ رہی تھی میں نے صبوحی کی بات
 بتادی۔

صبوحی میری اچھی پڑوسن اور دوست تھی، مگر جب
 سے اس نے میرے ہی کزن جازب نصیر سے اپنے
 عشق کی راز و نیاز والی باتیں مجھے بتانی شروع کیں اور
 پھر میرے لاکھ سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود جازب
 نے اس سے منگنی کروا کر ہی دم لیا۔ تب سے مجھے ان
 دونوں سے دشمنی ہو چلی تھی، مگر مصیبت تو یہ تھی کہ وہ
 موٹی مٹی مجھے اپنی پکی سہیلی سمجھ کر بہت شرماتے
 لجاتے اور اتراتے ہوئے اپنے اور جازب کے درمیان
 ہونے والی بے حد نجی باتیں مجھے جب تک بتانہ
 لیتی اس کے پیٹ میں موڑاٹھتے رہتے تھے۔ ابھی
 حال ہی کی بات ہے جازب کے کہنے پر میں اور مسبینہ
 چاچی کی تیار کی ہوئی عیدی کا سامان چاند رات سے پہلے
 ہی اسے دے کر آئے تھے۔ ماں تو تب سے تو وہ مزید
 ہواؤں میں اڑا رہی تھی۔

ستائیسویں شب کی نفلی عبادات کے بعد سحری کر
 کے میں سوئی تھی۔ ارادہ تو تھا کئی گھنٹے سونے کا، مگر ماں
 نے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ وقت دیکھا تو صبح کے ساڑھے
 نو بجے تھے۔

”ماں! کچھ دیر تو اور سونے دیں۔“
 ”ٹھکتی ہے یا لگاؤں ایک جھانپڑ۔“ اٹھ کر منہ
 دھو، پال بنا اور ذرا تیز سے اپنی چاچی کے کمرے میں
 آجانا وہاں مدیحہ آئی ہوئی ہے۔ ”ماں کے لہجے کی
 غراہٹ نے میری نیند تو اڑا ہی دی تھی۔ مسبینہ کا بستر
 دیکھا وہ بھی خالی تھا۔

”کیوں مدیحہ! آئی نے مجھے اپنے ”بانسری“ جیسے
 بیٹوں میں سے کسی کے لیے دیکھا ہے کیا۔ اگر ایسی
 بات ہے تو میرے طرف سے انکار ہے۔ چار سال
 پہلے دیکھا تھا، مگر ان کی شکل سے ہی لگتا تھا ان میں
 ”عقل“ کا فقدان ہے، روئس کرنا کیا خاک جانتے
 ہوں گے۔“ حسبِ عادات میری زبان بلا سوچے

مجھے فراتے بھر کر چپ ہوئی تو اماں کی طرف نظر
 ٹھہری۔ اف کیسی عقیسلی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی
 تھیں، ان کے عتاب سے بچنے کو میں چادر پھینک کر
 جھپاک سے ہاتھ روم میں گھس گئی۔

میری شکل تو خیر! اللہ نے اچھی دی تھی، البتہ عقل
 کی طرف سے اماں تھوڑی فکر مند رہتی تھیں، جبکہ
 میں مکمل طور پر پُر اعتماد تھی۔ میں نے الماری سے ساہ
 سالان کا جوڑا نکالا جو مسبینہ نے شاید ایک بار بھی نہ
 پہنا تھا، اب اس جوڑے کی مجھ پر ہی رونمائی ہوئی
 تھی۔ میری بلا سے مسبینہ خون کے گھونٹ پی کر رہ
 جاتی۔ میری بد تمیزی کا چرچا عام ہو جاتا اور پھر مدیحہ
 آئی اپنے لبوترے پالس جیسے کسی ایک بیٹے کے لیے
 مسبینہ کا ہاتھ مانگ لیتیں۔

میرے لیے تو کوئی ایسا بندہ ہونا چاہیے جو شکل سے
 بھی بے حد رومانٹک لگتا ہو۔ جیسا کہ۔۔۔ جیسا کہ
 عمران ہاشمی! نن نہیں۔۔۔ اب ایسا بھی رومانٹک
 نہیں۔۔۔ عمران ہاشمی کی فلمیں دیکھتے ہوئے تو زیادہ تر
 نگاہیں مارے شرم کے اسکرین کے بجائے زمین پر
 سجدہ ریز ہوتی ہیں۔۔۔

خیالات کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے میں ست
 قدموں سے چاچی کے کمرے میں چلی آئی۔۔۔

”ارے۔۔۔! یہ اتنا سارا سامان۔۔۔ مم میرا
 مطلب ہے یہ تو ”عیدی“ کا بڑا روایتی سا سامان ہے،
 مگر کس کے لیے۔۔۔؟ مدیحہ آئی کو سلام کر
 کے (مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکڑے کے ساتھ بڑے
 نفیس سے ”ڈبا پیکنگ“ میں جوڑا پچپل، چوڑیاں،
 ہندی، جیولری، ہر ایک چیز اپنی چھب دکھلا رہی تھی)
 میرے منہ سے چیخ برآمد ہوئی تھی، ایک ایک چیز کو چھو
 کر دیکھتے میں نے خوشی خوشی پوچھا تھا۔

”یہ سب تمہارے لیے ہے۔“ مدیحہ آئی نے
 بے حد پیار بھرے لہجے میں جواب دیا۔ تو میری آنکھیں چر
 گئیں۔

”بالکل اریب۔۔۔! مدیحہ آئی تمہارے لیے
 ”عیدی“ لائی ہیں“ مسبینہ کے لہجے میں بھی خوشی

ہلکورے لے رہی تھی۔ اس کی خوشی میں وہ اپنے سوٹ کا غم بھی بھول بیٹھی تھی۔
 ”مگر مدیحہ آئی۔! میں نے آپ کے بیٹے کو نہیں دیکھا ہے۔“ کندھے اچکاتے ادھر میرا منہ کھلا ادھر اماں نے میرا بازو پکڑ کر مجھے گھسیٹا اور مدیحہ آئی کے برابر میں لا کر صوفے پر بیٹھ دیا۔ ساتھ میں اک درد ناک چٹکی بھی بھری تھی جو شاید خاموش رہنے کا اشارہ تھا۔ مگر وہ اریبہ سہیل ہی کیا جو موقع محل کے لحاظ سے زبان کھولے۔ سو میں نے اپنی معصومیت (بے وقوفی) کا ریکارڈ قائم رکھا۔

”مدیحہ آئی۔! اماں نے یقیناً میری افلاطونی طبیعت کے باعث بلا ہی بلا میرا رشتہ طے کر دیا ہے۔ جب ہی تو آپ میرے لیے عیدی لائی ہیں۔ سب کچھ بہت خوبصورت اور ایکسپینسوز ہے مجھے بہت پسند آیا ہے۔ لیکن اگر مجھے آپ کا بیٹا پسند نہ آئے تو۔۔۔؟؟؟ پلیز۔۔۔ آپ ہی مجھے بتائیں نا وہ دیکھنے میں کیسے لگتے ہیں۔ ڈل اینڈ بورنگ یا پھر رومان۔۔۔ آہم۔۔۔“ آگے فل اشاپ لگا دینا چاہئے اس روز مجھے خود بخود احساس ہوا تھا۔ اماں کا بی بی یکدم لو ہوا تھا۔ وہ گرنے کے قریب تھیں بھلا ہوا مدیحہ آئی کا جن کی تسلی بھری بات نے اماں کو سنبھالا دیا۔

”میں شاہ زیب کو۔۔۔ ہمیں بلوائتی ہوں کتنا عرصہ ہو گیا ہے اسے یہاں آئے ہوئے سب ہی اس سے مل لیں گے۔ کیوں راجعہ! بہت سرپلا لوجہ تھا مدیحہ آئی کا جیسے انہوں نے میری بات کا قطعاً ”برانہ مانا ہو۔ ان کے اجازت لینے پر اماں کا سراپا میں ہلا اور میں ان کے عتاب سے بچنے کو پھر سارا دن ان سے دور دور رہی۔۔۔“



”کمیخت تیری تو زبان کے آگے خندق ہے، کبھی تو اپنے منہ کا بھی صحیح استعمال کر لیا کر۔ ضروری ہے جو دل میں ہے وہ پھٹے بانس کی طرح ہر کسی کے سامنے

بکدے۔۔۔“
 ”یہ اگر مدیحہ نے بچپن میں تجھے نہ مانگا ہوتا شاہ زیب کے لیے تو آج میں تیرے لیے سرپکڑ کر رو رہی ہوتی۔۔۔“

”اف۔۔۔“ میں سارا دن اماں سے بچ بچا کر جو نہی سببیں نہ کے ساتھ اس کے بستر پر لیٹی، اماں کا زبردست دھموکا میری پیٹھ سلگا گیا۔ پھر اس کے بعد جو ان کی زبانی کیسٹ بلے ہوئی تو میں زخم زخم ہکا ہکا سر نیہوڑائے سنتی رہی۔

”اماں! اگر مجھ پر حملہ کرنا ہی تھا تو دبے پاؤں کیوں آئیں؟ ان کے چپ ہوتے ہی میں اپنی پیٹھ سہلاتے دہائی دینے لگی۔

”ہاں! پورا لشکر لے کر بھونپو بجاتے ہوئے آئی کہ میری لاڈلی مہارانی نے اپنی ہونے والی ساس کے سامنے کیسی بے حیائی کا مظاہرہ کیا ہے چلو اسے شاپاش دے آؤں۔۔۔“ ان کے انداز گفتگو پر سببیں نہ کی ہنسی چھوٹ گئی تو میں نے اسے گھورا۔

”ایک انڈا دیا میرے مولا، وہ بھی چٹھا ہوا۔۔۔“
 ”ایک انڈا وہ بھی گندا درست محاورہ سے بڑی اماں۔۔۔! اماں کے شکوہ پر جاؤی نے سر اندر کر کے جھٹ یا دو لایا تھا۔ یقیناً وہ دروازے کے اوٹ میں ہو کر میری درگت بنتے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورا۔

”اور جلو میری پیاری صبوحی سے۔۔۔“ اماں کے کمرے سے نکلنے کے بعد وہ ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا۔
 ”میں نے خون کے گھونٹ پیئے سببیں نہ کے ساتھ بنائے گئے پلان پر عمل کرنے کے لیے سببیں نہ کو اشارہ کیا۔

”آہم۔۔۔ جائزہ۔۔۔! وہ کیا ہے کہ میں سوچ رہی تھی شاہ زیب بھائی کو دیکھے ہوئے اک عرصہ ہو گیا ہے کم از کم ان سے بات تو کر سکتی ہوں۔۔۔ تو پلیز۔۔۔“
 سببیں نہ آگے بڑھ کر اس کے کندھے دبانے لگی۔۔۔ تم ابھی کسی طرح مدیحہ آئی سے شاہ زیب بھائی کا سیل نمبر لاؤ۔۔۔ پلیز۔۔۔“ وہ گھٹنے کے بل اس کی پشت پر

بیٹھی اس کے شانے دیاتی منت بھرے لہجے میں بول رہی تھی۔

”یہ اس چالاک لومڑی کی فرمائش ہوگی۔ ہرگز نہیں میں مدیحہ آنٹی کے پاس نہیں جاؤں گا اس وقت تو وہ سو بھی چکی ہوں گی۔ لیکن ضروری بات تو یہ ہے کہ میں اس جل ککڑی کے کام آؤں کیوں یہ کون سا میرا خیال کرتی ہے۔“ اس نے صاف ہری جھنڈی دکھائی۔ جس پر میں میدان میں اتری۔

”دیکھو جازبی۔۔۔؟ پہلی بات تو یہ کہ مدیحہ آنٹی ابھی جاگ رہی ہیں یعنی تسبیح پڑھ رہی ہیں۔ دوسری بات۔۔۔ اب میں کبھی بھی تمہاری مولیٰ منگیتر، اوہ سوری مہی کے خلاف کچھ نہیں بولوں گی اور نہ تمہاری برائی کروں گی۔ پر اس۔۔۔ میں نے جھٹ دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔

”سنئے اور مہینہ کے لیے عبائے کی فرمائش بھی نہیں کروں گی۔“ اس خبیث نے فوراً ”مطلب کی ساری باتیں منوانے کی ٹھان لی۔

اس کے علاوہ چاند رات کو مجھے صبحی سے ملوانے کے لیے کوئی راستہ نکالو گی۔“

”دن۔۔۔“ میں اپنا کام نکلوانے کو فوراً ”اسی کی ساری باتیں مانتی چلی گئی۔ نتیجتاً ”اگلے آدھے گھنٹے میں شاہ زیب کا ممبر میرے سیل فون میں آچکا تھا“ مہیج بکس کھول کر میں نے ایک خوشی سے نعرہ لگایا تھا۔



مدیحہ آنٹی اماں کی چچا زاد بہن تھیں۔ بقول چاچی کے ”میرے بچپن میں ہی انہوں نے اپنے بڑے بیٹے شاہ زیب کے لیے مجھے اماں سے مانگ لیا تھا۔ جب تک وہ کراچی میں رہیں اکثر و بیشتر اماں سے ملنے آیا کرتی تھیں، جہاں تک مجھے یاد ہے ان کے وہی بیٹے تھے گورے چٹے سوکھے لمبے بانس جیسے۔ ان میں سے ایک جو اپنی اماں کے ہمراہ آیا کرتا تھا مجھ سے بہت مار کھاتا تھا ہاتھ سے نہیں جناب درخت پر لگے

آمیا کیریوں سے۔ کیوں کہ اماں ان دونوں ماں بیٹے کے جانے کے بعد میری خوب تو واضح (چپلوں اور زبان سے) کرتی تھیں، کہ میں نے شربت کیوں گرایا تھا، ان کے لیے رکھے ریفریجمنٹ کو خود فٹاٹ چٹ کیوں کر گئی۔۔۔ فالتو باتیں کیوں کیں، تمیز سے کیوں نہ بیٹھی رہی۔۔۔ ایسے بہت سے اعتراضات اماں کی یادداشت میں فٹا رہتے تھے، سو میں لمبوں بانس کے الوداعی کلمات سنتے ہی جو وہ اماں سے کہہ رہا ہوتا تھا، سن کر سرعت سے درخت پر چڑھ کر شاخوں میں جا چھپتی تھی۔ اور اس لمبوں کے گیٹ تک پہنچتے پہنچتے ایک دو کیریاں تو اس کا مزاج پوچھ ہی لیتی تھیں، پھر بعد میں پیچھے پیچھے مدیحہ آنٹی اماں کی ہمراہی میں نکلتیں تو وہ بے چارہ اپنی درگت پر ”آہ“ کے بنا جھٹ بائیک اشارت کرنے لگتا۔

مدیحہ آنٹی کے دو لمبوں سے جانے کس نے مجھ سے زیادہ مار کھائی ہے، ان کی شکلوں پر تو میں نے کبھی غور بھی نہیں کیا تھا۔

چار سال پہلے تک یہ سلسلہ چلا پھر وہ لوگ اسلام آباد شفٹ ہو گئے تھے، مدیحہ آنٹی کے شوہر نے اپنی پوسٹنگ کروالی تھی۔ جازبی نے بتایا تھا، ان کے دونوں سپوت اسلام آباد کی ایجنسزنگ یونیورسٹی میں مائیکریشن کروا کر وہیں اپنی بڑھائی مکمل کر رہے تھے۔ اب اللہ جانے کیا بنا ان کا۔۔۔ مجھے تو بس اپنی منگنی اور ایک عدد منگیتر کی ہی خواہش تھی۔



”یار مہینہ۔۔۔! کہاں سے آغاز کروں۔۔۔“ موبائل ہاتھ میں پکڑے شش و پنج میں گھری میں نے مہینہ سے پوچھا۔

”جس دن تم پیدا ہوئیں اس وقت سے اور جب تمہارا نام اربیبہ قیامت رکھا گیا تب سے شروعات کرو۔ بے وقوف نہ ہو تو۔۔۔“ مہینہ بری طرح چڑی۔

”یار۔۔۔“ وہ اگر واقعی میرا منگیتر بن گیا ہے تو مجھے

اپنا فیصلہ بدل ڈالا۔
 ”کیا پتا کس مزاج کا بندہ ہو۔ لے کر اماں سے شکایت لگاتے ہوئے میرا لکھا میسج دکھا دے تو اماں تو میری عید غارت کر دیں گی۔ ویسے۔۔۔ عیدی تو شاندار سی آئی ہے۔“ مجھے دن میں صبحی کا تبصرہ یاد آ رہا تھا۔
 ”یہ تیرا منگیتر میرے جازی سے زیادہ اچھا نہیں ہو سکتا۔“

”عیدی شاندار ہے تو منگیتر بھی اس سے زیادہ شاندار ہو گا۔“ میں جل کر جواب دینے سے باز نہ آئی۔

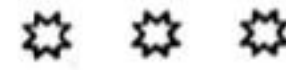
”اوہو۔ اتنا یقین۔۔۔ ویسے رابی خالہ۔۔۔! آپ نے اریب سے اس کے بچپن کا منگیتر چھپا کر اچھا نہیں کیا۔ بچاری خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی۔“ اس کا دھیرے سے کہا گیا آخری جملہ مجھے سلا گیا تھا۔ جی چاہا اس کے منڈیر سے جھانکتے بوتھے پر ایک کرار اسہا ہاتھ لگا دوں۔ پردھیان اماں کے جواب پر چلا گیا۔

”ہاں ہاں۔۔۔ سالوں پہلے اسے اس کا رشتہ طے ہونے کا بتا دیتی تا بیٹا۔! تو اب جو عقل اس کی ٹخنوں میں اٹکی ہے تب سے جاننے کے بعد تو یہ نخنے اوپر اور سر نیچے کیے گھومتی۔ اب ہیبت بھر میں اس کے ہاتھ پیلے کر کے جان چھڑاؤں اس کی بے عقلی و بدحواسی سے۔ ساس کی زبان سے چار چوٹ کھائے گی تب ہی عقل اس ”خالی تریوز“ میں آن سمائے گی۔“ اماں بھی جی بھر کے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔

”خیر۔ میں میسج کرنے کا سوچ رہی تھی۔“
 ”آہ۔۔۔“ کچھ یاد آنے پر میں اچھل کر اٹھ بیٹھی، فنانٹ اپنا فون تکیے کے نیچے سے نکالا اور میسج لکھنے لگی۔

”ساحر بھائی۔۔۔! زارا کو خبرہ کی خطرناک بیماری لگی ہوئی ہے ان دنوں۔۔۔ یقیناً“ بے چاری نے آپ سے یہ بات چھپائی ہوگی۔ لیکن میں ٹھہری آپ کی پکی ہمدردی۔ اس لیے آپ کو یہ مخلصانہ مشورہ دے رہی ہوں پلیز ابھی تین سے پانچ روز تک تو زارا کے قریب

اس سے کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہے جس سے میرا ایسج خراب ہو۔۔۔“ اماں کی دعا میں رنگ لارہی تھیں شاید مجھے تھوڑی تھوڑی عقل آرہی تھی۔
 ”تو پھر ایسا کرو اس فون کو الماری میں بند کر کے رکھ دو چاند رات کو جب شاہ زیب بھائی آئیں گے تب ان سے روبرو گفتگو کر کے ہی ایسج بنالیتا“ اوکے۔۔۔“
 سبویہ نے مجھے چڑایا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔
 ہا۔۔۔ مگر مجھے نیند کہاں آئی تھی۔۔۔ وہ ظالم ان دیکھا منگیتر میرے حواسوں پر طاری تھا۔۔۔ اللہ اللہ کر کے مجھے بھی نیند آئی گئی۔



اگلے دن اٹھا میسواں روزہ تھا“ سحری کے بعد سے ہی اماں اور چاچی نے مجھے اور سبویہ کو عید کی رہ جانے والی تیاری کے سلسلے میں صفائی ستھرائی اور دیگر کاموں میں لگا دیا اسی دن جازی سب کے کپڑے ٹیلر کے ہاں سے لے آیا تھا“ اب ایتیسویں روزے کی شام تک کپڑے پر لیس کر کے الماری میں تیار رکھنے تھے کیوں کہ اماں کا فرمان تھا کہ چاند رات کو چونکہ شاہ زیب اور جہانزیب بھی آچکے ہوں گے تو مہمانوں کی موجودگی میں کوئی فالتو کلام یا شاپنگ وغیرہ کا بکھیڑا نہ پھیلا یا جائے۔

اور میں تو باز امدوں میں پھرنے کے معاملے میں یوں بھی اول نمبر کی کال تھی۔

میرا کمرہ تو مدیجہ پھپھو کے لیے پہلے ہی تیار کر کے انہیں دے دیا گیا تھا“ اب باری تھی جازی کے کمرے کی۔۔۔ جس میں دونوں لیبوں کو رہنا تھا“ اور جازی بے چارہ شاید چچا مپاں کے کمرے میں ان کے ساتھ باادب“ بالملاحظہ“ ہو سیار کی صورت رہتا سوتا“ مجھے تو جازی کی حالت سوچ کر ابھی سے مزہ آ رہا تھا۔

رات کو تھک ہار کر بستر پر لیٹی تو ذہن شاہ زیب کے گرد ہی چکرار ہا تھا۔

”کیا کروں۔۔۔ اسے ایک میسج کر کے دیکھ لیتی ہوں رپلاٹی آتا ہے یا نہیں۔۔۔“ مگر پھر۔۔۔ خود ہی

”ماں! کیا تھا اگر سالوں پہلے مجھے بتادیتیں کا شاہ زیب میرا منگیترا ہے تو کم از کم میں اسے آموں کی مار تو نہ مارتی۔“ میں مارے افسوس کے اماں سے ہی الجھ پڑی مگر ہائے رے سچی زبان کی نادانی۔ اماں کی جرح پر بچپن کا سچ بتانا ہی پڑا ”جو ابا“ اماں کا زور یہاں کیا سناؤں سب روزا نزل سے آپ پر عیاں ہے۔

اماں کی کھنچائی کا صدمہ، شاہ زیب کے آنے کا صدمہ، اور اس کے اپنے منگیترا ہونے کا صدمہ۔ روزہ افطار کے وقت کون کون سے صدقات خدشات میرے ہمراہ نہ تھے۔ حلق سے کوئی چیز اتر ہی نہ رہی تھی۔ جب ہی مدیحہ آنٹی نے ٹوک دیا۔

”اریبہ! بیٹا طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔ تم نے کچھ بھی تو نہیں کھایا۔“ ان کی فکر جائز تھی، آخر میں دونوں سے ان کے سامنے ڈٹ کر کھائی تھی۔

”وہ۔ میں نماز کے بعد کھالوں گی۔“ میں فوراً ”نماز مغرب کے لیے اٹھ گئی۔ نماز کے بعد صدق دل سے دعا کی۔

”یا اللہ۔ عزت رکھنا میری، میرا منگیترا آم سے مار کھانے کا طعنہ مجھے نہ مارے۔ اماں کی طرح مجھ پر گرجنے برسنے والا نہ ہو۔“ دعائیں مانگ رہی تھی کہ مسجد سے چاند نظر آجانے کا اعلان نشر ہونے لگا۔

باہر سب ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔ کسی کو بھی بعد نماز وتر خوان پر رکھی پچی ہوئی افطاری کھانے یا سمیٹنے کی پروا تک نہ تھی، اماں ابا۔ چاچی اور چچا کو لے کر نیچے میرے کمرے میں مدیحہ آنٹی کے پاس چلے گئے۔ اللہ جانے انہیں کیا خفیہ باتیں کہی تھیں۔ سوائے سببینہ کے کسی نے بھی مجھے مبارکباد نہ دی تھی، حتیٰ کہ میرا سیل فون بجانہ اس پر کوئی مسیج لوٹن بھی جس سے میں سمجھتی کسی کو میرا خیال ہے۔

”ہائے رے بے قدری۔“ میں سببینہ کے کمرے سے نکل کر صحن میں آئی تو جازی اچک کر منی خالہ کی چھت پر جھانکنے کی سعی کر رہا تھا۔ دونوں گھروں کی درمیانی دیوار ذرا اونچی تھی، جبکہ سامنے والی منڈیر

بھی پھٹکنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ خسرو کا وائرس بہت تیزی سے لگتا ہے، امید ہے آپ اپنے خوبصورت چہرے کو چچک کے بد نما داغ سے سجانا گوارا نہیں کریں گے۔ میں نے آپ کو زارا کا حال بتا دیا ہے اس کا ذکر زارا سے مت کیجئے گا پلیز۔ آپ کی ہمدرد زارا کی کزن اریبہ۔“ مسیج سینڈ کر کے میں بہت مسرور ہونے لگی۔

اب ملو چوری چھپے عید۔ تمہاری عید کی دالی پر خسرو کا ایسا تڑکا لگایا ہے زارا میڈم کہ اب شادی کے بعد ہی تم ساحر بھائی سے مل پاؤ گی۔ ”میں بدلہ لینے پر خوش تھی۔

پھر ایک اور مسیج ٹائپ کرنے لگی۔ ایک معصوم سی خواہش ہے اگر یاد نہ ہو تری سوچوں کے جزیرے میں اترنا چاہتی ہوں ”او“ چاند رات ”کو میرے گھر میں اجالے لے کر اپنے گھر کی ”لائٹ“ پر بھروسا نہیں کرنا چاہتی ہوں (شاعر سے معذرت کے ساتھ) شعر میں تھوڑا رو بدیل کر کے میں نے اس شعر کو شاہ زیب کے نمبر پر بھیج دیا۔ اگلے دو منٹ میں ہی جوابی مسیج کی ٹون بجی تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہا۔ جلدی جلدی مسیج کا ڈبا کھولا۔ اک شعر ہی درج تھا۔

فلیک اپنے تعارف کے لیے بس اتنا کافی ہے ہم اس سے بچکے نکلتے ہیں جو رستہ ”آم“ برساتے۔

”ہیں۔“ میری پھٹی ہوئی نگاہیں لفظ ”آم“ پر جمی رہ گئیں۔ ”چلو جی گل ہی مک گئی۔ یہ تو وہی لبو نکلا جس نے میرے ہاتھوں آم سے خوب مار کھائی۔

سببینہ یا کسی کو بھی رات والے مسیج کا بتانا اپنی بے عزتی کروانے کے مترادف تھا سو میں دن بھر منہ پر ٹیپ لگائے گم صم رہی۔ جانے سامنے آنے پر ”مار کھانے“ والے کا کیا رد عمل ہوتا ہے۔ منگیترا سے کیا جانے والا رو مانس تو گیا کھڈے میں۔ اب کس طرح خود کو بے عزت ہونے سے بچاؤں۔ منگیترا اگر بدلہ لینے پر اتر آیا تو۔

سے جھک کر یا آسانی منی خالہ کی منڈیر پر کھڑا کوئی بھی نظر آسکتا تھا، مگر مسئلہ یہ تھا کہ چاند نظر آجانے کی وجہ سے پوری گلی کی رونق اور گہما گہمی بڑھ چکی تھی، سو وہ چھت کو ملانے والی درمیانی دیوار کا سہارا لے رہا تھا۔ میں اندر سے اسٹول لائی اور جاڑی کے پاس بیٹھ گیا۔

”مو اس پر۔۔۔ کھڑے ہو کر اس موٹی بھینس، مطلب اپنے چاند کا دیدار کر۔۔۔“

”اوہ تھینک یو میری بہنا۔! صرف رشتہ لگنے سے ہی کافی سدھر گئی ہو۔“ وہ اسٹول پر چڑھ کر دوسری طرف جھانکتے ہوئے مسرت سے گنگنایا۔

”یکو مت۔۔۔“ مجھے بے حد غصہ آیا۔ ”تم نے شاہ زیب کو میرا نمبر کیوں دیا۔“ مجھے ”آم“ والا مسیج آنے پر سخت رنج ہو رہا تھا۔ یعنی اسے پتا ہے میں نے ہی اسے مسیج کیا تھا۔

”کیوں کہ انہوں نے مانگا تھا۔“

”کیا۔۔۔؟؟؟ مگر اس نے کیوں مانگا تھا؟“ میں ہکا بکا اسے دیکھنے لگی ”کیوں کہ میں نے انہیں بتایا تھا۔ تم زندگی میں سب سے زیادہ محبت اپنے سیل فون سے کرتی ہو۔ نظر آگیا۔ میرا چاند مجھے نظر آ ہی گیا۔“ دوسری طرف دیکھ کر مجھے جواب دیتے دیتے جاڑی نے نعرہ بلند کیا تھا۔ جھٹ پٹ اس نے اپنے سیل فون کا بٹن دبایا تھا۔

”عید کا چاند نظر آجانا مبارک میرے چاند۔!“ خوشی سے بھر پور مگر بے حد دھیمے لہجے میں دی گئی جاڑی کی مبارکباد بھی میرے حساس کانوں سے بچ نہ پائی۔

”جاڑی کے بچے اتر جاؤ۔ نیچے اتر۔“ میں نے اسٹول کو ہلا کر اسے اترنے پر مجبور کر دیا۔ وہ دھڑام سے نیچے کودا۔

”گویا۔۔۔! تم نے وعدہ کیا تھا، ظالم سلج نہیں بنو گی۔“ جاڑی فون بند کرتے ہوئے جھنجھلا کے بولا۔

”جب میں خوش نہیں ہوں تو تمہیں بھی خوش ہونے کا کوئی موقع کیوں دوں۔ فوراً بتاؤ تم نے اور کیا کیا میری برائیاں کی ہیں شاہ زیب سے؟“ میرے تیور خطرناک ہو رہے تھے اگر شاہ زیب نے مجھ سے

منگنی کا ارادہ بدل دیا تو میرا کیا ہوگا۔؟

”تمہاری برائیوں کی لسٹ اتنی طویل ہے کہ چند منٹوں میں بیان نہیں ہو سکتی۔ مجھے لگتا ہے تمہیں شاہ زیب بھائی کے اب تک نہ آنے کا غم ستا رہا ہے۔“ اس نے سینے پر ہاتھ باندھ کر مجھے چڑایا تھا۔

تو کیا وہ نہیں آرہے؟“ پریشانی میں میں اپنی برائیوں کی لسٹ بھی پوچھنا بول گئی۔

”اطلاع تو یہی ہے۔“

اس کی بے نیازی پر میں ہاتھ لٹکائے کچھ مایوس سی کچن میں چلی آئی جہاں سب سے سب سمیٹنے میں لگی ہوئی تھی۔ میں بھی اس کے ساتھ بدولی سے کام کروانے لگی۔ فارغ ہوئی تو پھر سے ہاتھ میں کھجلی ہوئی اور شاہ زیب کو بے اختیار ایک شعر بھیج دیا۔

ہلال عید کے واسطے کوئی دعا کر دیکھیں
بجھتے ہوئے دیے کو پھر سے جلا کر دیکھیں
وہ آئے نہ آئے یہ اس کی رضا ٹھہری
جشن عید ہے، آؤ گھر کو سجا کر دیکھیں

پورا گھر صاف ستھرا ہو کر جس کے لیے محو انتظار تھا وہ تو آ ہی نہیں رہا تھا، جانے کیوں، میرا دل بچھ سا گیا تھا، اسی پل مسیج ٹون بجی۔ میں نے بڑی بے تابی سے مسیج کھولا۔ اور پڑھنے لگا۔

مسکراتی، گنگناتی، جھومتی آئے گی عید
تیرے دامن میں بہاروں کی مہک لائے گی عید
ہم پہ کب موقوف ہے رونق تمہارے بزم کی
چاہے ہم نہ ہوں، مگر آئے گی عید

”کیا مطلب ہو اس جوابی شعر کا۔۔۔“ میں بے حد جھنجھلائی۔

”مطلب یہی ہوگا کہ شاہ زیب بھائی نے تمہارے ماضی کی دہشت گردی کو سامنے رکھتے ہوئے آئندہ کچے یکے آموں کی نشانہ بازی سے بچنے کی خاطر تم سے منگنی یا شادی کا ارادہ کینسل کر دیا ہوگا۔“

”تمہارے منہ میں خاک۔۔۔“ سب سے نہ کی طویل

تشریح پر میں نے جل کر اسے تکیہ کھینچ مارا اور مہندی وغیرہ لگانے کا ارادہ موقوف کرتی اپنے تکیے میں منہ

گھسائے سو گئی۔ www.paksociety.com



عید کی صبح تقریباً پونے آٹھ بجے اماں کے دو ہتھروں سے آنکھ کھلی تھی۔

”کیا ہے اماں۔۔۔! میرا جی نہیں چاہ رہا ابھی اٹھنے کو۔۔۔“ میں دوبارہ سر سے پیر تک چادر تان کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ تب ہی میرے ہتھروں میں مہندی کی بھینی سی خوشبو آئی تھی۔

”عید کا دن ہے، یوں سر جھاڑ منہ بہاڑ ساس کو سلام پیش کرے گی۔۔۔“ انہوں نے دوبارہ چادر کھینچ کر اتار دی۔

”ارے ہاں۔۔۔ آج تو عید ہے، عید مبارک میری پیاری اماں!“ ایک جوش سے اٹھ کر میں ان کے گلے لگی۔

”اچھا بس بس۔۔۔ یہ جوڑا لے اور جا کر نہالے۔۔۔ سارے مرد حضرات عید کی نماز کے لیے جا چکے ہیں۔۔۔ ان کے آنے تک مدیحہ کی لائی ہوئی عیدی کی سب چیزیں پہن کر تیار ہو جانا“ کمرے میں ہی رہنا چن میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اور شمسہ (چاچی) کھانوں کی تیاری دیکھ لیں گے۔۔۔“ اماں کا لہجہ پہلی مرتبہ تھوڑا نرم ہوا تھا، مگر مجھے کچھ خاص خوشی نہ ہوئی تھی۔

”چھوڑیں اماں۔۔۔! جب شاہ زیب نے مجھ سے منگنی شادی ہی نہیں کرنی تو اس کی عیدی کا جوڑا پہننے کا کیا فائدہ۔۔۔“ میں نے جوڑا پرے سر کا دیا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ آگے کیے۔ اور مہندی کا بے حد خوبصورت ڈیزائن دیکھا۔

”ماں۔۔۔ یہ مہندی میرے ہاتھوں میں کس نے لگائی ہے۔۔۔“

”صبر جو آئی تھی لگانے۔ تو تو گدھے گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی، مہندی نے ہی تیرے ہاتھ سیدھے رکھنے میں بڑی رسہ کشی کی ہے۔“ اماں یقیناً رات کا

منظر سوچ کر ذرا سا مسکرائی تھیں۔

”اچھا اب جا“ جیسے میں نے کہا ہے ویسے تیار ہو، مزید فضول بک بک نہ سنوں۔۔۔ آج کے دن زبان کو ذرا لگام دے کر رکھنا۔ اور سب کے سامنے تمیز سے رہنا۔۔۔“ وہ شاید یہ کہنا چاہ رہی ہوں گی کہ مدیحہ اور اس کے بیٹوں کے سامنے تمیز سے رہنا۔

”اور بیٹا تو آیا ہی نہیں تھا، ہوز کیسٹ میں سر جھٹک کر اماں کے حکم کے مطابق تیار ہونے چل دی تھی۔

”یار مہینہ! جان تو چھوڑو میری۔۔۔ تم تو ایسے مجھ سے چٹھی ہوئی ہو جیسے منگنی یا شادی کی دلہن تیار کر رہی ہو۔۔۔“

مہینہ نے جب ہلکا پھلکا میک اپ کرنے کے بعد میرے لمبے بالوں کی چوٹی بنا کر مانگ میں بندیا نکالی تو میں کئے بغیر نہ رہ سکی، خود تو وہ صرف عید کا جوڑا پہننے ساہ سی تیار تھی۔ پراس کی مسکراہٹ مجھے کسی جھجکاہٹ جیسی لگ رہی تھی۔

جب وہ چوڑیاں بھی میرے ہاتھوں میں پہنا چکی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف کھیٹا۔ ابا اور چچا شاید نماز پڑھ کر آچکے تھے اب ہم دونوں کو ان سے عید کی مبارکباد دینے کا معاوضہ (عیدی) وصول کرنا تھا۔ میں سینڈل پہنے کھٹ کھٹ زینہ اترتی نیچے پہنچی تھی، مگر یہ کیا۔۔۔

ابا کے کمرے میں گھستے ہی سامنا ایک نئی شکل سے ہوا تھا۔

”یہ کون ہے۔۔۔“ کاندھے سے پھسلتا دوپٹا سینہالتے میں نے مہینہ کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

”مجھے کیا پتا۔۔۔ عمران ہاشمی کی طرح تو نہیں لگتا۔“ مہینہ کی سرگوشی مجھ سے زیادہ اونچی تھی۔

”دفع دوسرے۔ گولی مارو اس کو۔ یہ تو اس سے زیادہ ہینڈ سم ہے، پر یہ ہے کون۔۔۔؟“ مجھے فکر ہوئی تھی کہ کمرہ تو ابا کا ہی تھا۔

”آئی ڈونٹ نو۔۔۔ شاہ زیب یا جہاں زیب، تم خود

ہی پوچھ لو، میں چلتی ہوں۔" سبب یہ کہ مہنی چپکے سے کھسک گئی، بھید نہ کھولا کہ وہ رات میں اس سے مل چکی ہے۔

بتایا جائے۔
میرے تیکھے پن کا اس سے بھی زیادہ تیکھا جواب ملا تھا۔ "اف میری اماں۔۔۔ منگنی کا اتنا اچھا آٹھ سالہ پیرٹ مس کروا دیا۔۔۔" دل ہی دل میں مجھے بے حد حلق ہوا۔
"چھوڑو پرانی باتوں کو آج کی بات کرتے ہیں، آج کے دن کو جیتے ہیں۔۔۔ جب تم میرے پاس ہو۔ اتنے پاس کہ ہاتھ لگا کر تمہیں چھو سکتا ہوں۔ سالوں اسی عید کے خواب دیکھا کرتا تھا۔۔۔ مگر آج تم خواب نہیں حقیقت کی طرح میرے سامنے ہو۔" اس کی آنکھوں میں شوخی تھی، شرارت تھی، مستی تھی اور۔۔۔ محبت کی نرم نرم روشنی لوسی دینے لگی تھی۔
"پلیز اب تو مجھ سے ایک بار "عید مبارک" کہہ دو۔ دیکھو میں تمہارے لیے کتنا خوبصورت تحفہ لایا ہوں۔"

"آہم۔۔۔ آئی ایم شاہ زیب مصطفیٰ۔۔۔ وہ ذرا سا آگے کو ہو کر پشت پر ہاتھ باندھے سر کو ہلکا سا خم کر کے اپنا تعارف کرانے لگا۔ غالباً "ہم دونوں کی سرگوشی سن لی تھی، جب ہی لب مسکرا رہے تھے۔"

"اچھو ٹی۔۔۔ دونوں انکلز لوگوں سے عید ملنے میں اتنے بڑی تھے کہ میں خود ہی یہاں چلا آیا، اصل میں۔۔۔ میں کرتا شلوار میں کافی ان ایزی فیل کرتا ہوں سو آتے ہی چینج کر لیا۔۔۔ کوئی یہاں مائنڈ تو نہیں کرے گا۔۔۔؟؟؟" اس نے اپنے جینز اور ریڈ اینڈ بلیک ٹی شرٹ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"مانا کہ خوب ہوں مگر تم بھی کم نہیں۔۔۔" مجھے یک ٹک اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ پھر گویا ہوا تو میں گڑ بڑائی۔ ساتھ ہی اماں کا خشکیں چہرہ تصور میں آنے لگا۔

"میں چلتی ہوں۔۔۔" میں سرعت سے پلٹی کہ بھاگ لوں۔ مگر مجھ سے زیادہ پھرتی دکھائی تھی شاہ زیب نے اگلے ہی بل میرا بازو اس کے شکنجے میں تھا، مگر جلد ہی آنکھوں کے تنہی اشارے پر اس نے فوراً "میرا بازو چھوڑ دیا۔"

"عید مبارک نہیں کہو گی؟" بڑی شرافت سے پوچھا۔

"میں ہر ایرے غیرے کو مبارک نہیں کہتی۔" "اچھا جی۔۔۔ آٹھ سال پرانا منگیتر ایرا غیرا ہو گیا۔۔۔" وہ خفا ہونے لگا۔ "پورے چار سال آموں کے ہر سیزن میں تم سے کچے بکے آموں سے مار کھائی ہے۔ صرف اسی لیے کہ تم میری منگیتر تھیں اور مجھے اچھی لگتی تھیں۔"

چڑ کر ہی سہی اس نے اعتراف تو کیا تھا، مگر میں سدا کی انٹی کھوپڑی۔
"آٹھ سال مجھے اپنی منگیتر سمجھا تو مجھے کیوں لاعلم رکھا؟"

"کیوں کہ تمہاری اماں کو لگتا تھا کہ تمہاری اخلاقی تربیت پر برا اثر پڑے گا۔ لہذا شادی سے چند ماہ پہلے

اس نے ٹیبل سے ایک فریم میں لگی تصویر اٹھا کر میرے سامنے کی تھی، جس میں۔۔۔ میں آم کے درخت کی گھنیری شاخوں میں بندر کی طرح اکڑوں بیٹھی ہاتھ بڑھا کر آم توڑ رہی تھی۔ اور وہ آم یقیناً شاہ زیب کو کھینچ مارنے کے لیے ہی توڑ رہی تھی، کیوں کہ میرے چہرے کے تاثرات بڑے کڑے سے تھے۔

تصویر دیکھ کر میں بے ساختہ ہنستی چلی گئی تھی، ساتھ میں شاہ زیب بھی مجھے پیار بھری نگاہوں سے نکتے مسکرا رہا تھا۔

تمام عمر کی وابستگی کی خواہش تھی یہ کب کہا تھا میرا شہر چھوڑ جائے وہ میرے نبھی من کے درپچوں میں عید ہو جائے میرے ابق پہ اگر چاند بن کے چھائے وہ اماں کے ڈر سے ابا کے کمرے سے نکل کر میں کڑی دھوپ میں آم کے پیڑ تلے جھولے رہ آئی تھی، اور دھیرے دھیرے ایک سرور میں جھولتے ہوئے شاہ زیب کو مسجج بھیجا۔

"عید مبارک شاہ زیب۔۔۔" میرے لب گنگنانے لگے۔

یہ عید میرے لیے دلی مسرت کا پیغام لائی تھی۔



اسے امید بھی نہیں ہوتی۔“

وہ اماں کی بات پر جی جان سے ایمان لے آتا اور روز ٹھیلا دھکیلتا گلی کوچوں میں نکل پڑتا۔

وہ چھوٹا تھا مگر تختی تھا۔ ابا کی وفات کے بعد اس نے ابا کا ٹھیلا سنبھال لیا تھا۔ گھر میں دو ہی افراد بچے تھے۔ اماں جو گھر میں ہی کپڑوں کی سلانی کا کام کرتیں اور اقبال عرف بالا جو پھلوں کا ٹھیلا لگاتا۔ وہ محنت سے

ہرگز گھبراتا نہیں تھا بس آگ کا گولا جو آگ برساتا اس سے حالت پتلی ہو جاتی۔ ٹھیلا گھسیٹتے گھسیٹتے ہاتھ اور ٹانگیں جواب دینے لگتیں۔ پسینے میں شرابور ہو جاتا۔ سر پر کپڑے لپیٹے وہ لوکے پھیڑوں سے بچنے کی کوشش کرنا اور پیاس کی صورت میں راستے میں رکھے کسی مکے سے گرم تھپلانی اندر اتار لیتا۔

روز ہی اس کے سارے پھل بک جاتے اور جو ایک آدھ دانہ بیچ جاتا وہ کوڑا کرکٹ چننے والے بچوں میں تقسیم کر دیتا کہ اس نے پرندوں سے یہی تو سیکھا تھا کہ رازق روز رزق بانٹتا ہے اور جو آج دیتا ہے وہ کل بھی دے گا سو جمع مت کرو۔

”تو پاگل ہے بالے۔ جو پھل بیچ جاتا ہے اسے مفت میں بانٹ کیوں دیتا ہے؟ اپنا نقصان کرنا ہے۔ اسی پھل کو اگلے روز باقی پھلوں میں چھپا کر بیچ دیا کرو۔“ چاچا رحمہما سے عقل سکھاتا۔

”اماں کہتی ہے کہ بے ایمانی سے مال کبھی نہ بچنا۔ برکت اٹھ جائے گی۔ پاپ الگ چڑھتا ہے۔ میں بے ایمانی نہیں کرتا چاچا! تب ہی میرا مال روز بک جاتا ہے اور اللہ میرا نقصان نہیں کرتا۔“

چاچا رحمہما کی تضحیک کرتا۔ خوب ہنستا اور پاگل

”پرندے بڑے صوفی مزاج ہوتے ہیں۔ اپنے ساتھ گی جانے والی نیکیاں خوب یاد رکھتے ہیں اور اندر کہیں دل سے دعا دیتے ہیں۔“

اسے اماں کی ادق ادق باتیں شاذ ہی سمجھ آتیں۔ نہ جانے اماں اتنی مشکل زبان کہاں سے لاتی تھیں۔ وہ سن کر محض سر ہلا دیتا۔ اماں کی باتوں میں معنویت ہوتی اور وہ اصل ڈھونڈتا رہ جاتا۔

”رازق سے رزق وصول کرتے جاتے ہیں اور شکر ادا کرتے ہیں۔ ناشکروں میں سے نہیں ہوتے۔ پروں، بچوں میں رزق چھپا کر اڑتے نہیں ہیں۔ اپنے خصے کا کھا کر باقی ماندہ دوسروں کے لیے صدقہ کر دیتے ہیں۔ کیا تم سمجھ رہے ہو میرے بچے کہ پرندوں سے کیسے سیکھا جاتا ہے؟“

اور وہ کچھ کچھ سمجھ جاتا کہ اماں اسے کیا سمجھا رہی ہیں۔

اماں مٹی کی کٹوریوں کو روزانہ باجرے اور پانی سے بھر بھر کر لکڑی کے بنے ان ٹھڑوں پر رکھتیں جو انہوں نے خاص پرندوں کو سورج سے بچانے کی خاطر بنائے تھے۔ پرندے آ کر ٹھہرتے، پیاس، بھوک مٹاتے، ستاتے اور اڑ جاتے۔

اماں اسے صدقہ کہتی تھیں۔ غریبوں کا صدقہ، چھوٹی، مگر مستقل نیکی۔ گرمیوں کے موسم میں دوسروں کے لیے کی جانے والی بھاری نیکی۔

”اماں میں جا رہا ہوں۔ دعا کرنا پھل بک جائیں ورنہ گرمی میں جلدی خراب ہونے لگتے ہیں۔“

”جو رب کی مخلوق کے لیے آسانی پیدا کرے، رب اس کے لیے وہاں سے آسانی پیدا کرتا ہے جہاں سے



سامنے گھر سے جھانکتی بچی بوتل ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ غیب کی طرف سے بھیجی جانے والی ہمدرد۔۔۔
”یہ برف والی بوتل لے لو۔ گرم پانی ٹھنڈا کر کے پیتے رہنا۔“ اس نے لپک کر بوتل تھام لی اور اسے آفتاب کی کرنوں سے بچانے کے لیے بوری کے نیچے چھپا دیا۔

”روز برف کی بوتل لے جایا کرو۔ مگر پچھلے روز کی بوتل دینا مت بھولنا۔۔۔ بوتلیں کم پڑ گئیں تو پھیری والے زیادہ ہو جائیں گے۔ سو کل یہ بوتل ضرور لانا۔“ اور بالا تشکر سے اسے دیکھتا سر ہلا کر رہ گیا۔

صدقہ ایسا بھی ہوتا ہے۔۔۔ اتنا آسان اتنا بھاری۔۔۔ دو سروپ کے لیے آسانی پیدا کرتا ہوا۔ جیسا اس کی اماں کرتی تھی۔ جیسا وہ کرتا تھا اور جیسا اس بچی نے کیا۔

کرم کیے جانے والوں پر کرم ہی ہوتا ہے۔ یہ ہی کریم کا وعدہ ہے۔ وہ وہاں سے نوازتا ہے جہاں سے امید بھی نہیں ہوتی۔

کہتا اور وہ صرف مسکرا دیتا۔ بھلا چاچا کب سمجھ سکتا تھا جو اس کی سمجھ میں آتا تھا۔

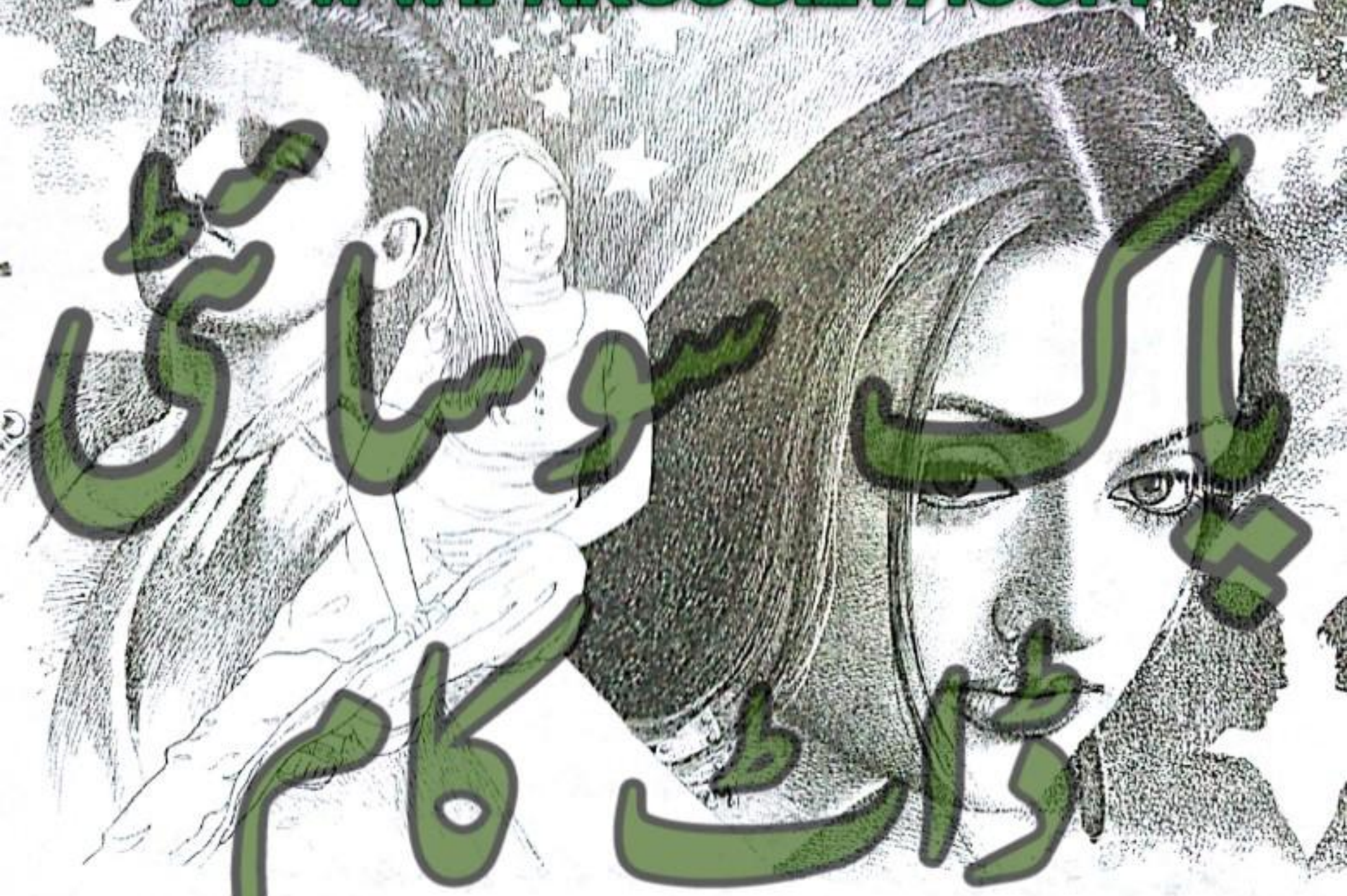
اس روز وہ صبح سویرے ہی گرمی سے ہلکان ہو چکا تھا۔ گرمی کا بہت زور تھا اور ہمت مفقود۔ پانی کے مشکوں سے پانی پیتا رہا، مگر گرم سپال ماہ اندریوں اترتا کہ گویا انتڑیاں سڑ کر بھسم ہو جائیں گی۔ پاس کہاں بچھنا تھی بھلا اور ایسے موسم میں پانی وہ بھی ٹھنڈا اٹھار سے بڑھ کر نعمت مترقہ کیا ہوگی۔ ”سوہنے رب! جیسے میری اماں تیری مخلوق کو سایہ اور پانی دیتی ہے تو کہیں سے ٹھنڈا پانی پلا دے۔“

وہ پسینہ پوچھتے درخت کے سائے میں ڈھے گیا۔ ٹھیلہ قریب ہی کھڑا تھا اور ہمت رخصت ہو چکی تھی۔ صدائیں لگا لگا کر گلا خشک تھا اور تپتا آب سیراب نہ کر سکتا تھا۔ آگے کا دن اب کیسے گزرنا تھا۔۔۔ اور یوں

بیٹھے بیٹھے پھل کیسے بکنا تھا؟

”بھائی۔۔۔“ آواز پڑنے پر اس نے مڑ کر دیکھا۔





نعمۃ احمد

سوسائٹی

فارس غازی انجیلی جنس کے اعلا عمدے پر فائز ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف اس کا بھانجا ہے جو اس سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔ سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ خین اور ایسامہ سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر سعدی کی پھوپھی ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالوے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی۔ فائرنگ کے نتیجے میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ یقین ہے کہ اس کا مامول بے گناہ ہے۔ اسے پھنسیا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن

پاک سوسائٹی ڈائجسٹ 122 جولائی 2015



مکمل ناول

ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جو اہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کی ایک بیٹی سونیا ہے جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔

فارس غازی ہاشم کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں جس میں اس کا بھی حصہ ہے رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔

والد کے کہنے پر زمر سعدی کی سالگرہ پر اس کے لیے پھول اور ہاشم کی بیٹی سونیا کی سالگرہ کارڈ لے کر جاتی ہے۔ سعدی ہاشم کی بیوی سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ مانگتا ہے۔ شہین اپنے دیور نوشیرواں سے جو اپنی بھابھی میں دلچسپی رکھتا ہے بہانے سے پاس ورڈ حاصل کر کے سعدی کو سونیا کی سالگرہ میں دے دیتی ہے۔

پاس ورڈ ملنے کے بعد سعدی ہاشم کے کمرے میں جا کر اس کے لیپ ٹاپ پر فلش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چیف سیکریٹری آفیسر خاور ہاشم کو اس کے کمرے کی فونٹ دکھاتا ہے جس میں سعدی کے کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے، لیکن سعدی اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شہرین نے نوشیرواں کو استعمال کر کے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔ دوسری جانب بڑے آواز مگر کو یہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گروہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔

نوشیرواں ایک بار پھر ڈرگزیلنے لگتا ہے اس بات پر جو اہرات فکر مند ہے۔

بعد میں سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمج ہو جاتی ہیں۔

سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے، حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر ”آئس ایور آفٹر“ لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے اور جینیا سے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس، زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لا پرواہی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بد تمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں ندرت سے زمر کی بات طے کر دیتی ہیں۔ وارث غازی، ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس کے پرکام کر رہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا پاس فاطمی، ہاشم کو خبردار کر دیتا ہے۔ ہاشم، خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضائع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کر رہا ہے۔ جب وارث ریڈ سگنلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہو کر ہاشم، خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث، فارس کو وہ سارے شواہد میل کر دیتا۔ وارث کے قتل کا الزام ہاشم، فارس پر ڈلوایا جاتا ہے۔

زر تاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ زر تاشہ مر جاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی، زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر اتفاقاً ”بچ جاتی ہے“ مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔ حنین کی نیٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاردار سے پیسے کے لیے غیر قانونی پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زر تاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین وارث کیس کی ایلی بائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

زمر فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ فارس کے خلاف بیان دے گی۔ گھر میں اس فیصلے سے کوئی بھی خوش نہیں، جس کی بنا پر زمر کو

دکھ ہوتا ہے۔

جواہرات، زمر سے ملنے آتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ فارس کے خلاف بیان دے۔ وہ زمر کے ساتھ ہے اسی وقت زمر کا منگیتر اس کو دیکھنے آتا ہے۔ اس کی ہونے والی ساس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ جواہرات اس کے منگیتر کو اپنی گاڑی میں بٹھالیتی ہے اور اسے آسٹریلیا بھجوانے کی آفر کرتی ہے۔

سعدی، فارس سے ملنے جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہاشم اس قسم کا آدمی ہے جو قتل بھی کر سکتا ہے اور وہ فارس سے مخلص نہیں ہے۔

سعدی کو پتا چلتا ہے کہ اسے اسکا لرشپ نہیں ملا تھا۔ زمر نے اپنا پلاٹ بیچ کر اس کو باہر رہنے کے لیے رقم دی تھی۔
اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔
www.paksociety.com

زمر کو کوئی گروہ دینے والا نہیں ملتا تو سعدی اسے اپنا گروہ دے دیتا ہے۔ وہ یہ بات زمر کو نہیں بتاتا۔ زمر بدگمان ہو جاتی ہے کہ سعدی اس کو اس حال میں چھوڑ کر اپنا امتحان دینے ملک سے باہر چلا گیا۔
سعدی 'علیشا کو راضی کر لیتا ہے کہ وہ یہ کہے گی کہ وہ اپنا گروہ زمر کو دے رہی ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر زمر کو پتا چل گیا کہ گروہ سعدی نے دیا ہے تو وہ کبھی سعدی سے گروہ لینے پر رضامند نہیں ہوگی۔
ہاشم حنین کو بتا دیتا ہے کہ علیشا نے اورنگ زیب کا ردار تک پہنچنے کے لیے حنین کو ذریعہ بنایا ہے۔ حنین اس بات پر علیشا سے ناراض ہو جاتی ہے۔

ہاشم 'علیشا کو دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس کی ماں کا ایک سیڈنٹ کروا چکا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ وہ علیشا کو بھی مروا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اور اس کی ماں بھی امریکن شہری ہیں۔
www.paksociety.com

جواہرات زمر کو بتاتی ہے کہ زمر کا منگیترا حماد شادی کر رہا ہے۔
فارس کہتا ہے کہ وہ ایک بار زمر سے مل کر اس کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے پھنسیا جا رہا ہے۔ وہ ہاشم پر بھی شبہ ظاہر کرتا ہے، لیکن زمر اس سے نہیں ملتی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمپیوٹر سے ڈیٹا چرا کر لے جا چکا ہے۔ وہ جواہرات سے کہتا ہے کہ زمر کی شادی فارس سے کرانے میں خطرہ ہے، کہیں وہ جان نہ جائے کہ فارس بے گناہ ہے، لیکن وہ مطمئن ہے۔ جواہرات زمر کو بتاتی ہے کہ فارس نے اس کے لیے رشتہ بھجوایا تھا جسے انکار کر دیا گیا تھا۔ زمر کو یقین ہو جاتا ہے کہ فارس نے اسی بات کا بدلہ لیا ہے۔ زمر جواہرات کے اکسانے پر صرف فارس سے بدلہ لینے کے لیے اس سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے۔

ڈیڑھ ماہ قبل ایک واقعہ ہوا تھا جس سے سعدی کو پتا چلا کہ ہاشم مجرم ہے۔
ہوا کچھ یوں تھا کہ نوشیرواں نے ایک ڈراما کیا تھا کہ وہ کوریا میں ہے اور اغوا ہو چکا ہے۔ تاوان نہ دیا گیا تو وہ لوگ اس کو مار دیں گے۔

ہاشم حنین اور سعدی کو آدھی رات کو گھر بلاتا ہے اور ساری پچویشن بتا کر اس سے پوچھتا ہے، کیا اس میں علیشا کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

وہ حنین سے کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں پتا کرو۔ حنین کمپیوٹر سنبھال لیتی ہے۔ سعدی اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ تب ہی ہاشم آکر اپنا سیف کھولتا ہے تو سعدی کی نظر پڑتی ہے۔ اس کو جو کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔

اس میں وارث کی بیٹیوں کی تصویر ہوتی ہے۔ جو وارث ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ہاشم کے سیف کے کوڈ آئینے میں دیکھ لیتا ہے اور کمرے سے اس کے جانے کے بعد سیف کھولتا ہے۔ اس سے ایک لفافہ ملتا ہے جس میں اس ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً بعد کی تصویر ہوتی ہے جس میں زمر خون میں لت پت نظر آتی ہے اور ایک فلیش ڈراما بھی ملتی ہے۔

تب اسے پتا چلتا ہے کہ ہاشم مخلص نہیں تھا۔ یہ قتل اسی نے کرایا تھا۔
www.paksociety.com

حنین نوشیرواں کی پول کھول دیتی ہے، وہ کہتی ہے کہ نوشیرواں پاکستان میں ہی ہے اور اس نے پیسے اینٹھنے کے لیے اغوا کا ڈراما چلایا۔

سعدی وہ فلیش سنتا ہے تو سن رہ جاتا ہے۔ وہ فارس کی آواز کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ جس میں وہ زمر کو دھمکی دیتا ہے۔ سعدی بار بار سنتا ہے تو اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ جعلی ہے۔ وہ فارس کے وکیل کو فارغ کر دیتا ہے۔ جو ہاشم کا آدمی تھا۔
سعدی زمر کے پاس ایک بار پھر جاتا ہے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ وہ کہتا ہے اس میں کوئی تیسرا آدمی بھی ملوث ہو سکتا ہے۔

”مثلاً ”کون؟“ زمر نے پوچھا۔

”مثلاً“..... مثلاً ”ہاشم کاردار....“ سعدی نے ہمت کر کے کہہ ڈالا۔ زمر سن ہی ہو گئی۔

زمر کو ہاشم کاردار کے ملوث ہونے پر یقین نہیں آتا سعدی زمر سے کسی اچھے وکیل کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ ریحان خلعی کا نام لیتی ہے۔ سعدی فارس کا وکیل بدل دیتا ہے۔

حنین علیشا کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ جیل میں ہے کیونکہ اس نے چوری کی کوشش کی تھی۔ ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی نے وہ آڈیو حاصل کر لی ہے جس میں فارس کا جعلی فون ٹیپ ہے لیکن وہ مطمئن ہے کہ جج تو ان کا ہے۔

ہاشم کی بیوی شہین ایک کلب میں جو اکیلا ہے اس کی سی سی ٹی وی فوٹیج ان کے کیمروں میں ہے۔ اسے غائب کرانے کے لیے سعدی کی مدد دیتی ہے۔

ریحان خلعی عدالت میں زمر کو جواب کر دیتا ہے۔ یہ بات فارس کو اچھی نہیں لگتی۔ فارس جیل سے نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا ساتھی غلطی سے زمر کو اس میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمر کا غصہ فارس کے خلاف مزید بڑھ جاتا ہے۔

زمر فارس سے ملتی ہے تو فارس کہتا ہے کہ ایک بار وہ اس کے کیس کو خود دیکھے۔ فارس کہتا کہ وہ زمر سے معافی نہیں مانگے گا۔

جیل سے علیشا حنین کو خط لکھتی ہے وہ حنین سے کہتی ہے تم میں اور مجھ میں ذہانت کے علاوہ ایک اور چیز مشترک ہے ہے ہماری برائی کی طرف مائل ہونے والی فطرت۔ اس لیے کسی کی کمزوری کو شکار مت کرنا۔ گناہ مت کرنا ورنہ کفارے دیتے عمر بیت جائے گی۔

حنین کو اپنا ماضی یاد آ جاتا ہے جب اس نے کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور وہ شخص صدمہ سے دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ وہ کفارہ کے لیے آگے پڑھنے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ سعدی کو یہ ساری بات بتاتی ہے تو سعدی کو شدید صدمہ ہوتا ہے۔

اورنگ زیب نوشیرواں کو عاق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جان کر جو اہرات غصہ سے پاگل ہو جاتی ہے۔ وہ اورنگ زیب کو قتل کر دیتی ہے اور ڈاکٹر سے مل کر اسے بلیک میل کر کے پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اپنی مرضی کی حاصل کر لیتی ہے۔

بارہویں قسط

”یا صاحبی السعجن“

ہم کبھی نہ ملے ہوتے۔

ایک دن!

کیوں کہ میں کبھی نہیں بھولوں گی۔
اور تمہیں رحم کے لیے گڑگڑاتے کوئی نہ سن پائے گا۔

کیوں کہ ابھی تو تم نے کچھ نہیں دیکھا۔
سو غور سے سنو۔

ایک دن تم جواب دو گے اپنے اعمال کا۔
بس انتظار کرو اور دیکھو۔

اے میرے قید خانے کے دو ساتھیو!

ایک دن میرا وقت بھی آئے گا۔

اور تم قیمت چکاؤ گے اپنے کیے کی۔

اور تم دیکھو گے کہ میں قطعاً ”اچھی“ نہیں ہوں۔

ایک دن میں آسیب کی طرح تمہیں ڈراؤں گی۔

یہ میرا وعدہ ہے جس کا ابھی تم کو اندازہ نہیں۔

مگر تم تب خواہش کرو گے کہ کاش۔

نکال کر لے گئے ہیں، اسی طرح آپریشن ٹیبل پہ مار دیتے۔ ان کو وہ زندہ چاہیے۔ اس لیے وہ اس کا خیال رکھیں گے۔“

”مگر کون ہیں وہ لوگ؟ بھائی نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟“ حنین نے بے بسی سے روتے پوچھا۔

زمر نے ملکہ سے کندھے اچکائے۔ ”مجھے نہیں پتا۔“ اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ پرس اٹھایا، چابیاں نکالیں۔ حنین نے تھیر سے اسے دیکھا۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ زمر نے جواب دیے بنا اسٹریپ کندھے پہ ڈالا، موبائل بیگ میں رکھا۔ فارس نے اس کی طرف نظریں اٹھائیں۔

”میں جا رہا ہوں تھانے، آپ مت جائیے۔“

”میں گھر جا رہی ہوں۔“ کسی سے نگاہ ملائے بنا وہ مڑ گئی۔ حنین کی آنکھوں میں صدمہ اترتا۔

”آپ بڑے ابا امی سب کو اتنی تکلیف میں چھوڑ کر جا رہی ہیں؟“

زمر کو عقب سے اس کی آواز آئی، مگر وہ قدم قدم

آگے بڑھتی رہی۔ حنہ نے بے دردی سے آنکھیں رگڑیں۔

”ٹھیک ہے۔ جائیے۔ ہمارا بھائی جیسے یا مرے۔ آپ کو کیا فرق پڑتا ہے؟ آپ نے تو ویسے بھی چار سال سے کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔“ زمر کے قدم لمحے بھر کو تھمے، پھر وہ آگے بڑھ گئی۔

”حنین! کم از کم اس وقت لڑائی مت کرو۔“ وہ خفگی سے ٹوکتا اٹھا۔ حنہ نے صرف ملامتی نظروں سے اسے دیکھا اور رخ پھیر گئی۔ امی گھٹا گھٹا سا ابھی تک رو رہی تھیں اور بڑے ابا کے ضعیف چہرے پہ آنسو ہنوز بہ رہے تھے۔

”وہ اب کسی کو نہیں ملے گا، میری امید کھو گئی ہے۔“ وہ دکھی دل سے کہہ رہے تھے۔



جو خیال تھے نہ قیاس تھے، وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے

اور تب تم جانو گے میرے خاندان کو۔ نقصان پہنچانے کے بعد کیا ہوتا ہے! ایک دن میں تمہیں ڈھونڈ لوں گی۔ مجھے پروا نہیں کہ اس میں کتنی دیر لگتی ہے۔ یا مجھے اس کے لیے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ میں کبھی اپنا وعدہ توڑا نہیں کرتی!

(Petite Magique کی نظم انتقام سے)

سعدی یوسف کی گمشدگی کے پانچ گھنٹے بعد آج صبح چھوٹا باغیچہ ویران پڑا تھا۔ سورج کی تپش نے سارے پھول جھلسا دیے تھے۔

اندر لاؤنج میں ندرت کے رونے کی آواز سب سے اونچی تھی۔ وہ چہرہ جھکائے نفی میں سر ہلاتی روئے جا رہی تھیں۔

”ہم اس کو ڈھونڈ لیں گے۔ یہ میرا آپ سے وعدہ

ہے۔“ فارس ندرت کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھے ان کو تسلی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ریت جگمگے کے باعث سرخ تھیں اور چہرے پہ تکان تھی۔

”اب کہاں ڈھونڈو گے؟ اب تک تو وہ اسے۔۔۔“ اور روپے میں چہرہ چھپائے اور زور سے رونے لگیں۔ ان کا کندھا سہلائی حنین بھی ”امی خود کو سنبھالیں۔“ کہتی پھر سے رونے لگی تھی۔ سیم سر گھٹنوں میں دیے کارپٹ پہ بیٹھا تھا۔ سامنے بڑے ابا گزروں جھکائے خاموش آنسو گرا رہے تھے۔

”وہ بالکل ٹھیک ہوگا“ اور اس کا خیال رکھا جا رہا ہوگا۔“ سنگل صوفے پہ گھٹنے ملا کر بیٹھی زمر نے بے تاثر سے انداز میں کہا تو وہ سب اس کو دیکھنے لگے۔ وہ اب بھی اسی طرح کم صم، چپ سی تھی۔

”تمہیں کیسے پتا؟“ ابا نے سر اٹھائے بغیر گلی آواز

میں پوچھا۔

”کوئی بھی بلٹ انجری مسلک نہیں تھی۔ اگر انہوں نے اسے مارنا ہوتا تو پہلی دفعہ میں مار دیتے یا پھر جیسے

جارہی تھی۔

”میں اب پہلے کی طرح آپ سے بات نہیں کرتی، میں ویسے دعا نہیں مانگتی۔ کیونکہ مجھے لگتا تھا، میرے پاس کھونے کو کچھ نہیں بچا۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ میرے پاس سعدی تھا۔“ یا تھا بیڈ سے نکالے وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے کہہ رہی تھی۔

”کیسے کسی نے اس کو گولی مار دی؟ کیسے اس کو اتنی تکلیف دی؟ اللہ۔ کوئی جانور کو بھی ایسے نہیں مارتا، وہ تو پھر انسان تھا۔“ وہ بولتی جا رہی تھی۔ ”میں نے اللہ۔ میں نے چار سال اس سے تعلق نہیں رکھا، میں نے چار سال ضائع کر دیے۔ میں کہاں سے وہ وقت واپس لاؤں؟ پلیز میرے ساتھ یہ مت کریں۔“ سر بیڈ کنارے سے لگائے وہ بچوں کی طرح روئے جا رہی تھی۔

کتنے لمحے بیتے، سورج کتنا تیز ہوا، معلوم نہیں، وہ اسی طرح بے خبری روئی رہی۔ یہاں تک کہ دروازہ دھیرے سے کھٹکا۔ پھر کھلا۔ چوکھٹ میں کھڑے فارس نے اندر دیکھا تو ساری پولیس فوٹو گرافس بکھری نظر آئیں اور وہ زمین پہ بیٹھی بیڈ کے کنارے پہ سر رکھے

رو رہی تھی۔ نیچے رکھا اس کا موبائل مسلسل زون زون کر رہا تھا۔

”زمر!“ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا قریب آیا۔ آنکھوں میں تکلیف لیے زمر کو دیکھا۔

”مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ اس نے چہرہ اٹھلایا، نہ آنسو پونچھے۔ بس آپ جناب کا تکلف بھی آج ختم کیا۔

”نہیں چھوڑ سکتا۔“ وہ بہت ہلکے سے بولا تھا۔ پھر جھک کر اس کا موبائل اٹھایا۔

”بصیرت صاحب کا فون ہے۔“

”مجھے تنہا چھوڑ دو فارس۔“ وہ چہرہ اٹھا کر اسے متفر نظروں سے دیکھتی ایک دم چلائی۔ ”جب بھی تم ہماری زندگیوں میں آتے ہو، کچھ نہ کچھ غلط ہو جاتا ہے۔ ہر چیز ہمیشہ تمہاری وجہ سے ہوتی ہے۔“ وہ چپ چاپ کھڑا دکھ سے اسے دیکھے گیا۔

جو محبتوں کے اساس تھے، وہی لوگ مجھ سے پھڑکے اس نے انیکسی کا دروازہ کھولا تو اندر سناٹا تھا۔ وہ اسی زرد چہرے اور ویران آنکھوں کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ پھر لکڑی کے زینے پہ قدم رکھتی چڑھتی گئی۔ ایک ہاتھ ریٹنگ پہ تھا۔ دوسرے میں پرس اور خاکی لفافہ تھام رکھا تھا۔

اپنے کمرے میں آکر زمر نے پرس فرش پہ ڈال دیا۔ پھر خاکی لفافہ کھولا۔ فل سائز تصاویر نکالیں۔ پھٹے ہونٹ، سرخ نشانوں اور زخموں والا چہرہ لیے، بند آنکھوں سے لینا سعدی۔ خون آلود لباس۔ زمر نے ایک کے بعد ایک تصویر سامنے کی۔ اس کی بھوری آنکھیں اس لڑکے کی بند آنکھوں پہ جمی تھیں۔ خشک بھوری آنکھیں۔

پھر ایک ان میں پانی بھرا۔ اتنا کہ وہ ڈبڈبا گئیں اور آنسو چہرے پہ تیزی سے بہنے لگے۔ اس نے زور سے وہ تصویریں سامنے دہرا رہی۔ دے ماریں اور پھر گھٹنوں کے بل بیٹھتی چلی گئی۔ چہرہ جھکائے، مٹھیاں فرش پہ رکھے، وہ ایک دم بلک بلک کر رونے لگی تھی۔

”کیوں اللہ۔ کیوں؟“ روتے روتے اس نے گیلا چہرہ اٹھا کر چھت کو دیکھا۔ ”کیا اتنے سل اسے اس لیے بڑا کیا تھا کہ کوئی آئے اور گولی مار کر چلا جائے؟ کیا ہم اپنے بچوں کو اس لیے بڑا کرتے ہیں؟ کیا آپ کی دنیا میں کوئی قانون نہیں؟ کوئی انصاف نہیں؟“

اس نے زمین پہ بیٹھے بیٹھے چہرہ بیڈ پہ رکھ دیا۔ دائیں گل پر آنسو بہتے دکھائی دے رہے تھے۔

”میں نے اسے کہا تھا کہ، میں اس کا خیال رکھوں گی۔ کئی سال پہلے جب ہم کلام میں تھے۔ ایک چشمے کے کنارے اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اس کا کوئی بھائی نہیں، تو اس کا کیپ کون ہو گا؟ میں نے کہا، میں ہوں گی۔ دو سال بعد سیم پیدا ہوا، مگر اسے تب بھی پتا تھا کہ اس کی کیپر زمر ہوگی، ہمیشہ اس کا خیال رکھے گی، مگر میں اس کا خیال نہیں رکھ سکی۔ میں اسے نہیں بچا سکی۔ کیوں اللہ، کیوں؟“ وہ سسکیوں سے روئے

میرے خاندان کو دیا ہے۔“

”آپ کو مجھ پر غصہ ہے اور آپ تکلیف میں ہیں، میں بھی ہوں۔ مگر یہ پہلی دفعہ نہیں ہے، جب مجھے یہ کہا گیا ہے کہ ہسپتال جاؤ، کیوں کہ تمہارے خاندان کا کوئی فرد گولیوں سے بھون دیا گیا ہے۔“ وہ اس کو دیکھتے ہوئے تکلیف اور دقت سے بولا تو گلے میں گولہ سا اٹکنے لگا، مگر اس نے نکل لیا۔ ”لیکن میں آپ کی طرح رو نہیں سکتا۔ میں رونا نہیں چاہتا۔ میں اس ایک شخص کو جس نے میرا خاندان تباہ کیا ہے ڈھونڈ کر اس کی چمڑی ادھیڑنا چاہتا ہوں۔“ اب کے اس کی آنکھوں میں درستی ابھری اور گردن کی رگیں کھینچتی ہوئی دکھائی دیں۔ زمر نے ایک تیز نظر اس پر ڈالی۔

”مجھے کچھ مت سناؤ۔ مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔“ اور رخ موڑ لیا۔ گیلی آنکھیں پھر سے رگڑ کر صاف کیں۔

”مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ میری بات سنیں۔ سعدی سے برابر کا رشتہ ہے ہمارا۔ ٹھیک ہے آپ کا کچھ زیادہ ہوگا، مگر اس وقت ہمیں آپس میں لڑنے کے بجائے ایک ساتھ مل کر اس کو ڈھونڈنا ہوگا۔“

”تو اتنی تو اتنی مجھ پر خرچ مت کرو۔ میں اسے ڈھونڈ لوں گی اور میں ہر اس شخص کو ڈھونڈوں گی جو اس میں

”مجھے نہیں پتا اسے کس نے مارا، لیکن اگر اس کا کوئی دشمن بنا ہے تو صرف تمہاری وجہ سے۔ تم نے ایک بڑھنے لکھنے والے بچے کو جیل پھری اور عدالتوں کے چکر میں دھکیل دیا۔ تم نے اس کو پتا نہیں کتنوں کا دشمن بنا دیا۔ مجھے تمہاری شکل سے بھی نفرت ہے۔“

ملاست سے اسے دیکھتی وہ صبح صبح کہتی پھر سے رونے لگی تھی۔

فارس خاموشی سے اس کے ساتھ اکڑوں بیٹھا اور گھٹنوں کے گرد بازو پھیلائے۔ پھر گردن گھما کر اسے یاسیت سے دیکھا۔

”مجھے پتا ہے اس کے دشمن میری وجہ سے بنے ہیں، میں نے اسے کہا تھا کہ میرے لیے غلط چیزوں میں انوالومت ہونا۔ مگر وہ ہوا۔ میں جیل میں تھا۔ اسے نہیں روک سکتا تھا۔“ وہ بدقت بول رہا تھا۔ اس کے انداز میں شدید تکلیف تھی۔

”تم ایک ہی دفعہ ہماری زندگیوں سے چلے کیوں نہیں جاتے؟ تمہاری وجہ سے ہم اور کتنا نقصان اٹھائیں گے؟ خدا کی قسم میرا دل چاہتا ہے، تمہیں جان سے مار دوں۔“ دکھ یہ اب غصہ غالب آنے لگا۔ وہ اس سے تین فٹ کے فاصلے پہ اکڑوں بیٹھا تھا۔ ان الفاظ پر بھی چہرے پر کوئی غصہ، کوئی تلخی نہ ابھری۔ بس تکان سے اسے دیکھے گیا۔

”آپ جو کرنا چاہتی ہیں، میرے ساتھ کر لیں۔ میں آپ کو نہیں روکوں گا۔“

”بے فکر رہو۔“ زمر نے تلخی سے سر جھٹکا۔ ”میں تمہارے ساتھ کچھ نہیں کروں گی۔ مجھے تم سے شادی بھی نہیں کرنی چاہیے، مگر خیر۔“ اس نے ہتھیلی سے آنکھیں رگڑیں۔ ”میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گی اور میں اپنے وعدے پورے کیا کرتی ہوں۔“ ساتھ ہی ملاستی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تم یہ مت سمجھنا کہ تمہیں بچ جاؤ گے، ایک دفعہ میں سعدی کو ڈھونڈ لوں، پھر میں تم سے بھی حساب لوں گی، اس ایک ایک زخم کا جو تم نے

سلسلہ چاندنی



قیمت - 300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 بازار کراچی 32735021

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں چل سکا۔ میں تھوڑی دیر میں گھر سے نکلوں گی، پھر دیکھوں گی۔ اچھا۔۔۔ وہ رک کر سننے لگی۔ پھر ہنسی تلخ سی ہنسی فارس نے چونک کر گردن موڑی۔

”مجھے اسی قسم کے آرڈر کی توقع تھی، مگر یہ کافی جلدی آگیا۔“

”نہیں۔۔۔ مجھے اب اس سے فرق نہیں پڑتا، آپ کا شکریہ۔“ موبائل رکھ کر اس کی نگاہیں انھیں تو فارس اسی طرف دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“

”مجھے ایڈووکیٹ جنرل نے بغیر وجہ بتائے معطل کر دیا ہے، اب میں پراسیکیوٹر نہیں رہی۔“ اتنی ہی تلخی سے بولی۔

”کیا۔۔۔؟“ فارس کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ ”مگر اس طرح کی معطلی غیر قانونی۔“

”اچھا ہی ہوا۔“ زمر نے شانے اچکائے اور الماری کی طرف بڑھ گئی۔ ”یہ وہ پہلی غلطی ہے جو ہمارے دشمنوں نے کی۔ اس سے انہوں نے مجھے یہ بتا دیا ہے، کہ وہ بار سوخ لوگ ہیں۔ یہ ان کی پہلی چال تھی۔“

بساط بچھادی گئی ہے اور کھیل شروع ہو چکا ہے۔ اب وہ دیکھیں گے کہ ان کا مقابلہ کس سے ہے۔ ”تلخی سے بڑھتی وہ الماری میں ہینگر الٹ پلٹ کرنے لگی۔ فارس کا ذہن ایک لفظ اٹک گیا۔“

(ہمارے دشمن؟ کیا اس کو خود بھی احساس نہیں کہ اس نے ”میرے“ یا ”سعدی“ کے بجائے ”ہمارے“ کہا؟)

اور اس ساری پریشانی، اذیت اور صدمے کی کیفیت کے باوجود ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ رنگ گئی۔ پھر وہ سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔ ابھی اسے بہت کچھ کرنا تھا۔



گھروں پہ نام تھے، ناموں کے ساتھ عہدے تھے بہت تلاش کیا، کوئی آدمی نہ ملا قصر کاردار کے ڈائمنگ ہل کی لمبی میزناشتے، پھلوں

انوالوڈ تھا اور پھر دنیا دیکھے گی کہ میں اس کے ساتھ کیا کرتی ہوں۔ مگر یہ تمہاری بھول ہے فارس! کہ میں اس سب میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گی۔“ اس کو تیز نظروں سے گھورتی وہ چبا چبا کر بولی۔

”نہ آپ اسے اکیلی ڈھونڈ سکتی ہیں نہ میں۔۔۔“

”مجھے تمہاری کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔“ تلخی سے کہتی وہ اٹھی۔ ”میں اکیلی سب کر لوں گی۔ تمہارا کیا بھروسا، کل کو مجھے بھی بچ آؤ۔“

فارس کے ماتھے پہ بل پڑے۔ دماغ کھول گیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھا۔

”ایسا سمجھتی ہیں آپ مجھے۔“ غصے سے اس کے مقابل کھڑے پوچھا تو چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”کیوں؟ کیا تم وہی نہیں ہو جس نے مجھ پہ گولی چلائی تھی؟ کیا تم وہی نہیں ہو جس نے مجھے استعمال کر کے جیل توڑی چاہی؟“ وہ بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ کر اتنے ہی غصے سے غرائی تھی۔ فارس کے لب بچھینچ گئے، چند لمحے ضبط سے گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔

”میں پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں، کیا آپ چلیں گی؟“ بدقت ضبط سے ساٹ سا پوچھا۔

”ہو نہ۔۔۔“ زمر نے نفی میں سر جھٹکا اور زمین پہ گرا موبائل اٹھایا۔ ”یہ ساری پولیس ان ہی لوگوں کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ یہ جتنی ناکہ بندیاں کرائیں، اسے نہیں ڈھونڈ پائیں گے“ ساتھ ہی موبائل پہ مسد کا لڑ دیکھ رہی تھی۔ اس کی ناک اور۔۔۔ آنکھیں ہنوز گلابی تھیں اور آنسو پھر سے بہنے لگے تھے۔ فارس کے چہرے کا ساٹ بن قدرے کم ہوا۔

”مجھے پتا ہے پولیس ملی ہوئی ہے، بے فکر رہیے، ان میں سے ایک ایک آفیسر کا وقت آئے گا۔“ اور جانے کے لیے مڑا تب ہی زمر نے فون کلن سے لگایا۔

”جی بصیرت صاحب۔۔۔“ وہ چوکھٹ میں ٹھہر گیا۔ مڑا نہیں۔ وہ اب فون پہ کہہ رہی تھی۔ آواز کونار مل کرتے ہوئے۔

”آپ کا بہت شکریہ۔۔۔ نہیں ابھی تک تو کچھ پتا

کے بعد اب کوئی نہیں ہے جو جانتا ہو کہ ہم نے وہ سب کیا تھا۔

ہاشم نے ملا متی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”کیا آپ کو اس حادثے کا ذرا بھی افسوس نہیں؟“

”اوہ نہیں، آف کورس ہے۔ میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔“ وہ فوراً ”معذرتی انداز میں کہتی ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئی۔“ آفس جانے سے پہلے ان کے گھر چلیں گے۔ یہ تو ابھی اس کا دماغ الٹا تھا، ورنہ وہ بہت پیارا لڑکا تھا۔ میرا بہت اچھا دوست۔“ (ایسے ہی غارت گروالی کہانی یاد آئی جو ایک شام اسے اہتر زہنی حالت میں سنائی تھی۔ چلو اس کہانی کا دوسرا گواہ بھی حتم ہوا۔ اور پہلی۔؟)

”میری کو بھجوا دیا تم نے؟“ سرسری سا پوچھا۔

”جی، اسے ملک بدر کر دیا ہے آج۔“ اور جو اہرات کا دل مزید ہلکا ہو گیا۔ (شکر!)

”اوکے۔“ اس کا دل اچاٹ ہو چکا تھا، بے زاری سے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”شیر پھرنا شتے نہیں آیا۔“ وہ ذرا فکر مند ہوئی۔

”وہ رات وہی چلا گیا تھا۔ آپ جب تک پارٹی سے آئیں، میں سوچتا تھا، بتا نہیں سکا۔“ اس نے سیل فون اٹھاتے سرسری سی اطلاع دی۔

جو اہرات نے شدید حیرانی سے چہرہ اٹھایا۔ ”مگر کیوں؟“

”دوستوں کے ساتھ پروگرام تھا۔ پریشان مت ہوں، اسے کچھ دن ریلیکس کرنے دیں۔ اور ہاں، یہ سعدی والی بات، اسے مت بتائیے گا ابھی۔ ڈسٹرب ہو جائے گا وہ۔ آخر وہ دونوں دوست تھے۔“

آخری فقرہ بدقت ادا کیا۔ پھر جو اہرات سے نگاہ ملائے بغیر وہ باہر نکل گیا اور وہ بس سر ہلا کر رہ گئی۔

”مجھے پتا ہے وہ کیوں گیا ہے۔ کیونکہ شہرین نے آج صبح وہاں جانا تھا۔“ ناراضی سے بڑبڑاتے گلاس اٹھایا۔

”آپ مسز کاردار سے کیوں چھپا رہے ہیں؟“ خاور نے اس کے پیچھے سے آکر پوچھا تھا۔

اور مشروبات سے بھی تھی، مگر جو اہرات سب چھوڑ کر پوری طرح ہاشم کی طرف متوجہ، حق دق سی سنتی جا رہی تھی۔ وہ سر جھکائے چائے کے کھونٹ بھرتے بتا رہا تھا۔ آفس کے لیے تیار اور ہلکا میک اپ کے تازہ دم جو اہرات کے برعکس وہ قدرے ست تھا۔ سوٹ، ٹائی، سب درست تھا، بس آنکھیں ہنوز سوجی ہوئی تھی۔

”سعدی کے ساتھ اتنا کچھ ہو گیا اور مجھے اب معلوم ہو رہا ہے۔“ بے حد حیرت اور افسوس سے وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ سامنے ہاتھ باندھے کھڑا خاور اپنے جوتے کو دیکھتا رہا۔ ہاشم کی نظریں بھی چائے پہ جمی تھیں۔

”اس کی فیملی تو بہت ڈسٹرب ہوگی۔“ جو اہرات کہنی میز پر جمائے، ایزنگ پہ انگلی پھیرتی، آنکھوں میں تاسف بھرے کہہ رہی تھی۔ ”آخر کون کر سکتا ہے یہ؟“ پھر چونک کر ہاشم کو دیکھا۔ ”تم نے تو۔“

ہاشم نے نہکین مٹھی میں بھینچا اور خفگی سے نظریں اٹھائیں۔ ”میں اس پہ کبھی کوئی نہیں چلا سکتا، نہ یہ خاور نے کیا ہے، ہم اس کے واحد دشمن نہیں ہیں۔“

”اوہ۔“ اسے سکون آیا۔ پھر گلاس اٹھا کر جوس کے دو گھونٹ بھرے۔ خاور اور ہاشم نے ایک خاموش نظر کا تبادلہ کیا۔

”مگر۔“ یکا یک جو اہرات کا سانس اٹکا۔ چہرے پر پریشانی آئی۔ ”وہ کل ہمارے پاس آیا تھا۔ کوئی ہم پہ شک۔“

”کسی کو نہیں پتا وہ کل ہمارے پاس آیا تھا۔ ہم آفس کے کل کے سی سی وی ریکارڈ کلنٹر کر دیں گے۔ زیادہ لوگوں نے اسے دیکھا بھی نہیں۔ اگر پتا چل بھی جاتا ہے تو کیا ہوا؟ کوئی ہم پہ شک نہیں کر سکتا۔“

”ہوں۔“ جو اہرات نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ہسپتال سے اگر وہ غائب ہوا ہے تو ظاہر ہے اتنی زخمی حالت میں۔ اونہوں۔ وہ تو ابھی تک زندہ بھی نہ ہو شاید۔“ پھر یکا یک ایک خیال کے تحت چونکی۔ ”ہاشم۔ سعدی کا یہ حادثہ۔ میرا مطلب ہے، اس کے جانے

چہرہ گھما کر ہاشم کو دیکھا۔ ہلکے سے شانے اچکائے۔
 ”جی۔ شکریہ۔ ابا آپ کھانا کھا لیجئے گا، مجھے در
 ہو جائے گی۔“ ابا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”تم
 کہاں جا رہی ہو؟“

وہ اداسی سے مسکرائی۔ ”سعدی کو ڈھونڈنے۔“
 ہاشم کی گردن کے گرد پھندا سا لگنے لگا۔ فوراً سے
 حنین کی طرف متوجہ ہوا۔

”اب تمہاری امی کیسی ہیں؟“

”دوا دے کر سلایا ہے۔ بہت اب سیٹ ہیں۔“
 اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ شاکی نظر زمرہ ڈالی۔ (ان
 کو تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ ایک آنسو جو بہایا ہو)
 زمرہ ابا کو دوسرے کمرے میں لے گئی، جب واپس
 آئی تو وہ کہہ رہا تھا۔

”آپ لوگوں نے مجھے کیوں فون نہیں کیا؟ میں ہوتا
 تو دیکھتا کس طرح کوئی اسے لے کر جاتا ہے۔“ وہ خفا ہوا
 تھا۔ جواہرات نے تاسف سے اس کا ہاتھ دبایا۔ اسے
 پتا تھا وہ سعدی کے لیے کیا جذبات رکھتا تھا۔

”ہاشم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ سعدی اس کا دوست تھا،
 آپ کو ہاشم کو بلانا چاہیے تھا۔“

”ہاشم کو بلانے سے۔“ زمرہ اور حنین دونوں نے
 ایک دوسرے کو دیکھا۔ کچھ یاد آیا۔

”ہاشم! کیا آپ نے سعدی کو بتائی تھی ایگزام والی
 بات؟“ زمرہ نے بغور اس کے چہرے کو دیکھتے پوچھا تو
 ہاشم نے چونک کر حنہ کو دیکھا۔ وہ بھی سانس روکے
 اسے دیکھ رہی تھی۔

”کون سی بات؟“

”جب ایگزام میں حنہ نے۔“

”اوکے میم پرائیویٹ۔“ ہاشم نے ہاتھ اٹھا کر روکا۔
 ”میں اس بارے میں بات نہیں کر سکتا۔ اٹارنی کلائنٹ
 ریویج کے تحت یہ میرے اور حنین کے درمیان ہے۔
 اگر آپ کو کچھ جاننا ہے تو حنین سے پوچھ لیں۔“

”میں سب جانتی ہوں۔ صرف سعدی کو بتانے کے
 متعلق پوچھا ہے۔“

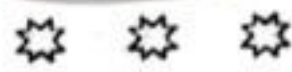
”میں ایسا کبھی بھی نہیں کر سکتا۔“ وہ اتنے اعتماد

”معاذ اللہ! ہونے دو پھر بتا دوں گا۔ ابھی کوئی
 لاپرواہی ہم افورڈ نہیں کر سکتے۔“ دلی آواز میں کہتا وہ
 اس کے ساتھ باہر آمدے تک آیا تھا۔ سیڑھیوں کے
 سرے پہ دونوں رکے۔ ہاشم نے چہرہ گھما کر نیچے پھلے
 سبزہ زار کو دیکھا۔ www.paksociety.com
 ”تم نے اس ممکنہ گواہ کو چیک کیا؟“ یہ پریشانی ختم
 ہونے کو نہیں آرہی تھی۔

”جی، مگر ایسا کوئی گواہ پولیس کے پاس پیش نہیں
 ہوا، نہ ہی سعدی کے گھر والوں سے کسی نے رابطہ کیا
 ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وہاں کوئی اور بھی تھا۔ وہ
 صرف نوٹیروں صاحب کی ڈرگز کے باعث
 Hallucination (وہم) ہو سکتی ہے۔“

”مگر میں اس امکان کو رد نہیں کر سکتا۔“ ہاشم
 مطمئن نہیں تھا۔ ”تم معلوم کرنے کی کوشش کرو۔“
 اور زینے اترنے لگا۔ خاور سر ہلا کر رہ گیا۔ ایک طویل
 اور اندھیرا رات ختم ہوئی تھی۔

حسب معلوم ہاشم کا رد کرنے سب سنبھال لیا تھا۔



وہ دیکھنے آیا تھا کہ کس حال میں ہیں ہم!
 چھوٹا باغیچہ ہنوز جھلس رہا تھا۔ اندر لاؤنج میں حنین
 خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ سامنے صوفے پہ
 ہاشم اور جواہرات ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ ابا اپنی وہیل
 چیئر پہ ندھال سے لگ رہے تھے، اور ان کے ساتھ
 کھڑی زمرہ کو دوا دے رہی تھی۔ ہاشم بار بار نگاہ اٹھا
 کر اس کو غور سے دیکھتا تھا۔ پڑمروہ، اداس حنین کے
 برعکس وہ تازہ دم لگ رہی تھی۔

اس کے آنے کے بعد ہی وہ اور فارس یکے بعد
 دیگرے آئے تھے (فارس پھر چلا گیا تھا) وہ بدلے
 ہوئے لباس میں تھی۔ سامنے کے بال پیچھے کر کے پن
 لگائے، باقی کھلے چھوڑے، ٹاپس پہنے، ہر روز کی طرح
 تیار لگ رہی تھی۔ یہ نارمل نہیں تھا۔

”آپ ٹھیک ہیں زمرہ؟“ ہاشم نے فکر مندی سے
 اسے مخاطب کیا۔ وہ ابا کو پانی کا گلاس پکڑاتے چوٹی۔

سے بولا تھا کہ حسین کی آنکھیں مزید بھیگیں۔ اس نے زمرہ ”دیکھا؟“ والی جتنی نظر ڈالی۔ جو اہرات بھی اسی اعمکو سے گردن اکڑائے بیٹھی رہی۔ زمرہ البتہ مشکوک نظروں سے ہاشم کو دیکھ رہی تھی۔

”ہوا کیا تھا؟“

”بھائی کو کل کسی نے بتایا تھا۔ یہ نہیں پتا کہ کس نے۔“

”کیا تم نے اپنی کلاس فیروز سے پوچھا؟ مجھے وہاں بہت سے لوگوں نے آتے دیکھا تھا۔“

”اوہ ہاں۔“ حسین کو یاد آیا۔ ”ناعمہ کا بھائی سعدی بھائی کا دوست ہے۔ شاید اسی نے بتایا ہو۔“

”اور تم نے سب سے پہلا شک مجھ پر کیا؟“ ہاشم مسکرایا۔ حسین کو ڈھیر ساری شرمندگی نے آن گھیرا۔

”آہم۔ یہ کس بارے میں بات ہو رہی ہے۔“ جو اہرات نے باری باری ان کے چہرے دیکھے۔

ہاشم نے ”ایک غیر اہم سی بات تھی۔ جانے دیجیے۔“ کہہ کر موضوع بدل دیا۔

زمرہ ہر نکلی تو باغیچے کے گیٹ کے ساتھ اسلامہ کھڑا ادا سی سے دھوپ کو دیکھ رہا تھا۔ صبح اب دوپہر میں تبدیل ہو رہی تھی۔

”مجھے ”اس“ جگہ جانا ہے۔ کیا تم مجھے پتا سمجھا دو گے، سیم؟“ وہ اس کے قریب آکر بولی تو وہ چونکا پھر فوراً ”سر ہلایا۔“

”آپ اکیلی مت جائیں۔ میں ساتھ آؤں گا۔“ اس کے کندھے کے برابر آتا سیم ایک دم سنجیدگی سے بولا۔

زمرہ کا سا مسکرائی، پھر اس کی کہنی تھام لی اور دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

”ماموں بھی ادھر گئے ہیں۔“ جگہ کا نام لیے بغیر اس نے بتایا تو وہ ہلکا سا چونکی تھی۔

جیسے ہی وہ زیر تعمیر گھر قریب آیا، زمرہ کے قدم بھاری ہوتے گئے۔ چہرے کی رنگت زرد پڑتی گئی۔ آنکھوں میں نمی ابھری جس کو اس نے اندر اتار لیا۔ (اللہ مجھے صبر دینا! کچھ دیر کے لیے ہی سہی!) گیٹ کے سامنے جب وہ رکی تو آنکھوں میں کرب کی جگہ افسوس نے

لے لی۔ اس نے ادھر ادھر گردن گھمائی۔

”پولیس نے اتنی جلدی کراٹم سین دھو دیا؟“ غصہ بھی اس نے اندر دبا لیا۔ وہاں چند لوگ اور پولیس اہلکار دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے پورچ میں قدم رکھا تو سیم کی کہنی زیادہ سختی سے بھینچ لی۔ سامنے فرش پر خاک زدہ خاکہ بنا تھا۔ (جدھر سعدی گر املا تھا)۔ اپنی گلابی ہوتی آنکھیں اٹھائیں تو گھر کے اندرونی حصہ میں وہ کھڑا نظر آ رہا تھا۔ اس کی زمرہ کی جانب پشت تھی اور وہ اینٹوں کی برہنہ سیڑھیوں کے پاس آدھا جھکا کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آگے آئی۔ فارس سے فاصلہ رکھے، رخ پھیر کر کھڑی، ارد گرد نگاہیں دوڑانے لگی۔

”ادھر کیا ہے ماموں؟“ سیم اس کی طرف گیا وہ چونک کر پلٹا، تو دیکھا وہ اس کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ فارس نے ایک خاموش نظر اس پر ڈالی، پھر سیم کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

”یہاں دو گولیوں کے نشان ہیں۔ اور ایک گولی اس دیوار میں بھی لگی ہے۔“ وہ اتنی آواز میں بولا کہ زمرہ سن لے اور وہ سن کر چونک کر مڑی تھی۔

”مگر۔ یہاں گولیاں کیوں ہیں؟“ سیم نے نا سبھی سے دونوں کو دیکھا۔

”اس کے اینگل سے لگتا ہے کہ یہ۔“ کہتے ہوئے اس نے گردن موڑی، وہ اب ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔ نگاہیں ملیں تو وہ سیڑھیوں میں لگے سوراخوں کو دیکھنے لگی۔ ”یہ پورچ سے ہی چلائی گئی ہے۔ ظاہر ہے اسی شوٹنے چلائی ہے۔“

”مگر۔ ادھر کیوں وہ گولی چلائے گا؟ سعدی بھائی تو بالکل دوسری طرف تھے۔“

”شاید اس کا نشانہ برا تھا۔“ فارس نے سرسری سا تبصرہ کیا۔

”یا شاید یہاں کوئی اور بھی تھا۔“ وہ ہلکا سا بڑبڑائی۔

”آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ کوئی اور بھی تھا؟“ وہ چونکا۔ زمرہ نے جواب نہیں دیا بس گردن موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ سیم نے بے چینی سے اسے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”مجھے بتائیے میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لیے۔“
 وہ سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی باغیچے کے جھلے پھول دیکھ رہی تھی جب وہ عین سامنے آکر اہوا۔
 ”آپ کا شکریہ، ضرورت پڑی تو بتا دوں گی۔“ ہاشم نے بس سر کو خم دیا۔ چند لمحے کی خاموشی چھائی رہی۔
 ”نہ کون کر سکتا ہے؟“
 ”مجھے نہیں معلوم، مگر ہو جائے گا۔“ ہاشم نے تھوک نکلا۔

”جس وقت سعدی کو گولی لگی، اس وقت۔“ مڑ کر گھر کو دیکھا جہاں ابھی وہ اندر گیا تھا۔ ”فارس کہاں تھا؟“
 زمر نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر گھر کو۔ ”کیا مطلب؟“

”کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ آپ کے خاندان میں ایک بڑی ٹریجڈی ہوئی تھی جس کے باعث وہ جیل گیا تھا، اور پھر وہ جیل سے نکلتا ہے تو ایک اور ٹریجڈی ہو جاتی ہے؟“ سرسری انداز میں کہتے وہ زمر کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

زمر پلک بھی نہ جھپک سکی۔ ”وہ اس کا بھانجا ہے، ہاشم!“
 ”جیسے وارث اس کا بھائی تھا اور زرتاشہ اس کی بیوی تھی؟“

زمر نے آنکھیں سکیڑ کر قدرے تعجب سے اسے دیکھا۔ ”فارس کا سعدی والے واقعے میں کوئی ہاتھ نہیں ہے، وہ اس وقت کہیں اور تھا۔“

”اوہ کم آن زمر!“ ہاشم نے بے زاری سے ہاتھ چہرے کے آگے جھلایا۔ ”اس کے پاس ہمیشہ ایلی بانی ہوتا ہے، آپ اس پہ اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی کیسے اعتبار کر سکتی ہیں؟ وہ فارس ہے، اس سے کچھ بھی بعید ہے۔ ہم سب جانتے ہیں، آپ نے اس سے کیوں شادی کی۔ اور میرے نزدیک تو اس کے جرائم میں آج ایک جرم کا مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ اب وہ وقت ہے جب آپ کو فارس کے خلاف کوئی ٹھوس قدم اٹھانا چاہیے۔“

”پھپھو۔ آپ کو کیسے پتا؟“
 ”میں نے ابھی معلوم کیا تھا کہ پولیس کو کس نے کال کی، کیونکہ سعدی کو بروقت اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ تو۔“ وہ سیم کو بتانے لگی۔ آواز بلند رکھی۔ فارس اسے غور سے دیکھتے ہوئے سننے لگا۔ ”تو معلوم ہوا کہ ہمسائے میں سے کسی نے کال کی تھی اور پتا سمجھایا تھا، مگر جب پولیس آئی تو یہاں زحمی سعدی کے سوا کوئی نہ تھا۔ اور ہمسائے میں۔“ زمر نے ادھر ادھر گردن گھمائی۔ ”سارے گھر تو ابھی زیر تعمیر ہیں۔“
 ”یعنی کہ وہ شخص جس نے پولیس کو کال کی، اس واقعے کے وقت یہیں تھا؟“

زمر نے نگاہیں پھیر کر فارس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”تھی۔ کال کرنے والی کوئی لڑکی تھی۔“ اور وہ مڑ گئی۔ اسے جاتے دیکھ کر سیم پیچھے لپکا۔
 ”پھپھو۔ کیا ہمیں یہاں اور نہیں کچھ تلاشنا چاہیے؟ مثلاً، کوئی نشانی، کوئی ثبوت، کوئی فنکر پرنٹ۔“

”سب دھل کر تباہ ہو چکا ہے سیم۔ ہمیں اس کو وہیں ڈھونڈنا ہے جہاں وہ کھویا تھا۔“ وہ جیسے صرف یہ جگہ دیکھنے آئی تھی۔ کسی اور چیز کی امید نہ تھی۔
 سیم اور وہ ساتھ ساتھ چلتے واپس آئے تھے۔ فارس چند قدم پیچھے تھا۔ سیم اندر چلا گیا اور وہ ابھی باغیچے کے دروازے پر تھی جب اس نے عقب سے پکارا۔

”میں اسپتال جا رہا ہوں۔ اس کی انتظامیہ نے۔“
 زمر بات مکمل ہونے سے پہلے اڑیوں پر گھوی۔
 ”ان کی انتظامیہ نے پولیس کو نامکمل سی سی ٹی وی فوٹیج دی ہیں، میں جانتی ہوں، اور یہ بھی جانتی ہوں کہ مکمل فوٹیج کیسے نکلوانی ہیں اور وہ میں نکلوا لوں گی۔ آپ اپنے کام سے کام رکھیے، میرے راستے میں مت آئیے۔“ سروپاٹ سا کہتی وہ واپس مڑ گئی تو فارس نے ایک تاسف آمیز سانس لے کر سر جھٹکا اور گھر کی طرف بڑھ گیا۔ فارس جیسے ہی اندر گیا، ہاشم باہر آنا دکھائی دیا۔

زمر نے لب بھینچ لیے عین نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”آپ پوچھیں گے نہیں کہ اس کا اہلی بائی کون ہے؟“

”اس دفعہ کون ہے؟“ اس نے استہزائیہ سر جھٹکا۔ ”میں! وہ اس وقت میرے ساتھ تھا۔“

لمحے بھر کو وہ کچھ بول نہیں سکا پھر وضاحتی انداز میں گویا ہوا۔ ”میں فارس پہ اعتبار نہیں کر سکتا میں اپ سیٹ ہوں سعدی میرا دوست تھا اور۔“

”او کے ہاشم! ایک بات۔“ وہ ایک ہاتھ اونچا کر کے اسے درمیان سے ٹوکتی اس کی آنکھوں میں دیکھ کر اسی سرد مہری سے بولی۔ ”آپ فارس کو ناپسند کرتے ہیں مگر مجھ سے زیادہ نہیں۔ آپ سعدی کو پسند کرتے ہیں مگر مجھ سے زیادہ نہیں۔ اس لیے میری یہ بات پہلی اور آخری دفعہ دھیان سے سنیں فارس نے۔ یہ نہیں کیا۔ اپنے پچھلے اعمال کا وہ حساب دے گا مگر آپ نے اگر اپنے خاندانی تنازعات کے بدلے کے طور پر فارس کے خلاف میرے بھینچے کی ٹریجڈی کو استعمال کرنا چاہا تو آپ مجھے اپنا دشمن بنائیں گے۔ دوست ہم پہلے بھی نہیں تھے۔“

ہاشم نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں۔“

”یہ موضوع ختم ہوا۔“ وہ ایک سلگتی ہوئی نگاہ اس پہ ڈال کر آگے بڑھ گئی۔ ابھی دروازے کے قریب آئی تھی کہ وہ کھلا اور فارس باہر نکلا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر رکا اور ہٹ کر راستہ دیا۔ زمر آگے نہیں بڑھی وہیں کھڑے فارس کو دیکھا اور کافی صاف آواز میں بولی۔

”میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ میری گاڑی میں کچھ مسئلہ ہے۔“ کن اکیوں سے نظر آ رہا تھا کہ باغیچے میں کھڑا ہاشم ہلکا سا چونکا تھا۔

”او کے“ میں انتظار کر رہا ہوں۔“ فارس ایک سنجیدہ مگر حیران نظر اس پہ ڈال کر آگے چلا آیا۔

زمر اندر آئی کمرے سے اپنی ایک دو چیزیں اٹھائیں تو لاؤنج میں بیٹھی جواہرات کی آواز سماعت میں پڑی۔

”اب تم لوگوں کو اس جگہ نہیں رہنا چاہیے۔ یہ علاقہ محفوظ نہیں ہے۔“ وہ حنین سے کہہ رہی تھی۔ زمر ٹھہر کر کچھ سوچنے لگی پھر سر جھٹک کر باہر نکل آئی۔

پرس کہنی پہ لٹکائے اس نے باہر قدم رکھا تو دیکھا فارس گاڑی کی طرف جاتے ہوئے رک کر ہاشم سے کچھ کہہ رہا تھا۔ دونوں کا انداز عام اور سرسری تھا۔ زمر خاموش نظروں سے ان کو دیکھتے ہوئے کار کی طرف چلی آئی۔



نئی منزل کی راہ ڈھونڈو تم! میرے عم سے پناہ ڈھونڈو تم!

چند منٹ بعد جب کار سڑک پہ رواں تھی تو فرنٹ سیٹ پر بیٹھی زمر نے موبائل پہ چلا تا ہاتھ روک کر سرسری سا پوچھا۔

”ہاشم تم سے کیا کہہ رہا تھا۔؟“

وہ ڈرایو کرتے ہوئے چونکا رخ ذرا پھیر کر اسے دیکھا۔ وہ سر جھٹکائے موبائل پہ لگی تھی۔

”پولیس کی کار روائی کے پارے میں پوچھ رہا تھا۔“

”کیا تم نے اسے کسی ممکنہ گواہ کا بتایا؟“

”نہیں تو۔“

”اس کو کچھ مت بتایا۔“

”کیوں؟“ فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔ زمر نے چہرہ اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں وہی انہی سرد مہری تھی۔

”یہ مت سمجھنا کہ تمہیں فیور دے رہی ہوں میں صرف یہ نہیں چاہتی کہ سعدی کے کیس کی تفتیش پہ ہاشم اثر انداز ہو۔“ کہتے ہوئے وہ چہرہ موڑ کر کھڑکی کے باہر گزر تا ٹریفک دیکھنے لگی۔ ”ہاشم نے مجھے کہا ہے کہ یہ واقعہ میں تمہارے اوپر ڈال دوں۔“

اسٹیمرنگ وہیل پہ اس کے ہاتھوں کی گرفت سخت ہوئی بے یقینی سے اس نے زمر کو دیکھا۔

”یہ کہا اس نے؟“ اس کے کان سرخ ہوئے

آنکھوں میں طیش ابھرا۔ پھر لب بھینچ لیے اور غصے سے اہکسلٹروپہ پاؤں کا زور بڑھا دیا۔ اندر ہی اندر لاوا سا لٹنے لگا تھا۔

”مجھے پتا ہے اس میں تمہارا ہاتھ نہیں ہے، لیکن اپنے پچھلے اعمال کا تم حساب دو گے۔ ایک دفعہ یہ معاملہ ختم ہو جانے دو۔“ باہر دیکھتی وہ تلخی سے کہہ رہی تھی جب کہ اس نے زور سے بریک پیپر رکھا، کار جھٹکے سے رکی، وہ بے اختیار ڈیش بورڈ پہ جھٹکتی گئی مگر خود کو سنبھال لیا۔ غصے سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ اس سے زیادہ اشتعال سے اسے گھور رہا تھا۔

”بس بہت ہو گیا۔ بہت سن لی میں نے آپ کی بکو اس۔“ وہ غصے سے غرایا تھا۔ زمرد اپنی پیچھے ہوئی۔

”ہاشم کو دیکھ لوں گا میں، مگر آپ کا بھی لحاظ نہیں کروں گا۔ اس لیے آئندہ میرے آگے زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت دیکھ لیا میں نے اپنے گھر والوں کو قتل ہوتے اور خود پہ الزام لگتے۔ آج کے بعد کوئی مجھے نہیں بتائے گا کہ میں نے کیا کرنا ہے۔ سمجھیں آپ؟“ آنکھوں میں پیش لیے اس کو دیکھ کر کہتے وہ کار سے نکلا اور ٹھام سے دروازہ بند کیا۔

وہ تنفر اور بے بسی سے اسے گھورتی وہیں بیٹھی رہی۔ کار اسپتال کے سامنے رکی کھڑی تھی اور وہ چابیاں جیب میں ڈالتا اب اس طرف جا رہا تھا۔

چند منٹ بعد وہ اسپتال میں ایک کمرے کے باہر کھڑے تھے۔ بیگ کہنی پہ نکائے، سن گلاسز گھنگھریا لے بالوں کے اوپر چڑھائے، یہ آج سیاہ پاجامے پہ ہلکی سبز لمبی قمیص پہنے ہوئے تھی، اور سبز دوپٹہ دائیں کندھے پہ تھا۔ سکون سے کھڑی وہ فارس اور سیکورٹی آفیسرز کو بحث کرتے دیکھ رہی تھی۔ سیکورٹی ٹیم کے دو افراد دروازے کے آگے کھڑے تھے۔

”سر میں آپ کو بتا چکا ہوں، ہم نے پولیس کے حوالے سب کچھ کر دیا ہے، اگر آپ کو مزید کوئی فوجی نکلوانی ہے تو کورٹ آرڈر لانا ہوگا۔ ورنہ میں آپ کو اس کمرے میں داخل نہیں ہونے دے سکتا۔“

”اور آپ کا قانون اس وقت کہاں تھا جب میرے

بھانجے کو اسپتال سے اغوا کیا گیا؟ ہاں؟ ہاں؟“ غصے سے بولتے اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ زمر گھنگھریا لی لٹ انگلی پہ لپیٹ رہی تھی۔

”سر! مجھے مجبوراً سیکورٹی سے آپ کو باہر نکالنے کو کہنا پڑے گا۔“ سر دتے میں کہتے آفیسر ساتھ میں اسے تیز نظروں سے گھور بھی رہا تھا۔ پیچھے کھڑے دونوں اہلکار آگے ہوئے۔ ہاتھ اس کی طرف بڑھائے۔

”اے۔ ہاتھ نہیں لگانا۔“ اس نے سختی سے ہاتھ اٹھا کر ان کو روکا۔

”السلام علیکم۔“ وہ نرم سا مسکراتی، کھنکھاری۔ فارس نے بس ایک تیز نظر اس پہ ڈالی۔ مگر وہ سیکورٹی آفیسر کو دیکھ رہی تھی۔

”میں زمر یوسف ہوں، ڈسٹرکٹ۔“

”میم! مجھے پتا ہے آپ کون ہیں، اور نہیں ہم آپ کو کوئی ٹیپ نہیں دے سکتے۔ اگر آپ کو ٹیپ چاہیے، تو وارنٹ لے کر آئیں۔“ اس نے سختی سے زمر کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ وہ اسی طرح مسکراتی رہی۔

”اوکے۔ کل عدالت کھلے گی تو میں وارنٹ لے آؤں گی، مگر آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کس فوجی کا وارنٹ لاؤں گی؟“

”میم! میں آپ کو بہت تحمل سے۔“

”کل جب میں کورٹ جاؤں گی، تو جانتے ہیں کن کے وارنٹ نکلیں گے۔ 16 مارچ کا جب ایک ممبر قومی اسمبلی کی نوکرانی کا ال لیگل ابارشن آپ کے اسپتال میں ہوا تھا، ستائیس جنوری کا جب آپ کے وارڈ سے دو نومولود بچے غائب ہوئے تھے، اور آپ کی فارمیسی کے ریکارڈز کا سرچ وارنٹ بھی جہاں پچھلے تین مہینے سے آپ کے ایک خود ساختہ ملٹی وٹامن نے آدھ درجن عورتوں کے مہینہ طور پر مس کیمرج کروائے ہیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہ ملٹی وٹامن ابھی مکمل پور طور پر ووڈ نہیں ہوا۔ سو پتا ہے کیا آفیسر، یہ ایک اچھا اور بڑا اسپتال ہے، مگر یہ ایک پرائیویٹ اسپتال ہے، اور سرکار ایک نجی اسپتال کے

ساتھ کیا کر سکتی ہے، یہ ہم دونوں جانتے ہیں، سو اب آپ مجھ سے پوچھیں کیا چاہیے؟“ ایک سانس میں تیز تیز بولنے کے بعد وہ رکی اور مسکرا کر باری باری ان تینوں کے چہروں کو دیکھا۔

آفیسر انچارج غصے بھری بے بسی سے اسے گھورتا رہا، ”میم!“

”مجھ سے پوچھئے آفیسر کہ مجھے کیا چاہیے!“ اس نے ضبط سے گہری سانس لی۔ ”آپ کو کیا چاہیے؟“

”جب آپ سامنے سے ہٹ کر مجھے کنٹرول روم میں جانے کا راستہ دیں گے تب ہی میں بتا سکوں گی۔“ آفیسر چند لمحے اسے گھورتا رہا، پھر دو سروں کو اشارہ کرتا ایک طرف ہٹا اور دروازہ کھول دیا۔ زمر نے ایک چھپتی ہوئی (مگر فاتحانہ) نظر فارس پر ڈالی۔ جس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ چکے تھے اور آگے بڑھ گئی۔ پھر بظاہر ان ہی سخت تاثرات کو چہرے پہ طاری کیے وہ اس کے عقب میں اندر داخل ہوا۔

چند منٹ بعد ایک کمپیوٹر اسکرین کے سامنے کرسی پر موجود سی آر انچارج فولڈرز کھول کر ان کو مطلوبہ فونیکس دکھا رہا تھا۔ زمر اس کی کرسی کے ساتھ کھڑی ذرا جھک کر دیکھ رہی تھی اور فارس اس کے کندھے کے پیچھے کھڑا تھا۔

”دو لوگ تھے“ وہ اسکرین کو دیکھتے ہوئے برسرِ پائی جہاں کارڈور میں دو ماسک والے وارڈ بوائز اسٹریچر لاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اسٹریچر پہ لیٹے لڑکے کے اوپر چادر ڈالی تھی، مگر سر سے ذرا سے گھنگھریالے بال نظر آتے تھے۔ زمر کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ پھنسنے لگا مگر اس نے پلکوں کو جھپک کر نمی اندر دہالی۔

”یہ فونیکس پولیس کے پاس بھی ہے۔ یہ نہیں چاہیے۔“ فارس نے بے زاری سے آپریٹر کو دیکھا تھا۔ ”لفٹ کی فونیکس کہاں ہے؟“

آپریٹر نے سر ہلا کر ایک اور فولڈر کھولا۔ تھیٹر میں اسٹریچر لانے سے قبل وہ دونوں لفٹ سے اترے تھے۔

یہ اس سے پہلے کی ٹیپ تھی۔ لفٹ میں وہ دونوں کھڑے تھے۔ ان کے سروں پہ سبز ٹوپیاں اور چہرے پہ سبز ماسک تھا۔ دفعتاً ایک وارڈ بوائے جس کا رخ کیمرے کے عین سامنے تھا اس نے چھینکنے کے لیے منہ پہ ہاتھ رکھا۔ پھر چھینک مار کر ماسک ہٹایا، رومل سے منہ صاف کیا اور ماسک درست کر لیا۔

”پیچھے کرو۔“ آپریٹر نے پیچھے کر کے روکا اور تصویر کو بڑا کیا۔ وارڈ بوائے کا چہرہ کافی واضح تھا۔ وہ ایک پکی عمر کا مرد تھا اور اس کی گھنی مونچھیں تھیں۔

”کیا آپ نے پولیس کو دکھایا؟“ اس نے باری باری آپریٹر اور سیکورٹی آفیسر کو گھورا۔ آفیسر جو سینے پہ بازو لپیٹے کھڑا تھا ذرا بے زار ہوا۔

”نہیں، کیوں کہ انہوں نے یہ فونیکس نہیں مانگی تھی۔“

فارس نے جیب سے ایک فلیش نکالی اور سسٹم میں داخل کی، سیکورٹی آفیسر فوراً آگے بڑھا۔ ”نہیں، آپ میرا ڈیٹ کاپی نہیں کر سکتے۔“

”میں تمہارے سامنے کل کی تمام فونیکس کاپی کرنے لگا ہوں اور تم مجھے خاموشی سے یہ کام کرتے دیکھو گے۔“ پھر آپریٹر کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

”جو فولڈرز میں کہہ رہا ہوں وہ کاپی کرتے جاؤ۔ شاباش!“ آپریٹر نے بے بسی سے انچارج کو دیکھا جو محض خون کے گھونٹ پی کر کھڑا رہا، دوبارہ کچھ نہیں بولا۔

”یہ بھی کرو۔ اور یہ بھی۔ مجھے کیا دیکھ رہے ہو؟“ ”مگر سر! یہ دوسرے فولڈر کی ویڈیو۔“

”میرا دماغ پہلے ہی بہت گھوما ہوا ہے، مزید خراب مت کرو۔“ وہ جس طرح اس لڑکے کو گھور کر بولا تھا، زمر نے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا اور وہاں سے ہٹ کر دروازے کے پاس آکھڑی ہوئی۔ وہ کرسی کے ساتھ جھکا، انگلی سے اسکرین کی طرف اشارہ کرتے آپریٹر کو ہدایات دے رہا تھا۔



ابھی سے برف الجھنے لگی ہے بالوں سے

ابھی تو قرض ماہ وصال بھی اتارا نہیں!

اس اپارٹمنٹ کی دیواریں خوب صورت سجاوٹ سے ڈھکی تھیں اور فرش عیشے سے چمک دار تھے۔ لونگ روم میں نیوی بلنڈ آواز سے چل رہا تھا اور بڑے صوفے پہ نیم دراز نوشیرواں پاؤں میز پہ رکھے، ٹائپسنگ سے اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ رفتی شرٹ اور کھلے ٹراؤزر میں ملبوس اس کا منہ بھی دھلا ہوا نہیں لگتا تھا پھر اسی بے زاری سے اس نے موبائل اٹھایا اور نمبر ملا کر کان سے لگایا۔

”ہاں شیرو تم ٹھیک ہو؟“ ہاشم مصروف سے انداز میں بولا تھا۔

”خاک ٹھیک ہوں؟ قید پڑا ہوں ادھر۔“

”میں نے کہا تھا گھر میں بند مت رہو۔ وہی میں اپنے ایک ایک دوست سے ملو، تاکہ سب کو معلوم ہو کہ تم ادھر ہو اور ادھر ہی تھے۔ جو بھی پوچھے تو کہنا کہ میں اتوار کی رات آیا ہوں۔ سمجھے؟“

”آپ تو ایسے برتاؤ کر رہے ہیں جیسے واقعی مجھے کبھی گرینڈ چیوری کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔ خدا کے لیے بھائی۔“

”شکر ادا کرو کہ میں نے تمہیں بچالیا ہے اور سب سنبھال لیا ہے، لیکن اگر اب تم نے میری بات نہ مانی تا شیرو تو میں اگلی دفعہ تمہیں نہیں بچاؤں گا۔ اب میرا مانع مت خراب کرو اور دوستوں کو جا کر ملو۔“ تلخی سے کہہ کر فون رکھ دیا گیا۔ نوشیرواں غصے سے موبائل کو گھور کر رہ گیا۔

پھر اٹھا اور اوپن کچن کی طرف آیا۔ فریج کا دروازہ کھولا، جوس کا ڈبانا نکالا اور اوپر لگے اسٹینڈ میں لٹکائے گلاس اتار کر کاؤنٹر پہ رکھا۔ پھر انگور کا مشروب اس میں انڈیلا۔ سرخ مانع گلاس میں بھرنے لگا۔ گلاس اٹھا کر وہ ہونٹوں کے قریب لے کر گیا تو۔ مشروب کے سرخ رنگ میں وہی منظر ابھرنے لگا۔

بحری اور سیمنٹ کے ڈھیر کے قریب گراڈ کا اس کی اکھڑتی سانسیں۔ کھلتی بند ہوتی آنکھیں اور۔ خون کا تلاب۔ سرخ تازہ سرخ پانی جو ہوتا جا رہا تھا۔

ایک دم اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ بے زاری سے اس نے سرخ مشروب سٹیک میں انڈیل دیا۔ چہرے پہ شدید جھنجھلا ہشدر آئی تھی۔

”کیا مسئلہ ہے۔“ آکتا کر وہ چلا آیا اور پھر سے صوفے پر گر کر موبائل اٹھا۔ کچھ دیر منہ بگاڑے موبائل دیکھتا رہا، پھر ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ تاثرات بدلے۔ فوراً ”سے نمبر ملا کر فون کان سے لگایا۔“

”ہیلو۔ شیرو۔ کیسی ہیں آپ؟ میں نے ابھی آپ کی اپ ڈیٹ دیکھی۔ آپ وہی میں ہیں؟ جی میں بھی ادھر ہی ہوں۔ آج صبح ہی پہنچا ہوں۔ کیا ہم مل سکتے ہیں؟ آنکھوں میں امید جاگی اور چہرے پہ جوش سا ابھرا۔

www.paksociety.com

”اوکے۔ میں آجاؤں گا۔“ وہ مسکرایا اور موبائل کان سے ہٹایا۔ سرخ دل نے سرخ پانی کو ذہن سے محو کر دیا۔



مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے چھوٹے باغیچے کے سامنے کاروکتے ہوئے وہ اس کی طرف دیکھے بغیر تو لا۔ ”وہ فونج اے ایس پی کے حوالے کر دی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ وہ اس آدمی کو پہچانتا ہے، جلد اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔“ زمر نے کوئی تاثر دے بغیر پرس اٹھایا اور لاک کھولا۔ فارس نے نظریں پھیر کر اسے دیکھا۔ وہ گھٹنگھریالے پال کان کے پیچھے اڑتی اپنی طرف کا دروازہ کھول رہی تھی۔

”میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ ان لوگوں کو ادھر نہیں چھوڑ سکتا۔ اب وہ ہماری طرف رہیں گے، اگر آپ کو کوئی اعتراض ہے تو ابھی بتادیں۔“ تنبیہ کی سے کہتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا۔

”اگر ابا کو تم ہمارے ساتھ رہنے کے لیے راضی کر لو، تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ بظاہر اس نے ساٹ انداز میں کہا اور آگے بڑھ گئی مگر چہرے پہ واضح اطمینان اتر آیا تھا گویا کوئی ان کی خواہش پوری ہوئی

وہ بنا چاہپ کے اندر راہداری میں آئی تو لاؤنج سے آوازیں آرہی تھیں۔

”فارس صبح کہہ رہا تھا کہ ہم اب اس کے ساتھ جا کر رہیں۔“ ندرت تھکی تھکی سی کہہ رہی تھیں۔ زمر کے قدم راہداری میں ست ہو گئے کیوں کہ حنین آگے سے بہت حنفی سے بولی تھی۔

”ہمارا بھائی کھو گیا ہے تو ہم اتنے لے آسیرا ہو گئے ہیں کہ گھر بدر ہو جائیں؟“ کہہ کر رونے لگی تھی۔

”تمہیں‘ اسامہ اور تمہاری امی کو ان کے ساتھ جا کر رہنا چاہیے۔ یہاں اکیلے نہیں رہ سکتے تم لوگ۔“ ابا کی آواز میں بھی تکان تھی۔ صبح سے سعدی کو رورو کر اب سب نڈھال بیٹھے تھے۔

”ماموں یہ بوجھ کیوں بنیں؟ آپ اپنے کرائے داروں کو فارغ کر دیں، ہم وہاں چلے جاتے ہیں۔“

”کون سے کرائے دار؟“

”وہ جو آپ کے پلاٹ پہ گھر بنا تھا اور اس میں نئے کرائے دار آئے تھے۔“ وہ ان کو یاد کروا ہی تھی۔ زمر نے دیوار سے لگے آنکھیں بند کر لیں۔

”گھر؟“ ابا حیران ہوئے۔ ”تمہیں کس نے کہا؟“

”میری فرینڈ کا گھر بھی ہے اس کالونی میں۔ اس کی طرف گئی تو دیکھا تھا۔“

”وہ پلاٹ تو زمر نے کب کا بیچ دیا۔ حنین۔“ ندرت نے بتایا۔

چند لمحے کے لیے لاؤنج سے کوئی آواز نہ آئی۔

راہداری میں کھڑی زمر نے آنکھیں کھولیں۔

”بیچ دیا؟“ حنین شاکڈ تھی۔ ”مگر کیوں؟“

”اس کو شاید کسی مقدمے کے لیے رقم چاہیے تھی۔“ ندرت نے بے پروائی سے بتایا گویا یہ ذکر غیر اہم تھا۔ ابا خاموش رہے۔

”مقدمے کے لیے؟“ ابا بڑے ابا۔ آپ نے ان کو یوں کرنے کیسے دیا؟ وہ آپ کے لیے ایک سیکورٹی تھی۔ ایک سہارا تھا۔“

”وہ زمر کا تھا۔“

”ہونہ۔“ حنی کی لٹخی سے بھری آواز آئی تھی۔

”اور زمر صرف اپنا سوچتی ہیں۔“ اور پھر غصے سے بولتی اٹھ کر آئی تو وہ راہداری میں کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر ایک دم ٹھہر گئی۔ نظریں اس کے عقب میں گئیں تو زمر نے بھی چونک کر گردن موڑی، فارس بھی پیچھے کھڑا تھا، مگر زمر کے چہرے کے برعکس اس کی آنکھوں میں حنین کے لیے ناراضی تھی۔

”بھائی کا کچھ پتا چلا؟“ اس نے بے تابی سے فارس کو مخاطب کیا۔ مگر اس کے نفی میں ہلتے سر کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں اور وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئے۔

بڑے ابا اور ندرت دونوں نے بے قراری سے ان کو دیکھا، مگر چہروں پہ لکھی تحریر پڑھ لی اور نگاہیں مایوس پلٹ آئیں۔ وہ سامنے صوفے پر جا کر بیٹھا۔ زمر چوکھٹ میں کھڑی رہی۔

”میں جاتے وقت آیا کو بتا کر گیا تھا کہ اب آپ لوگ ہمارے ساتھ چل کر رہیں گے۔“ اس نے بات کا آغاز ابا کو دیکھتے ہوئے کیا۔ انہوں نے ”اونہوں“ نفی میں گردن ہلانی۔

”میں اسی گھر میں ٹھیک ہوں، صداقت ہے میرے پاس۔ ہاں تم باقی سب کو لے جاؤ۔“ ایک ہی دن میں وہ کمزور نظر آنے لگے تھے۔

”ابا! وہ گھر آپ نے مہینے کے آخر میں ویسے بھی خالی کرنا تھا اور یہ جگہ اب رہنے کے قابل نہیں۔ اس لیے پلیز ضد مت کیجئے اور ہمارے ساتھ چلیں۔“

”زمر ٹھیک کہہ رہی ہیں اب آپ کا کہیں اور رہنا صحیح نہیں ہے۔“ وہ ابا کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ابا مسلسل انکاری تھے اور ندرت متامل تھیں۔

”فارس، ہم اتنے سارے لوگ کیسے رہیں گے ادھر؟“

”اتنا چھوٹا نہیں ہے وہ گھر۔ تین بیڈ روم ہیں۔ نیچے والے۔ یوسف صاحب اور سیم لے لیں گے۔“

صدائق پوریج کے ساتھ سرونٹ روم میں رہ کے گا اور اوپر سے "وہ رکا" ایک نظر زمر کو دکھا وہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ "اور میرا اور زرتاشہ والا پرانا کمرہ آپ کے اور حنین کے لیے کالی ہے باقی۔ ہمارا تو ویسے بھی امی والا کمرہ ہے۔" اب کے اس نے زمر کو دیکھے بنا سنجیدگی سے بات مکمل کی۔ دیوار سے پہرے رکھے اس کے ہاتھ کی گرفت سخت ہوئی تھی، ابرو تن گئے، ایک خاموش تیز نظر اس پہ ڈالی، مگر جب بولی تو آواز ہموار تھی۔

"سب آرام سے آجائیں گے۔ آپ بس چلنے کی تیاری کریں۔" اور مڑتے ہوئے کانوں میں ندرت کی آواز پڑی۔

"میرا بیٹا ہوتا تو ہمیں کبھی یوں نہ جانے دیتا۔" بڑے لپا مسلسل انکار کر رہے تھے اور فارس کچھ کہہ رہا تھا، مگر زمر نے بغیر آگے چلتی آئی۔ سعدی کا کمرہ خالی بڑا تھا۔ وہ دیوار سے لگے اس کے بیڈ پہ بیٹھی جوتے اتار کر پیر اوپر کر لیے اور دیوار سے ٹیک لگالی۔ آنکھوں میں پانی سا ابھر رہا تھا۔ جس کو اندر اتارے بنا دیوار سے سر نکائے، بس چپ چاپ سامنے دیکھے گئی۔ دل خالی تھا، ہاتھ خالی تھے، دنیا خالی تھی۔

اسی دیوار کے دوسری طرف حنین کے کمرے میں بھی ایسے ہی بیڈ لگا تھا اور وہ بھی اسی دیوار سے لگی۔ اکڑوں بیٹھے، سر گھٹنوں پہ رکھے رو رہی تھی۔ دل خالی تھا، ہاتھ خالی تھے، دنیا خالی تھی۔

دونوں ایک ہی بات سوچ رہی تھیں۔
ہمارا سعدی کہاں ہوگا اس وقت؟



بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجب رسم چلی ہے، دعا نہ مانگے کوئی
اس نے بدقت آنکھیں کھولیں تو دھندلی سی چھت
نظر آئی۔ پلکیں آہستہ سے جھپکیں تو منظر قدرے
صاف ہوا۔ سعدی کے چہرے پہ تکلیف ابھری،
حیات جاننے کے ساتھ درد شدت سے لوٹ آیا تھا۔

وہ ہلکا سا کراہا، پھر گردن موڑی۔
وہ ہسپتال کے بیڈ پہ لیٹا تھا اور اس کے ارد گرد ایک
کشاہ اور چمکتا ہوا کمرہ تھا۔ اس نے کہنی کے بل اٹھنے
کی کوشش کی، مگر جسم جیسے جام ہو چکا تھا۔
"آہ۔" اذیت کے احساس سے آنکھیں میچ لیں۔
"ریلیکس۔ آرام سے۔" ایک عورت تیزی
سے اس کے قریب آئی تھی۔ سعدی نے مندی مندی
سی آنکھیں کھولیں۔ یہ چہرہ۔ وہ اسے پہچانتا تھا، مگر
اس وقت ذہن میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہے۔
"امی کہاں ہیں؟" وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے
برہنہ پایا۔

"آپ کو پانی چاہیے؟ یا کچھ اور؟ کہیں تکلیف
ہو رہی ہے؟" آواز، لہجہ سب شناسا تھا، مگر یہ کون؟ اس
نے پلکیں جھپکیں۔ خود پہ جھکی اسمارٹ سی عورت کا
چہرہ واضح ہوا۔ بھورے سنہرے رنگے بال اور سفید
جلد۔

"میری امی کہاں ہیں؟" اس نے پھر اٹھنے کی
کوشش کی، مگر وہ اٹھ نہیں پارہا تھا۔

"آپ کو پانی دوں؟" اب کے سعدی نے الجھن
سے آنکھیں سیکڑ کر اسے دیکھا۔ کیا وہ اس کی بات سن
نہیں سکتی تھی؟ اس نے پھر اٹھنے کی سعی کی۔ مگر
کیا شے تھی جو اس کو حرکت نہیں کرنے دے رہی
تھی۔ اس کی نگاہیں اپنے بازوؤں تک گئیں۔ دونوں
بازو، کہنی سے کلائی تک، بیڈ کے ساتھ اسٹریپس سے
بندھے تھے۔

ایک دم سے ذہن پہ دوانیوں سے چھایا نشہ اور
غنودگی اترنے لگی۔ اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔
"میں کہاں ہوں؟" بے حد حیرت اور وحشت سے
اس نے خود پہ جھکی عورت سے سوال کیا۔

"کیا آپ کو پانی چاہیے؟" اس نے اس نرمی سے
پوچھا۔ ذہن میں بکھرے ٹکڑے جڑنے لگے۔ اس
عورت کو دیکھتی اس کی آنکھیں سکڑیں۔

"میری؟ میری اینجیو؟" کہنے کے ساتھ اس نے
بازو زور سے کھینچے، مگر گرفت مضبوط تھی، وہ کے



اس رات قصر کاردار کے عقب میں انیکسی کی

ساری بتیاں روشن تھیں۔

صداقت بچن میں کھڑا ندرت کے ساتھ چیزیں سیٹ کروا رہا تھا۔ ندرت پھر اس کے بعد نہیں روٹی تھیں۔ دو دن لگے ساری تیاریوں میں اور آج پیرے دن وہ لوگ بالآخر اس انیکسی میں آچکے تھے۔ لاؤنج بھی صفائی کے بعد چمکنے لگا تھا۔ لاؤنج میں سے ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا جس میں بڑے ابا ایک سنجل بیڈ پہ لیٹے تھے۔ فاصلے پہ دوسرے بیڈ پہ سارے دن کا تھکا ہارا ایم سو رہا تھا۔

اوپر سیڑھیاں چڑھ کر جاؤ تو فارس اور زرتاشہ کے پرانے کمرے کا حلیہ ذرا بدلا ہوا تھا۔ فارس کی کوئی چیز ادھر نہ تھی۔ حنین اور ندرت کے پیگڑ اور کپڑے وہاں دکھائی دے رہے تھے۔

ساتھ والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اندر مدھم زرد بتیاں جل رہی تھیں۔ (یہ وہی کمرہ تھا جس میں زمر شادی کے دن سے رہ رہی تھی۔) سعدی کے لائے بکے وہیں رکھے تھے گو کہ وہ اب سوکھ چکے تھے۔

ایک الماری کھلی تھی اور فارس اس کے سامنے کھڑا اس میں اپنی چیزیں رکھ رہا تھا۔ دلعتاً اس نے ہاتھ روک کر ایک نظران باکسز پہ ڈالی بجن میں زمر کے کاغذات تھے اور جو اس نے (باہل خواستہ) فارس کی چیزوں کے لیے اس الماری سے نکال لیے تھے اور پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا جو اسٹڈی ٹیبل پہ اس کی طرف پشت کیے لیپ ٹاپ کھولے بیٹھی تھی۔ مدھم زرد بتی میں بھی اس کے گھنگھریالے بال چمک رہے تھے۔

”آپ یہ باکسز نیچے بیسمنٹ (تہ خانے) میں رکھ دیں۔ بیسمنٹ کی چابی آپ کی ڈرائنگ ٹیبل پہ بڑی ہے۔“ پچھلے دو دن کی خاموشی کے بعد اس نے پہلی دفعہ اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ جواب دیے بنا کام کیے گئی۔ فارس نے گہری سانس لی۔

”آئی ایم سوری اس دن آپ پہ غصہ کر گیا۔“
”آپ کی معذرتوں کا وقت گزر چکا ہے۔“ وہ مڑے

”میں کہاں ہوں؟“ وہ سیدھی ہوئی سینے پہ بازو لپیٹ کر اسے دیکھا۔

”آپ کو پانی چاہیے یا نہیں؟“

سعدی نے سر تکیے پہ گرا دیا۔ میری کو سکتی اس کی آنکھوں میں زمانے بھر کی حیرت تھی۔

”میں کہاں ہوں؟ میرے گھر والے کہاں ہیں؟“ مگر میری کاؤچ کی طرف گئی، شاید فون وغیرہ پہ کسی کو اطلاع دی کہ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور قدموں کی چاپ سنائی دی۔

”میری امی کہاں ہیں؟“ وہ بدقت بول پارہا تھا۔ تکیے پہ رکھی گردن ذرا موڑی تو دھندلا سا منظر نظر آیا۔ نیلی جینز پہ گھٹنوں تک آتیا سفید اور آل پنے ایک لڑکی اس کی جانب آرہی تھی۔ اس کے بال سیدھے اور لمبے تھے کہنی تک آتے اور گردن میں اسٹیتھ اسکوپ پڑا تھا۔ قریب آئی تو چہرہ واضح ہوا۔

گندمی رنگت اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور ان میں ایک معصوم سا تاثر۔ نرمی سے مسکراتی وہ اس سے انگریزی میں اس کی طبیعت پوچھ رہی تھی۔

”میری۔۔ امی کہاں ہیں؟“ وہ اس کو اب کوئی انجکشن لگا رہی تھی اور سعدی ایک ہی بات دہرائے جا رہا تھا۔ آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں۔ اندھیرا پھر روشنی پھر اندھیرا۔

پھر وہ میری کی طرف گھومی۔ ”اس کے ہاتھ کھول دو کم از کم۔۔ وہ بیمار ہے اور زخمی بھی۔ اس حالت میں بھاگ کر کہاں جائے گا؟“ اس کی آواز میں ترحم تھا۔ مقابل کھڑی میری نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

”تمہیں اس سے بات کرنے کی اجازت نہیں ہے اپنے کام سے کام رکھو!“

”اپنے پاس سے کہو، صرف اس کے ہاتھ کھول دیں۔۔۔“ الفاظ گنڈ ہو گئے۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

سازش تھی رہبوں کی یا قسمت کا پھیر تھا ہم ہجرتوں کے بعد بھی قاتل کے گھر میں تھے

”تم اس معاملے میں کوئی دلچسپی کیوں نہیں لے رہیں؟“

”پھپھو اور ماموں کر رہے ہیں ناسب۔“

”مگر وہ سعدی کے لیگل وارث نہیں ہیں۔“

”مطلب؟“ اس کے چہرے پر آتی الجھن دیکھ کر وہ

قدرے حیران ہوا۔ ”کیا تمہیں کسی نے نہیں بتایا؟

پھپھو اور ماموں قانونی وارث نہیں ہوتے۔ اس کیس

میں صرف تمہاری امی یا تم سعدی کے وارث ہو۔“

”اور سیم؟“

”وہ اٹھارہ سال سے چھوٹا ہے، سو وارث نہیں

ہو سکتا۔“

”لو۔ مگر کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ بے دلی سے سر

جھکائے، جوتے سے فرش کھرچنے لگی۔

”تم کتنے سال کی ہو؟“ سامنے جیبوں میں ہاتھ

ڈالے کھڑے ہاشم نے پوچھا۔

”بیس۔“

”میں پینتیس سال کا تھا جب میرا باپ مرا۔ میں

بیس کا نہیں تھا، پھر بھی لوگوں نے میرا استعمال کرنے

کی کوشش کی۔ اس لیے میری نصیحت یاد رکھنا۔ جب

آپ کے گھر کا سربراہ نہ رہے تو آنکھیں اور کان کھلے

رکھتے ہیں۔“

حنین چپ چاپ اسے دیکھے گئی، مگر اس کے چہرے

پر الجھن بھری ناپسندیدگی کا تاثر تھا۔ ”مگر فارس ماموں

اب ہمارے سربراہ ہیں۔ تو۔“ اسی پل دروازہ کھلا

اور فارس باہر آیا۔ حنہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ایک

دم اپنا آپ چور لگا۔

”ہیلو فارس!“ ہاشم نے اسی طرح مسکرا کر سر کو خم

دیا۔ حنہ فوراً اس کی طرف مڑی۔

”ماموں۔۔۔ ہاشم بھائی آپ کا پوچھ رہے تھے، میں

سمجھی آپ سوچکے ہیں۔“

فارس نے ایک تیز سپاٹ نظر ہاشم پر ڈالی، پھر حنہ

کو اشارہ کیا۔ ”اندر جاؤ“ آواز میں سختی تھی۔ وہ سر

جھکائے، ”او کے گڈ نائٹ“ کہتی فوراً اندر کھسکی۔

اب وہ اپنے گھر کے دروازے کے بالکل سامنے آ

بنائے اچھا کر رہی۔

”کوشش کروں گا اس کمرے میں کم سے کم آؤں

اور آپ کو زیادہ پریشان نہ کروں۔ یہ بھی مجبوری

ہے۔“

وہ چپ چاپ اسکرین کو دیکھے گئی اور وہ اس کے

بالوں کو۔

”اگر آپ میری وجہ سے بے آرام ہیں تو اس کے

لیے بھی معذرت کرتا ہوں۔ یہ آپ کا کمرہ ہے، آپ کا

ہی رہے گا۔ میں صوفے پہ سوؤں گا۔ جب تک ہمیں

ساتھ رہنا پڑے۔“

زمر کی ٹائپ کرتی انگلیاں تمہیں، گردن موڑ کر

جتاتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں نے اپنے کمرے میں یہ صوفہ آپ کے لیے

ہی ڈلوایا ہے۔“ اور واپس گھوم گئی۔ فارس نے ٹھنڈی

سائس لی، پھر الماری کا پٹ بند کرنا کھڑکی تک آیا تو دم

شہرا۔ برہ ذرا سر کا کرینچے دیکھا جہاں برآمدے میں ہاشم

کھڑا حنین سے بات کرتا نظر آ رہا تھا۔ فارس کے

جڑے پیچھے وہ تیزی سے باہر نکلا۔

انیکسی کے برآمدے میں وہ کھڑی تھی اور اس کے

سامنے ہاشم تھا۔ ہاشم کے عقب میں سبزہ زار اونچا ہوتا

دکھائی دیتا اور چولی پہ وہ بلند محل تھا۔ مگر جب ہاشم

سامنے ہوتا تو دو سری ہر شے اپنا حسن اور عظمت کھو

دیتی تھی۔ اب بھی وہ نرمی سے مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔

”اچھا کیا جو تم لوگ یہاں آگے۔ میٹل ہو گئے ہو یا

کوئی بددعا ہے؟“

”نہیں، تمہیںک یو سب ہو گیا۔“ وہ اواسی سے

مسکرائی۔ بال پونی میں بندھے تھے اور لباس ملگجا تھا۔

اس کے مقابلے میں وہ رات کو بھی چمک دار سفید

شرٹ میں ملبوس کتنا تازہ دم لگ رہا تھا۔ حنہ کو احساس

کتری نے آن کھیرا۔

”وہ بندہ پکڑا گیا یا نہیں؟ جو لفٹ کی فونج میں ملا

تھا؟“

”نہیں، پتا نہیں۔“ حنہ نے یاسیت سے شانے

اچکائے۔ ہاشم نے غور سے اسے دیکھا۔

کھڑا ہوا۔ آستین چڑھائے تے ابرو اور دبے دبے
غصے کے ساتھ ہاشم کو دیکھا۔

”کیا ہوا؟“ پرسکون کھڑے ہاشم نے ابرو اٹھائے۔
”وقت نہیں مل سکا“ کچھ حساب کتاب کرنا تھا
تمہارے ساتھ۔“ آنکھوں میں تپش لیے اسے
گھورا۔ ”کیا کہہ رہے تھے تم اس دن زمر سے؟ کہ
سعدی کا حادثہ میرے سر پہ ڈال دو؟“

”اوہ کم آن!“ ہاشم نے بے حد حیرت سے سر جھٹکا۔
”کیا اس نے“ یہ بتایا ہے تمہیں؟ اور کیا یہ نہیں بتایا
کہ اس نے خود کو کیا کہا؟ ان فیکٹ مسز غازی نے مجھے
بہت صاف لفظوں میں بتایا کہ وہ آپ سے مجھ سے
زیادہ نفرت کرتی ہیں اور یہ بھی کس۔“ طنزیہ لہجے میں وہ
گویا ہوا۔

”اور یہ بھی کہ اتفاق سے اس دفعہ بھی آپ کے
پاس ایلی بانی ہے۔ تو میں نے پوچھا فارس اس وقت
کہاں تھا۔ بولیں میرے ساتھ تھا، مگر وہ اپنے تمام
اعمال کا حساب بھگتے گا۔ میں نے پوچھا آپ یہ فارس پہ
ڈالنا چاہتی ہیں؟ تب ہی تم آگے۔ شاید انہوں نے
تمہارے سامنے اپنی پوزیشن کلینئر کرنے کے لیے یہ
کہا۔ ورنہ۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو بہت محتاط
رہتا۔ کیوں کہ ہم سب کو پتا ہے کہ انہوں نے تم سے
شادی کیوں کی ہے۔“

”میری بات کان کھول کر سنو ہاشم!“ وہ چبھتی ہوئی
نظروں سے اسے دیکھتا آگے آیا۔ ”یہ میرا گھر ہے اور
زمر میری بیوی ہے۔ مجھے تمہارے مقابلے پہ اس کی
بات کا زیادہ یقین ہے۔ اس لیے میری بیوی سے۔۔۔ دور
رہو۔“ چباچبا کر ایک ایک لفظ ادا کیا۔ ”اگر ایک لمحے
کے لیے بھی مجھے لگا کہ تم سعدی کے حادثے کو استعمال
کرنے کی کوشش کر رہے ہو تو یاد رکھنا میں تمہیں
اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔“ ایک تیز نظر اس پہ ڈال
کر وہ مڑنے گا پھر رکا۔ ”اور ہاں۔۔۔ میرے گھر میری
غیر موجودگی میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا
دوست سعدی تھا۔ اس گھر میں اب تمہارا مزید کوئی
دوست نہیں ہے۔“ اور اندر جا کر زور سے دروازہ بند

کریا۔
ہاشم بمشکل ضبط کرتا مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا سبزہ
زار پہ چلا گیا۔ اس کے چہرے پہ شدید غصہ تھا۔ اس
کے کمرے کی بالکونی سامنے تھی۔ بیرونی زینے سے وہ
بالکونی پہ چڑھا اور اندر کمرے میں آکر موبائل پہ نمبر
ملایا۔ خاور نے پہلی گھنٹی پہ کال ریسیو کی۔

”جی سر؟“
”خاور۔۔۔ مجھے نہیں پتا تم یہ کیسے کرو گے۔“ غصیلی
آنکھوں کے ساتھ وہ فون میں غرایا تھا۔ ”مگر مجھے فارس
غازی جیل کے اندر چاہیے، کبھی بھی باہر نہ نکلنے کے
لیے۔“

”او کے سر۔۔۔ میں کچھ کرتا ہوں۔“
کال بند ہوئی تو ہاشم نے اسی برہمی سے فون صوفے
پہ پھینک دیا اور منہ ہی منہ میں چند انگریزی گالیاں
اسے دیں۔ غصہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔
انیکسی کے اندر فارس سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا تو
حنہ کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور وہ بجھے چہرے کے
ساتھ بیڈ پہ بیٹھی تھی۔ وہ چوکھٹ میں ٹھہرا۔

”آئندہ ہاشم سے زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں
ہے۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔“ نہ سختی نہ نرمی بس
ہموار لہجے میں کہہ کر اس کا ”جی اچھا“ میں جھکتا سر دیکھ
کر وہ اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔ (اپنا کمرہ؟)

ہلکی دستک دے کر دروازہ کھولا تو کمرے کی بتی بجھی
تھی، صرف ڈرائنگ روم کا بلب جل رہا تھا۔ اسٹڈی
ٹیبیل خالی تھی۔ وہ بیڈ پہ لچاف گردن تک اوڑھے،
آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹی تھی۔ (کیا یہ میرے جانے کا
انتظار کر رہی تھی؟) وہ آہستہ سے دروازہ بند کرتا بیڈ
کے قریب آیا۔ دوسرا تکیہ اٹھایا اور صوفے پر رکھا۔ پھر
یوں ہی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ آنکھیں بازو سے
ڈھکی تھیں۔ مگر ناک کی لونگ دکتی نظر آرہی تھی۔
فارس کے چہرے پہ چھائے تے تاثرات ڈھلے پڑے۔
نظر زمر کی سائیڈ ٹیبیل پہ پڑی۔ وہاں دو امیں رکھی تھیں،
اور ساتھ میں جگ گلاس۔ جگ خالی تھا۔ اس نے
جگ اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ واپس آیا تو وہ پانی سے بھرا

تھا۔

جگ واپس دھرتے اس نے گردن جھکا کر ذرا کی ذرا اسے دیکھا۔ وہ جاگ رہی تھی۔ وہ جانتا تھا۔ ایک تلخ مسکراہٹ لبوں پہ ابھر کر معدوم ہوئی۔ پھر صوفے کی طرف آگیا۔

گھر کی بتیاں آہستہ آہستہ بجھنے لگیں۔ خاموشی چھانے لگی۔ کتنے ہی پل ان کے کمرے میں آہستہ سے سرک گئے۔ وہ ہنوز بازو آنکھوں پہ رکھے لیٹی تھی اور وہ صوفے پہ نیم درازہ سینے پہ لیپ ٹاپ رکھے اسپتال کی فونج بار بار دیکھ رہا تھا۔ اندھیرے میں اسکرین کی روشنی اس کے چہرے کو چمکا رہی تھی۔ ڈریسنگ روم کی بتی اب بند تھی اور باقی کمرہ اندھیرے میں ڈوبا تھا۔

ایک دم سے وہ اٹھ بیٹھی۔ بالکل سیدھی 'فارس' نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ پاؤں نیچے اتارے، بالکل ساکت سی بیٹھی تھی۔ "اوہ!" وہ ہلکا سا بریداری۔

"زمر۔ آپ ٹھیک ہیں؟" وہ لیپ ٹاپ میز پہ رکھتا خود بھی اٹھ بیٹھا۔ زمر نے چونک کر اسے دیکھا۔ نیم اندھیرے میں بھی اتنا واضح تھا کہ اس کی آنکھیں خوابیدہ تھیں۔ شاید وہ سو گئی تھی اور کچی نیند سے جاگی تھی۔ "وہ۔ ویڈیو۔" وہ بے خودی کے عالم میں بولی۔ "کون سی ویڈیو؟ اسپتال والی؟" وہ ایک طرف ہو کر بیٹھا۔ "آئیے دیکھ لیجئے۔"

وہ ایک دم اٹھی اور ننگے پیر تیزی سے اس تک آئی۔

"کیا آپ اس ویڈیو کی بات کر رہی ہیں؟ بیٹھ جائیے۔" وہ جو کافی مضطرب سی لگ رہی تھی۔ صوفے کے کنارے ٹک گئی اور آگے جھک کر اسکرین دیکھی۔ اسپتال کے ایک کوریڈور کی فونج چل رہی تھی۔

"اونہوں۔ لفٹ والی۔" وہ پریشانی سے بولی تو فارس نے "اچھا" کہہ کر مطلوبہ ویڈیو لگائی۔ زمر نے

چہرہ مزید آگے جھکایا تو کھنگھریالی لٹیں کندھوں سے پھسل کر سامنے آگئیں۔ فارس نے ذرا کی ذرا نظر اس پہ ڈالی۔ وہ بال کان کے پیچھے اڑتی، آنکھیں سیکڑے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

یہ دیکھو۔ "اس نے ایک منظر کو اسٹیل کیا تو فارس نے توجہ اور دھیان اسکرین کی طرف لگانا چاہا۔

"مجھے ابھی یاد آیا یہ آدمی۔ دیکھو۔ چھینک مارنے کے لیے ماسک اتارنے سے چھ سیکنڈ پہلے۔ اس نے نظر اٹھا کر کمرے کی طرف دیکھا ہے۔"

وہ ایک دم چونکا۔ اسکرین پہ اس شخص کی نگاہ اٹھا کر فوراً "واپس موڑ لینے کو زمر نے اسٹیل کر رکھا تھا۔

"یعنی کہ وہ اس بات سے واقف تھا کہ لفٹ کا کیمرو اس کی تصویر بنا رہا ہے۔"

"ہاں۔ اور پھر بھی اس نے ماسک اتارا۔" زمر کا اضطراب اب غصے میں بدلنے لگا تھا۔ "ناکہ ہم اس کا چہرہ ٹھیک سے دیکھ لیں۔ اب دیکھنا دو چار دن میں پولیس اس کو پکڑ بھی لے گی اور یہ اعتراف جرم بھی کر لے گا۔"

"کیوں کہ یہ صرف ایک کراے کا آدمی ہے جسے اصل مجرم خود کو چھپانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔" وہ اسکرین کو دیکھتے ہوئے سوچتے ہوئے بول رہا تھا۔ پھر کچھ یاد آیا۔ "یہ دیکھیے۔ میں دوسری فوٹیج جزی

چیک کر رہا تھا۔ یہ اس کوریڈور کو دیکھیے۔" اس نے ایک اور ویڈیو لگا کر دکھائی۔ کوریڈور خالی تھا۔ فارس نے ذرا فارورڈ کیا۔ "اس شیشے کے دروازے کو دیکھیے۔ اس میں مخالف کوریڈور کا عکس جھلک رہا ہے۔" زمر نے گردن مزید آگے کر کے غور سے دیکھا۔

"اس عکس میں ایک نرس جاتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے اس کی پشت ہے اس طرف، مگر سطر راستے میں وہ

ٹرے میں سے کچھ گراتی ہے، پھر اٹھاتی ہے اور چلی جاتی ہے۔"

"او کے پھر؟" نیم اندھیرے کمرے میں وہ دونوں صوفے پہ ساتھ ساتھ بیٹھے بات کر رہے تھے۔

"اس کوریڈور میں اگلے آدھے گھنٹے میں ہر پانچ

پہلی دفعہ مسکرائی اور نگاہیں موڑ کر فرانس کو دیکھا۔ ”کیا تم نے کرمینل لاء میں پڑھا نہیں تھا کہ

its not the crime its the cover-up

فرانس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”بالکل۔۔۔ مجرم کو اس کا جرم نہیں پکڑو تا بلکہ جرم کو چھپانے کی کوشش پکڑو اتی ہے۔“

”سو اپنے جرم کو چھپانے کی کوشش میں انہوں نے اپنا ایک بندہ ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ اب تک وہ ہمارے لیے ایک انجان گروہ تھا مجرموں کا، مگر اب۔۔۔ اب ہم ان کے ایک ساتھی کو جانتے ہیں۔ یہ لفٹ والا آدمی۔“ مگر فرانس نے نفی میں سر ہلایا۔

”یہ تو صرف ایک ہرکارہ ہے، گرائے کا آدمی۔ جن لوگوں نے سعدی پہ حملہ کیا ہے، یہ آدمی ان کو جانتا تک نہیں ہوگا۔“

”بالکل۔۔۔ وہ بھی یہ ہی سمجھتے ہیں، مگر فرانس۔۔۔ وہ کسی کو تو جانتا ہوگا۔ کسی نے تو اس کو پیسے دیے ہوں گے اس کام کے۔ ہم اس آدمی کے ذریعے اس کو ڈھونڈیں گے جس نے اسے پیسے دیے اور پھر اس سے اوپر والے کو اور یوں زینہ بہ زینہ چڑھتے، ہم ان لوگوں تک پہنچ سکتے ہیں جنہوں نے سعدی کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ سو اب ہم سعدی کو نہیں ڈھونڈیں گے، ہم ان لوگوں کو ڈھونڈیں گے۔ جس دن ہمیں یہ لوگ مل جائیں گے، اس دن سعدی بھی مل جائے گا۔“ اس کے لہجے میں عزم تھا۔

”اوکے۔۔۔ ایسے ہی کرتے ہیں، مگر ان تک پہنچنا آسان نہیں ہوگا۔ کیا آپ نے ہیلسٹک رپورٹ دیکھی؟ سعدی کو Glock گن سے گولی ماری گئی۔ قوی امکان ہے کہ جی فورٹی ون استعمال کی گئی۔ پاکستان میں جی فورٹی ون منگواؤ تو ڈھائی تین لاکھ سے کم کی نہیں ملتی اور کون منگوا سکتا ہے اتنے آرام سے گلاک کی پستول؟ اسلحے کی درآمد ممنوع ہے اور صرف سنڈل امپورٹ لائسنس کے ذریعے ہی کوئی ایک وقت میں ایک ہی پستول منگوا سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے یہ

منٹ اور سترہ سیکنڈ بعد ایک نرس کا عکس دکھائی دیتا ہے، جو بیچ راستے میں کچھ گرا دیتی ہے یا تو اسپتال کی ساری نرسیں اندھی ہیں، یا پھر یہ ایک ہی پانچ منٹ کا کلپ ہے جسے بار بار دہرایا گیا ہے۔“

”یعنی اصل آدھے گھنٹے کی ٹیپ غائب ہے؟“ وہ چونکی۔ ”اگر اسپتال والے ان آرگنائزڈ کرمینلز کے ساتھ مل کر یہ ٹیپ ڈاکٹر کر سکتے تھے تو لفٹ والی ٹیپ بھی غائب کر سکتے تھے، مگر نہیں۔۔۔ انہوں نے ہمارے ساتھ کھیل کھلایا۔“ اس کی پیشانی پہ بل پڑ رہے تھے اور وہ غصے سے کہتی جا رہی تھی۔ ”ان کو پتا تھا ہم فوٹیجز نکلاؤں گے۔ سو وہ ہر اس راستے پہ بیٹھے ہیں، ہمیں بھٹکانے کے لیے جو سعدی تک جانا ہے۔ وہ ہمیشہ ہم سے دو قدم آگے رہیں گے۔“ وہ ذہنی طور پہ اتنی الجھی ہوئی تھی کہ فرانس نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے صوفے پہ اس کے تکیے کے ساتھ بیٹھی ہے۔ اسے احساس نہیں ہوا۔

”اگر وہ ہمیشہ ہم سے دو قدم آگے رہیں گے تو ہم سعدی کو کبھی نہیں ڈھونڈ سکتے۔“

”بالکل۔۔۔“ وہ اسکرین کو پلکیں سیڑ کر دیکھے گئی۔ اندھیرے کمرے میں واحد مدہم سی روشنی عجیب فسوں بکھیر رہی تھی۔ وہ بدقت (زمر سے نظریں ہٹا کر) سامنے دیکھنے لگا۔ لائبریری کے سارے منظر ارد گرد اترنے لگے تھے۔

”بس پھر ہم سعدی کو نہیں ڈھونڈتے۔“ وہ قطعیت سے بولی تو وہ چونکا۔

”کیا مطلب؟“

”ہم ان کے قدم پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں، مگر وہ ہمیشہ دو قدم آگے رہیں گے۔ سو ہم سعدی کو نہیں ڈھونڈیں گے۔ ہم ان کو ان کی گردن سے پکڑیں گے۔ وہاں سے جہاں سے انہوں نے تصور نہیں کیا ہوگا۔“ وہ لیپ ٹاپ کو دیکھتی گویا خود سے بول رہی تھی۔

”مگر ہم نہیں جانتے وہ کون ہیں۔“

”وہ بھی یہ ہی سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں نہیں جانتے، مگر۔۔۔ یہاں پر انہوں نے ایک غلطی کر دی ہے۔“ وہ

آدھا حصہ اس سامان اور باکسز سے بھرا ہوا تھا جو گھر خالی کر کے شفٹنگ کے وقت وہ ادھر لائے تھے۔ ایک کونے میں الگ سے چند باکسز رکھے تھے۔ حنین قدم قدم چلتی اس کونے تک آئی۔ ان چیزوں کو دیکھ کر آنکھیں نم ہوئیں۔ سعدی کی چیزیں۔ اس نے سعدی کے کپڑوں والا باکس کھولا۔ ایک شرٹ نکالی۔ صاف ستھری سفید ٹی شرٹ۔ وہ سوتے وقت عموماً یہ ہی پہنتا تھا۔ ٹی شرٹ دونوں ہاتھوں میں پکڑے، وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ جب ہی اندھیرے تمہ خانے سے آواز آئی۔

منگی ترین گن میں سے ایک ہے۔ کلاس اور ٹیسٹ چیک کریں ذرا ان لوگوں کا۔“ وہ اسکرین کو دیکھتے ہوئے تبصرہ کر رہا تھا۔ ایک دم رکا۔ اس نے زمر کو چونکتے ہوئے دیکھا تھا۔ گن کے ذکر پہ جیسے وہ ہوش میں آئی۔ بے اختیار چونک کر اس پاس دیکھا۔ وہ اس کے صوفے پہ۔ ایک دم وہ کھڑی ہوئی۔ چہرے پہ سپاٹ پن آگیا۔

”ظاہر ہے‘ قاتل اسلحے کے بارے میں آپ سے بہتر کون جانتا ہوگا۔“ تلخی سے کہہ کر وہ تیزی سے بیڈ تک آئی۔ زرد موسموں کا سارا فسوں غائب ہو گیا۔ اندھیرے میں دو سائے رہ گئے۔ ایک صوفے پہ بیٹھا تھا اور دوسری بیڈ کے ساتھ اس کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔

”گڈ نائٹ۔“ فارس کے چہرے پہ سنجیدگی اتر آئی۔ اس کی بات کو نظر انداز کر کے وہ کمپیوٹر آف کرنے لگا۔



جنہیں مانتا ہی نہیں یہ دل، وہی لوگ میرے ہیں، ہم سفر مجھے ہر طرح سے جو اس تھے، وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے دیوار کے پار حنین اور ندرت کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ ندرت بیڈ پہ بیٹھی نماز پڑھ رہی تھیں اور حنین کروٹ کے بل لیٹی، چادر پہ انگلی سے لکیریں کھینچتی جا رہی تھی۔ زمر کے الفاظ ذہن میں گونج رہے تھے۔

”مجھے سعدی کا لیپ ٹاپ کھول دو حنین۔ میں کسی شاپ پہ جا کر بھی کھلوا سکتی ہوں۔ مگر یہ کام تم مجھے خود کر کے دوگی۔ اگر تم کچھ کر سکتی ہو تو۔“ وہ جانتی تھی زمر نے صرف اس کو اکسانے کے لیے ایسا کہا تھا، مگر وہ ان باتوں میں اب نہیں آیا کرتی تھی۔ پھر بھی وہ اٹھی اور سیلپرز پہن کر باہر نکل آئی۔ چند لمحے بعد وہ بیسمنٹ کے زینے اتر رہی تھی۔ بتیاں جلا میں تو سارا تمہ خانہ روشن ہوا۔ وہ ایک کھلا سا کمرہ تھا جس میں ستون۔۔۔ تھے اور پورے گھر کے رقبے پہ وہ پھیلا ہوا تھا۔ اس کا

”یا صاحبی السعجن“ (اے میرے قید خانے کے دو ساتھیو!) اس نے چونک کر گردن گھمائی۔ سعدی کی آواز تھی وہ۔ مگر وہ خود ادھر نہیں تھا۔ وہ دور کہیں کسی دوسرے زمانے میں اسے پکار رہا تھا۔ ایک منظر سا ذہن میں روشن ہوا۔

ریسٹ ہاؤس کا کمرہ۔ فاصلے پہ بچھے دو سنگل بیڈ۔ دونوں بیڈز کے پاؤں کی طرف نیچے لگے دو میٹرز (انگریزی حرف T) کی طرح۔ ندرت کا بیڈ خالی تھا۔ اس کی پائنتی سے نیچے بچھے میٹرز پہ سیم سو رہا تھا۔ دوسرے بیڈ پہ حنین آنکھوں پہ بازو رکھے چادر گردن تک تانے لیٹی تھی۔ نچلے میٹرز پہ سعدی چپت لیٹا تھا۔ اسی سفید ٹی شرٹ میں ملبوس۔ یکایک اس نے بازو پہ ہاتھ مارا۔

”حنین! یہاں کتنے مجھ رہیں۔“

وہ آنکھوں سے بازو ہٹائے بغیر نیند میں ڈوبی آواز میں بولی۔

”یہاں ایک بھی مجھ نہیں ہے بھائی۔ آپ صرف مجھے بلوانے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔ پلیز سو جائیں، مجھے نیند آرہی ہے۔“ سعدی کے چہرے پہ خفگی ابھری۔

”یار حنین! بندہ کوئی بات ہی کر لیتا ہے، ہم کب سے اس قید خانے میں پڑے ہیں۔“

”اس چھوٹے شہر میں صفیہ خالہ لوگوں نے ساری بارات کے لیے اتنا اچھا ریسٹ ہاؤس بک کروایا ہے،

ہمیں پورا ایک کمرہ ملا ہے اس کو قید تو نہ کہیں اور سو جائیں۔

”تمہیں یاد ہے، یوسف علیہ السلام نے جب قید خانے میں اپنے ساتھیوں کو ان کے خواب کی تعبیر بتائی تھی ایک کو سولی پہ چڑھنا تھا اور دوسرے کو بادشاہ کا ساتی بننا تھا۔ یوسف علیہ السلام نے ساتی سے کہا کہ جب بادشاہ کے پاس جانا تو میرا ذکر کرنا۔ اس سے اگلی آیت یاد ہے تمہیں؟“

رات کے ڈیڑھ بجے وہ کچی نیند میں ڈوبی حنین سے پوچھ رہا تھا۔ حنہ کے چہرے پہ جھنجلاہٹ نمودار ہوئی۔ (سنہڑا ایسہ کیڑی آیت اے؟) (اب یہ کون سی آیت ہے؟) (اف بھائی کو کون سمجھائے کہ ہر کوئی آپ کی طرح قرآن کریزی نہیں ہوتا۔)

”نہیں۔۔۔ کون سی آیت؟“ جمائی روکتے پوچھا۔

”وہ سورۃ یوسف کی سب سے دلچسپ آیت ہے اور تمہیں وہی نہیں یاد؟“

(لو جی۔۔۔ ان سے پوچھو تو ہر دوسری آیت ”سب سے دلچسپ“ ہوتی ہے۔)

”بھی نہیں۔“ جمائی سے آواز پھر بھاری ہوئی۔

”یاد آرہی۔“

”میں بتاتا ہوں۔“ وہ چپت لیٹا، ایک دم ہرجوش سا بولا۔ اور ساری دنیا کے درخت قلم بن جائیں اور سارے سمندر روشنائی اور ان سے لکھنے بیٹھو تو ختم ہو جائیں درخت اور ختم ہو جائیں سمندر، مگر اللہ کی باتیں کہاں ختم ہوتی ہیں اور قرآن کے اچھے طالب علموں کو بھی بس بولنے کا موقع چاہیے۔

”یوسف علیہ السلام نے اس قیدی سے کہا کہ اپنے آقا سے میرا ذکر کرنا۔ اگلی آیت ہے شیطان نے بھلا دیا اس کو ذکر کرنا اپنے آقا سے تو وہ ٹھہرا رہا قید میں کئی سال۔“

”ہوں۔۔۔“ وہ آدھا پونا لفظ سن پائی۔

”اب سنو مزے کی بات اس آیت میں اپنے آقا سے ذکر کرنے کے لیے لفظ آیا ہے ”ذکر رہ“ اس کے دو مطلب ہیں۔ آقا سے ذکر کرنا اور آقا کا ذکر کرنا۔ اصل میں اس آیت کے بھی دو مطلب ہیں۔ پہلا

چند لمحے کی خاموشی۔ پھر وہ بولا۔ ”مجھے نیند نہیں آرہی امی کہاں رہ گئیں۔“

”وہ فرزانہ خالہ کے کمرے میں ہیں۔ وہاں ساری خلائیں، ممانیاں محفل لگائے بیٹھی غیبتیں کر رہی ہوں گی۔ آپ بھی وہیں چلے جائیں۔“

”نہیں یا۔۔۔ اتنی مشکل سے بندہ روز کی پانچ نمازیں پوری کیا تا ہے، ایویں سارا ثواب ان سب لوگوں کو دے دیں بجن کو ہم تخت ناپسند کرتے ہیں؟“

”پھر سو جائیں۔“ جمائی روکتے اس نے گروٹ بدلی۔ نیند سے آنکھیں بند تھیں۔ چند لمحے گزرے پھر اس نے بڑے پیار سے پکارا۔

”یا صاحبی السعجن!“ (اے میرے قید خانے کے دونوں ساتھیو!)

حنین کے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیلے بازو ہٹایا اور کہنی کے بل اٹھ کر چہرہ اونچا کیا، وہ نیچے تھا تب ہی نظر نہ آیا، تو وہ اٹھی اور تکیہ اٹھا کر پاؤں والی طرف رکھا اور گھوم کر اس طرف سر رکھ دیا۔ پھر گردن اٹھا کر دیکھا تو وہ نیچے لیٹا، مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر دوسرے قیدی پہ ڈالی۔ (سیم) جو کب کا سوچا تھا۔

”سورۃ یوسف؟“ اس نے مسکرا کر آیت کا متن پوچھا۔

”ہوں۔۔۔ میری فیورٹ سورۃ۔“

”بس کرو بھائی، آپ سے تو جس سورۃ کا ذکر کرو، آپ کہتے ہی یہ میری فیورٹ ہے۔“

”کب کہا میں نے ایسا؟“

”مجھے زیادہ بولنے پہ مجبور نہ کریں اور سو جائیں۔“

دوبارہ ماتھے پہ بازو رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

”یا صاحبی السعجن!“ ذرا دیر گزری تو اس نے پھر نرمی سے حنہ کو پکارا۔ وہ۔۔۔ ”ہوں“ کر کے رہ گئی۔

”میں ایک بات سوچ رہا تھا۔“

”دل میں سوچیں بھائی۔“ مگر وہ بھی ڈھیٹ تھا، بولتا گیا۔

توقعات اتنی بڑھ جائیں گی۔ کوئی عام بندہ رہائی کا کہے بادشاہ سے تو بہت اچھا، مگر اللہ تعالیٰ کو یوسف علیہ السلام سے اس سے کہیں زیادہ کی توقع تھی۔

”مطلب انہوں نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا؟“

”نہیں استغفر اللہ... حنہ! انبیا کبھی بھی اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والے کام نہیں کرتے تھے۔ وہ معصوم

تھے اور یوسف علیہ السلام کی تو اللہ نے صرف اس ذرا سی کمی کی طرف توجہ دلائی، کیونکہ وہ ایک کامل انسان

تھے۔ صبر والے اور علم والے۔ یہ ایک غلطی تھی کہ

انسان کو مصیبت میں صرف اللہ کی طرف دیکھنا

چاہیے۔ اچھا اب وہ سنو جو میں سوچ رہا تھا۔ ”وہ چیت

لیٹا بولتا جا رہا تھا۔ ”تم نے نوٹ کیا، یوسف علیہ السلام

کو دنیا کا آدھا حسن دیا گیا تھا اور جن عورتوں کو خواہش

ہوتی ہے کہ ان کا بچہ خوب صورت ہو، وہ روز سورۃ

یوسف پڑھتی ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ایک دفعہ ”قطعاً“

ایک دفعہ بھی سورۃ یوسف میں نہیں کہا کہ یوسف

خوب صورت تھے۔ ان کے حسن کا ذکر بھی نہیں کیا۔

کیوں کہ اللہ نے ہمیں ”حسن القصص“ (سورۃ

یوسف) اس لیے دی تھی تاکہ ہم کسی انسان کی ان

خوبیوں کو جان پائیں جو اس کو اللہ کی نظر میں خوب

صورت بناتی ہیں، مگر حنہ یار! کوئی یہاں قرآن سمجھ کر

کیوں نہیں پڑھتا، تم سن رہی ہونا؟“ ہاتھ بڑھا کر حنہ

کے بالوں کی لٹ کھینچی۔ ”کٹویار! سنو، میں تم سے بات

کر رہا ہوں۔“

”سو نے دو بھائی۔“ وہ نیند میں تھی۔

”ایک وقت آئے گا حنین یوسف! جب تم میری

باتوں کو مس کیا کرو گی۔“ بڑے ہی خفا انداز میں وہ بولا۔

”اس؟ کون سا وقت؟“ اس کے ذہن میں کوئی فکر

جاگی۔

”جب میں شادی کے بعد رخصت ہو کر کسی گاگر

وامادین جاؤں گا۔“

”توبہ!“ وہ نیند میں بھی زور کی ہنسی۔ ”آپ کو کوئی

گھر واماد نہیں بنائے گا۔“

”یوں نہیں بنائے گا؟ جیب خالی ہے تو کیا ہوا، بندہ

شیطان نے اس ساتھی قیدی کو بھلا دیا کہ وہ بادشاہ سے یوسف علیہ السلام کا ذکر کرتا اور دوسرا، شیطان نے یوسف علیہ السلام کو بھلا دیا۔ اپنے رب کا ذکر کرتا اس لیے وہ ٹھہرے رہے جیل میں اگلے کئی سال، آئی کبھی؟“

”ہیں؟“ وہ بمشکل آنکھیں کھول پائی۔

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میرے

بھائی یوسف یہ الفاظ نہ کہتے تو اتنے برس جیل میں نہ

ٹھہرے رہتے۔“

”مگر انہوں نے جیل سے نکلنے کی کوشش ہی تو کی

تھی اس میں کیا بری بات ہے؟“

”میرے یا تمہارے جیسے لوگوں کے لیے جیل سے

نکلنے کی کوشش کرنا دراصل خود ایک جہاد ہے، ایک

اچھا کام ہے، ہم کریں تو ٹھیک ہوگا، مگر مقررین کی

حسنت دراصل سیات شمار ہوتی ہیں۔“

”کس کی کیا، کیا شمار ہوتی ہیں؟“ اس نے ترجمہ

مانگا۔

”مطلب جو لوگ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے

ہوتے ہیں، ان کی حسنت یعنی چھوٹی نیکیاں، ان کی

غلطیاں شمار ہوتی ہیں۔ گناہ نہیں، کہ انبیا کبھی گناہ

نہیں کرتے تھے۔“

”نہیں سمجھ میں آئی بھائی۔“

”دیکھو۔ مسجد میں جھاڑو لگانا کتنی اچھی بات ہے،

ہے نا؟ جو عورت مسجد میں جھاڑو لگاتی تھی، جب فوت

ہو گئی تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے

لیے خصوصی دعا کی۔ یہ ایک حنہ ہے۔ ایک نیکی،

لیکن تصور کرو کسی ایسے اسکالر کو جس کا عمل بھی نیک

ہو اور علم بھی بہت ہو۔ اللہ نے اسے ری سوز دیے

ہوں، ٹیلنٹ دیا ہو، مواقع دیے ہوں کہ وہ پوری دنیا

میں جا کر دین کی تبلیغ کرے، بڑے بڑے فورمز پر جا کر

قرآن کی باتیں لوگوں کو سنائے، اب اگر ایسا بندہ سب

چھوڑ چھاڑ کر مسجد میں دن رات صفائی کرنے لگ

جائے تو ہوگی یہ بھی ایک نیکی، مگر یہ اس کی برائی شمار

ہوگی، کیونکہ جو جتنا نیک اور اچھا ہوگا، اللہ کی اس سے

بہت اچھا ہوں میں۔ ایک تو خوش اخلاق اتنا ہوں اوپر سے خوب صورت بھی ہوں۔“ ذرا رک کر پوچھا۔
”ہوں نا؟“

اس نے بالآخر تکیہ اٹھا کر زور سے نیچے اچھالا۔ ”سو جاؤ بھائی۔ میں کبھی نہیں مس کرنے والی آپ کو“ جائیں کر لیں شادی۔“

یاد کا بلبلہ پھٹا اور وہ واپس اس نیم اندھیر تہ خانے میں آئی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپکتے آنسو سعدی کی شرٹ پہ گر رہے تھے۔ دل جیسے بری طرح ٹوٹ گیا تھا۔ وہ سعدی کے لیپ ٹاپ اور دوسرے gadgets والا باکس چھوئے بغیر واپس ہوئی۔ کسی بھی چیز کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔



یہ اہل درد بھی کس کی دہائی دیتے ہیں وہ چپ بھی ہو تو زمانہ ہے ہمنا اس کا وہ بار۔ کاؤنٹر کے اونچے اسٹول پہ بیٹھا تھا۔ پیچھے لوگوں کا شور، موسیقی، جلتی جھپتی روشنیاں تھیں۔ وہ بار بار کلائی کی گھڑی دیکھتا۔ چہرے پہ فکر مندی بھی تھی اور امید بھی۔

”ہائے شہر!“ وہ اسی پل اس کے ساتھ والے اسٹول پہ آ بیٹھی۔ کلچ کاؤنٹر پہ دھرا اور چہرہ اس کی طرف موڑا۔ اپنے سنہری بالوں کو اونچی (اور چھوٹی) سی پونی میں گسے اور سرخ لپ اسٹک لگائے، شہرین ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

”کیسی ہیں آپ؟“ ایک دم سے ساری دنیا رنگین ہو گئی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے لیے آرڈر کرنے لگا۔

”میں ٹھیک ہوں، مگر تم نے سعدی کے بارے میں سنا؟ اوہ گاڈ! مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔“ وہ سر شاک کے عالم میں نفی میں ہلاتی موبائل پہ انگلی پھیر رہی تھی۔ نوشیرواں کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ حلق میں گولہ پھنسا۔

”جی۔ میں نے سنا۔“
”مطلب کہ لا قانونیت کی حد ہوتی ہے۔ پہلے گولی اور پھر اغوا۔ یہ پکچر دیکھی تم نے؟“ اس نے اسکرین پہ وہی پولیس فوٹو گراف نکال کر اس کے سامنے کی۔ ”یہ وائرل ہو رہی ہے۔ اس کے یونیورسٹی کے دوست اس کے لیے

Hash Tag Save Saadi ٹرینڈ کو بہت بروموٹ کر رہے ہیں، مجھے بھی اسی سے پتہ چلا۔ تمہیں پتا ہے انہوں نے لیڈز میں اس کے لیے Vigil بھی کیا ہے۔ دیکھو کتنی بری طرح پینا گیا ہے اسے۔“ وہ فکر مندی اور تاسف سے بولے جا رہی تھی اور وہ صبر سے گھونٹ بھرنا گیا۔ مشروب زہر جیسا تلخ تھا۔

”آپ واپس کب جا رہی ہیں؟ سونیا کو مس تو کر رہی ہوں گی۔“

”میں اگلے ہفتے چلی جاؤں گی، مگر یقین کرو جب سے میں نے سعدی والی نیوز دیکھی ہے، بہت اپ سیٹ ہوں۔ شکر ہے تم مجھے مل گئے، کم از کم کسی سے ڈسکس تو کر سکتی ہوں۔ اس دن اتنا کچھ بول گئی میں اس کے بارے میں جو بھی ہے وہ اچھا لڑکا ہے۔“ پھر رک کر پوچھا۔ ”ہے کہنا چاہیے یا تھا؟“
”واپس جا کر کیا پلانز ہیں آپ کے؟“

”ایک سوشلائٹ کے کیا پلان ہو سکتے ہیں؟ وہی روٹین لائف۔ ویسے تمہیں کیا لگتا ہے، سعدی کو ان لوگوں نے مار دیا ہوگا؟“

گلاس پہ نوشیرواں کی انگلیوں کی گرفت سخت ہو گئی اور لب بچ گئے۔ آنکھوں میں بے پناہ بے زاری اتری۔ ”پتا نہیں۔“ اور گھونٹ بھرا۔ شہرین ہنوز تاسف سے بولے جا رہی تھی۔
وہ مرا ہوا ہاتھی بھی سوالا کھ کا تھا۔



یہ گرد باد تمنا میں گھومتے ہوئے دن کہاں پہ جا کے رکیں گے یہ بھاگتے ہوئے دن

دو ہفتے بعد۔
وہ گرم صبح قصر کاردار اور ملحقہ انیکسی پہ چمک دار
سی طلوع ہوئی تھی۔ زمر نے آئینے کے سامنے کھڑے
بالوں میں برش پھیرتے کھڑکی سے باہر دیکھا تو سبزہ زار
پہ ملازموں کی چہل پھل شروع ہوئی دکھائی دے رہی
تھی۔ تب ہی ہاتھ روم کا دروازہ کھلا اور وہ باہر آیا۔
زمر نے برش رکھ دیا اور پرس اٹھائے باہر نکل گئی۔
فارس نے ایک نظر اسے جاتے دیکھا اور دوسری
کمرے پہ ڈالی جس کو وہ ہر صبح کی طرح چند منٹوں میں
نفاست سے سمیٹ چکی تھی۔ تکیے بیڈ پہ بیڈ کور
برابری ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے سر جھٹکا
اور الماری کی طرف آیا۔ آج اسے جا ب پہ جاتے
پانچواں دن تھا۔

یہ پانچ جون تھی اور اکیس مئی کے اذیت ناک دن
کو گزرے قریباً دو ہفتے بیت چکے تھے۔
زمر یا ہر ننگی تو نیچے صداقت کے کچن سے خوشبو
آ رہی تھی۔ وہ حنہ کے دروازے پہ رکی پھر اسے
دھکیلا تو اندر کا منظر نمایاں تھا۔ ندرت کا بیڈ خالی تھا اور
حنین اپنے بیڈ پہ اکڑوں بیٹھی تھی۔ بال پونی میں
بندھے وہ ڈل اور کمزور لگتی تھی۔ آہٹ پہ چہرہ اٹھایا
آنکھوں میں امید جاگی۔

”بھائی کا کچھ بتا چلا؟“
”اونہوں۔ لیکن اگر تم چاہو تو میرے ساتھ چل
سکتی ہو۔ ہم مل کر سعدی کو ڈھونڈیں گے۔“ حنہ کے
چہرے کی جوت ماند بڑ گئی اس نے ٹھوڑی گرا دی۔

”میں کچھ بھی نہیں کر سکتی میری وجہ سے۔ اپنے
آخری دن بھائی اتنا ناراض ہوا تھا۔ میں آپ کی طرح
نہیں ہوں کس۔“ نظریں جھکائے خفگی سے بولی۔
”اس سے چار سال بات نہ کروں اور پھر طاہر کروں کہ
مجھے اس کی بہت پروا ہے۔“

چوکھٹ میں کھڑی زمر کی آنکھوں میں نمی ابھری۔
”حنین! مجھ سے ایک غلطی ہوئی تھی اور میں اس
کے لیے شرمندہ ہوں۔ تم نے سنا؟ آئی۔ ایم۔
سوری فاروٹ!“ وہ بولی تو آنکھوں میں شکوہ اور آواز

میں کپکپا ہٹ تھی۔ ”میں نے چار سال اس سے تعلق
نہیں رکھا“ میں نے غلط کیا اور مجھے تب یہ احساس ہو گیا
تھا جب ابا نے بتایا کہ مجھے گروہ سعدی نے دیا تھا۔ میں
اس دن اس کے پاس چلی گئی تھی اور ہمارے درمیان
سب ٹھیک ہو گیا تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ
چار سال مٹ گئے۔ مجھے مرتے دم تک ان کا افسوس
رہے گا۔“ اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ حنین نگاہیں
اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں دکھ کی
کرچیاں سی بکھری تھیں۔

”مگر تم مجھ سے پوچھو تو میرا دل چاہتا ہے کہ ہر اس
شخص کو روکوں جو اپنے کسی خونی رشتے دار سے ناراض
ہے اور کہوں کہ اس کو کال کر لو اس سے تعلق جوڑ لو
چاہے اس نے آپ کا کتنا بھی دل کیوں نہ دکھایا ہو۔
میری طرح اتنے سال ضائع نہ کرو بے کار کی اتنا میں۔
اگر تعلق نہیں جوڑو گے تو پتا ہے کیا ہوگا؟ آپ کے
بچوں میں ان ہی بہن بھائیوں کی شکلیں اور عبادتیں
نظر آنے لگیں گی جن سے آپ بہت دکھی دل کے
ساتھ علیحدہ ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کیوں بناتا ہے آپ
کی اولاد میں آپ کے رشتوں کی مشابہت؟ اس لیے
ناکہ ہم ان کو نہ بھول سکیں۔ کیونکہ اگر ہم نے جلد
صلح نہ کی تو وہ مرجائیں گے، کھو جائیں گے، یا ہم مر
جائیں گے، کھو جائیں گے، میں نے غلطی کی تھی اور
مجھے اس کے لیے ہمیشہ افسوس رہے گا۔ مگر تم میری
غلطی کیوں دہرا رہی ہو؟“ آخری فقرے پہ حنہ نے
منہ موڑ لیا۔

”ایک حادثے کے بعد اپنے واحد پیرنٹ کو مزید بیمار
دیکھنا اور ساری دنیا سے کٹ کر کے کمرے میں پڑ جانا“
اور جو اپنے تمہارے پاس ہیں، ان کو ہر وقت التزام
دیتے رہنا، تمہیں لگتا ہے یہ تمہاری کہانی ہے حنہ؟
نہیں۔ اگر چار سال پیچھے جاؤ تو یہ میری کہانی ہے۔
جب میں اس غلطی کو نہیں دہرا سکتی تو تم کیوں دہرا رہی
ہو؟“

حنین نے جواب نہیں دیا۔ منہ موڑے، گیلی
آنکھوں سے کھڑکی کو دیکھے گئی۔

”مجھے نہیں پتا تمہیں کون سا گلٹ روز بروز کمزور کرتا جا رہا ہے، لیکن میں جس حنین کو جانتی ہوں وہ ہمارے خاندان کا سب سے جینٹلس اور بولڈ بچہ تھا۔ اتنی ڈل اور کم اعتماد نہیں تھی وہ۔ تمہیں سعدی سے محبت ہے تو اٹھو اور اس کمرے سے باہر نکلو اور اس کے لیے کوشش کرو۔ یا کم از کم میری اس کے لیے محبت کو حج کرنا چھوڑو۔“ اور وہ مڑ گئی تو پیچھے سے حنہ ہلکا سا بولی۔

”مجھے پتا ہے آپ کو بھائی سے بہت محبت ہے اور ساری بات یہی ہے کہ آپ کو صرف بھائی سے محبت ہے۔“ کیلی آنکھوں سے اس نے زمرد کی پشت دیکھی۔ ”اگر سعدی کی جگہ حنہ کھوتی تو آپ اتنی بھاگ دوڑ کبھی نہ کرتیں۔ میرے اور آپ کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم ایک ٹیم کبھی نہیں ہو سکتے اس لیے میرے ساتھ بار بار یہ pep talk کرنا چھوڑ دیں۔“

زمرد نے گہری سانس لی اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ پیچھے حنین کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ”وہ میرا بیسٹ فرینڈ تھا پھپھو، آپ کو اندازہ بھی نہیں کہ میں کتنی اکیلی ہو گئی ہوں؟“ سر جھکائے، آنسو صاف کرتے وہ خود سے کہہ رہی تھی۔

زمرد نیچے لاؤنج میں آئی تو صداقت چائے لارہا تھا۔ ”بھابھی ریٹونٹ چلی گئیں؟“

”جی ہاں۔ ہر روز جلدی چلی جاتی ہیں اور دیر سے آتی ہیں۔ آنٹی جی کو تو چپ ہی لگ گئی ہے۔“ زمرد نے جو ابی بصرہ نہ کیا اور ٹانگ پہ ٹانگ جما کر بیٹھی، چائے کا کپ اٹھا لیا تب ہی وہ سیڑھیاں اترتا دکھائی دیا۔

”تھانے سے فون آیا ہے۔ بلا رہے ہیں۔ کیا آپ چلیں گی؟“ والٹ جیب میں رکھتے اس نے پوچھا۔ زمرد نے گھونٹ بھرتے ہوئے شانے اچکائے۔

”میں ایک اٹارنی ہوں، ایک نوٹس پہ ان پولیس والوں کو عدالت بلوا سکتی ہوں۔ ان کو کام ہے تو وہ ہمارے پاس آئیں۔“

(جلی رسی کا بل۔ خیر) اس نے کوٹ کا مٹن بند کرتے

”وہ لفٹ والا آدمی۔ نیاز بیگ۔ اسے کل رات گرفتار کر لیا گیا ہے۔ دوپہر میں آپ کو پک کر لوں گا“ آپ اس سے ملنا تو چاہیں گی۔“ زمرد نے چونک کر کپ نیچے کر کے اسے دیکھا۔ وہ اب ریک سے چابی اٹھا رہا تھا۔ وہی گلے کی شرٹ پہ گہرے کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ (جواب شروع کر لی، مگر کالروالی ڈریس شرٹ یا ٹائی پہننا تو اس کو پسند ہی نہیں ہے جیسے!) بال ذرا بڑھے تو پھر سے چھوٹے کروالیے۔ اپنی جاب کے لحاظ سے مناسب لگ رہا تھا۔ زمرد نے نظریں پھیر لیں اور ہلکا سا اثبات میں سر ہلادیا۔

”اوکے“

فارس نے بس رک کر ایک نظر اس پہ ڈالی اور پھر بیرونی دروازے کی طرف چلا گیا۔

چلو یہ سیل بلا خیز ہی بنے اپنا سفینہ اس کا، خدا اس کا، ناخدا اس کا ہسپتال کا کشادہ اور پرعیش کمرہ اس صبح بھی دمک رہا تھا۔ کاویج پہ میری بیٹھی، کتاب چہرے کے سامنے کیے ہوئے تھی۔ بستر پر لیٹے سعدی کے بازو آزاد تھے، مگر پاؤں میں ہتھکڑی لگا کر بیڈ کے ساتھ نتھی کر دی گئی تھی۔ سر کی طرف سے بیڈ اونچا کر رکھا تھا اور وہ کھلی آنکھوں سے پہلے سے خاصا بہتر نظر آتا، ارد گرد دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں کاردار صاحب نے میری نگرانی کے لیے ادھر چھوڑا ہے؟“ دفعتا اس نے پکارا۔ مگر میری کتاب پڑھتی رہی۔

”کیا تمہیں معلوم ہے، مجھے گولی کس نے ماری تھی؟“

میری نے صفحہ پلٹایا۔ نگاہیں صفحے پر جمی تھیں۔ وہ پلکیں سکیڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں سب معلوم ہے۔ تم بھی ان کی شریک جرم ہو۔“

خاموشی نے پھر سے اطراف کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دفعتاً "سعدی نے ٹھنڈی سانس لی۔
"تمہارا بچہ کیسا ہے؟ اس کا علاج کیسا جا رہا ہے؟"
اب کے اس کا اندازہ دوستانہ تھا۔

میری نے پلک تک نہیں جھپکی۔ اسی طرح پڑھتی رہی۔ سعدی نے نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں۔ کمرہ بالکل صاف تھا۔ اس کاؤچ اور بیڈ اور ضروری طبی اشیاء کے علاوہ اس کمرے میں کوئی بھی شے نہ رکھی تھی جو اس کے کسی کام آسکتی۔ کوئی کھڑکی تک نہ تھی۔

"میرے گھر والے میرے لیے پریشان ہوں گے۔ ان کو صرف اتنا بتا دو کہ میں زندہ ہوں۔" بولتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ بہت امید سے میری کو دیکھا۔ مگر اس نے نگاہیں تک نہیں اٹھائیں۔

"مجھے کچھ چاہیے۔" کچھ دیر بعد سعدی نے پکارا۔ میری نے فوراً "چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ آدھے آستین کی اسپتال کی شرٹ میں ملبوس، تکیوں کے سہارے نیم دراز اس کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا؟" اس نے بے تاثر سپاٹ انداز میں دریافت کیا۔

"مجھے قرآن لا دو۔ میں اس کو پڑھ لوں گا۔ جیسے تم بوری ہو رہی ہو، ویسے ہی میں بھی بوری ہو رہا ہوں۔ اتنا تو تم کر سکتی ہو میرے لیے۔"

"اوکے منگوادو گی۔" اور دوبارہ سے کتاب چہرے کے سامنے کر لی۔ سعدی نے گہرے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔



ہر غلط بات پہ میں آپ کی کہہ دوں لہیک! اس طرح خون صداقت نہیں کر سکتا میں تھانے کے اس کمرے میں چوکور میز چھپی تھی۔ فارس اور زمر برابر کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔ دائیں ہاتھ اے ایس پی سرد شاہ تھا۔ سامنے چھپی کرسیوں پہ نیاز بیگ براجمان تھا۔ کندھے کرسی کی ٹیک پہ گرائے

گربان کے بٹن کھلے تھے، سیاہ مونچھیں اور سیاہ آنکھیں تھیں بجن میں زمانے بھر کی بے زاری۔ سموئے وہ زمر کو دیکھ رہا تھا۔

"تو تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم نے سعدی کو گولی ماری ہے۔" زمر نے پھبتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتے ٹھنڈے انداز میں پوچھا تھا۔

منہ میں کچھ چباتے ہوئے اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "ہاں۔ اس کا ریستورنٹ خریدنے کی بات ہی تو کی تھی۔ آگے سے بولا نہیں بیچتی۔ سارے لوگ شروع میں یہی کہتے ہیں۔ میں نے صرف اصرار کیا۔ دو تین دفعہ جا کر ملا بھی اس سے۔ مگر سالانہ میں آگیا۔ مجھے گالیاں بکنے لگا۔ سب برداشت ہوتا ہے بی بی مگر۔" انگلی اٹھا کر سلگتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "گالی برداشت نہیں ہوتی۔ سو وہیں پھڑکا دیا اسے۔ اب جا کر اگلے جہاں میں بیچے اپنی دکان۔" ساتھ ہی استہزائیہ سر جھٹکا۔

"اے۔ زبان سنبھال کر!" وہ ذرا غصے سے آگے کو ہوا تو سرد شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے تھمنے کا اشارہ کیا۔ زمر نے محض ایک ناپسندیدہ نظر فارس پہ ڈالی اور دوبارہ نیاز بیگ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"اسپتال سے کیوں غائب کیا تم نے اسے؟" "صاف بات ہے بی بی۔ جب تک لاش نہیں ہوتی، قتل ثابت نہیں ہوتا۔ بس وارڈ بوائے کو ملایا ساتھ اور لے گئے اسے گاڑی میں ڈالا اور کوڑے کے ڈھیر پہ پھینک دیا۔ صبح جا کر دیکھا میں نے۔ نام و نشان تک نہ تھا۔ خلاص۔" بے پروائی سے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا۔ فارس بہت ضبط سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ اتنی ہی ٹھنڈی تھی۔

"کون سی گالی وی تھی اس نے؟" "آہ۔ کیا دہراؤں اب؟" اس نے تلخی سے ہنس کر سر جھٹکا۔ اے ایس پی کے ابرو بھیچے۔ "حد میں رہ کر بات کرو نیاز بیگ۔"

"تو بی بی کو منع کرونا۔ کیوں میرا منہ کھلوانا چاہتی ہے۔"

مگر اسی پل زمر نے (میز کے نیچے سے) جوتی کی ہیل اس کی پنڈلی پہ زور سے ماری۔ فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سامنے اے ایس پی کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ کے تعاون کا شکریہ۔ اس سے وہ جگہ معلوم کرنے کی کوشش کیجئے جہاں اس نے باڈی پھینکی تھی۔ کوڑا کون اٹھاتا ہے، ٹرک کہاں جاتے ہیں، آپ بس ہمیں باڈی ری کور کر کے دے دیں، اور اس شخص کو اس کی سزا دلوادیں، اس سے زیادہ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔“ اس کے انداز پہ وہ خون کے گھونٹ بھر کر خاموش ہو گیا۔ وہ اب پرس اٹھا کر کھڑی ہو رہی تھی۔

”ہم باڈی کور کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ ایک دفعہ پھر مجھے بہت افسوس ہے۔“ سرمد شاہ نے سر کو خم دے کر تعزیت کرتے اٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی اٹھا۔

”آپ کا بہت شکریہ۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔“ وہ مڑی اور ایک تیز نظر فارس پہ ڈالتی باہر نکل آئی۔

گاڑی سامنے ہی کھڑی تھی۔ وہاں جانے تک اس نے بمشکل ضبط کیا تھا، مگر چالی دروازے میں گھساتے ہوئے وہ طیش سے زمر کی طرف گھوما۔

”وہ شخص میرے سامنے۔“

”فارس غازی! وہ ہمیں دیکھ رہے ہیں، تماشا مت بناؤ۔ گھر جا کر بات کرتے ہیں۔“ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے وہ تلخی سے بولی اور موبائل پہ ایک نمبر ملانے لگی۔ وہ اندر ہی اندر کھولتا ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا اور زور سے دروازہ بند کیا۔



مجھے لمحہ بھر کی رفاقتوں کے سراب اور ستائش کے میری عمر بھر کی جو پیاس تھی، وہی لوگ مجھ سے چھڑ گئے، حنین اور ندرت کے کمرے میں وہی اداسی چھائی ہوئی تھی وہ بیڈ پر گم صم بیٹھی تھی، سیم اندر آیا اور دھپ سے بیڈ پر آگرا۔

”حننا، بیڈ پر چت لیٹے چھت کو تکیے پکارا، حنین گھٹنوں پہ گال رکھے، خاموش بیٹھی رہی۔“

”میں نے پوچھا۔“ زمر اس کی آنکھوں میں دیکھتی آگے ہوئی۔ ”کون سی گالی دی تھی اس نے؟“

”دہرا دیتا ہوں، مگر تمہارے بندے کو اچھا نہیں لگے گا۔“ استہزائیہ زہریلی مسکراہٹ لبوں پہ بکھیرے اس نے فارس کو دیکھا جو اتنے ہی غصے سے اسے گھور رہا تھا۔ اور پھر اس نے تین چار گالیاں دہرا دیں۔ میز پہ رکھی فارس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔

”اور کتنی دفعہ دیں اس نے یہ گالیاں؟“ زمر کا چہرہ سپاٹ تھا۔

”چار ایک بار تو دی تھیں۔ تب ہی اسے خلاص کرنا پڑا۔“

”اور یہ سب کہنے کے کتنے پیسے دیے گئے ہیں تمہیں؟“ وہ خود کو پولنے سے روک نہیں سکا۔ زمر نے ضبط سے گہری سانس لی۔ (فارس کو برداشت کرنا، نیاز بیگ کو برداشت کرنے سے زیادہ مشکل تھا) نیاز بیگ کے چہرے کے اطمینان اور استہزائیہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔

”نیاز بیگ کسی سے ڈرتا نہیں ہے۔ ڈنکے کی چوٹ پہ بولا ہے سب، کیونکہ ابھی وہ افسر پیدا نہیں ہوا جو چار دن سے زیادہ۔“ انگوٹھا بند کر کے چار انگلیاں دکھائیں۔ ”نیاز بیگ کو حوالات میں رکھ سکے۔ اس لیے اپنی وکالت عدالت میں کروبی لی۔ میرے پر یہ سکہ نہیں چلنے والا۔“ مسلسل منہ میں کچھ چباتے وہ پیچھے ہو کر بیٹھا اور ایک طنزیہ مسکرائی نظر زمر پہ ڈالی۔

”ویسے وہ تمہارا بھتیجا تھا؟ سچ سچ۔ بہت رویا تھا بچہ جب گولی لگی، بالکل لڑکیوں کی طرح۔“

”بس بہت ہو گیا۔“ سرمد فارس کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا (اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر نیاز بیگ کا گریبان پکڑ لے) اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ وہ چٹکڑیاں لگے نیاز بیگ کو اندر لے گئے۔ دروازے میں گم ہونے سے قبل اس نے مسکراتے ہوئے پیچھے زمر کو دیکھتے منہ سے وہ تنکا تھوک کر پرے پھینکا تھا۔

”اس ساری بکو اس کا کیا مطلب تھا؟ یہ شخص۔“ اس کے جاتے ہی وہ ایک دم جیسے کھول کر کہنے لگا تھا،

”میرا بھائی کھو گیا ہے اور میں دن رات اس کے لیے دعا کرتی ہوں۔ مگر میں سوچتی ہوں کہ جو مقدر میں لکھا ہے وہ تو ہو جائے گا جو نہیں لکھا وہ نہیں ہوگا“ پھر بندہ دعا کیوں کرتا ہے؟“ دھول سے اٹے راستے پہ وہ دونوں آگے چلتے جا رہے تھے اور وہ سر جھکائے دھیمی آواز میں پوچھ رہی تھی۔

”وہ بھی ایسا ہی سوچتے ہیں۔“ چلتے چلتے شیخ نے ایک طرف اشارہ کیا تو حنہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ سڑک کنارے بازار میں ایک قہوہ خانے کے باہر چوکیوں پہ چند لوگ بیٹھے تھے اور بلند آواز میں بحث کر رہے تھے۔

”جو مقدر میں ہے وہ ملے گا جو نہیں مقدر وہ نہیں ملے گا سو سوال کرنا یا نہ کرنا برابر ہے۔“ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا اور باقی سردھن رہے تھے۔ حنین نے الجھی ہوئی نگاہیں اٹھا کر شیخ کو دیکھا۔ وہ مسکرائے۔ ”یہ کہتے ہیں دعا کرنے یا نہ کرنے کا کیا فائدہ؟ سب کچھ تو لکھا جا چکا۔ مگر یہ ان کی جہالت ہے اور اپنے مسلک میں یہ خود تضاد رکھتے ہیں۔ کیوں کہ اگر ایسا ہے تو پھر ان سے پوچھو، اگر سیرابی تمہارا مقدر ہے تو پانی پیو یا نہ پیو، پیاس بجھ جائے گی۔ کھیتی مقدر ہے تو دانہ ڈالو یا نہ ڈالو، اناج آگ ہی جائے گا۔ تو پھر کھاتے مٹتے کیوں ہو؟ دانے بوتے کیوں ہو؟“ وہ قدم بڑھاتے گئے اور حنین ان کے ساتھ آگے چلتی گئی۔ قدم بازار میں لوگوں کی بھیڑ سے شور، آوازیں، قہوے کی مہک، سب خلط ملط ہو رہا تھا۔

”اور ان کو دیکھو۔“ ذرارک کرانہوں نے چوتھوں سے ایک کھلے خیمے کی طرف اشارہ کیا جہاں اندر فرشی نشست بچھائے چند لوگ بیٹھے تھے۔ ان کے سروں پہ مخصوص ٹوپیاں تھیں اور وہ آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔

”یہ کہتے ہیں دعا تو بس عبادت ہے، ثواب کا ذریعہ۔ نیکی اور بدی تو لکھی جا چکی تو دعا کرنا بس نیکی کی نشانی ہے اور عذاب پانا کفر کی علامت ہے۔ نہ نیکی خیر کا سبب ہے۔ نہ عذاب کفر کی وجہ ہے۔ دعا صرف

”یاد ہے حنہ تھندر کیٹس میں بھی ممرایا اس کا کوئی ساتھی کسی تھندر کیٹ کو اغوا کر لیتا یا نقصان پہنچاتا تو آخر میں باقی کیٹس اس کو بچا لیتے تھے اور سب صحیح ہو جاتا تھا۔ کیا ہمارا بھائی بھی واپس آجائے گا؟“

”ہمیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ ہمارا ممر کون ہے۔ اور جو اسے ڈھونڈنے کے لیے بظاہر بھاگ دوڑ کر رہے ہیں، ان کو بھی کچھ نہیں پتا۔“ وہ خفگی سے بولی۔ ”ماموں بھی بدل گئے ہیں۔ پھپھو کی بدل گئی ہیں۔“ سیم کہنی کے بل بیٹھا اور چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”تم بدل گئی ہو!“ حنین نے گلہ آمیز نظر اس پہ ڈالی۔ ”جاؤ مجھے بڑھنے دو۔“ اور خلاف معمول وہ بنا چوں چرا کیے باہر نکل گیا۔ پھر وہ اٹھی اور سائیڈ میبل پہ دھری سفید جلد والی کتاب اٹھائی۔ گھنٹوں پہ رکھ کر بے دلی سے صفحے ملنے لگی۔

دروازہ کھلا تو تیز روشنی اٹھ کر آنکھوں کو چندھیا گئی۔ وہ ماتھے پہ ہاتھ کاچھبنائے قدم قدم چلتی آگے آئی تو دیکھا اس کے ارد گرد قدیم دمشق کی ایک روشن دوپہر آباد تھی۔ ہر شے زردی میں لپٹی تھی۔ مگر پہلے کے برعکس وہ بے دلی سے سر جھکائے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کچے راستے پہ آگے بڑھتی گئی۔ دھول جو توں کو آلودہ کرتی گئی۔ جب چہرہ اٹھایا تو مسجد سے ملحقہ حجرہ سامنے تھا اور ایک طرف درخت تلے وہی ہڈیوں کا سا بنجر آدمی اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کی مرونی اور ویرانی ہنوز برقرار تھی۔

آج چھوٹی دیوار کے ساتھ شیخ کھڑے تھے۔ پیروں تک آنا سفید چمک دار لباس پہنے، مسکراتے ہوئے۔ وہ بنا مسکرائے قریب آرکی۔

”کیا آپ نے اس بیمار کو ابھی تک شفایاب نہیں کیا؟“

”بیمار خود کوشش نہ کرے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔“ وہ کچے راستے پہ چلنے لگے تو وہ بھی سر جھکائے بدل سی ساتھ ہوئی۔ ”تم کیوں اداس ہو؟“

ہو اور وہ بات بھی سن بھل گئی۔ ”وہ تپتی دوپہر میں کچے راستے پہ چلتی کہہ رہی تھی۔ ”دعا کافی ہے نا پھر تو۔“
 ”یہ تو کل نہیں کاہلی ہے۔ بے عملی ہے۔ جمالت ہے۔ عقل مند وہ ہے جو تقدیر کو تقدیر سے توڑے اور تقدیر کے مقابلے میں تقدیر کو ہی لا کھڑا کرے۔“

”اس کا کیا مطلب ہوا؟“

”مطلب یہ ہے لڑکی کہ اسباب بھی قدرت نے دیے ہیں اور پریشانیاں بھی۔ ان کو آپس میں لڑاؤ اور آسمانوں سے مدد کی دعا کرو۔ اور سنو۔ قرآن پڑھا کرو۔ اس میں ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے۔“

مسجد آگئی تھی اور وہ بیمار ہنوز درخت تلے بیٹھا تھا۔ اکڑوں، سر گھٹنوں پہ رکھے ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ لاغر اور مایوس سا وجود۔ اس نے ایک ترجم بھری نگاہ اس پہ ڈالی اور قدم آگے بڑھا دیے۔

”امام کو کیا معلوم میرے مسئلوں کا! ایک سات صدیوں پہلے کے نائیو (سادہ لوح) بوڑھے امام کو کیا معلوم؟“

شیخ وہیں مسجد کے پاس کھڑے رہ گئے۔ اور وہ مدرسہ الجوزیہ سے دور بہت دور صدیوں کی مسافت طے کرتی چلتی گئی۔



وہ تو زخموں کو نمکدان بنا دیتے ہیں دل کے زخموں پہ سیاست نہیں کر سکتا میں دوپہر ہنوز جھلس رہی تھی جب فارس نے کار انیکسی کے سامنے سبزہ زار پہ روکی اور ایک سلگتی نظر اس پہ ڈالی۔ وہ موبائل کان سے لگائے دوسری طرف جانی گھٹی سن رہی تھی۔

”وہ نہیں اٹھائے گا فون۔ چھوڑ دیں اس انوسٹی گیشن کا پیچھا۔ اب باس نہیں ہیں آپ اس کی۔“ زمر نے زور سے فون پریس میں پٹخا۔ پیشانی پہ بل لیے وہ منہ میں کچھ بڑا بڑائی تھی۔

”اس شخص کا منہ توڑنا تھا میں نے، مگر آپ کی وجہ سے چپ رہا اور وہ اے ایس پی۔ وہ سب ایک ساتھ

ثواب کے لیے کرو اور نہ ہونا وہی ہے جو تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔ جس نے اس گھڑی مرنا ہے اب وہ خود کشی کرے، طاعون سے مرے، یا اسے قتل کیا جائے، سب برابر ہے، مگر نہیں۔“ شیخ نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ بھی غلط ہیں۔“

”تو پھر صحیح کون ہے؟“ وہ پست آواز سے اور چہرے پہ تکان لیے پوچھنے لگی۔ شیخ دوبارہ چلنے لگے تھے حنہ کے پیردھول میں اے جا رہے تھے۔

”یہ ہیں وہ جو صحیح ہیں۔“ انہوں نے انگلی سے اشارہ کیا تو حنین نے دھوپ کے باعث آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ ایک درخت تلے چاور بچھا کر چند لڑکے قرآن پڑھ رہے تھے۔ ان کا معلم ان کے سامنے چوکی پہ براجمان تھا۔

”یہ کہتے ہیں کہ کوئی کام تب ہوتا ہے جب اس کے لیے اسباب اختیار کیے جائیں اور دعا ان اسباب میں سے ایک ہے۔ سیرالی کھانے پینے کے ساتھ ہے، بھیتتی دانہ بونے کے ساتھ ہے اور جانور کی جان نکلنا ذبح کرنے کے ساتھ ہے۔ اور وہ جو بیمار تم نے دیکھا، وہ یہی بات نہیں سمجھ پارہا کہ اسباب میں سب سے طاقتور سبب دعا ہے۔“

وہ اب رکے اور اپنے قدموں پہ واپس جانے لگے۔ تھکی تھکی سی حنہ بھی ساتھ پلٹی۔

”اور جو دعا کرنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکے وہ؟“
 ”کچھ تو کرنا پڑتا ہے۔ فتح کثرت افواج سے نہیں ملتی، آسمانوں سے مدد کی صورت اترا کرتی ہے۔ جو اللہ سے نہیں مانگتا، اللہ اس پہ خفا ہوتا ہے، پس تم دوسروں کے ساتھ جتنی بھلائی کرو گی، اتنا ہی اللہ تمہیں عطا کرے گا۔ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اگر یونس علیہ السلام خدا کی تسبیح کرنے والوں میں نہ ہوتے تو اس دن تک کہ جب تک کھڑے کیے جائیں گے، مچھلی کے پیٹ میں ہی رہتے۔“

”مگر شیخ! جب دعا سب سے طاقتور ہتھیار ہے تو دوسری چیزوں کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے دعا کی بھائی ٹھیک ہو جائے وہ ہو گیا۔ میں نے دعا کی وہ مجھ پہ خفا نہ

ملے ہوئے ہیں، کیا ضرورت تھی اس کے سامنے خاموش رہنے کی۔“

وہ نمبر ملاتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ ”مجھے پتا تھا تم کام بنانے کی بجائے صرف بگاڑو گے۔ تم سے کچھ نہیں ہوگا۔“

وہ تیکھی نظروں سے اسے دیکھے گیا۔ اندراٹھتال بال ذرا کم ہوا۔ چہرے کی رنگت نارمل ہونے لگی، پھر اس نے گہری سانس لی۔

”آپ کو کیا چاہیے؟“ زمر نے فون کان سے لگاتے ہوئے آکٹاہٹ بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”انوسٹی گہٹو کو کیوں کال کر رہی ہیں؟ کیا چاہیے آپ کو؟“ اس نے دہرایا۔

”ایسے مت پوچھو، جیسے تم میرا کوئی کام کر سکتے ہو۔“ بے زاری سے اس نے فون ہٹایا اور لاک کھولا۔

”ایک آدمی ہر اس کر رہا تھا آپ کو، پھر آپ نے مجھے بتایا۔ کیا دوبارہ اس نے کبھی تنگ کیا آپ کو؟“ زمر کے دروازہ کھولتے ہاتھ تھے، چونک کر اس نے فارس کو دیکھا۔

”دو تین دفعہ آپ نے کچھ لوگوں کے بینک اکاؤنٹس اور بیک گراؤنڈ چیک کرنے کے لیے کہا تھا، میں نے وہ کر کے دیا تھا یا نہیں؟“ وہ سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے پوچھ رہا تھا۔ زمر کے ابرو مشتبہ انداز میں اکٹھے ہوئے۔

”تب تم قائل نہیں تھے۔“

”میں نے پوچھا، آپ کو کیا چاہیے؟“ ایک لفظ پہ زور دیا۔ نظریں ابھی تک اس کی آنکھوں پہ تھیں۔

”تم کیا کر سکتے ہو میرے لیے؟ اس نیاز بیک کا بیک گراؤنڈ چیک کر سکتے ہو؟ اس کا پولیس ریکارڈ، مالی حالات، خاندانی حالات، ڈیپلنگز، مجھے ہر چیز چاہیے، وہ بھی جو اس کو خود بھی نہ معلوم ہو۔ اگر میرا انوسٹی گہٹو ہوتا تو کل شام سے پہلے ہر چیز میری ٹیبل پہ ہوتی۔ بولو، تم کر سکتے ہو؟“ درشتی سے چبا چبا کر بولتی، ایک ملامتی نظر اس پہ ڈال کر اس نے دروازہ کھولا تو سنا۔

”کل دہر سب آپ کی ٹیبل پر ہوگا۔“ وہ نکلی تو وہ

”مجھ پہ چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہاری کوئی ملازمہ نہیں ہوں۔“ وہ ناگواری سے اس کی طرف دیکھ کر بولی تھی۔ ”میں نے نہیں کہا تھا مجھے تمہاری ضرورت ہے، تم نے کہا تھا کہ ہم ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں۔ اگر میرے ساتھ کام نہیں کرنا تو جہنم میں جاؤ میری طرف سے۔ میں اپنے بچے کو اکیلے ڈھونڈ لوں گی۔ لیکن اگر میرے ساتھ کام کرنا ہے تو سب میرے طریقے سے ہوگا۔“

”وہ میرے سامنے اتنی بکو اس کرتا رہا اور میں سنتا رہا۔ لعنت ہے مجھ پہ۔“ اس نے غصے سے اسٹیمرنگ پہ ہاتھ مارا۔ زمر نے بے اختیار کپٹی کو مسلا۔

”فارس! تم مجھے مزید ٹینشن دینے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔ مجھے بھی پتا ہے کہ کون کس کے ساتھ ملا ہوا ہے، مگر بات بات پہ اگلے کا گریبان پکڑنے اور دانت توڑنے کے علاوہ کبھی بہت طریقے ہوتے ہیں۔ مگر میں بھی کسے بتا رہی ہوں۔“ سر جھٹک کر وہ کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی جہاں سبزہ زار اور انیکسی دکھائی دے رہی تھی۔

فارس نے تپ کر اسے دیکھا۔ ”تو اب کیا ہوگا؟ وہ تو اصل مجرموں کو کور کر گیا ہے۔ کل کلاں ضمانت پہ رہا ہو جائے گا۔ اور وہ اے ایس پی، ایس پی بن جائے گا۔ ایسے ملے گا ہمیں سعدی؟“

”میرا اس اے ایس پی کے ساتھ ایک ورکنگ ریلیشن ہے تم اتنے غصے میں اندھے ہو کر اسے خراب مت کرو، یہ میری درخواست ہے۔“

”مجھے ایک گھنٹہ مل جائے اس نیاز بیک کے ساتھ، میں دیکھتا ہوں وہ کیسے سب نہیں بلکتا۔“

”کیا بتائے وہ؟ اس کو کچھ بھی نہیں پتا۔ اگر پتا ہوتا تو سوہ شاہ اسے ہمارے سامنے نہ لاتا۔ یہ فون کیوں نہیں اٹھا رہا۔“ وہ دوبارہ سے موبائل نکال کر نمبر ملانے لگی۔ جسٹلاہٹ اور آکٹاہٹ اس کے چہرے پہ بکھری تھی۔ فارس چہرہ اس کی طرف موڑے اسے دیکھنے لگا۔

ہوں گے نا۔“
 ”نہیں۔ مجھے کیا پتا۔ میں تو کافی دن سے اس سے ملا بھی نہیں تھا۔ ان فیکٹ میں تو اس واقعے سے ایک دن پہلے وہی چلا گیا تھا۔ مجھے واقعی افسوس ہے کہ میں اس کے پاس اس مشکل وقت میں نہیں تھا۔“

بظاہر لاروائی سے شانے اچکائے ہر اندر سے اس کا سانس خشک — ہو رہا تھا کیونکہ وہ چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”جی مجھے پتا ہے آپ تب وہی میں تھے، اس اوکے ہاشم نے بتایا تھا۔“ وہ بات ختم کر کے مڑنے لگی، مگر ایک دم رکی۔ چونک کر اسے دیکھا۔

”سعدی کے واقعے سے ایک دن پہلے، مطلب میری شادی والے دن آپ وہی گئے ہوئے تھے؟ ایس تاریخ کو؟“

”جی۔ اور سوری بھول گیا۔ شادی کی مبارک ہو آپ کو۔“

زمر نے سر جھٹکا۔ ”میں پبلک پراسیکیوٹر نہیں ہوں اب۔“ محض اتنا بتا کر وہ پلٹ گئی۔ نوشیرواں نے شانے جھٹکے اور واپس ہولیا۔

لبوں میں سیٹی بجاتا وہ جواہرات کے ساتھ کرسی پہ دھپ سے آگرا تو اس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”ڈھنگ سے افسوس کیا یا نہیں؟“
 ”ہاں، کر لیا۔“ اس نے ہاتھ جھلا کر اشارہ کیا۔
 ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی جواہرات نے رس بھرا گلاس ہونٹوں تک لے جاتے سوچتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”شیرو! کیا مسئلہ ہے؟ تم دونوں بھائی مجھ سے کیا چھپا رہے ہو؟“

”اوہ می! بس کر دیں۔“ وہ بے زار ہوا۔ ”آپ کو بتائے بغیر کیا چلا گیا تب سے تفتیش کر رہی ہیں۔“

”کوئی تو بات ہے۔ سعدی والے معاملے سے اگر تم لوگوں کا کوئی تعلق ہے تو مجھے ابھی بتا دو۔“
 ”مجھے نہیں پتا یہ سعدی والا معاملہ بھئی! میں تو وہی

زن سے کار آگے لے گیا۔ زمر نے مڑ کر برہمی سے اسے دیکھا۔ ”بد تمیز۔“ انگلی سے چہرے پہ آئی لٹیں ہٹائیں اور انیکسی کی طرف قدم اٹھانے لگی۔ تب ہی عقب میں آواز آئی۔

”ہیلو ڈی اے۔“ وہ گھومی۔
 قدرے جھنجھلایا، قدرے جھجکتا سانوشیرواں وہاں کھڑا تھا۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسے دیکھا، اور پھر مڑ کر ایک خفا نظر عقب میں برآمدے میں کرسی پہ بیٹھی جواہرات پہ ڈالی۔

”اوہ نوشیرواں۔ آپ کو بہت عرصے بعد دیکھا ہے۔“ وہ خود کو پرسکون کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”میں وہی گیا ہوا تھا۔ کل واپس آیا ہوں۔ می نے بولا کہ۔“ ایک بے زار نظر پھر دور بیٹھی جواہرات پہ ڈالی جو ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔ ”آپ سے تعزیت کر لوں۔“

”تعزیت؟“ زمر کے دل کو دھکا سا لگا۔ ابو بھینچ گئے۔

”مطلب وہی۔ سعدی کے لیے مجھے بہت بہت افسوس ہے۔“

”تھینک یو نوشیرواں، مگر وہ زندہ ہے اور ہم اسے ڈھونڈ لیں گے۔“ قدرے خشک انداز میں بولی۔
 نوشیرواں کی گردن میں کوئی پھندا سا پھنسنے لگا۔

”ہاں شیور کیوں نہیں۔ مجھے بہت افسوس ہے ویسے۔“ جلدی سے بات سنبھالی۔ ”مگر یہ کیسے ہوا؟ کس نے کیا؟“

”پولیس ان کو ڈھونڈ رہی ہے، جلد پتا چل جائے گا۔“

”آپ کو کسی پہ شک نہیں؟“ اس نے غور سے زمر کا چہرہ دیکھتے پوچھا۔
 ہاشم سامنے ہوتا تو اس سوال پہ اسے ایک تھپڑ تو لگا ہی دیتا۔

”آپ بتائیں، آپ کو کس پہ شک ہے؟ آپ کا تو وہ فریڈ تھا۔ اس کے سوشل کانٹیکٹس کو آپ جانتے

رکی۔ ”سر میں نے ابھی میگزین میں دیکھا“ آپ کا وہ فرینڈ ”سعدی یوسف۔ وہ مسنگ ہے۔“ صفحے پلٹتے خاور نے ایک دم مڑ کر اسے دیکھا اور دوبارہ فون اٹھاتے ہاشم نے بالکل ٹھہر کر پھر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”ہاں۔۔۔ وہ تو کافی دن سے مسنگ ہے، ہم سب اس کے دوست اور خاندان والے بہت اب سیٹ ہیں اس کے لیے۔“ ہاشم بولا تو لہجے سے فکر مندی جھلکتی تھی۔

”اوہ آئی ایم سوری سر! اکیس مئی کو وہ آیا ادھر اور کسے پتا تھا کہ اسی رات۔۔۔“ وہ تاسف سے بول رہی تھی اور ہاشم کی گردن میں ڈوب کر ابھرتی گلٹی واضح دکھائی دی۔

(کسے پتا تھا!) خاور چونکے انداز میں ہاشم کو دیکھ رہا تھا۔ ہاشم ذرا کھنکھارا۔

”حلیمہ! تم نے اس ہفتے بہت دفعہ کل کی تھی اسے، کیا پولیس نے تم سے کچھ پوچھا اس بارے میں؟“

وہ ٹھنک کر رکی، آنکھیں اچھٹے سے سکڑیں۔

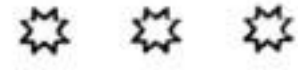
”نہیں سر!“

”دراصل پولیس اس کی گرل فرینڈ کو ڈھونڈ رہی تھی، وہ بھی مسنگ ہے اور تمہاری کالز کی وجہ سے انہوں نے مجھ سے تفتیش کی تھی، مگر میں نے انہیں تسلی کروادی کہ تمہارا اس سے ایسا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ایسا ہی ہے نا؟“ اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ اپنائیت سے کہہ رہا تھا۔ (خاور نے مسکراہٹ چھپانے کو چہرہ نیچے کر لیا۔)

”نہیں سر! میں تو اسے جانتی بھی نہیں۔“ وہ ایک دم حیران پریشان نظر آنے لگی۔

”ہاں میں نے بھی انہیں یہ ہی کہا کہ تمہاری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور کالز بھی تم نے نہیں میں نے کی تھیں آفس سے، وہ مشکوک تھے ان کو بس کسی لڑکی کا چہرہ چاہیے اس مسنگ گرل فرینڈ کے ساتھ فٹ کرنے کے لیے، مگر تم فکر مت کرو، ہاشم

میں تھا، مگر بہت خوشی ہوئی۔ زندگی سے ایک مسئلہ تو کم ہوا۔ اندر جا رہا ہوں، آپ بیٹھیں اتنی گرمی میں باہر۔“ منہ کے زاویے بگاڑتا، وہ اٹھا اور بیرونی زینے کی طرف بڑھ گیا۔ (جو اوپر اس کے کمرے کی بالکونی تک جاتا تھا) جو ہرات سوچ میں کم اسے جاتے دیکھے گئی۔



تحریر بیچ کر تو کبھی بات بیچ کر باتے ہیں رزق صورت حالات بیچ کر اگلی سہ پہر بھی زیادہ گرم تھی۔ یہ شعبان کے آخری ایام تھے اور شہر بھر میں مصروفیات بڑھ سی گئی تھی۔ ایسے میں اس بلند عمارت کے ٹاپ فلور کے آفسز میں بھی معمول کی چہل پھل جاری تھی۔ ہاشم کارڈار کے آفس کے باہر بیٹھی سیکریٹری بیچ بریک کے دوران، ایک ہاتھ میں سینڈویچ لیے، دوسرے میں میگزین پکڑے، قدرے تعجب سے بڑھتی جا رہی تھی۔ تب ہی انٹرکام بجاتا وہ میگزین پہ سینڈویچ بیگ رکھ کر فوراً متوجہ ہوئی۔

”جی سر؟ اوکے!“ ریسیور رکھ کر اٹھ گئی۔ اس کے سینڈویچ بیگ تلے میگزین کا آدھا صفحہ دکھائی دے رہا تھا۔ تہہ سرخی واضح تھی۔

”نیکس کام کے نوجوان سائنس دان اور تھرکول کے سینئر انجینئر کو لاپتہ ہوئے پندرہواں روز ہو گیا۔“ ساتھ میں آدمی ڈھکی تصویر بھی جھلک رہی تھی۔ گھنگھریالے بالوں والا لڑکا مسکراتا ہوا۔ حلیمہ نے آفس کا دروازہ دھکیلا تو منظر سا کھلتا گیا۔ چوڑی میز کے پیچھے ہاشم، بغیر کوٹ کے بیٹھا، فون پر بات کر رہا تھا اور سامنے کرسی پہ خاور بیٹھا ایک فائل کے صفحے پلٹتے تھا۔

ہاشم نے انگلی سے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا، پھر فون پہ ہنس کر کسی کو الوداعی کلمات کہے، پھر اسے دیکھتا اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ”حلیمہ، وہ لیٹرز مجھے ابھی لاؤ، میں سائن کر دیتا ہوں۔ پھر مجھے نکلنا ہوگا۔“

”اوکے سر!“ وہ چپ ہوئی۔ قدرے تذبذب سے

کاردار کی سیکریٹری کو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔
 میں سنبھال لوں گا۔" رمان سے اس کی تسلی کرائی۔

کوئی شک نہیں کرے گا۔"

"اس کے فون سے کچھ نہیں ملا؟"
 "انہوں نے صفا چٹ۔۔۔ اسے شاید ڈر تھا کہ ہم اس
 کا فون بگ نہ کر رہے ہوں، اس لیے وہ اس میں کوئی
 خطرے نہیں رکھتا تھا۔ بہر حال وہ مکمل طور پر تباہ
 گر کے ڈسپوز آف کر دیا ہے۔ کسی کو نہیں ملے گا۔
 جیسے وہ خود کسی کو نہیں ملے گا۔"

ہاشم کے چہرے پہ ایک عجیب سا احساس ابھرا۔
 اس نے خاور کی طرف دیکھا اور جب بولا تو آواز ہلکی
 تھی۔

"کیسا ہے وہ؟"
 "ری کور کر رہا ہے۔ جلد شفٹ کرنے کے قابل
 ہو جائے گا۔ اور۔۔۔" وہ رکا۔ "وہ پڑھنے کے لیے قرآن
 مانگ رہا تھا۔"

"دے دو۔" ہاشم نے ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے
 قدرے تکان سے کہا۔ خاور کو بے چینی ہوئی۔
 "ہمیں اس کو اسپتال میں ہی ختم کر دینا چاہیے
 تھا۔ اس کو زندہ چھوڑ کر آپ غلطی کر رہے ہیں۔"
 "خاور! ہم یہ موضوع ختم کر چکے ہیں۔" خاور سر
 ہلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے ہمیشہ سوچا ہے کہ جب نجومی کہہ دے
 کہ اس سال میں پیدا ہونے والے لڑکے کو مار دینا بہتر
 ہے، تو نیل میں تیرتے صندوق کو ڈبو دینے کے بجائے
 اسے پہلے پہلو اور دل میں جگہ دینے کا غلط فیصلہ انسان
 سے کون کرواتا ہے؟ مگر کچھ دن سے مجھے لگنے لگا ہے کہ
 واقعی محبت پہ انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔۔۔ خیر۔۔۔" اس
 نے گہری سانس لی۔ "مسز کاردار مجھ سے بار بار
 اشاروں کنایوں میں وہ پوچھ رہی ہیں جو آپ انہیں
 نہیں بتانا چاہ رہے۔ اس بارے میں عورت کیجئے گا۔"
 وہ چلا گیا اور ہاشم فلم انگلیوں میں گھماتا، سوچ میں
 ڈوبا بیٹھا رہا۔



کام اس سے آڑا ہے کہ جس کا جہان میں

"تھینک یو سر!" وہ ذرا پریشان ذرا ممنون سی
 واپس پلٹی۔ (اپنے ڈیسک پہ آکر اس نے کسی کراہیت
 بھری شے کی طرح وہ میگزین موڑ کر ڈسٹ بن میں
 پھینکا اور سینڈوچ لے کر واپس کمپیوٹر پہ بیٹھ گئی۔) (اف
 ساتھ ہی جھرجھری لی۔)
 اندر خاور نے ستائشی مسکراہٹ سے سامنے بیٹھے
 ہاشم کو دیکھا۔

"اب یہ قیامت تک سعدی کا ذکر نہیں کرے
 گی۔"

اس نے ہلکے سے کندھے اچکائے۔ "ہاشم سب
 سنبھال سکتا ہے۔" پھر ذرا آگے کو ہوا۔ "اس شخص کا
 کچھ پتا چلا جو موقع پہ موجود تھا؟"

"مجھے یہ ایک واقعہ سے زیادہ کچھ نہیں لگتا۔ اگر
 وہاں کوئی انجان شخص ہوتا تو گواہی کے لیے آگے آتا،
 مگر ایسا نہیں ہوا۔ بالفرض اگر وہ سعدی کا کوئی جاننے
 والا تھا تو اس سنان گلی میں کیا کر رہا تھا؟ یقیناً "سعدی
 نے ہی اسے بلایا ہو گا۔ میں نے اس کا سارا کال ریکارڈ
 چیک کیا ہے، اس نے ہمارے آفس سے جانے کے
 بعد کوئی کال نہیں کی۔ سو یہ ممکن نہیں کہ وہاں کوئی
 ہو۔" مگر ہاشم کی آنکھوں میں تشویش کم نہیں ہوئی
 تھی۔

"پولیس کو کس نے بلایا؟"

"ہمسایوں میں سے کسی نے فون کیا تھا، انہوں
 نے اس کی چیخیں سنی تھیں۔ پولیس کو معلوم نہیں تھا،
 مگر میں نے زمر صاحبہ سے پوچھا تھا، وہ کہہ رہی تھیں
 کہ وہ سعدی کے محلے کی کوئی خاتون ہیں اور زمر کی ان
 سے بات ہوئی ہے، انہوں نے بھی کچھ نہیں دیکھا۔"
 ہاشم نے گہری سانس لی، پیچھے کو ٹیک لگائی اور
 سوچی نظروں سے سامنے دیوار کو دیکھنے لگا۔

"اس کے کال ریکارڈز وہ لوگ بھی نکلوائیں
 گے۔"

"علیمہ نے اپنے نمبر سے کوئی کال نہیں کی، آپ

”سارا خالہ ابھی تک گھر میں ہی ہیں؟“ واپس آکر پتا کریں گی اس سیکریٹری کا۔ وہ خود اتنی پریشان اور شاکڈ ہیں بھائی کے لیے۔ کہہ رہی تھیں، ”فیلڈ پہ بھی سب بہت اپ سیٹ ہیں بھائی کی وجہ سے۔ اب بار بار کیا تنگ کروں ان کو؟“

زمر نے نفی میں سر ہلاتے گہری سانس خارج کی اور واپس کانڈات کی طرف متوجہ ہوئی۔ تب ہی سامنے دروازہ کھلا اور کوئی لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی میز کے قریب آکھڑا ہوا۔

زمر نے سر اٹھایا۔ احمر سامنے کھڑا تھا۔ تذبذب اور فکر مندی سے اسے دیکھا۔

”میسلم۔ السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام! بیٹھے۔“ وہ بے نیازی سے کہہ کر کچھ صفحے نکال کر ووسری فائل میں لگانے لگی۔

”آ۔۔۔ وہ۔۔۔ میں نے آپ کو ابھی کال کیا تھا“ آپ نے بتایا آپ ادھر ہیں۔“ کرسی کھینچ کر سامنے بیٹھتے اس نے یاد دلایا۔ (چڑیل کا کیا بھروسا۔)

”ہوں۔۔۔ کافی جلدی مل گیا آپ کو ایڈریس۔“

”تو پرابلم۔۔۔ میں پہلے بہت آچکا ہوں ادھر۔۔۔ سعدی کے ساتھ۔۔۔ اہ۔۔۔ مجھے بہت افسوس ہے اس کے لیے۔“ جلدی سے آگے ہو کر وہ تاسف سے کہنے لگا۔ ”میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایسا ہوگا۔ اگر میں کچھ کر سکوں اس کے لیے تو پلینز بتا لیں۔“

”آپ کے خیال میں اس کے ساتھ یہ کس نے کیا ہوگا؟“ وہ کانڈات سمیٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ۔۔۔“ وہ رکا، ہچکچاہٹ سے کٹیٹی کھجائی۔ ”کورٹ میں ایک جج ہے، سعدی نے اس جج کو۔۔۔“

”اشاپ!“ زمر نے ایک دم ہاتھ اٹھا کر اور آنکھیں نکال کر اسے روکا۔ وہ ٹھہرا اور نا ججھی سے اسے دیکھا۔ ”ہم اس بارے میں بات نہیں کر رہے اوکے!“ اسے گھور کر نظا ہر ٹھنڈے انداز میں کہا۔ وہ ذرا الجھا۔ ”مگر آپ میری بات تو سن لیں۔“

”احمر! اگر مجھ سے کورٹ میں پوچھا گیا کہ ہم نے

لیوے نہ کوئی نام، ستم گر کے بغیر! ”ٹوڈلی ایور آفٹر۔“ ریسٹورنٹ کے اندر اس سہ پہر اکاڈکا لوگ ہی موجود تھے۔ کونے کی ایک میز پر زمر کانڈات پھیلائے بیٹھی تھی۔ اس نے زرد پھول دار جوڑا پہن رکھا تھا اور بال آدھے کپچو میں باندھے، سر جھکائے، صفحے الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ گاہے گاہے نگاہ اٹھا کر کاؤنٹر کے ساتھ کھڑی ندرت کو بھی دیکھ لیتی جو رجسٹر چیک کر رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں تلے گہرے حلقے تھے اور چہرہ زرد تھا۔

”بھابھی! ہم اسے بہت جلد ڈھونڈ لیں گے۔“ ہلکا سا مسکرا کر زمر نے ان کو پکارا۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھے بنا سر ہلایا۔ زمر کی مسکراہٹ سدھم ہو گئی۔ ندرت اب زیادہ بات نہیں کیا کرتی تھیں۔ زمر روز ادھر ہی ہوتی، مگر آج خلاف معمول حنین بھی ساتھ آئی تھی۔ البتہ اس کے قریب نہیں بیٹھی۔ کچن میں کھڑی رہتی یا کبھی باہر آجاتی۔

”حنید! کیا تم مجھے سعدی کے لیپ ٹاپ پاس ورڈ کھول کر دے سکتی ہو؟“ زمر نے نرمی سے اسے پکارا۔ وہ کچن کے دروازے پہ کھڑی تھی اس کی بات پر مڑ کر اسے دیکھا۔

”مجھے نہیں آتی یہ کام۔“ گورنر رخ پھیر لیا۔

”ہم دونوں جانتے ہیں کہ یہ سچ نہیں ہے۔“

”لیپ ٹاپ سے کیا ملے گا؟ کل ریکارڈ سے بھی تو کچھ نہیں ملا۔“ وہ خفگی سے اس کی طرف پشت کیے بولی تھی۔ زمر نے گہری سانس لی۔

”کیا تم نے اپنی دوستوں سے پتا کیا؟ کس کے بھائی نے بتائی تھی سعدی کو وہ بات؟“

”ناعمد کے بھائی نے بتایا ہوگا۔ اب وہ کوئی مانے گی تھوڑی؟“

”اور میں نے تمہیں کہا تھا کہ ڈاکٹر سارہ سے پوچھو، نیکس کام میں حلیمہ نامی سیکریٹری کس کی ہے؟“

زمر کے پاس ان کاموں کی ایک لمبی فہرست تھی جو اس نے حنین کو دی تھی اور جو حنین کر کے نہیں دے رہی تھی اس بات پر تنگ کر پلٹی۔

ایسی کوئی بات کی ہے یا نہیں۔ تو میں اسٹینڈ پب جھوٹ نہیں بول سکتی اس لیے ہم ایسی کوئی بات نہیں کر سکتے۔ اوکے۔۔۔“ ابرو اٹھا کر سختی سے بتایا۔ احمر کا منہ کھل گیا۔

”آپ جانتی ہیں کہ غازی کیسے رہا ہوا تھا۔“
 ”اسے جج نے رہا کیا تھا۔ میں یہ ہی جانتی ہوں۔“
 کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھتے احتیاط سے الفاظ کا چناؤ کیا۔

”جی۔۔۔ بالکل۔۔۔ آف کورس۔۔۔“ احمر نے دم بخود اثبات میں سر ہلایا۔ ”مگر۔۔۔ جسٹس سکندر نے کبھی کوئی ذکر کیا؟“

”احمر! جسٹس صاحب میرے پاس آئے تھے اور میں نے وہی کہا جو میں نے کہنا تھا۔“ ٹھہر ٹھہر کر وہ بولی۔ احمر نے سمجھنے والے انداز میں گردن ہلانی۔ زمر کی نگاہوں کے سامنے وہ منظر پھر سے تازہ ہو گیا۔ وہ اپنے آفس میں کھڑی تھی اور جسٹس سکندر بدلتے رنگوں والا چہرہ لیے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

”یہ پکٹ مجھے آپ کے بھتیجے نے بھجوایا ہے اس کو ایک نظر دیکھیے اور بتائیے کہ میں کیا کروں اور کیا نہ کروں۔“

زمر نے سینے پہ بازو لپیٹے اور چبھتی ہوئی آنکھوں سے ان کو دیکھا۔ ”نیور آرز میں اس کو نہیں کھولوں گی“ مجھے نہیں معلوم کہ اس میں کیا ہے اس میں ثبوت اور شواہد ہو سکتے ہیں جو اس نے اپنے ماموں کے حق میں جمع کر کے بھیجے ہوں آپ کو اور اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ اس لیے آپ اس پکٹ کو لے جائیے اور بطور جج وہی کیجئے جو آپ کو بہتر لگتا ہے کیوں کہ میں یہ کیس آپ سے ڈسکس نہیں کر سکتی یہ غلط ہے۔ سو۔۔۔“ ساتھ ہی کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ ”مجھے چلنا ہو گا۔“ اور پرس وغیرہ سمیٹنے لگی۔

”آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ اس میں کیا ہے۔“
 ”نیور آرز میں نے اس کو نہیں کھولا اس میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے اجازت دیجئے۔“ اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ ہلکا سا سر جھٹکا تو یاد کا بلبلہ ہوا میں تحلیل

ہوا اور وہ واپس ریسٹورنٹ میں آئی۔
 ”کئی اور کام جس میں آپ سعدی کے شریک رہے ہوں؟“ سنجیدگی سے احمر کو دیکھ کر وہ پوچھنے لگی۔
 ”نمسز شہرین کاردار کا ایک کام تھا۔“ وہ تفصیل سے بتانے لگا۔ زمر غور سے سنتی رہی۔ آخر میں بس اتنا بولی۔ ”مجھے شہرین کی وہ ویڈیو چاہیے۔ آپ کے پاس ہوگی یقیناً؟“

احمر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”سوری! مگر میں نے ابھی آپ کو بتایا ہے کہ وہ میں ہر جگہ سے مٹا چکا ہوں میرے پاس وہ نہیں ہے۔“

”مجھے۔۔۔ وہ۔۔۔ ویڈیو چاہیے احمر!“ توڑ توڑ کر اس نے الفاظ ادا کیے۔ احمر کے چہرے پہ بے پناہ افسوس بھرا۔

”مطلب آپ مجھے اتنا کوئی گرا ہوا انسان سمجھتی ہیں کہ میں کلب کے ریکارڈ سے مٹا کر اس کو اپنے پاس رکھ لوں گا؟ مجھے آپ کی سوچ پہ افسوس ہے اور۔۔۔“
 جذباتی انداز میں وہ بولے جا رہا تھا کہ زمر نے زور سے میز پہ ہاتھ مارا۔ ”احمر شفیع!“ اور اس کو گھورا۔

”اوکے سوری۔۔۔ میرے کمپیوٹر میں پڑی ہے کل لادوں گا۔“ اس نے فوراً ہاتھ اٹھا دیے۔ پھر بے چارگی سے ادھر ادھر دیکھا، ذرا دیر کو ٹھٹکا۔

”ایکسکیوز می۔۔۔ یہ لڑکی کون ہے؟“ زمر نے اس کی نظروں کے تعاقب میں کچن کی سمت دیکھا، جہاں حنین قدرے رخ موڑے کھڑی تھی۔ زمر نے واپس ایک تیز نظر احمر پہ ڈالی۔

”یہ سعدی کی بہن ہے یعنی کہ فارس کی بھانجی اور اگر فارس یہاں ہوتا تو آپ کی آنکھیں نکال چکا ہوتا اب تک۔“ نرمی سے گویا ہوئی تو وہ جو دیکھے جا رہا تھا، ہڑبڑا کر سیدھا ہوا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ سوری۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ کرسی پہ رخ بھی موڑ لیا۔ پھر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں چلتا ہوں۔۔۔ کل ویڈیو لادوں گا۔“ عجلت میں کہتا، شرمندہ سا فوراً باہر نکل گیا۔ زمر نے دیکھا۔ باہر شیشے کے دروازے کے پار فارس آتا دکھائی دے رہا

احمر نے بھی اسے دیکھ لیا۔ اس کے پاس لمحے بھر کو رک۔

”تم ادھر؟“ فارس نے دھوپ کے باعث آنکھیں چندھیا کر اسے دیکھا۔ آج اس نے بھورا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اندر گول گلے کی سیاہ شرٹ۔ (پھر وہی ہی شرٹ! ہاتھ میں کچھ کانڈ پکڑ رکھے تھے۔

”سعدی کا افسوس کرنے آیا تھا، مگر اب سوچ رہا ہوں کہ جو اس دن فیصلہ کیا تھا، چڑیل کو چڑیل نہ کہنے کا وہ واپس لے لوں۔“ تمہایت جل کر بولا۔

”مطلب؟“ اس نے تعجب سے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔

”رفع کرف۔“ احمر نے سر جھلایا۔ پھر جلدی سے قریب ہوا۔ ”پتا ہے کیا زمر میڈم سب جانتی ہیں کہ کیسے تم باہر آئے، کیسے سعدی نے حج کو بلیک میل کیا اور وہ حج سب سے پہلے ان ہی کے پاس گیا تھا، مگر۔“ وہ تیز تیز بولے جا رہا تھا۔ فارس نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا۔

”ایک منٹ ایک منٹ!“ حیرت اور شاک سے اس نے بات کالی۔ ”اس کو چھوڑو، تم کیسے جانتے ہو یہ سب؟“

جذباتی انداز میں بولتے احمر کو بریک لگی۔ منہ کھل گیا۔ (oops) بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹا۔ ”میری امی میرا انتظار کر رہی ہوں گی، میں چلتا ہوں۔“

”تمہاری امی کے انتقال کو سات سال گزر چکے ہیں۔ سیدھی طرح مجھے پوری بات بتاؤ!“

”وہ۔ دیکھو۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ آخر لوگ میرے پاس مشورے لینے آتے ہی کیوں ہیں؟“ وہ واقعی روہانسا ہوا۔ ”میں نے تو صرف ایک مشورہ۔“

”تم۔!“ وہ انتہائی غصے سے آگے بڑھا۔ ”تم نے میرے بھانجے کو بلیک میلر بنا دیا۔“ دبی دبی آواز میں غرایا تھا۔

”تو اور کیا کرتا؟ کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ دیکھو مجھے جلدی ہے، ابھی میں جا رہا ہوں، بعد میں بات کرتے ہیں ہال۔“ تیز تیز بولتا، پیچھے ہٹتے وہ مڑا اور اپنی کار کی طرف لپکا۔ فارس بمشکل ضبط کر کے اسے جاتے دیکھتا رہا، پھر واپس مڑا تو شیشے کی دیوار کے پیار، ریسٹورنٹ کے اندر وہ بیٹھی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے دیکھنے پہ سر جھکا کر کانڈ الٹ پلٹ کرنے لگی۔

”اس کو تو بعد میں پوچھوں گا۔“ ایک خشکیوں نگاہ دور جاتے اسٹین پی ڈال کر وہ (گہری سانس لے کر) اندر آیا۔ زمر سر جھکائے کانڈ دیکھ رہی تھی، جب ان کانڈوں پہ اس نے ایک فولڈر رکھا۔ زمر نے سر اٹھایا۔ وہ سنجیدہ ساسا منے کھڑا تھا۔

”آپ کے انویسٹی گیشن نے جواب نہیں دیا؟“ زمر نے اس کا طنز نظر انداز کر کے فولڈر کھولا۔ آہستہ آہستہ کانڈات پہ نظر دوڑاتی گئی۔ ابو اٹھے، لب سکرے۔

”نیاز بیگ دو دفعہ جیل جا چکا ہے، صرف ایک بار تین سال کی سزا کالی تھی۔ مہینہ طور پہ دو قیل کر چکا ہے، اور دونوں دفعہ التزام سے بچ گیا تھا۔ چار بچے ہیں، ایک بیوی، جو میٹھلاٹ ٹاؤن میں اس کے گھر میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک۔۔۔“ وہ رکا۔ ”ایک عورت سے اس کا تعلق ہے امینہ، امتیاز نام ہے اس کا، اس کو فلیٹ لے کر دیا ہوا ہے اور ایک این جی او میں اچھی نوکری دلوا رکھی ہے۔ باقی سب اس فولڈر میں ہے۔“

زمر صفحے پلٹی گئی۔ (اور چہرے پہ متاثر کن تاثرات نہ آنے دینے کی کوشش کرتے خود کو سپاٹ رکھا) پھر نگاہیں اٹھائیں۔

”مجھے اس امینہ امتیاز کی ایک ایک تفصیل چاہیے۔ یہ کہاں رہتی ہے، کیا رو مین ہے اس کی۔ کب۔۔۔“ الفاظ لبوں میں رہ گئے۔ فارس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے چند تہہ شدہ کانڈ نکال کر اس کے سامنے رکھے۔

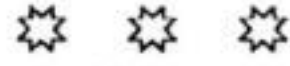
”اور کچھ؟“ وہ سنجیدہ تھا۔ سپاٹ سا۔

خاموشی سے صفحے پلٹنے لگا۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ کل تلاوت کہاں سے چھوڑی تھی۔ پھر یاد کرنے کی کوشش کیے بغیر اس نے اپنی پسندیدہ سورت کھولی۔ چیونٹیوں کی سورۃ۔ پامبروں کی سورت۔

”مجھے اپنا قرآن پتین بھی چاہیے۔“ صفحے سے نگاہ اٹھائے بغیر اطلاع دی۔ جواب بھی اسی سرد انداز میں میری طرف سے آیا تھا۔

”تمہیں کسی بھی قسم کا gadget نہیں مل سکتا“ سوری۔“

”نہیں۔۔۔“ وہ بے نیازی سے کانڈوں کی تمہیں کھولتی قدرے رخ موڑ گئی۔ وہ بھی نہیں رکا۔ ندرت کو بس سلام کیا اور باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی زمر کے چہرے کی لا تعلقی ہوا ہونے لگی اور وہ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ تیز تیز ان کانڈات کو پڑھنے لگی۔



ہم سے نہ پوچھو، بھجر کے قصے اسپتال کا وہ کمرہ ساری دنیا سے الگ تھلگ اور کٹا ہوا لگتا تھا۔ سعدی بیڈ سے ٹیک لگائے پاؤں لہے کیے بیٹھا تھا اور دو تین افراد اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ ایک جھک کر اس کی ٹانگ کے زخم کی ڈریسنگ تبدیل کر رہا تھا۔ خود وہ بس سینے پہ بازو لپیٹے خاموشی سے ان کو یہ کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ شروع میں اس نے ان میل نرسز سے ہم کلام ہونے کی بہتیری کوشش کی تھی، مگر وہ نہ سنتے تھے نہ جواب دیتے تھے، سوا ب تو اتنی ضائع کرنا بے کار تھا۔ سوائے اس ڈاکٹر کے آج وہ بال پونی میں باندھے اس کے سر پہ کھڑی گردن جھکا کر پٹی بدلنے کے عمل کو دیکھ رہی تھی۔ کام مکمل کر کے وہ لوگ اسی خاموشی سے چلے گئے جس سے آئے تھے البتہ وہ چند لمحے کے لیے کھڑی رہی۔

”کیا تمہیں اس پیر کی ہتھکڑی سے تکلیف تو نہیں ہو رہی؟“ ڈرتے ڈرتے میری کو نظر انداز کرتے اس نے پوچھا۔ میری ایک دم ناگواری سے اٹھی۔

”نہیں۔“ سعدی نے رخ پھیر لیا۔ لڑکی نے بے بسی بھری ہمدردی سے اسے دیکھا۔

”تمہارا کام ختم ہو گیا ہے مایا اب تم جاؤ۔“ میری نے اس کو گھورا۔ مایا سر جھکائے ”اوکے“ کہتی دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھولتے ہوئے مڑ کر ایک بے بس دکھی نظر اس پہ ڈالی اور پھر باہر نکل گئی۔ میری صوفے پہ بیٹھ گئی۔ سعدی اب اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ وہ ڈھیلا پڑ چکا تھا یا شاید اس قید سے نکلنے کا راستہ کوئی نہ تھا۔

اس نے سائیڈ ٹیبل سے اپنا قرآن اٹھا لیا اور

سعدی نے مزید کچھ نہیں کہا۔ اعوذ باللہ پڑھا اور صفحے پہ دھیان دیا جہاں سفید کانڈ کے اوپر سیاہ الفاظ جگمگا رہے تھے۔ اس کی آنکھیں ان الفاظ پہ جم گئیں۔ کمرے میں چھایا ڈپریشن، تناؤ اور افسردگی ہر شے اس جگمگاہٹ کے پس منظر میں جانے لگی۔ آیت اس سے کہہ رہی تھی۔

”مگر جس کسی نے بھی ظلم کیا، پھر برائی کے بعد اسے نیکی سے بدل دیا ہو تو بے شک میں (اللہ) غفور اور رحیم ہوں۔“

چند لمحے کے لیے اس کا رابطہ کمرے کے دوسرے حصوں سے کٹ گیا۔ بیڈ کے گرد سیاہ جگمگاہٹ کا ایک ہالہ سا کھنچ گیا جس میں وہ سر جھکائے بیٹھا ہاتھ میں پکڑی کتاب پڑھ رہا تھا۔

”اللہ تعالیٰ!“ وہ مدھم آواز میں برید لیا تو سیاہ ہیروں سی جگمگاہٹ دل کے اندر اترتی ہر آگ کو ٹھنڈا کرنے لگی۔ ”مجھے یہ آیت یاد ہے۔ جہاں بچپن میں، میں قرآن پڑھنے جاتا تھا، وہاں میری نیچر نے یہ آیات بہت اچھے سے پڑھائی تھیں۔ وہ کہتی تھیں، عربی بہت گاڑھی زبان ہے، اس میں ہر لفظ کا بہت وسیع مطلب ہوتا ہے۔ قرآن تب سمجھ آئے گا جب اس کے ہر لفظ کے مطلب کو سمجھو گے۔ جسے اللہ دیکھیں نا، آپ نے کہا، جو کوئی ظلم کرے، تو ظلم کا مطلب کیا ہے؟ اس سارے ذہنی تناؤ میں بھی مجھے یاد ہے۔ ظلم کا مطلب ہے، کسی کے حق میں کمی کرنا۔ تو آپ مجھے یہ سمجھا رہے ہیں اللہ کہ ہم زندگی میں جب بھی کسی کے حق

میں کمی کریں تو احساس ہونے سے صرف سوری کر دینے کی بجائے برائی کو اس دکھ اور تکلیف کو ہمیں اچھائی اور محبت سے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان سارے دنوں میں مجھے لگنے لگا تھا کہ میں اس قید میں اس لیے پڑا ہوں کیوں کہ میں نے زمر کا دل دکھایا تھا وہ بیمار تھیں، انہوں نے کیا نہیں کیا میرے لیے، کیا تھا اگر میں فارس ماموں کی مسلسل حمایت کرنے کے بجائے دکھاوے کو ہی سہی ان کی بات پہ یقین کر لینے کی اداکاری کر لیتا، مگر میں نے ان کا حق ادا نہیں کیا۔ اگر چار سال انہوں نے تعلق نہیں رکھا تو میں بھی ان کی موجودگی میں ان کے گھر نہیں جاتا تھا، میں نے بھی کال کرنی چھوڑ دی۔ آخر میں پہل تو پھر بھی انہوں نے کی۔ وہ سونیا کی سالگرہ کا کارڈ لے کر آئیں۔ میں تو نہیں گیا، مگر اب آپ مجھے بتا رہے ہیں کہ اگر میں نے اس ظلم کو اچھائی سے بدلنے کی کوشش کی ہے تو پھر آپ غفور بھی ہیں اور رحیم بھی۔ اتنا تو مجھے پتا ہے کہ پیچھے گھر میں مجھے کوئی بھی برا نہیں سمجھتا ہوگا۔ میری مدد اے کی کوششوں نے میری سب کمی کو تباہی ڈھانپ لی ہوگی۔

وہ سر جھکائے بڑبڑاتے ہوئے چونکا۔
 ”اوہ!“ جیسے کچھ سمجھ آیا۔ ”اسی لیے آپ نے کہا کہ آپ غفور اور رحیم ہیں۔ غفور کہتے ہیں ڈھانپنے والے کو جو گناہوں کو ڈھانپ کر ان کو مٹا دے، معاف کر دے اور رحیم۔“ اس نے آنکھیں میچ کر یاد کرنا چاہا۔ کندھا پھر سے درد کرنے لگا تھا۔ ”بار بار رحم کرنے والا لوگوں کی غلطیاں گناہ سب بار بار معاف کر کے پھر سے ان کو موقع دینے والا۔“

سیاہ حروف کی جگمگاہٹ اس کے گرد کسی اونچے دائرے کی طرح رقصاں تھی۔ باقی سب کچھ چھپ گیا تھا۔ بدقت اس نے اگلے الفاظ پڑھنے چاہے۔
 ”اور اپنا ہاتھ ڈال لیجئے اپنے گریبان میں (اے موسیٰ) وہ نکلے گا سفید چمک دار، بغیر کسی عیب کے (یعنی کسی بیماری کی وجہ سے نہیں، معجزاتی طور پر) یہ نو نشانیاں ہیں، ان کو لے جائیے فرعون اور اس کی

قوم کی طرف۔ بے شک وہ لوگ ہیں جو حد سے بڑھ جانے والے ہیں۔“
 ”آہ اللہ!“ سر جھکائے بیٹھے لڑکے نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔ ”میں نے بھی یہ ہی کرنا چاہا تھا، مگر مجھے بھول گیا تھا کہ موسیٰ تنہا نہیں گئے تھے۔ وہ اپنے بھائی کو ساتھ لے کر گئے تھے۔ میں نے زندگی کی دوسری بڑی غلطی کی زمر اور حنین سے جھوٹ بول کر کہ میں نیس کام جا رہا ہوں۔ اب ان کو کون بتائے گا کہ میں کہاں ہوں اور پہلی غلطی۔“ اس کی بند آنکھوں کے آگے ایک منظر لہرایا۔ ”گولی لگنے سے چند منٹ پہلے۔ میں نے وہ پین کیمرہ ایک غلط شخص کے ہاتھ میں دے دیا۔۔۔ اوہ اللہ!“

پھر اس نے ذہن ساری یادوں کو جھٹک کر آنکھیں کھولیں اور اگلی آیت پہ انگلی رکھی۔
 ”پھر جب ان کے پاس آنکھیں کھول دینے والی ہماری نشانیاں آگئیں تو وہ کہنے لگے، یہ تو کھلم کھلا جادو ہے۔“ ایک ایک لفظ اس نے ٹھہر کر اندر اتارا۔ دل و دماغ میں عجیب قنوطیت اور اذیت بھرتی گئی۔

”اللہ! آپ کو تو پتا تھا کہ وہ اس کو نہیں مانیں گے، ہدایت کی کوئی بات ان کے دل کو موم نہیں کر سکے گی۔ پھر آدمی کیوں جا کر کسی منکر، ظالم کو لکارے؟ وہ اپنا عمل کریں اور ہم چپ چاپ اپنی نماز، روزہ کرتے رہیں۔ میں بھی کوئی ان کا دل موم کرنے نہیں گیا تھا، مگر یوں ہی ایک انہونی سی آرزو تھی کہ شاید وہ مدد اے کے لیے کچھ کریں۔ کچھ کرنا چاہیں، مگر فائدہ کیا ہوا؟“
 سیاہ جگمگاہٹ کو مایوسی کا اندھیرا لگنے لگا اور جیسے جیسے آس پاس سیاہ دھوس کے مرغولے اٹھنے لگے۔ اس کا دل پھر سے زخم زخم ہونے لگا۔

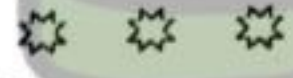
”اور انہوں نے ان کا انکار کیا، ظلم اور تکبر کے ساتھ، حالانکہ ان کے دل یقین کر چکے تھے۔“
 وہ بڑھتے بڑھتے چونکا۔ سیاہ دھواں پھیلنا ٹھہر گیا۔ ساری فضا ساکن ہو گئی۔
 ”حالانکہ ان کے دل یقین کر چکے تھے۔“
 ”پھر دیکھو!“

کیا انجام ہو فساد پر پا کرنے والوں کا! دھواں چھٹ گیا۔ سیاہ حروف کی جگہ گاہٹ پھرے ارد گرد پھیل گئی۔ اداس بیٹھے سر جھکائے لڑکے کے چہرے پہ تکان بھری مسکراہٹ آٹھری۔ اس نے گھری سانس خارج کی۔ ہونٹوں سے اسی کتاب کی ایک اور آیت ادا ہوئی۔

”اور جو اللہ پہ بھروسا کرتے ہیں اللہ ان کے لیے ضرور راستہ نکالتا ہے۔“

مقدس کتاب بند کی ادب سے چوما اور سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دی۔ پھر اداسی سے مسکراتے واپس ٹیک لگالی۔ میری ہنوز بیٹھی کتاب بڑھ رہی تھی۔ سعدی خاموشی سے مسکراتا چھت کو تکتا رہا۔

”اور تم ہاشم کاردار دیکھنا ہمیں کہ ہم کیسے بحر احمر کو دو حصوں میں کاٹتے ہیں اور پھر تمہیں اسی میں ڈبو تے ہیں تم دیکھنا۔“



غم کی حدت سے کوہسار پھلتے دیکھے انسان تو پھر انسان ہوا کرتے ہیں قصر کاردار سے بے انیکسی میں ان دنوں سمجھوتے کی سی فضا چھائی تھی۔ رمضان شروع ہو چکا تھا اور پہلے چند روزے کب گزرے پتا ہی نہیں چلا۔ عجیب سی رو میں بنی ہوئی تھی۔ افطاری کے بعد سحری تک کوئی نہ سوتا۔ پھر سحری کر کے سیم اور حنین دوپہر تک سوتے۔ ندرت کا وہی طریقہ تھا۔ رمضان کے باوجود جلدی ریٹورنٹ چلی جاتیں۔ زمر بھی گھر پہ نکلتی اور فارس جا بپہ ہوتا۔ بڑے ابا خالی بڑے لاؤنج میں سارا دن صداقت کے ساتھ بے مقصد بیٹھے رہتے۔

صداقت بولتا رہتا یا سیم اٹھ جاتا تو وہی بولتا یا وہ دونوں ٹی وی دیکھتے رہتے اور دونوں کو لگتا کہ وہ موسیقی سے بھرپور دکان رمضان ٹرانسمیشن میں لوگوں کی طرف بھکاریوں کی طرح تحفے اچھالتے دیکھ کر ثواب کما رہے ہیں۔ ابا سیم سے اتنا بھی نہ کہتے کہ رمضان عبادت کا مہینہ ہے ٹی وی کے سامنے بیٹھنے سے اسے

ضائع نہ کرو کہ انہیں ڈرتھا، اگر وہ بھی لاؤنج میں آکر نہ بیٹھے گا تو یہ تنہائی شاید مار ہی دے۔ حنین پہلے بھی ست تھی اب تو ہر کام سے گئی۔ کمرے میں بند رہتی یا باہر لان میں بیٹھی گردن اٹھائے قصر کو دیکھتی رہتی۔

ایسی ہی ایک رات زمر اور فارس کے کمرے میں مدھم زرد بتی جل رہی تھی۔ بجلی گئی تھی۔ یوپی ایس پہ پنکھا چل رہا تھا، مگر اے سی کی ٹھنڈ باقی تھی۔ فارس صوفے پہ پاؤں لمبے کیے لیٹا، سینے پہ لیپ ٹاپ رکھے کچھ کام کر رہا تھا۔ (وہ ایک کارپوریٹ فرم میں بطور چیف سیکورٹی آفیسر تعینات تھا۔) سامنے جائے نماز پہ زمر التحیات میں بیٹھی تھی۔ سر پہ دوپٹا اچھے سے لپیٹے اس کا چہرہ جھکا تھا۔ فارس کی طرف اس کی پشت تھی۔ وہ کن اکیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ تراویح ختم کر کے اب وتر کا سلام پھیر رہی تھی۔ پھر جائے نماز سمیٹتی اٹھ گئی۔

”آپ کی نماز کافی خوب صورت ہے۔ سلو اور آرام سے۔۔۔ میں بھی پڑھتا تھا جیل میں۔۔۔ مطلب اتنی اچھی نہیں۔ آس پاس کی ساری آوازیں سنائی دیتیں اور سارے دن کے کام یاد آتے۔“ اسکرین کو دیکھتا وہ بولا تو وہ جو پشت کیے کھڑی جائے نماز کر رہی تھی رک گئی، مگر مڑی نہیں۔ ”اور آپ کی طرح پانچ وقت کی نہیں پڑھتا تھا۔ کچھ دن بڑھی پھر چھوڑ دی۔۔۔ اور۔۔۔ ایک بات دعا نہیں مانگا کرتا تھا، مگر سچ تو یہ ہے دعا کے بغیر نماز ادھوری ہے۔“

وہ ہلکا سا مڑی، چبھتی نظر اس پہ ڈالی۔ ”میں دعا مانگوں یا نہیں، یہ میرا اور میرے اللہ کا معاملہ ہے۔“

”میں نے تو کچھ نہیں کہا۔“ وہ شانے اچکا کر اسکرین کی طرف متوجہ ٹاپ کرتا رہا۔

زمر جائے نماز رکھ کر اسٹڈی ٹیبل پہ آ بیٹھی۔ (اس کی طرف اب بھی پشت تھی) انگلی سے چہرے کے گرداڑ سا دوپٹا کھولا۔ فائل سامنے کی۔ قلم اٹھایا۔ الفاظ پہ نگاہ بڑی تو ہر چیز مدھم ہونے لگی۔ اپنی زندگی کسی قلم کی طرح نظروں کے سامنے گھوم گئی۔

”اللہ تعالیٰ۔“ اس نے بنا آواز لب ہلائے۔

”تم نے کہا تم میرا ساتھ دینا چاہتے ہو۔ میں کیسے یقین کروں کہ تم میرے ساتھ پھر سے کوئی دھوکا نہیں کرو گے۔“

”زمر!“ اس نے گہری سانس لی اور اسی سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ ”میں وہ نہیں ہوں جس کو اس نے اپنا گروہ دیا تھا، نہ میں وہ ہوں جو اس کی یونیورسٹی کی فیس دیتا تھا، مجھے پتا ہے اس بارے میں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اس سے آپ سے کم محبت تھی۔“

www.paksociety.com

وہ چونکی تھی، آنکھوں میں شاک ابھرا۔ ”مجھے پتا ہے اور یہ نہیں بتاؤں گا کہ کیسے پتا ہے، مگر یہ یاد رکھیے کہ وہ میرے چھوٹے بھائیوں کی طرح تھا۔ اس نے میرے لیے بہت کچھ کیا اور میں اسے کبھی نہیں بتا سکا کہ اس سے کتنی محبت تھی مجھے۔ آپ کو میں اپنے ساتھ مخلص نہیں لگتا، خیر ہے، مگر اس کے ساتھ کتنا مخلص ہوں یہ آپ کو پتا ہے۔“

زمر نے ہلکا سا اثبات میں سر ہلایا۔ لب کھولے پھر بند کر دیے۔ (وہ نہیں بتائے گا تو وہ کیوں منت کرے؟ ضرور ابانے بتایا ہو گا)

”پھر کیا چاہتی ہیں آپ؟ میں کیا کروں؟“ اب کے ذرا نرمی سے پوچھا۔

زمر نے گہری سانس لی۔ (یا اللہ مجھے اتنا صبر دینا کہ میں اپنا ضبط کھوئے بغیر اس شخص کے ساتھ کام کر سکوں جس سے مجھے شدید نفرت ہے)

”کیا تم نے شہزاد ملک کے بارے میں سنا ہے؟“ اس نے فارس کو مخاطب کیا تو آواز متوازن تھی اور بے تاثر۔



اور جب وہ دونوں آئندہ کالائٹ عمل طے کر رہے تھے تو ساتھ والے کمرے میں ندرت بیڈ پر تھکی ہاری سو رہی تھیں اور حنین لیٹی ہوئی ان کے فون پر سعدی کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر کٹے بال اب آنکھوں تک آتے تھے۔ باقی تکیے پہ کھلے پڑے

آنکھوں میں اضطراب در آیا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ میں پہلے جیسی دعا نہیں کرتی۔ آپ سے بات بھی نہیں کرتی۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی کہ آپ سے ناراض ہوں، نعوذ باللہ! بس میرا دل سخت ہو گیا ہے۔ مجھے لگتا تھا میرے پاس اب کھونے کو کچھ نہیں بچا، مگر میں غلط تھی۔ جب تک انسان کی سانس ہے، اس کے پاس کھونے کو کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ میرے پاس کبھی تھا۔ سعدی۔ اور اب وہ نہیں ہے۔ ابا اور بابی سب ہیں، میں ان کو کھونا نہیں چاہتی۔ آپ اس کا خیال رکھیے گا۔ آپ اس کو اکیلا نہ بیچیں گے۔“ اس نے آنکھیں بند کیں تو دو آنسو ٹوٹ کر چہرے پہ گرے۔ پھر بھگی پلکیں کھولیں۔

”فارس!“ اس کی آواز بھی رندھی ہوئی تھی۔ اس نے چونک کر سر گھمایا۔ پھر لیپ ٹاپ ہٹا کر اٹھا اور قدرے تشویش سے اس کی پشت کو دیکھا۔

”کیا ہوا؟“

”آج نیاز بیگ کی ضمانت ہو گئی۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ ہلکا سا بولا، نگاہیں اس کے سر کی پشت پر تھیں، جس سے دوپٹا پھسل گیا تھا اور بھورے گھنگھریالے بال جھلک رہے تھے۔

”اس نے جج کے سامنے کہا کہ اس نے یہ قتل سیلف ڈیفنس میں کیا تھا۔ اس نے کہا کہ سعدی اس کو مارنے لگا تھا۔ اس نے۔“ ایک اور آنسو آنکھ کے کنارے سے ہٹا۔ ”اس نے ہمارے فجر پر اٹھ کر مسجد کی امامت کروانے والے سعدی کے بارے میں کہا وہ اس سے ڈر گز خریدتا تھا اور یہ جھگڑا ڈر گز پر ہوا تھا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ اس کے چہرے پہ ایک زخمی تاثر آٹھرا۔ ”قتل سے نکلنے کا سب سے اچھا طریقہ مقتول کی اتنی کردار کشی کرنا ہے کہ جج کو لگے، اسے مار کر قاتل نے دنیا پہ احسان کیا ہے۔ آپ نے ہی بتایا تھا کہ مندل لاء کی کلاس میں۔“

زمر نے آنکھ انگلی کی نوک سے پونچھی اور پلٹی تو اس کی آنکھیں اور ناک گلابی ہو رہی تھی۔ (اور ناک کی لونگ۔ اس نے نگاہ چرائی)



کروٹ کے بل لیٹے دائیں ہاتھ کی انگلی سے ٹائپ کرنے لگی۔

”ہاشم بھائی؟“

”کون؟“ چند لمحے بعد جواب چمکا۔ ہلکی سی تھر تھر ہٹ ہوئی۔ حنا نے فوراً امی کو دیکھا۔ وہ سو رہی تھیں اور موبائل سائلنٹ کر دیا۔

”حنا۔ یہ امی کا فون ہے۔“

”حنین! ہماری پڑوسن حنین!“ وہ اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھا، لیپ ٹاپ اور فائلز کھولے ہوئے کام کر رہا تھا۔ جب موبائل بجا، سو وہ اس طرف متوجہ ہوا۔ پیغام بھیج کر موبائل رکھا اور پھر سے ٹائپ کرنے لگا۔

”شکر ہے آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ کون حنین؟“

”کیسی ہو تم؟ تم لوگ آتے ہی نہیں ہو اس طرف۔“

”رمضان کی وجہ سے روٹین بدل گئی ہے۔ افطاری سے پہلے شدید پیاس سے نڈھال، افطاری کے بعد بہت کھا کر نڈھال۔“ اتنے عرصے بعد ٹائپ کرنے کے باعث حنین کی رفتار سست تھی۔

”یہ تو ہے اور سعدی کا کچھ پتا چلا؟“

تنہائی میں ڈوبا کمرہ اداس ہو گیا۔ موبائل کی روشنی سے چمکتا حنا کا چہرہ بچھ گیا۔

”نہیں۔“ ذرا ٹھہر کر میسج کیا۔ ”اوکے۔ آپ سو جائیں۔ میں نے یوں ہی آپ کو آن لائن دیکھ کر ٹیکسٹ کر دیا تھا۔“ وہ برے دل کے ساتھ فون رکھنے لگی۔

”نہیں۔ میں جاگا ہوا ہوں۔ کل کورٹ جانا ہے۔ اسی کی تیاری کر رہا تھا۔ میں بات کر سکتا ہوں۔ نوپراہلم، تم بتاؤ، کیا کرتی رہتی ہو سارا دن؟“ وہ پیغام بھیج کر فون رکھ دیتا اور پھر سے کام کرنے لگ جاتا۔ مکمل توجہ اور دھیان سے اسکرین پہ نظریں جمائے۔

”نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ بس بھائی یاد آتا ہے۔“

اور۔۔۔ وہ لکھتی گئی۔ باہر رات پکھلتی گئی۔ قطرہ قطرہ۔ تاریکی بڑھتی گئی اور وہ ٹیکسٹ پہ ٹیکسٹ کرتی گئی۔

تھے وہ پہلے سے بڑھ رہے اور کمزور لگتی تھی۔ اسکرین پہ انگلیاں پھیرتے یک دم غلطی سے وائی فائی کو چھو لیا۔ شاید سیم نے اس فون سے زمر کے کمرے میں رکھا وائی فائی پہلے استعمال کیا تھا کہ پاس ورڈ پوچھے بنا وہ آن ہو گیا۔ امی نے یہ اسمارٹ فون چھ ماہ پہلے لیا تھا وائبر کے لیے۔ حنا تو اسے ہاتھ بھی نہ لگاتی، مگر اب لگا رہی تھی۔ وائبر۔ امریکا سے کسی کزن کا میسج آیا ہوا تھا۔ اس نے کھولا اور پھر وائی فائی بند کرنے لگی، یکا یک ٹھہر گئی۔

”امی نے واٹس ایپ نہیں ڈاؤن لوڈ کیا۔“ اندھیرے کمرے میں ایک نظر کروٹ لیے سوئی ندرت پہ ڈال کر سوچا۔ ”ڈاؤن لوڈ کرنے میں کیا حرج ہے؟ بھائی کی ڈی پی دیکھ لوں گی۔“ اس نے پلے اسٹور آن کیا۔ واٹس ایپ ڈاؤن لوڈ کیا اور پھر فہرست دیکھی۔ اس کے اسٹینس میں لکھا تھا۔ Everafter Ants وہ اداسی سے مسکرائی۔ بھائی کا کی چین بھی بھائی کے ساتھ کھو گیا تھا۔ اس نے سعدی کا چوکھٹا کھولا۔

Last Seen 22 May

حنا چونکی۔ بھائی کا حادثہ اکیس مئی کو ہوا۔ مگر اگلے دن بھی کسی کے پاس اس کا فون تھا؟ وہ سوچنے لگی۔ پھر ایک خیال نے ذہن کی رو بھٹکائی۔ اس نے سیاہ سنہرے جگمگاتے ہند سے یاد کیے اور موبائل میں لکھے اور ہاشم کاردار کے نام سے محفوظ کیے، پھر کانٹیکٹس کی فہرست دیکھی۔ (پتا نہیں ہاشم بھائی واٹس ایپ پہ ہیں یا نہیں؟)

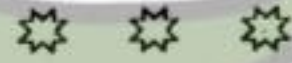
دفعتا، فہرست اوپر کرتا انگوٹھار کا آنکھوں میں کچھ چمکا۔ ہاشم کاردار، ساتھ میں اپنی اور سونی کی سیلفی۔ وہ ہلکا مسکرائی۔ کھڑکی کو دیکھا جس کے پار اوپر قصر تھا۔ اس نے انگوٹھے سے ہاشم کا نام دیا۔ پیغام بھیجنے کا صفحہ کھلا۔ اوپر ”آن لائن“ جگمگا رہا تھا۔

”مجھے موبائل رکھ دینا چاہیے، یہ چیزیں میرے لیے نہیں ہیں، ان کے نتائج برے نکلتے ہیں“ اس نے خود کو کہا، مگر سنا ہی نہیں اور بائیں ہاتھ میں موبائل پکڑے

وقت اور جگہ کا سارا احساس ختم ہو گیا۔ ہر اگلے پیغام کے انتظار کی بے قراری اور ہر پیغام پڑھتے وقت لبوں پہ مسکراہٹ۔ کیونکہ ابھی دنیا میں وہ خمر کشیدہ ہی نہیں گئی تھی جس کا نشہ آدھی رات کو کسی نامحرم سے موبائل پہ بات کرنے سے زیادہ ہو۔

سحری کے قریب اس نے لکھا۔ ”اب سو جاؤ نیچے“ مجھے صبح کورٹ جانا ہے۔“

”او کے گڈ نائٹ!“ مسکرا کر اس نے لکھا، پھر ساری گفتگو کو مٹانے کا بٹن دبایا۔ پھر لکا سا چونکی۔ (مٹانے کی کیا ضرورت؟ ہاشم بھائی ہی ہیں۔ ان سے بات کرنے میں غلط کیا ہے؟) مگر جب وائس ایپ نے پوچھا کہ واقعی سب مٹانا ہے تو اس نے لیس کا بٹن دبا دیا۔ پھر فون رکھا اور آنکھیں بند کیں تو سعدی ایک دفعہ پھر سے یاد آ گیا۔ کرب بڑھ گیا اور اس میں اب ایک اور کرب بھی شامل ہو گیا۔



اس کے نزدیک غم ترکِ وفا کچھ بھی نہیں مطمئن ایسا ہے وہ جیسے ہوا کچھ بھی نہیں شام پارش کے باعث پہلے سے ٹھنڈی اور خوش گواری آتر رہی تھی۔ ہاشم نے قصر کا داخلی دروازہ کھولا تو اندر کا منظر نمایاں ہوا۔ اونچے اور وسیع لاؤنج میں بڑے صوفے تھے۔ جواہرات تمکنت سے بیٹھی تھی۔ کہنی صوفے کے سہنے تھے۔ جمائے وہ چائے کی نازک پیالی سے گھونٹ بھرتی، مسکراتی نظروں سے سامنے بیٹھی شہرین کو دیکھ رہی تھی جو اس سے قطعاً بے نیاز، سونیا کے بالوں میں برش پھیر رہی تھی۔ ساتھ میں چیونٹم بھی چبا رہی تھی۔

آفس سے تھکے ہارے ہاشم نے ایک مشترکہ سلام کیا اور زینے کی طرف بڑھ گیا۔

”سونیا! اپنے بابا کو بتادو کہ آج سونیا ماما کے ساتھ جارہی ہے اور دو دن بعد آئے گی اور یہ بھی بتاؤ کہ سونیا کتنی خوش ہے ان سارے پلانز پر جو ماما نے سونیا کے لیے بنائے ہیں۔“ آخری پن لگا کر اس نے سونیا کے

نرم بالوں میں برش پھیرتے اونچا سا کہا تو سونیا خوش خوش سی اٹھی اور بھاگتی ہوئی ہاشم کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

”بابا۔ سونیا ماما کے ساتھ جارہی ہے۔ اور پتا ہے ماما نے۔“ آگے اس نے جوش میں وہ چند فقرے دہرائے جو شہرین کی ڈھائی گھنٹے کی محنت کا نتیجہ تھے۔

ہاشم نے مسکرا کر اس کا گال تھپتھپایا اور پھر ایک تیز سنجیدہ نظر اس پہ ڈالی، جواب ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھی، جتنی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ہاشم سونیا کو انکار نہیں کر سکتا، اسے معلوم تھا۔

”شیور۔ انجوائے کرو۔“ جھک کر اس کا گال چوما اور سیدھے ہوتے ہوئے مسکرا کر بولا اور پھر ایک قہر آلود نظر شہری پہ ڈال کر اوپر کی جانب قدم اٹھا دیے۔ شہری نے فاتحانہ مسکراہٹ جواہرات کی طرف اچھالی جو عادتاً ”مسکراتے ہوئے چائے پی رہی تھی۔“

”پتا نہیں کیوں لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ شہری کو ہراسکتے ہیں۔“ انگلی سے سنہری بال نزاکت سے پیچھے کرتے وہ بولی۔ ساتھ ہی دور کھڑی فینونا کو اشارہ کیا۔ وہ آئی اور سونیا کو تیار کرنے ساتھ لے گئی۔ ”صرف وہی ایسا سمجھتے ہیں جو شہری کو کئی دفعہ ہرا چکے ہوں۔“ جواہرات نے شانے اچکائے۔

تب ہی دروازہ پھر سے کھلا اور موبائل کے بٹن دباتا آنکھ اٹھا ہوا نو شیرواں اندر داخل ہوا۔ وہ ویسٹ اور ٹالی میں ملبوس تھا، اور پیچھے ملازم اس کا بریف کیس اٹھائے ہوئے تھا۔ یقیناً ”وہ ہاشم کے ساتھ آفس سے آرہا تھا۔“

ماں کو سلام کرتے ذرا کی نگاہ اٹھائی تو ٹھہرا۔ شہری سامنے بیٹھی تھی، ابو بھیج کر جواہرات کو دیکھتی، کسی تاہر توڑ حملے کے لیے تیار۔

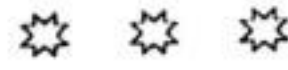
”اوہ ہائے!“ نو شیرواں ہلکا سا مسکرایا۔ جواہرات نے پوری گردن گھما کر اس کی مسکراہٹ دیکھی۔

”ہیلو!“ شہری کا فقرہ منہ میں ہی رہ گیا۔ بد مزہ سی اٹھی اور سونیا کے کمرے کی طرف جانے لگی۔

”آپ کہاں جارہی ہیں؟“ جواہرات نے ہوا۔ وہ مڑی،

تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”اپنی بیٹی کے لیے آئی تھی، اس کو لینے جا رہی ہوں، ورنہ مجھے قطعاً کوئی خواہش نہیں اس گھر میں بار بار آنے کی۔“ تنے ابرو کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ وہ ہونقوں کی طرح اسے جاتے دیکھتا رہ گیا۔ ہاتھ میں موبائل جوں کاتوں اٹھا رکھا تھا۔ جواہرات کی مسکراہٹ، شدید ناپسندیدگی میں بدلتی گئی۔ اور شیرو کو گھورتے اس نے تاسف سے سر جھٹکا۔

”وہ صحیح کہہ رہی ہے، اس گھر میں ذرا دیر بیٹھی ہے، ورنہ آتے ساتھ ہی سوئی کو لے کر زمر کپاس چلی گئی، سعدی کا افسوس کرنے! جاؤ تم فریش ہولو۔“
نوسیرواں کا دل جیسے اچاٹ ہو گیا۔ وہ برہمی سے زینے چڑھنے لگا۔



دنیا تو ایک برف کی سل سے سوانہ تھی پچھی ذرا جو آج تو دنیا تمام شد! اس شام، جب دفاتر میں لوگ اپنے کام جلد از جلد نبھاتے، گھر جانے کی تیاری میں تھے کہ پانچ بجنے میں ذرا سی دیر ہی باقی تھی، ایسے میں اس عمارت کے اندر ایک چھوٹے آفس کے سامنے لاؤنج نما کمرے میں فارس کھڑا تھا۔ اس نے نیلی کف والی شرٹ اور سر پہ پی کیپ پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پہ گلاسز تھے، اور کیپ گوچرے پہ خاصا جھکار کھا تھا۔ ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کا گلدستہ لیے۔ (جو اوپر سے شفاف پلاسٹ میں پیک تھے) وہ پیون کو رسید نکال کر دے رہا تھا۔

”امینہ صاحبہ کے لیے ہیں، ان سے دستخط لائیے۔“ آفس کے بند دروازے کی طرف اشارہ کیا تو پیون سر ہلا کر گلدستہ احتیاط سے پکڑے اندر چلا گیا۔ دروازہ ذرا سا کھلا رہ گیا۔ فارس نے کن اکیوں سے جھری سے دیکھا۔ اندر آفس میں میز کے پیچھے ایک نارنجی ڈالنی بالوں والی لڑکی نما عورت بیٹھی تھی اور پیون اس کی میز پہ گلدستہ رکھ رہا تھا۔

”کس نے بھیجے ہیں؟“
”نام نہیں بتایا۔ بس اتنا بولا کہ نیاز بیگ کے کسی پولیس والے دوست نے بھیجے ہیں اپنی ترقی کی خوشی میں جو آپ کی وجہ سے ہو رہی ہے۔“ وہ رخ موڑے کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ پیون نکل آیا۔ رسید اسے لا کر دی، جسے اس نے رجسٹر میں لگایا تب ہی رجسٹر ہاتھ سے پھسلا اور سارے کاغذ بکھر گئے۔ رسیدیں پرچیاں۔ فوٹو اسٹیٹ کاغذ۔

”معاف کرنا!“ وہ بچوں کے بل زمین پہ بیٹھا کاغذ سمٹنے لگا۔ آہستہ آہستہ۔ کیپ والا سر جھکائے۔ بار بار کلائی کی گھڑی دیکھتا۔ پیون کبھی اندر آ رہا تھا، کبھی باہر جا رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے پرچیاں اٹھاتا اور رجسٹر میں لگاتا رہا۔ پھر گھڑی دیکھی۔ اور کن اکیوں سے پیون کو دیکھا۔ وہ اب ٹرے لے کر راہداری کی طرف جا رہا تھا۔ ادھر وہ نکلا، ادھر فارس تیزی سے اٹھا اور آفس کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔

میز پہ سر نکائے، ڈالنی بالوں والی عورت آنکھیں بند کیے بڑی تھی۔ ساتھ ہی گلدستہ کھلا ہوا پڑا تھا اور اس سے عجیب مہک اٹھ رہی تھی۔ ناک بند کر کے وہ تیزی سے قریب آیا، گلوڑ والے ہاتھوں سے اسے واپس ریپ کیا۔ پھر لینڈ لائن کا تار کاٹا۔ انٹر کام کا تار کاٹا۔ کمپیوٹر کی تار کو منقطع کیا۔ امینہ کا پرس کھنگالا۔ اندر سے چابیاں نکالیں۔ پھر میز پہ رکھا موبائل جیب میں ڈالا اور دروازے تک آیا۔ جھری سے باہر دیکھا، پیون ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ اس نے جلدی سے بتی، پنکھا سب بند کیے۔ باہر نکلا۔ دروازہ لاک کیا۔ باہر نکلا، ”اوپن“ کارڈ پلٹ کر ”کلوزڈ“ سامنے لایا۔ اور پھر جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سر جھکائے، وہ آگے چلتا گیا۔

پھر شام گہری ہو گئی، افطار کے قریب لوگ سمٹ کر گھروں کے اندر چلے گئے تو شہر قدرے سنسان لگنے لگا۔ مغرب باسی ہوئی اور رات اترنے لگی۔

ایسے میں ایک بڑے اور مہنگے پرائیویٹ اسپتال کے باہر کھلے پارکنگ ایریا کے ایک کونے میں ایک کار کھڑی دکھائی دیتی تھی اور ڈرائیونگ سیٹ پر فارس پی

برہمایا۔ جسے اس نے رومال میں لپیٹ کر پکڑا۔ کال وہ ملا چکا تھا کیونکہ اس کے ہاتھوں پہ گلوں چڑھے تھے۔ پلاسٹک کے شفاف پیلے گلوں۔ زمر نے کان سے موبائل لگایا۔ ایک رومال منہ کے قریب فون پہ رکھا۔ گھنٹی کے بعد مردانہ آواز ابھری۔

”ہاں امینہ!“

”میں اسپتال سے بات کر رہی ہوں، یہاں ایک بی بی کو لایا گیا ہے، نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی ہے اس نے۔ امینہ نام ہے اس کا۔“ وہ پختون لہجے میں روانی سے بول رہی تھی۔ (اور وہ ہلکا سا مسکرایا۔ واہ۔ چڑیل اداکاری بھی کرتی ہے۔) ”اس کے فون پہ آپ کا آخری نمبر ڈائل کیا گیا تھا۔“

”کیا؟ کون سے اسپتال سے؟“ دوسری طرف

الجھن اور پریشانی در آئی۔ زمر نے جلدی جلدی نام اور بتایا۔ ”پندرہ بیس منٹ بعد پولیس آجائے گا، اگر تم نے آنا ہے صاحب تو جلدی آؤ۔“

”پولیس سے کچھ نہیں کہنا، میں آرہا ہوں بس اور۔“ مگر زمر نے سنے بغیر کال کاٹ دی۔

”یہ لہجہ کہاں سے سیکھا آپ نے؟“ مسکراہٹ چھپائے اس کو دیکھ کر پوچھا تو زمر فون ڈیش بورڈ پہ دھرتے ہوئے اسی بے تاثر انداز میں بولی۔

”آریو شیور، وہ امینہ سے یہاں آنے سے پہلے رابطہ نہیں کر سکے گا۔“

فارس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ”جی۔“

زمر نے ایک اچھتی سی نظر اس پہ ڈالی۔

”کیا کیا ہے اس کے ساتھ؟ اس نے چہرہ موڑ کر زمر کو دیکھا۔“ گلا گھونٹ کر سنبھلے سے لٹکا دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ خودکشی ہے۔“

وہ اکتا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

رات باہر قطرہ قطرہ بہتی رہی۔ کار کے اندر خاموشی چھائی رہی۔ دونوں میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ دفعتاً وہ سیدھا ہوا۔

”وہ نیاز بیگ!“ زمر نے بھی اسی طرف دیکھا۔ شلوار سوٹ میں ملبوس نیاز بیگ اسپتال کے اندر داخل

کیپ پہنے بیٹھا نظر آتا تھا۔ چیونگم چباتے ہوئے وہ آنکھیں سیکڑ کر اسپتال کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں بیرونی استقبالیے سے ہٹ کر باہر ایک اندھیرے کونے میں اسے زمر دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں سے وہ مبہم سی دکھائی دیتی تھی۔ اگر قریب جا کر دیکھو تو وہ اس ویران کونے میں ایک نرس کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نرس نے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھتے، ایک پیکٹ زمر کی طرف برہمایا۔

”سب کچھ پورا ہے؟“ زمر نے سرگوشی میں پوچھا۔

نرس نے جھٹ سر اثبات میں ہلایا۔

”اوکے۔ وہ ابھی آئے گا، آگے تم جانتی ہو، تمہیں کیا کرنا ہے۔“ کہنے کے ساتھ پرس سے ایک بند خاکی لفافہ اس کی طرف برہمایا۔ نرس نے فوراً ہاتھ اٹھائے۔

”نہیں، نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کے مجھ پہ احسان ہیں۔“

”رکھ لو۔ میں خوشی سے دے رہی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر زبردستی پیکٹ تھما دیا۔ نرس نے شرمندہ ہوتے ہوئے اسے رکھ لیا۔

تب ہی فارس کو وہ واپس آتی دکھائی دی۔ اس نے نیلی قمیص پہن رکھی تھی اور سیاہ دوپٹہ سر پہ تھا۔ وہ سر جھکائے مناسب چال چلتی اس طرف آرہی تھی۔ فارس نے ہاتھ برہا کر فرنٹ سیٹ کالا کھولا۔

”آدھا کام ہو گیا۔“ اندر بیٹھتے ہوئے زمر نے عام

سے انداز میں اطلاع دی اور پیکٹ ڈیش بورڈ پہ رکھا۔ فارس نے ایک نظر اس پہ ڈالی۔ وہ سر سے دوپٹا اتار کر اب گھنگریالے بالوں کو گول مول لپیٹ کر جوڑا بنا رہی تھی۔ وہ سامنے دیکھنے لگا۔

”اب؟“

”وہ آجائے پھر فون کرتے ہیں۔“ اس نے متلاشی نظروں سے دور اسپتال کے بیرونی دروازوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ آچکا ہے۔ جب آپ گئیں تب ہی آ گیا تھا۔“ کہنے کے ساتھ اس نے امینہ کا موبائل زمر کی طرف

”نیاز بیگ۔ تم ادھر کیسے؟“ تعجب سے آنکھیں
 سکیڑ کر اسے دیکھتے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا۔
 ”یہ تمہارے تھانے کی حدود تو نہیں ہے اے ایس
 پی۔“ وہ بھی ذرا حیران ہوا۔ ”خیر میری پہچان کی ایک
 عورت۔ (آنکھ سے اشارہ کیا) ادھر ایڈمٹ ہے۔“
 سرد شاہ کا برو بے اختیار اٹھا۔ ”ادھر؟ اس کمرے
 میں؟“

”ہاں۔ دیکھو اسے پولیس کیس مت بناؤ یہ اتنا کوئی
 بڑا معاملہ“

”تم شہزاد کو کیسے جانتے ہو؟“ سرد شاہ نے تیزی
 سے بات کالی۔ اس کی متعجب نگاہیں نیاز بیگ پہ جمی
 تھیں۔

”کون شہزاد؟“ وہ ٹھہرا۔
 ”آئی جی صاحب کی بیٹی اور میری کزن شہزادہ ملک
 جو ریپ اور نارجر کے بعد پچھلے ڈیڑھ ماہ سے کوما میں
 ہے۔ بتاؤ کیسے جانتے ہو اسے؟“ سرد شاہ کی نگاہوں کا
 تعجب اب کھوجتے تاثر میں بدل رہا تھا۔

ایک دم نیاز بیگ کو کسی انہونی کا احساس ہوا۔
 ”نہیں شہزاد کون؟ میں تو نہیں جانتا کسی شہزاد کو۔
 میں تو ادھر ایمینٹ کے لیے آیا تھا۔ وہ میری ایک عزیزہ
 ہے۔“ پھر کمرہ نمبر دیکھا۔ ”شاید غلط کمرہ نمبر بتا دیا
 انہوں نے۔ میں پوچھتا ہوں دوبارہ۔ اور۔ افسوس ہوا
 تمہاری کزن کا سن کر۔“ غلط وقت یہ غلط جگہ یہ ہونے
 کا احساس ہوتے ہی وہ عجلت میں کہتا اس کا کندھا
 تھپتھپاتا جیب سے موبائل نکال کر مڑا۔

سرد شاہ آنکھیں سکیڑ کر اسے جاتے دیکھنے لگا۔ پھر
 اس نے ایک نظر اپنے ایس آئی پہ ڈالی وہ بھی ان ہی
 نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک دم سرد شاہ اس
 کے پیچھے لپکا۔ پیچھے کمرے کے دروازے کی ہلکی سی
 دیر ز کھلی تھی جس سے بیڈ پہ لیٹی لڑکی نظر آرہی
 تھی۔ ہوش و خروش بے گانا۔ آکسیجن ماسک لگا
 تھا۔ بہت سی دوسری نالیاں بھی۔ اس کے بال
 بھورے سنہرے سے تھے اور کان کے قریب ان میں
 تیلی کی شکل کانٹوں والا کلپ لگا تھا۔

ہو رہا تھا۔ فارس نے گردن گھمائی۔ ”اس کی کار قریب
 میں ہی کہیں ہوگی جلدی میں لگ رہا ہے۔“ لاک
 کھولتے ہوئے اس نے ڈیش بورڈ سے پیکٹ اٹھایا اور
 دروازہ کھولا۔ زمر نے قدرے بے چینی سے اسے
 دیکھا۔

”دھیان سے!“ ہلکا سا بولی۔ وہ چونکا اس کی
 آنکھوں کو دیکھا اور ہلکا سا مسکرایا۔

”میں نہیں چاہتی تمہاری لاپرواہی سے کوئی گڑبڑ
 ہو۔“ وہ وضاحت دے کر رخ موڑ گئی۔ اس کی
 مسکراہٹ پھلکی پڑی۔ سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔

اندر استقبال تک نیاز بیگ تیز قدم اٹھاتے پہنچا۔
 وہی نرس کاؤنٹر کے پیچھے دو تین افراد کے ہمراہ کھڑی
 تھی۔ اسے آتے دیکھ کر فوراً اس طرف متوجہ ہوئی۔
 ”جی؟“ وہ اس کے مخاطب کرنے پہ وہیں رکا۔

”ہاں وہ۔ امینہ نامی خاتون کو لایا گیا ہے مجھے فون
 آیا تھا اور۔“

”پرائیویٹ روم چھ نمبر میں ہے وہ۔ آپ یہاں
 سے سیدھا جا کر دائیں مڑ کر۔“ وہ عجلت میں رستہ
 سمجھاتی گئی۔ وہ سنجیدگی اور قدرے اضطراب سے
 سرہلاتے آگے بڑھ گیا۔

چند راہداریاں عبور کر کے کمروں کے نمبر پڑھتا وہ
 مطلوبہ کمرے کے قریب آیا۔ باہر دو پولیس اہلکار
 کھڑے تھے۔ نیاز بیگ کی تیوری چڑھی۔ وہ دروازے
 کے نزدیک جانے لگا تو ایک سپاہی نے راستہ روکا۔
 ”کیا کام ہے؟“

”اندر میرا مریض ہے۔ اسے دیکھ لوں پھر تم سے
 بات کرتا ہوں۔“ وہ قدرے اکھڑے لہجے میں کہہ کر
 آگے بڑھنے لگا مگر سپاہیوں نے پھر سے روک دیا۔
 ”اجازت نہیں ہے۔ مریض سے کیا رشتہ ہے
 تمہارا؟“

اس سے پہلے کہ وہ غصے سے کچھ جواب دیتا دروازہ
 کھلا۔ نیاز بیگ کے الفاظ منہ میں رہ گئے۔ اے ایس پی
 سرد شاہ عام پینٹ شرٹ میں ملبوس باہر نکل رہا تھا۔
 اسے دیکھ کر چونکا۔

”کیا نام بتایا تم نے اپنی عزیزہ کا؟“ راہداری کے آخر میں اس نے نیاز بیگ کو جالیا۔ جو موبائل پر نمبر ملا کر کان سے لگائے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پہ الجھن تھی۔ سرمد شاہ کے پکارنے پہ چونک کر گردن گھمائی۔

”ہاں وہ امینہ ہے، میری جاننے والی۔ اسپتال والوں نے ابھی فون کر کے بتایا۔ میں پوچھتا ہوں ابھی۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو اے ایس پی؟“ وہ ذرا اکتایا۔ ”بھئی میں نہیں جانتا تمہاری کزن کو۔“

”ٹھیک ہے۔ میں بھی تمہاری عزیزہ کی عیادت کر لوں۔“ اس نے ابرو سے اسے چلتے رہنے کا اشارہ کیا۔ تیز جا چلتی نگاہیں بار بار نیاز بیگ پہ ڈالتا تھا۔ وہ اندر کی اندر کوفت کا شکار ہونے لگا، مگر چلتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ واپس استقبالیہ کاؤنٹر تک آ پہنچے۔

”اوہ بی بی، کس کمرے میں بھیج دیا تم نے مجھے؟“ وہ گبڑ کر کہتا سی نرس سے مخاطب ہوا۔ ”وہ تو کسی سٹرا بی بی کا کمرہ ہے۔“ ”سر آپ نے سٹرا ملک کے کمرے کا ہی پوچھا تھا، تب ہی میں نے روم نمبر سکس بولا۔“ وہ سادگی سے گویا ہوئی۔ سرمد شاہ نے پوری گردن گھما کر اسے دیکھا۔ وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔

”کیا بکو اس کر رہی ہو؟ میں نے امینہ امتیاز کا پوچھا تھا۔ تم لوگوں نے مجھے کال کر کے بلایا ہے۔“ ساتھ ہی حیران پریشان نگاہ اے ایس پی پہ ڈالی۔ جو بس چپ چاپ اسے گھور رہا تھا۔

”سوری سر، مجھے سٹرا ملک سنائی دیا تھا۔“ ”امینہ امتیاز۔“ وہ جھک کر چیک کرنے لگی۔ ”یہاں تو کوئی امینہ امتیاز نہیں لائی گئی۔ نہ ہم نے اس سلسلے میں کسی کو کال کی ہے۔“

”کیا بکو اس ہے۔ تم لوگوں نے مجھے ابھی کال کی خود مجھے بلایا، خود کشی کا کیس تھا۔“ غصے سے لال پیلے ہوتے اس کے ماتھے پہ پسینہ آ رہا تھا۔

”سر یہ سارے فونز آپ کے سامنے رکھے ہیں، آپ کال ریکارڈز چیک کر لیں۔ ہمارے پاس کوئی امینہ امتیاز نہیں لائی گئی۔ آپ نے خود ابھی سٹرا ملک کا

پوچھا تھا مجھ سے۔“ وہ روہا تسی ہو گئی۔ ”تمہیں کس نمبر سے فون آیا؟“ وہ جو چپ کھڑا تھا، ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ نیاز بیگ نے جھنجھلا کر اسے دیکھا۔

”امینہ کے موبائل سے فون آیا تھا۔“ وہ واپس اسے کال بیک کرنے لگا۔

”گھنٹی جا رہی ہے، کوئی اٹھا نہیں رہا۔ میں اس کے گھر دیکھتا ہوں۔ اچھا خدا حافظ!“ ماتھے کو چھو کر عجلت میں اسے سلام کیا اور باہر کی طرف بڑھا۔ ایس آئی نے بے اختیار سرمد کو دیکھا۔ وہ سوچتی نظروں سے نیاز بیگ کو باہر نکلتے دیکھ رہا تھا۔

”نیاز بیگ کی کار کون سی ہے امجد حسین؟“ اس نے سوچ میں ڈوبے پکارا۔

”سر، ہمیشہ نیلے رنگ کی نسان میں دیکھا ہے اسے۔“

”اور اس دن ہمیں جو گمنام ٹپ موصول ہوئی تھی، یاد ہے؟ فون کرنے والی عینی شاہد نے کہا تھا کہ اس نے ایک آدمی کو سٹرا کو کار کی ڈگی سے نکال کر سڑک پہ پھینکتے دیکھا تھا۔ کون سی کار بولی تھی اس نے؟“ ”نیلے نسان۔ مگر سر، ٹپ تو جھولی بھی ہو سکتی ہے۔“ وہ خود متذہب تھا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ سرمد شاہ کے چہرے پہ بے پناہ سختی در آئی۔ وہ باہر نکلا۔ ایس آئی فوراً پیچھے لپکا۔

دو گاڑیوں کی قطار کی طرف نیاز بیگ تیز تیز قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی موبائل پہ مسلسل نمبر ملا رہا تھا۔ جب تک وہ دونوں اس تک پہنچے، وہ نیلی نسان سے چند قدم دور تھے۔

”تمہاری امینہ نے فون نہیں اٹھایا؟“ خشک انداز میں اس نے پوچھا تو وہ چونک کر گھوما۔ چہرے پہ دبا دبا غصہ در آیا۔

”اے ایس پی میں پریشان ہوں اس ٹائم! امینہ گھر بھی نہیں پہنچی اور فون بھی نہیں اٹھا رہی، کوئی مسئلہ ہے اس کے ساتھ۔“ وہ ذرا جھنجھلا یا ہوا، ذرا متفکر کہہ رہا تھا جب ایس آئی نے آواز دی۔ ”سر!“

یہ کارروائی دیکھ رہا تھا اور نیاز بیگ تملاتا ہوا سا کھڑا تھا۔

”یہ تم اچھا نہیں کر رہے۔“ ایک سلگتی نظر سرمد شاہیہ ڈال کر ہلکا سا بولا۔ سرمد شاہ خاموش رہا۔ ایس آئی اب ڈگی کھول رہا تھا۔

”میں پہلے مصیبت میں ہوں، اوپر سے تم کسی مشتبہ کی طرح میرے ساتھ برتاؤ کر رہے ہو۔ میں یہ بے عزتی بھولوں گا نہیں۔“

”سر!“ ایک دم ایس آئی سیدھا ہوا، اس کے چہرے پہ کوئی ایسا ہکا بکا تاثر تھا کہ سرمد شاہ فوراً ڈگی کی طرف آیا۔

”یہ دیکھیے۔“ اس نے ٹارچ کی روشنی ڈگی کے ایک کونے میں ماری۔ سرمد شاہ نے آنکھیں سیکڑ کر دیکھا اور اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

وہاں ایک جگمگاتا ہوا تتلی کی صورت کا تین اونچ چوڑا ہینو کلب گرا تھا۔ اس میں چند ہلکے بھورے بال بھی اڑے تھے۔ (اور چند بال فاصلے فاصلے پہ ڈگی میں بکھرے بھی تھے جو ابھی دکھائی نہیں دے رہے تھے) تتلی کے چند نگ جگمگارے تھے اور باقی نگوں کو سوکھے خون کے دھبوں نے ماند کر رکھا تھا۔ سزا کا خون۔ سرمد شاہ کی آنکھوں میں سرخی ابھری۔ وہ طیش میں اس کی طرف گھوما۔

”نیاز بیگ! اپنے ہاتھ پیچھے باندھ لو۔ رفیع محمد اسے ہتھکڑی لگاؤ۔“ وہ غرایا تھا۔

”کیا بکو اس“ نیاز بیگ کی ساری جھلاہٹ ہوا ہوئی وہ حیران پریشان سا آگے ہوا مگر ایس آئی کو تتلی نما کلب اٹھا کر پلاسٹک بیگ میں ڈالتے دیکھ کر اس کا چہرہ فرق ہوا۔

”اوہ یہ میرا نہیں ہے۔ یہ میری گاڑی میں کہاں سے۔ اوہ میری بات سنو۔“

سرمد شاہ نے پوری قوت سے اس کے منہ پہ گھونسا مارا۔ وہ ایک دم تیور کر پیچھے کو گرا، مگر گرنے سے پہلے سرمد شاہ نے گریبان سے کھینچ کر اسے اٹھایا اور اس کا خون نلکا ستا چہرہ قریب کیا۔

”میں نے تمہیں کتنے کھسڑے نکالا، کیا اس لیے

سرمد شاہ نے اس طرف دیکھا۔ وہ چند قدم دور نیکی نسان کے ساتھ کھڑا ان کو بلارہا تھا۔ نیاز بیگ فون کان سے لگائے جھجلا کر بولے جا رہا تھا، مگر سرمد شاہ نے بغیر آگے آیا۔

نیاز بیگ کی کار کے ڈیش بورڈ پہ ایک موبائل تھر تھراتا ہوا جل بجھ رہا تھا۔ اندھیرے میں اس کی روشنی ونڈا سکرین پہ عکس بنا رہی تھی۔ عکس پہ نیاز بیگ کا نام اور نمبر لکھا آ رہا تھا۔ سرمد شاہ نے تیز نظروں سے اسے گھورا جو روشنی دیکھ کر اس طرف آیا تھا۔

”تمہاری امینہ شاید اپنا فون تمہاری کار میں بھول گئی۔“

وہ حیران پریشان سا قریب آیا۔ موبائل دیکھ کر اس کے چہرے پہ شاک در آیا۔ تیزی سے کار کھولی اور موبائل نکال کر چہرے کے سامنے کیا۔ وہ امینہ کا ہی موبائل تھا۔ اس نے الجھن بھری نگاہیں اٹھائیں تو اے ایس پی ٹیکھی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

”یہ اوہر کیسے؟“ وہ کبھی ڈیش بورڈ کو دیکھتا، کبھی موبائل کو۔

”امجد حسین ذرا گاڑی کی تلاشی لو۔ شاید امینہ بی بی بھی مل جائے۔“ اے ایس پی نے تحکم سے ایس آئی کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا تو نیاز بیگ کی پریشانی پس منظر میں چلی گئی اور ابرو تن گئے۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کے گھر جاتا ہوں۔“ ہاتھ جھلا کر قدرے کھردرے انداز میں کہتے ایس آئی کو روکا۔ ایس آئی نے ایس پی کو دیکھا۔ وہ آگے ہوا اور نیاز بیگ کی آنکھوں میں دیکھتے تحمل سے بولا۔

”نیاز بیگ اس وقت مجھے غصہ دلا کر مجھے اپنا دشمن مت بناؤ۔ میں نے بڑے موقعوں پہ تمہارا ساتھ دیا ہے، اس لیے چپ چاپ یہاں کھڑے رہو۔“ پھر امجد حسین کو اشارہ کیا۔ ”گاڑی کھولو۔“

چند لمحوں بعد تین چار مزید اہلکار وہاں کھڑے تھے، ایس آئی ٹارچ سے اندر روشنی مارتا، کاکی سیٹیں، خانے، کلوز کپارٹمنٹ چیک کر رہا تھا۔ اے ایس پی سرمد شاہ کمر پہ ہاتھ باندھے پتھر لے تاثرات کے ساتھ

کہ تم میرے خاندان کی لڑکی کے ساتھ ایسا کرو گے؟ تم (گالی) گھٹیا انسان! وہ میری بہنوں جیسی تھی۔" شاکند سے نیاز بیگ کو جھٹکے سے چھوڑا۔ ایک اہلکار نے اس کے ہاتھ موڑ کر پیچھے باندھے۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ "نہیں نہیں یہ کوئی گڑبڑ ہے مجھے اس میں پھنسیا جا رہا ہے میں نہیں جانتا تمہاری بہن کو۔ میری بات سنو!" وہ دو اہلکاروں کی آہنی گرفت میں پھڑپھڑاتا چلا رہا تھا۔

"آئی جی صاحب کو فون لگاؤ اور بولو۔ تھانے آجائیں۔" سرد شاہ سرخ چہرے کے ساتھ ایس آئی کو کہہ رہا تھا۔

اور دور سڑک کے اس پار گرین ہیلٹ کے ساتھ پارکنگ کار کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی زمر گھنگھریالی لٹ اٹھی۔ لپٹی وہ منظور دیکھ رہی تھی۔ آواز سنائی نہ دیتی مگر وہ ایک منظر سو آوازوں پہ بھاری تھا۔ اس کے چہرے پہ اطمینان تھا مگر آنکھوں میں سردی پیش بھی تھی۔ فارس نے گہری سانس لی اور کافی مطمئن سے انداز میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی۔

"آریو شیور۔ اے ایس پی کو اصل معاملہ سمجھ نہیں آئے گا؟"

"میں اسے جانتی ہوں کام کیا ہے اس کے ساتھ۔ اگر اس میں اتنی عقل ہوتی تو چار سال سے اسے ایس پی نہ ہوتا سال ڈیڑھ پہلے ایس پی بن چکا ہوتا۔ یہ اس کے گھر کا معاملہ ہے۔ اس کی حج منٹ کو غیرت ڈھانپ دے گی۔" وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی کہہ رہی تھی۔ "مگر اس کی جلد ہی ترقی ہونے والی ہے۔"

"اس کی ترقی کا انحصار اس کیس پہ ہے۔ اس کو شہزاد کا مجرم مل گیا یعنی اس کو ترقی مل گئی۔" زمر نے ملے سے کندھے اچکائے۔ دور نیاز بیگ سپاہیوں کی گرفت میں پھڑپھڑاتا مسلسل چلا رہا تھا۔

"اب دیکھو کون لڑکیوں کی طرح چیخ رہا ہے۔" وہ اسی منظر کو دیکھتے بولی تو لہجے میں نمی بھتی تھی اور آنچ بھی۔ فارس نے ٹیک لگائے گردن اس کی طرف موڑی۔

"کل جب امینہ اس سے لاک اپ میں ملے گی تو اس کی بات سن کر نیاز بیگ کو یہی لگے گا کہ اسے پولیس نے پھنسیا ہے اس کیس میں۔ ہمارے دشمن ایک دوسرے کے خلاف کھڑے ہوں گے اس دفعہ ہم ان کا تماشا دیکھیں گے۔" وہ رکا۔ "مگر شہزاد؟"

زمر نے گہری سانس لی۔ "اس کے مجرم یقیناً" چلاک لوگ ہیں ان کو کبھی نہیں ملیں گے۔ وہ بے چاری بچی شاید چند دن زندہ رہ پائے۔ مگر وہ نہ کبھی ہوش میں آئے گی نہ کسی کو کچھ بتا پائے گی۔" وہ ابھی تک پولیس موبائل کو دیکھ رہی تھی جس میں اب وہ چیختے چلاتے نیاز بیگ کو لارہے تھے۔

"وہ کلپ جو میں نے اس کی ڈگی میں رکھا ہے کیا اس کے خاندان والے پہچانیں گے نہیں؟ گو کہ وہ شہزاد کے کلپ کے جیسا ہی ہے۔ مگر اس کا نہیں ہے۔ کیا معلوم شہزاد کے پاس صرف ایک ہی کلپ ہو۔"

"اونہوں۔ وہ ڈیزائنر کلپ ہے اور اس کے جیسا کلپ جو میں نے خریدا تھا وہ اس وقت شہزاد کے بالوں میں لگا ہے۔ جس کلپ پہ اس کا بلڈ اور بال لگا کر سسٹر نے مجھے دیے تھے وہ شہزاد کا اصلی کلپ ہے۔ وہ اسے فارنرک بھیجیں گے ہر طرح سے چیک کریں گے۔ مگر شہزاد کے بالوں میں لگا کلپ کوئی نہیں چیک کرے گا۔" سرسری سا بتا رہی تھی۔

"اوہ۔" وہ چیپ ہو گیا۔ پولیس موبائل اب دور جا رہی تھی۔

زمر نے گردن موڑ کر اسے دیکھا پھر کچھ کہتے کہتے چیپ ہوئی۔ پھر سامنے دیکھنے لگی۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ پھر ہلکا سا بولی۔ "گڈ جاب فارس!" اس کے لہجے میں نرمی تھی مگر وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔ وہ ذرا سا مسکراتے ہوئے کار اشارٹ کرنے لگا۔

"پلان آپ کا تھا۔ گڈ جاب ٹویو! سو۔ اب کس کی باری ہے؟" کار ریورس کرتے اس نے پوچھا۔ سیڑھی کا پہلا زینہ ان کے قدموں تلے تھا اور اس کی چوٹی تک پہنچنے کے لیے ہرزینے کو اسی طرح روندنا تھا۔ یہ سعدی یوسف کو پہچاننے کا واحد طریقہ تھا۔

ہے۔ امی میں ہوں وہ گواہ جسے وہ لوگ ڈھونڈ رہے ہیں۔“
www.paksociety.com
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

”بتاؤ گی۔ جب ضرورت پڑی تو!“ وہ پھر سے وہی ہی روکھی ہو گئی۔ مگر ایک تبدیلی آئی تھی۔ کم از کم وہ بات کرنے لگے تھے۔ ابھی وہ رستے میں تھے کہ زمر کا موبائل بجا۔ ڈاکٹر سارہ عازمی۔

”جی ڈاکٹر سارہ۔“ اس نے مصروف سے انداز میں فون کان سے لگایا۔

”کچھ پتا چلا سعدی کا زمر؟“ وہ فکر مندی سے بولی۔
”کہاں سارہ؟ آپ بس دعا کریں۔ اچھا میرا کام ہوا؟“

”جی میں نے پتا کیا تھا۔ نیس کام میں کوئی حلیمہ کام نہیں کرتی۔ ایک حلیمہ سرفراز ہے مگر وہ انجینئر ہے سیکریٹری نہیں۔“ زمر نے تکان سے آنکھیں میچ لیں۔

”نہیں وہ حلیمہ ہی تھی۔ خیر تھینک یو۔ واپس آکر چکر لگائیے گا۔ سچے آپ کو مس کرتے ہیں۔“

”جی میں بس تمہیں پھنسی ہوں اتنے دن سے۔“
سعدی کی پریشانی الگ جیسے ہی آئی چکر لگاؤں گی۔“
زمر نے فون رکھ دیا اور دوسری طرف۔

دوسری طرف اپنے بیڈ روم میں کھڑی سارہ نے بھی موبائل رکھ دیا۔ اور جیسے ہی وہ پیٹی ذکیہ بیگم پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ایک تاسف بھری نظر سارہ پہ ڈالی جو ساہ شلوار قمیض میں ملبوس بالوں کا جوڑا بنائے ہوئے تھی۔ ان کو دیکھ کر چونکی۔

”کیوں ان کو او اینڈ کر رہی ہو؟ تم پچھلے ایک مہینے سے جب سے سعدی کھویا ہے یہیں اس گھر میں قید ہو۔ پھر بار بار جھوٹ کیوں؟“

سارہ کی سبز نیلی آنکھوں میں نمی در آئی۔ ”میں ان لوگوں سے نہیں ملنا چاہتی۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں ملی تو وہ جان لیں گے۔“

”کیا جان لیں گے؟“ وہ ذرا حیران ہوئیں۔ سارہ کے آنسو بننے لگے۔

”امی! اس رات سعدی کے ساتھ اس گھر میں میں تھی۔ امی میں نے اپنے سامنے اسے گولیاں لگتے دیکھا

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
بساط دل	آمنہ یاس	500/-
ذردموم	راحت جمیں	750/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار رحمان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار رحمان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری	500/-
حیرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری	250/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فازہ انصار	500/-
بہول بھلیاں تیری گلیاں	فازہ انصار	600/-
پھلاں دے رنگ کالے	فازہ انصار	250/-
یہ گلیاں یہ چہارے	فازہ انصار	300/-
میں سے محبت	غزالہ عزیز	200/-
دل آسے اور مٹ لایا	آسید ذاتی	350/-
کھرنا جائیں خواب	آسید ذاتی	200/-
زخم کو خند تھی سمائی سے	فوزیہ یاسمین	250/-
امانس کا چاند	بشری سعید	200/-
رنگ خوشبو ہوا ہا دل	انٹاس آنریدی	500/-
درد کے قاصدے	رضیہ جمیل	500/-
آج سگن پر چاند نہیں	رضیہ جمیل	200/-
درد کی منزل	رضیہ جمیل	200/-
میرے دل میرے مسافر	قیمہ سحر قریشی	300/-
حیری راہ میں زل گئی	میونہ خورشید علی	225/-
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر	400/-

ناول منگوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ - 30 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ - 37 اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32216361

افطاری کی توجی

بڑے۔ اس طرح ہم کو مزہ بھی آئے گا اور مل بیٹھ کر کھانے سے بہار بڑھے گا۔" فاطمہ نے ستائشی نظروں سے اپنی لاڈلی کی طرف دیکھا جو بہت سمجھ دار تھی اور اس کا دل محبت کے جذبات سے لبریز تھا۔

"فاطمہ! تم سمجھتی ہو کہ اسد مان جائے گا۔" اختر میاں نے فاطمہ کی طرف دیکھا جو اپنے چھوٹے بھائی کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے کہ اس کی عزت نفس مزید مالی مدد لینا گوارا نہیں کرے گی۔

"ہاں کیوں نہیں مانے گا" اس میں کیا مضائقہ ہے؟" کنزہ کا مشورہ سن کر اماں بہت خوش تھیں انہیں یہ تجویز پسند آئی تھی۔ فاطمہ پھوپھو اپنے چھوٹے بھائی کے دونوں بچوں میں کسی طرح کا احساس کمتری پیدا ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھیں اس لیے انہوں نے اسد سے بات کی تھی۔ اسد نے اپنے دونوں بچوں حسن اور ردا کی معصوم شکلوں کو دیکھا جو کارٹونز دیکھنے میں مگن تھے اور سعدیہ کی طرف دیکھتے ہوئے تائیدی انداز میں سر ہلادیا۔

روڈ ایکسیڈنٹ حادثے نے اسد کے مالی حالات کافی خراب کر دیے تھے اگرچہ اب وہ ٹھیک تھے آفس بھی جانے لگے تھے سعدیہ بھی اسکول میں پڑھاتی تھی، مگر ابھی ان دونوں کو بہت محنت کرنا تھی ان خوابوں کے لیے جو انہوں نے اپنے بچوں کے لیے دیکھے تھے۔

"روزے کا اصل مقصد بھوکا پیاسا رہ کر اپنے نفس کو مارنا ہے اور ان لوگوں کی تکلیف کا احساس کرنا جن کو سارا سال بھوکا پیاسا رہنا پڑتا ہے اس کا مقصد صرف نئے کھانوں سے دسترخوان بھرنا نہیں بلکہ

"کل میرا پہلا روزہ تھا اور می نے افطاری میں بہت کچھ بنایا تھا، فروٹ چاٹ، وہی بھلے، چکن پکوڑے، سمو سے رول اور جو کچھ میں نے کہا، مجھے منگوا کے دیا۔ مجھے بہت مزہ آیا۔" شاہ زیب نے خوشی اور فخر کے ساتھ اپنے چچا زاد حسن کو بتایا۔

حسن کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری اور غائب ہو گئی جو پاس بیٹھی فاطمہ پھوپھو کو چونکا گئی۔ فاطمہ پھوپھو کے دل کو دکھ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا وہ کچن میں آگئیں جہاں کنزہ ان کی لاڈلی بیٹی افطاری کی تیاری کر رہی تھی اور ان کے دونوں بیٹے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے جو کنزہ سے مہتھس پڑھنے آئے تھے۔

فاطمہ اور ان کے تینوں بھائیوں کے گھریلو حالات بہت اچھے تھے وہ چاروں بہن بھائی ایک ہی محلے میں رہائش پذیر تھے اور ان کی اماں چاروں بچوں کو اپنے گھروں میں خوش حال دیکھ کر بہت خوش تھیں، مگر فاطمہ کے چھوٹے بھائی اسد کی ایک حادثے میں ٹانگ ٹوٹنے سے اس کے مالی حالات خراب ہونا شروع ہو گئے تھے اسد کی عزت نفس بہن بھائیوں سے مزید مالی امداد لینا گوارا نہ کرتی تھی۔ گو بڑے تینوں بہن بھائی اسد کی مدد کرنے میں پیش پیش تھے اور فاطمہ جانتی تھیں کہ ان کا بھائی کبھی بھی اپنے بچوں میں احساس کمتری پیدا ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"امی! ہم سب مل کر افطاری کیا کریں گے۔ ہفتے میں دو دن۔ سب اپنی اپنی استطاعت کے مطابق افطار کے لیے کچھ نہ کچھ لائے گا تاکہ کسی کی جیب پر بوجھ نہ



کو لوٹ گئے، کیونکہ اگلے جمعے کے دن ان کو دوسرے بھائی کے گھر روزہ افطار کرنا تھا اور اپنی استطاعت کے مطابق ایک ایک کھانے کی ڈش لانا تھی یہ جانے بغیر کہ کون کیا لایا؟ اور کسی دکھاوے کے بغیر کسی بھائی یا بہن کی عزت نفس مجروح کیے، کیونکہ ان کے دل پیار کی ڈوری سے بندھے تھے نہ وہ اپنے بچوں میں احساس برتری یا احساس کمتری پیدا ہوتے دیکھ سکتے تھے اور نہ اپنے چھوٹے بھائی کی عزت نفس کو مجروح کرنا چاہتے تھے۔

ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے۔“ سب نے کنزہ کی طرف توصیفی نظروں سے دیکھا۔ وہ سب آج بڑے بھائی کی طرف افطاری کر رہے تھے اور چاروں بہن بھائی اپنی اپنی استطاعت کے مطابق افطاری کا سامان لائے تھے جو کنزہ کے مشورہ کے مطابق صرف کھانے کی ایک ڈش پر مشتمل تھا جس میں نہ دکھاوا تھا نہ نمود و نمائش، بلکہ کنزہ نے کسی کو بھی یہ معلوم نہ ہونے دیا کہ کون کیا لایا؟ سب نے خاموشی سے افطاری کی اور اس کے لیے ڈھیر ساری دعائیں کیں رات کو تمام افراد اپنے اپنے گھروں



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

محبت ساری کا کلمہ

تھکان چہرے پر سجائے کوئی سراپا انتظار تھا۔ وہ مانند بت اس کے سامنے ایستادہ تھی۔ نگاہ اٹھائے نہیں اٹھ رہی تھی اور جھکائے جھکتی نہیں تھی، کیا غضب تھا؟ ایک تھی دست دوسرے تھی دامن سے بھیک چاہتا تھا اس کی ویران آنکھوں سے چند آنسوؤں سے زیادہ کوئی پیمان نہ ہو سکا۔ اس کی زیست کی ساری کہانی اسی پانی میں نہاں تھی، جنہیں مجتبیٰ احمد نے زمین پر بکھرنے سے قبل اپنی کپکپاتی پوروں پر سمیٹ لیا۔ وفا کا مان چاہنے سے قبل وہ مان بھرے انداز میں اس کی حاصل متاع اپنے لبوں پر سمیٹ گیا۔



قتیل ایاز نے دس روپے اس کے سر سے وار کے ویٹر کے ہاتھ میں تھما دیے جہاں مجتبیٰ احمد نے اس کی حرکت حیرت سے دیکھی وہیں ویٹر بھی دس روپے کے نوٹ کو چنگیوں سے پکڑ کر ناگ چڑھاتا واپس لوٹ گیا تھا۔ دونوں بغیر دیکھے جان سکتے تھے کہ ویٹر نے دس

”وفاتو کرو گی ناں؟“
سوال تھا کہ التجا تھی، شوق کا اظہار تھا کہ حسرت کی انتہا تھی، آنکھوں میں امید کے دیے جلانے، سفر کی



خصوصیات کے باوجود جڑواں نہیں تھے اب کیوں کا سوال اٹھنا لازمی ہے تو مختصر ترین جواب ہے کہ دونوں کی مائیں الگ الگ تھیں۔

زیبا اور دیبا دونوں بہنوں کی ایک ساتھ شادی اور اللہ کے کرم سے ایک ساتھ بہرہ ور ہونے کی تک تو سمجھ آتی ہے، مگر ایک ہی دن ڈلیوری میں اللہ کی تدبیر کے ساتھ ذرا سا ہاتھ زیبا کا بھی تھا، زیبا کو چند پچیدگیوں کے باعث آپریشن بتایا گیا تو اس نے دیبا کی نارمل ڈلیوری کے ساتھ آپریشن کی تاریخ کو سیٹ کروا دیا اس میں شک نہیں کہ ایسا کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں یقیناً اللہ کی تدبیر میں ہی دیبا کو یہ راہ فراہم کرنا پوشیدہ تھا۔

قصہ مختصر دونوں خالہ زاد قتیل اور مجتبیٰ مانند جڑواں دنیا میں تشریف لائے اور زندگی کے تمام مراحل ایک ساتھ طے کرتے آج اس مقام پر تھے کہ مقامی کیفے ٹیریا میں مجتبیٰ نے قتیل کو نئی نئی حاصل ہونے والی خوشی سے آگاہ کیا۔

”قتدی تو تصور کر ہی نہیں سکتی کہ جب میں نے

روپے کسی بھکاری کو پدے دی، وہی۔

”قتدی! یہ کیا حرکت تھی؟“

مجتبیٰ کو ایک تو انوکھی حرکت اوپر سے دس روپے کی حقیر حیثیت دونوں پر ہی اعتراض تھا سو سوال کافی تیکھے انداز میں وارد ہوا۔

”کیسی حرکت، صدقہ اتارا ہے تمہارا، آخر کو تم اتنے خوش تھے اور میں تمہاری خوشی کو دیکھ کر خوش، نظر اتارنا ضروری تھا۔“

قتیل نے اس کی ٹھوڑی انگلیوں کی پوروں میں لے کر بچوں کی طرح اسے بہلایا، یہ الگ بات کہ بڑھی شیوسے سچی ٹھوڑی کسی بچے کی نہیں تھی۔

اٹھائیس سالہ مضبوط، صحت مند، گھنے بالوں، سرخ و سفید چہرے والا مجتبیٰ احمد خیر سے تعلیمی مراحل سر کیے اب تو چیف ایگزیکٹو کے عہدے پر بھی فائز ہو چکا

تھا مگر اسے بڑا سمجھنے کو قتیل ہنوز تیار نہ تھی، کیونکہ اس سے پانچ منٹ بڑا ہونے کا اعزاز بہر حال اسے حاصل تھا۔ ایک ہی دن ایک ہی وقت ایک ہی اسپتال میں دنیا میں وارد ہونے والے یہ دونوں نفوس تمام تر

نافیٹ



حسنہ کی اطلاع نئی تھی نہ وہ خود کوئی فرد واحد تھی بلکہ وہ ساتواں نمبر آف کزن تھی جس نے قذیل کو گھر میں داخل ہوتے ہی خبر بہم پہنچائی تھی اور ہر ایک کو جواب میں اس کی کھنکتی ہنسی نے مطمئن کرایا تھا۔

قذیل اشعر کی کھل کھل کتنی اثر انگیز تھی اس خوبی سے وہ بخوبی واقف تھی۔ مجتبیٰ احمد کا غصہ پانی کے ملبے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا وہ اپنی نازک لائبریری انگلیوں سے یہ جھاگ پھوڑ دیا کرتی تھی جیسا کہ اب ہوا تھا وہ جو ہفتہ بھر سے کھولتا رہا تھا کہ محترمہ میسج آویں اور وہ حال دل سناوے سارا غصہ بھلائے جلدی جلدی اس کے ہاتھ کے ابلے چاول پر رائتہ ڈال کر کھاتے ہوئے محو گفتگو تھا۔

”یا تو کھانا کھا لیا بات کر لو۔“ قذیل اس کے تہذیب سے عاری طریقہ تناول کی گرچہ عادی تھی مگر نصیحت کرنا کبھی بھولتی نہیں تھی۔

”مجھے سمجھ نہیں آتی تمہاری زبان ایک ہی وقت میں چکھنے اور بولنے کا کام کر کیسے لیتی ہے؟“ اسے قطعاً یاد نہیں تھا کہ وہ اب تک کتنی بار اس سے یہ سوال پوچھ چکی تھی اس کا جواب ہمیشہ ایک ہی ہوتا تھا۔

”قذیل! نندیوں کی طرح مجھے دیکھنے کے بجائے خود ٹھونس لیا کر تو ذرا سی صحت بن جائے تیری بھی اور میری بھی۔“ اور وہ اس کی نہ بنتی صحت کی بابت سوچ کر کڑھتی رہتی۔

”سندس کے ساتھ سمندر کی لہریں دیکھنے کا مزہ ہی اور ہے اس کی سنگت بے رنگ پانی کو بھی رنگ دیتی ہے قذیل! قوس قزح اس کے وجود سے تخلیق پائی ہے وہ سامنے ہوتی ہے اور میں اسے سوچ رہا ہوتا ہوں جیسے کہ وہ میلوں کے فاصلے پر ہوا سے پانا سراب کیوں معلوم ہوتا ہے۔“ مجتبیٰ کی ہر بات سندس سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتی تھی کچھ قدرت نے اسے حسین تخلیق کیا تھا اور کچھ مجتبیٰ کی چاہت نے اسے حسن کا شاہکار بنا دیا تھا۔

سندس سے حکایت دل بیان کی تو اس نازک لب نے کیا افشاں کیا۔ میں کچھ سن نہ پایا دیکھا تو صرف اس کے شفق نما رخسار کو ریلی مسکراہٹ تکلم کر رہی تھی تو شعلہ گوں عارض بے دم کر رہے تھے نہیں جانتا کہ ان قدموں کے ساتھ تیرے پاس کیسے آیا ہوں۔“

”میرے خیال میں تو تم آئے ہی نہیں ہو ابھی تک وہیں ہو۔“

جذب نہماں سے گھائل مجتبیٰ کو قطع کلامی کیے بغیر قذیل واپس لا بھی نہیں سکتی تھی گرچہ بات درست تھی مجتبیٰ قذیل کے سامنے ضرور تھا مگر تھا سندس کے پاس۔ دونوں کی مشترکہ یونیورسٹی فیلو سندس رجحان کی کون سی ادا مجتبیٰ کے اندر گھر کر گئی وہ نہیں

جانتا تھا وہ کب اپنے شب و روز اس کے نام کر گیا، کب وہ اتنا اندر اتر گئی۔ کہ بات ہو تو اس کی ذات ہو تو اس کی مانند وہ عشق کے آب و رنگ میں نہا گیا اس کی دیوانگی سے کورن۔ واقف نہ تھا اور قذیل تو ویسے ہی ہر لمحے کی ساتھی تھی ساتھ بیٹھے مجتبیٰ کا دیوانوں کی مانند سامنے بیچ پر براجمان سندس کو تلے جانا اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھا۔ پروفیسر کی آمد پر سخت ہاتھوں کی چٹکی لے کر وہ اسے کلاس روم میں حاضر کیا کرتی تھی سندس کو گھر تک چھوڑ کے آتا اور اس کے گھر کے سامنے گھنٹوں کھڑے رہنے کی ذمہ داری مجتبیٰ نے اپنے سر کیا لی کہ اس کے تمام نوٹس مکمل کرنا اور تھیسس تیار کرنے کی ذمہ داریاں قذیل نے بخوشی اٹھالیں۔ وہ عشق کے داؤ پیچ میں الجھا رہا اور وہ اس کے لیے گھر کے اندر اور باہر آسانیاں مہیا کرتی رہی بالآخر وہ دن آن پہنچا جب ایک ہی ہوٹل میں مجتبیٰ نے اسے چیف ایگزیکٹو بننے کی ٹریٹ دی تو قذیل نے اشعر سے شادی طے پا جانے کی مٹھائی کھلائی۔ رنگ زندگی پیہم رقصاں تھے۔



”آج مطلع انتہائی ابر آلود سے ڈرا سنبھل کے۔“

مجتبیٰ کا عشق وصال کے مرحلے میں داخل ہونے کو تھا۔ وہ سندس سے روبرو ہونے کے قریب تھا کیا کیا مدوجزر نہیں اٹھتے تھے اس کی سوچوں میں مجنہیں بیان کرنے کے لیے بہترین سامع کی کمپنی میسر نہیں آتی تھی، قندیل اس کی شادی کی تیاریوں میں بھرپور طریقے سے مگن تھی ویسے بھی وہ خاندان کے تمام غم و خوشی کے معاملات کی ہمیشہ سے انچارج رہی تھی۔ مجتبیٰ اینڈ کمپنی نے تو اسے ”فیملی بھوت“ کا خطاب دے لکھا تھا۔ کیوں کہ وہ بھوت کی مانند ہر جگہ موجود ہوتی تھی۔

”قندی سندس کی مایوں کے جوڑے کی تصویر ضرور لے کر آنا جسے دیکھنا ضروری ہو اسی سے چھپاتے ہیں ظالم لوگ بھلا دیکھو پابندی بھی کیسی ہے لال جوڑے میں تمہاری پیلے میں ہماری! حد ہو گئی۔“

وہ آنکھوں کو لائٹ شیڈز دیتی قندیل کے سر پر سوار

اپنی کہے جا رہا تھا جو اپنے کام میں اتنی مگن تھی گویا اس سے ضروری اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ قندیل کو میک اپ کا کریز تھا وہ ہمیشہ ڈارک کلرز پہنتی اور ڈارک ہی شیڈز استعمال کرتی تھی، مگر آج نہ تو وہ بہت شوخ رنگ پہنے تھی نہ ہی میک اپ میں گہرے پن کا احساس تھا۔ اوپر سے کھل کھل کی کمی الگ جان لیوا تھی مجتبیٰ جو وصال یار کے لیے بے چین تھا اس کے رویے کی تبدیلی نوٹ کر کے بھی انجان ہی رہا اور وہ اپنی سنانے کے لیے اس کے سوال کی منتظر ہی رہی۔

”اف سندس کہاں سے اتنا روپ چرا کے لائی ہو کند چھری سے فزح ہو رہا ہوں میں۔“ قندی کے موبائل پر سندس سے حال زار کہتا وہ دنیا مافیہا سے بے نیاز نظر آتا تھا۔ سندس کی ریسلی ہنسی اور اپنے اظہار شوق میں الجھے وہ قندیل کی خاموشی مکمل فراموش کر چکا تھا سو وہ دھیرے قدموں سے چلتی وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ مجتبیٰ کی شادی کے لیے اس سے زیادہ پر جوش کوئی نہیں تھا، کیوں کہ دونوں دوست اکلوتے تھے نہ مجتبیٰ کو دیر کہنے والی کوئی تھی نہ قندیل کا کوئی۔ ویر تھا سو وہ ایک دو سرے کی کمی پوری کر دیا کرتے تھے۔

”مجتبیٰ، کچھ عرصے میں ایک ہو جاؤ گے تم دونوں تو سارے واسے دم توڑ دیں گے تب تک کے لیے میرا مشورہ ہے کہ کم ملا کرو۔“ قندی بہترین سامع تھی وہ پچھلے کئی سالوں سے اس کی حکایت عشق سن رہی تھی محسب ضرورت مشوروں سے نوازتی رہتی، مگر ایسا مشورہ مجتبیٰ کو حیرت میں ڈال گیا۔

”کیوں؟ اس میں کم یا زیادہ ملنے کا کیا تعلق؟ تم جانتی ہو کہ میں اس طرح کی پابند۔“

”ارے نہیں! میں اس حوالے سے نہیں کہہ رہی ہوں۔“ مجتبیٰ کو بات غلط سمت لے جاتے دیکھ کر وہ فوراً تصحیح کرنے لگی۔

”میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تم محبت میں گوڑے گٹے تک دھنسنے ہوئے ہو اور شادی محبت کا اینڈ ہے، کہیں ایسا نہ ہو یہ رنگ و فاشادی کے بعد محض ایک رنگین کہانی ثابت ہو اس لیے خود کو جانچنے کے لیے تھوڑا سا اسپیس (Space) دو۔“ مگر مجتبیٰ کو لگا کہ قندیل کی ازدواجی زندگی کا اس کی بدلتی سوچ کے ساتھ ربط ضرور تھا سو پہلی بار وہ اپنی کہنے کے بجائے اس سے دریافت کرنے لگا۔

”کیا ہوا قندی! کیا تم اس رنگ الفت کے کچے پن کا شکار تو نہیں ہو گئی ہو۔“ اشعر قندیل اور مجتبیٰ کا گزن تھا طوفانی عشق کی داستان اگرچہ نہ تھی، مگر اشعر اور قندیل کی شادی ان دونوں کی باہمی رضامندی اور ذہنی ہم آہنگی کے بعد ہی ہوئی تھی ڈیڑھ برس گزر ا تھا ان کی شادی کو اور قندیل کی کھل اور دکھتی رنگت کچھ بھی تو اس طرف اشارہ نہ کرتے تھے اس لیے مجتبیٰ کو اپنے سوال کے بودے پن کا خود بھی اندازہ تھا۔

”رہنے دو یہ کچا پکا عشق اور دور جدید کی اصطلاحات سے مجھے تو معاف ہی رکھو، اشعر ان خرافات میں پاؤں کیا ہی دھرے گا میں اس کی لائف سے نو دو گیارہ ہو جاؤں گی۔“ قندیل صاف گوئی سے کہے گئی۔

نقل کرتے ہوئے الفاظ کی کمی پر اور اور کرنے لگی وہ جانتی تھی کہ مجتبیٰ کو سندس کی شان میں قصیدہ گوئی کے سوا کوئی کام نہ تھا، مگر اسے حیرت کا جھٹکا لگا جب مجتبیٰ نے اس کے قصیدے کو مکمل کرنے کے بجائے خاموشی کا سہارا لیا تو وہ بھی سنجیدگی کے دائرے میں آنے لگی۔

”وہ سب میرا تصور ہے، مگر سندس اپنے انداز سے سوچنے کی عادی ہے۔“ مجتبیٰ نروٹھے انداز میں کہنے لگا۔ قندیل دوران گفتگو معمول کے کام بھی پنٹا رہی تھی ہاتھ میں گلاس لیے اب وہ فریزر کی طرف بڑھی تھی اس کی مصروفیت اس جانب اشارہ تھا کہ وہ مجتبیٰ سے کسی خاص بات کی توقع نہیں رکھتی تھی اس کے نزدیک مجتبیٰ نے خود کو محبت کے شیرے میں اس طرح ڈبو دیا تھا کہ اب اس کے لیے ذرا سی بے نیازی بھی ناقابل قبول تھی سندس کی زندگی کی کٹھنائیوں کا اسے اندازہ تھا۔

”قندی! اس کا اندر بھی اس کے ظاہر کی طرح جان لیوا ہے اسے دیکھ دیکھ کر ترپتا ہوں تو اس کی بات سن کر بھی بے سکون ہوں یہ محبت مجھے مار دے گی۔“ قندیل بچوں کی طرح بلبلا تے مجتبیٰ کے پاس چلی آئی اور اپنے مخصوص شفیق انداز میں اس کے بکھرے بال سمیٹنے لگی۔

”تو پوچھے گی نہیں کہ ہوا کیا ہے؟“ مجتبیٰ اپنی بات کی طوالت اور قندیل کے کچھ بھی دریافت نہ کرنے سے خود بھی بے زار ہو گیا تھا، سوا اپنے سر پر دھرا اس کا ہاتھ تھام کر سختی سے بولا۔

”اچھا بتاؤ، محب سے محبوب فریفتہ کی شان میں کیا گستاخی ہو گئی ہے او نہیں، کچھ الٹا ہو گیا میرا مطلب۔“ قندیل اس کے انداز کی نقالی میں ہمیشہ ناکام رہتی تھی، مگر باز پھر بھی نہیں آتی تھی۔ مجتبیٰ کے ہلکے سے قبضے نے اسے راحت فراہم کی۔

”رہنے دو کوئی گستاخی نہیں ہوئی بس ایک ذرا سی بات مجھے جذباتی کر گئی قندی! سندس ناروغ سے سوچنے کی عادی ہے۔“ قندیل نے مجتبیٰ کی بات سختی سے کالی

مجتبیٰ کی شادی کے تمام نیک وصول کرتے اور رسومات انجام دے کر تے وہ سوچوں کے ڈستے ناگ سے دامن بچاتی رہی۔ انس عارف کی آمد نے شادی کی رونقیں مزید بالا کر دی تھیں۔ مجتبیٰ کے چچا زاد انس کا اس کی شادی پر آنا گھر بھر کے لیے سر پر اتر سے کم نہیں تھا۔

سرخ جوڑے میں اس کے من آنگن کو مہکاتی سندس کو دیکھ دیکھ کر وہ نہال ہوا جاتا تھا۔ انس کے شرارتی کیمرے سے اس نے خوب رومانٹک پوز بنوائے تھے اس سارے ہنگامے میں مجتبیٰ سمیت سارے کزن قندیل کی غیر موجودگی کو نظر انداز کر چکے تھے جو بھیگے گالوں کو بے دردی سے رگڑتی کونے کھدروں میں ٹھسی جاتی تھی خود پر قابو رکھنے میں جب کامیاب نہ ہو پائی تو اشعر کے ساتھ گھر لوٹ گئی۔



”مجتبیٰ جاگ رہے ہو یا نیند میں چل کر آئے ہو۔“ شادی کے دو دن بعد علی الصبح مجتبیٰ کی آمد اسے حیرت زدہ کر گئی وہ دیر تک سونے کا عادی تھا ”جاگ رہا ہوں بلکہ کافی دیر گزر گئی جاگتے ہوئے سونا چاہتا تھا اسی لیے یہاں آیا ہوں۔“ مجتبیٰ کے لہجے میں خفیف سی افسردگی تھی۔

”یہاں سونے کے لیے، سندس کو لوری نہیں آتی!“ وہ شرارت برساتی آنکھوں سے پہلے تعجب اور پھر استہزائیہ گویا ہوئی۔

”حال دل کہنے آیا ہوں جب تک کہوں گا نہیں سو نہیں پاؤں گا۔“ وہ قیدرے جھنجھلا کر جیبا چبا کر بولا تھا اور یہ بات سچ بھی تھی وہ جب تک ”عظیم سامع“ کو سزائے سماعت نہ دیتا سکون سے رہ نہیں پاتا تھا۔

”اچھا تو کہو سندس نے جب پہلی صبح بیڈ روم میں آنکھ کھولی تو گویا کلیاں مسکرا اٹھیں، رات بھر کی پتوں پر گری شبنم کسمسا اٹھی، سورج کی کرنیں شرما گئیں اور۔ اور۔“

وہ ہنوز شرارتی انداز میں اس کے شاعرانہ تخیل کی

”دو سال سے مسلسل ٹیسٹ کروا رہی ہوں اب فاسٹ رپورٹس یہ ہی آئی ہے کہ میں بنجر زمین ہوں وائے عجب کوئی لینے سے انکاری ہے اور کسی کو قدرت دینے سے انکار کر دیتی ہے۔“ قیدی نہ چاہتے ہوئے بھی ساون بھاؤں برسا رہی تھی۔ کتنے تکلیف دہ آنسو ہوتے ہیں جو باہر کے ساتھ ساتھ اندر بھی گھائل کر دیتے ہیں بعض درد ایسے ہوتے ہیں جن کا درماں کوئی نہیں ہوتا، کوئی حرف تسلی نہیں ہوتا، کوئی مداوے عم نہیں ہوتا۔ مجتبیٰ کو رتی برابر بھی اس کے اندر کے اس زخم کا اندازہ ہوتا تو وہ اس کے سامنے کبھی یہ موضوع نہ چھیڑتا۔

”تم اتنا بڑا درد تنہا سہہ رہی تھیں مجھے بتایا تک نہیں۔“ مجتبیٰ چاہتے ہوئے بھی اس کے آنسو نہ پونچھ پایا ہاتھوں میں دم نہیں تھا یا اس درد میں بہتے آنسوؤں میں شدت ہی بہت ہوتی ہے۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ سندس کے ایک بچکانہ فیصلے پر جسے وہ سختی سے رد بھی کر چکا تھا وہ کتنا دلبرداشتہ تھا تو جس سے یہ امید ہمیشہ

کے لیے چھن جائے اس کی تڑپ اس کے کرب کا شاید ہی کوئی اندازہ کیا جاسکے۔

”یہ تمہاری شادی کے دنوں کی بات سے میں خوشی کے شادیاؤں میں اپنی کم بختی کا ماتم نہیں کرنا چاہتی تھی۔“ قیدی کی بات سے اختلاف کے باوجود اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔



”سندس! تھوڑا سا لے لو یار! ٹھنڈا ہو گیا تو پینے کے قابل نہیں رہے گا۔“ مجتبیٰ کی پکارتی آواز اور سندس کے نخریلے آوں ہوں نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ سجادی گھر میں قدم رکھتے ہی اس حسین ہلچل نے خوش گواریت کا احساس بخشا تھا وہ سیدھی صوفے پر دراز سندس اور سوپ کا پالہ ہاتھ میں لیے التجا کرتے اس کے پہلو میں بیٹھے مجتبیٰ کے پاس چلی آئی۔

تمہید بوریٹ کے مراحل میں داخل ہو گئی تھی۔

”قیدی! سندس کہتی ہے اسے کچھ سالوں تک بچے کا جینجھٹ نہیں پالنا، کتنی اسٹوپڈ سوچ ہے اس کی یار بچہ تو پیار کی نشانی، انسانی شناخت ہوتا ہے، مگر وہ اسے غیر ضروری ذمہ داری قرار دیتی ہے۔“ وہ بات کرتے کرتے قیدی کو دیکھ کر چونک گیا قیدی کا انداز اس کی توقع سے ہٹ کر تھا۔ وہ شدید کرب میں دکھائی دیتی تھی اپنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے دپائے آنکھیں پھاڑے دیوانوں کی مانند اسے تک رہی تھی ایک لمحے کو اسے لگا قیدی کی روح بدن سے الگ ہو گئی ہے ایسا شدید رد عمل مجتبیٰ کے لیے حیران کن تھا۔

”قیدی ٹھیک تو ہو؟“ ہوا کیا ہے، مجتبیٰ نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کر تقریباً ”جینجھوڑ ڈالا تھا“ تب وہ حواسوں میں لوٹی تھی اپنی عجیب کیفیت پر وہ خود بھی نادام دکھائی دیتی تھی خود کو کنٹرول کرتے کرتے بھی اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

”قیدی۔“

”میں ٹھیک ہوں مجتبیٰ! اس تمہاری طرح میں بھی جذباتی ہو گئی تھی۔“ مجتبیٰ کو حد سے زیادہ فکر مند دیکھ کر وہ اسے مطمئن کرتے ہوئے بولی۔

”بس قدرت کے کھیل پر حیران تھی، کہیں کوئی اس تحفہ کو بوجھ سمجھتا ہے تو کہیں کوئی یہ بوجھ اٹھانے کو تڑپتا ہے۔“ قیدی دلگرفتہ ضرور تھی، مگر قدرے سنبھل گئی تھی۔

”قیدی اب اصل بات بھی بتا دو۔“ مجتبیٰ کے ڈپٹے پر وہ استہزائیہ ہنسی تھی کیوں کہ دیر اس نے بتانے میں نہیں مجتبیٰ نے دریافت کرنے میں لگائی تھی۔

”سندس کو بچہ نہیں چاہیے اور قیدی کو بچہ دینے پر قدرت راضی نہیں۔“ وہ دو ٹوک لفظوں میں کہہ اٹھی۔ مجتبیٰ چونک گیا ایسی کسی بات کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا یہ قیدی کیا کہہ رہی تھی اس کی مسلسل خاموشی اور موجودہ کیفیت کی وجہ ہوگی یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

”دماغ تو نہیں خراب ہو گیا تمہارا کیوں ایثار بننے پر تلی ہوئی ہو یہ افسانوی باتیں کتابوں میں ہی اچھی لگتی ہیں یا فلموں میں، حقیقت میں زندگی ایسی فضول قربانیوں کی مشتمل نہیں ہو سکتی۔“ مجتبیٰ کی چیخ و پکار اس کے لیے نئی نہیں تھی اب تک جس نے بھی اس کے فیصلے کے بابت سنا تھا یوں ہی اسے سمجھایا اور دھمکایا تھا، کچھ دیر پہلے دیا بھی اپنی اکلوتی صابر بیٹی کو سمجھانے کا فریضہ ادا کر کے گئی تھیں۔ مجتبیٰ کو اس بات سے آگاہ بھی انہوں نے ہی کیا تھا اور وہ حسب توقع اس کے رویہ تھا۔

www.paksociety.com

”قدی! میں دیوار سے بات نہیں کر رہا تم سے مخاطب ہوں۔“ وہ قدیل کی مسلسل خاموشی پر ضرورت سے زیادہ چڑچکا تھا۔

”دیوار ہی تو ہوں میں، مٹی گارے سے بنی صرف ایک دیوار جس کی مٹی کبھی زرخیز ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی نیل پروان چڑھ سکتی ہے بے نمر درخت۔“ قدیل یاسیت کی انتہا پر تھی مگر حقیقت یہ تھی کہ اس کا ہر لفظ اس کے ذہنی کرب کا آئینہ دار تھا۔

”اسٹاپ اٹ قدیل! زندگی بے شمار خواہشات کا نام ہے، اسے صرف ایک خواہش اور حسرت کی نذر کر دینا عقل مندی نہیں، اولاد زندگی کے لیے ضروری ضرور ہے، مگر زندگی نہیں ہے سات رنگوں سے بنی ہوئی ایک حساس نازک عورت ہو تم، تمہارے اندر زندگی ہے، حرارت ہے، خوشی ہے، صرف ایک کمی تمہارے وجود کو مانس نہیں کر سکتی۔“ مجتبیٰ کبھی بلند، کبھی دھیمے، کبھی نرمی سے بہلاتے کبھی سختی سے دھمکاتے۔ ہر ممکن طریقے سے اسے سمجھانے کا فریضہ ادا کرتا رہا۔

”مگر یہ خوبیاں کسی کو نظر نہیں آتیں مجتبیٰ! تمہارے کہہ دینے سے اور میرے مان لینے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ شعر اور اس کی بہنوں کو مجھ سے وفا نہیں اولاد چاہیے اپنی ریاضت سے اسے اللہ کو راضی نہ کر سکی تو ان سب کو کیسے مناؤں؟ شعر کو دوسری شادی کی اجازت دے کر اپنی خدمت، وفا ایثار سب کچھ

”پی لو سندس! سوپ ہو یا پیار ٹھنڈا بہت جلدی ہو جاتا ہے۔“ وہ مجتبیٰ کی حمایت کرتی سندس سے شرارتی پن سے بولی۔

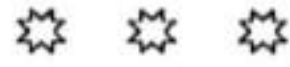
”قدی! تم ہی اسے سمجھاؤ، نہیں دل چاہ رہا کچھ بھی کھانے کو، منگی ہو جائے گی ایک تو زبردستی اس مصیبت میں الجھا دیا، اوپر سے کھلانے پلانے اٹھانے بٹھانے میں بھی زبردستی، تھوڑا وقت اور سکون سے گزار لیتے۔“ سندس پامن چاہی اور اللہ کی نعمت سے نوازی گئی، ہستی بھی مخربلی ادا میں کیسے نہ سمجھیں اس پر، مگر قدیل کے پھیکے پڑتے چہرے کو دیکھتے ہی مجتبیٰ موضوع بدلنے لگا۔

”او قدی! اب تو حویلی اپنے بھوت کو ترسنے لگی ہے کہاں رہتی ہوا تے اتنے دنوں تک صورت نہیں دکھاتیں۔“ مجتبیٰ سندس سے توجہ ہٹائے اس کے پاس آن بیٹھا تھا جو اپنے درد کو اپنی — کھلکھلاہٹ میں چھپائے پھر سے ہشاش بشاش دکھائی دیتی تھی۔

”بس وہ چچی جان تنہا ہوتی ہیں گھر میں، شعر تو پوسٹنگ کے بعد مہینوں گھر کا چکر نہیں لگاتا ہے اور تینوں سندس بھی کم کم ہی آتی ہیں اب ایسے میں چچی جان کو چھوڑ کے آنا اچھا نہیں لگتا۔“ قدی تفصیل سے بتانے لگی اشعرتین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ والد حیات نہیں تھے اور والدہ معذور تھیں قدیل نے اشعر کے ساتھ جانے کے بجائے ساس کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی اب وہ کیسے بتاتی کہ اشعر نے ساتھ لے جانے کی ضد ہی کب کی تھی

”ہیلو فرینڈز اور مائی ڈیر سندس! کیا حال چال ہیں؟“ انس کی اچانک پرجوش آمد اور زور دار حال احوال نے ماحول کو اچھا رخ دیا تھا، سندس کو الگ سے پکارنا قدیل کو عجیب لگا تھا، مگر مجتبیٰ کو مطمئن دیکھ کر وہ بھی نظر انداز کر گئی، باقی تمام وقت مجتبیٰ سندس کے صدقے واری جاتا رہا، انس سندس کو دیکھتے ہوئے قدیل سے محو گفتگو رہا اور وہ محض لایعنی سوچوں کو جھٹکتی مسکراتی رہی۔

اپنے ساتھ لیے زندگی گزار لوں گی وقت ہی ہے بیت جائے گا۔“ قندیل نے نہ صرف عزم سے فیصلہ کیا بلکہ ہمت اور حوصلے کے ساتھ اشعر کی دوسری شادی کروادی اس شرط پر کہ وہ اسے بھی خود سے جدا نہیں کرے گا۔ مجتبیٰ سمیت گھر والوں کے پاس سوائے کڑھنے کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہ بچا تھا۔



کبھی کبھی زبان سے نکلے الفاظ کا بوجھ اٹھانا کتنا مشکل ہو جاتا ہے اس کا اندازہ اسے اب ہوا تھا اولاد کی بابت قندیل کو دیتی اس کی طفل تسلیاں خود اسی پر لوٹ آئیں گی اس نے کب سوچا تھا؟ سندس کی بے احتیاطی تھی یا قدرت کو امتحان مقصود تھا؟ سندس کے بچہ ضائع ہونے سے انتہائی رنجیدہ خاطر کر دیا اوپر سے قندیل کا اس سے فاصلہ بڑھا لینا کہ اس کی نحوست کا سایہ مجتبیٰ کی زندگی پر پڑ گیا ہے اسے اور بھی تاؤ دلا گیا نتیجتاً وہ ”عظیم سامع“ کے کانوں میں لاوے کی طرح پھٹ پڑا۔

”قندی! میرا دل چاہتا ہے کہ تمہاری سب ڈگریاں سو روپے میں بیچ کر نان چھولے کھالوں کیسی پڑھی لکھی جاہل ہو، تعلیم نے تمہیں جمالت سے نکالا نہیں لگتا ہے اور بھی اندر دھنسا دیا ہے۔“

”جذباتی مت بنو مجتبیٰ! آنکھوں دیکھی حقیقت کو جھٹلاؤ مت نہ میں تمہاری زندگی میں ہونی نہ تمہاری اتنی قیمتی خواہش رائیگاں جاتی۔“ قندیل خود کو مورد الزام ٹھہرائے جاتی اور اسے اور بھی رنجیدہ کرتی تھی۔

”قندی خود کو اتنا بے مول کیوں سمجھ لیا ہے تم نے میری خواہش سے زیادہ قیمتی میرے لیے تم ہو۔ مخلص دوست سے بڑھ کر کوئی نعمت ہے دنیا میں اور ویسے بھی یہ صرف ایک آزمائش تھی میرے پیار کی اللہ چاہے گا تو میرے صبر کے بدلے مزید نوازے گا میں مایوس نہیں۔“

”ان شاء اللہ۔“

قندیل نے اس پر عزم چہرے کو دیکھتے پر خلوص لہجے میں کہا اور دل سے اس کی خوشیوں کے لیے دعا کی۔

وقت کی رفتار گھڑی کی سوئیوں کی مانند ہے تو زندگی بدلتے موسموں کی طرح ہر قدم پر نیا پینا دکھاتی ہے، کبھی غم کو خوشی کے رنگ میں ڈھال دے تو کبھی ہنستے ہنستے رلا دے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ لب بلا وجہ مسکراتے تھے۔ لایعنی باتوں میں کئی گھنٹے بیت جاتے تھے اور اب یہ عالم تھا کہ زندگی گزر رہی تھی اور وہ اس کا دامن تھامے ساتھ چلنے کی کوشش میں ہلکان ہوئے جاتے تھے۔ حد سے زیادہ خاموشی اس کے لیے ناقابل برداشت ہونے لگی تو بلا وجہ چائے سا سر میں انڈیل کر زوردار سرکیاں لینے لگی، سر سر کی آواز پر وہ خود ہی ہنس دی کافی دیر تک خواہ مخواہ ہنس ہنس کے وہ گہرا سانس لے کر اٹھ گئی۔

قندیل نے اشعر کو اپنی ایک صفت کی کمی پر خود سے دور کیا کیا، اس نے تو اس کی ذات ہی کی نفی کر دی اس کے ایثار کے عوض دو لفظ پیار کے بولنے کا بھی روادار

نہ رہا تھا۔ کئی کئی ماہ اس کی طرف نگاہ نہ کرنے والا یہ فراموش کر گیا کہ وہ صرف اولاد پیدا کرنے سے محروم تھی وگرنہ سانس لیتی، جیتی جاگتی انسان تو تھی، مگر ہمارے معاشرے میں ساری صلاحیتیں ایک طرف اور محض بچہ پیدا کرنا ایک طرف۔

”قندی! ایک کپ چائے مجھے بھی دو۔“ وہ اپنی سوچوں میں اتنی محو تھی کہ مجتبیٰ اس کے سامنے ڈائمنگ ٹیبل پر آن بیٹھا اسے خبر نہ ہوئی اور شاید مجتبیٰ بھی تھکا ہوا تھا وہ اس کی غائب دماغی اور پھر چونکنا کچھ بھی محسوس نہ کر سکا۔

”کیا ہوا؟ سندس کے بغیر ناشتہ کرو گے تو ہضم کیسے ہوگا۔“ وہ دونوں ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھاتے تھے اس لیے قندیل مسکرا کے بولی۔

”اب وہ گھر پر نہ ہو تو کیا بھوکا رہوں۔“ سندس میکے میں تھی اور وہ اداس، صورت حال تو بالکل واضح تھی وہ اس کے کپ میں چائے ڈال کر اپنی پلیٹ سے دو پاپے اٹھا کر اس کے سامنے رکھنے لگی، سر اسر شرارت کا موڈ

تھا کیوں کہ مجتبیٰ کو رسک سے کتنی چڑھتی وہ جانتی تھی، مگر حیرت کا مقام تھا کہ مجتبیٰ نے رسک چائے میں ڈبو کر منہ میں رکھ لیا غائب داعی یہیں نہیں وہاں بھی تھی۔ وہ ایک بار پھر بلاوجہ کھلکھلا اٹھی۔

”مجتبیٰ! بہت بدل گئے ہو۔“ وہ اس کی ناک کھینچ کر بولی۔

”ہاں، پیار ہر رنگ میں ڈھل جانا سکھاتا ہے، میں نے اپنی سوچ، پسند ناپسند، ترجیحات سب کو پیار کا جامہ پہنا کر سندس کا اوڑھنا بنا لیا ہے، وہ تکلفات سے کتراتا ہے اس نے ناشتے میں رسک رکھنا شروع کیا میں نے کھانا شروع کر دیا بس سو سمپل زیادہ لمبی چوڑی کہانی نہیں ہے میری۔“ مجتبیٰ کو عشق کا عجب بخار چڑھا تھا اپنی ذات کو کسی اور کے سانچے میں ڈھالنا کتنا مشکل امر ہے۔ قندیل کو سندس کی قسمت پر رشک آیا، سونے کے قلم سے نصیب لکھا گیا تھا سندس کا وہ سوچے بنا نہ رہ سکی۔

”ویسے ان عاداتِ شریفہ کے لیے ہمارے معاشرے میں ایک خاص اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔“ وہ شرارت سے لب و لہجہ میں دبائے بولی۔

”ارے میں مستند ”زن مرید“ ہوں مجھے بے شک گولڈ میڈل پہنا دو۔“ مجتبیٰ اس کا اشارہ سمجھ کر کمال ڈھٹائی سے بولا۔ قندیل کی بے ساختہ ہنسی نے بو جھل صبح کو خوش گوار کر دیا تھا۔



”مجتبیٰ!“

تیسری بار پکارنے پر مجتبیٰ نے سر اٹھایا تھا قندیل کو اس کی ذہنی براگندگی کا اندازہ ہوا۔

سندس میکے سے اس کے لیے دکھ لے کر آئی تھی ایک بار پھر تین ماہ کا حمل گر گیا تھا مجتبیٰ کے لیے انہونی انتہائی تکلیف دہ ثابت ہوتی تھی۔ اب کی بار وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ سندس کے متکبرانہ بول پکڑ میں آپکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پیار کی پھوار میں لڑائی کا

چھیننا پڑ چکا تھا۔ حسب معمول خالہ کے بلاوے پر قندیل دوڑی چلی آئی تھی قندیل کے والد کے انتقال کے بعد مجتبیٰ خالہ اور قندیل کو اپنے گھر لے آیا تھا، سو قندیل کا میکہ مجتبیٰ کا ہی گھر تھا اشعر کی دوسری شادی کے بعد وہ زیادہ تر وقت میکے میں ہی رہتی تھی، چچی جان سمیت، مگر وہ دن قبل اشعر کی آمد پر وہ گھر لوٹ گئی تھی، مگر آج پھر اس کے روبرو تھی۔

”قندی اسے سمجھاؤ یہ اس معاملے کو لے کر اتنا یوزیو کیوں ہے؟“ سندس دھیمے قدموں سے چلتی ان کے پاس آئی تھی، نقاہت اس کے چہرے سے عیاں تھی بے درپے نچے ضائع ہونے نے اس کی شادابی نچوڑ لی تھی، مجتبیٰ کی سندس اب پہلے جیسی نہ رہی تھی تب ہی تو مجتبیٰ کی چاہت کا اول روز کی طرح جنونی پن اسے اور بھی حیران کر دیتا تھا۔

”قندی اسے بتاؤ کہ میں ہریات سے بڑھ کر صرف اس کی ذات کے لیے فکر مند ہوں اب بھی میری تکلیف کا سبب اس کی یہ حالت ہے اگر یہ ذرا سی احتیاط کرے تو اسے اتنی بڑی اذیت نہ سہتا پڑے۔“

مجتبیٰ نے بھی قندیل کے ذریعے بات پہنچائی جو کہ وہ اچھی طرح جانتی تھی، سندس نے جہاں لفظوں کی ادائگی میں لایروائی کی تھی وہیں ضروری تدابیر کو بھی فضول سمجھا تھا، مگر قندیل کے لیے دونوں کو سمجھانا مشکل امر تھا، وہ سامع اچھی ضرور تھی، مگر ناصح بالکل نہیں تھی۔

”او کے لیواٹ یہ وقت تم دونوں کا ایک ساتھ بیٹھ کر دکھ سکھ بانٹنے کا ہے، گلے شکوے کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔“ وہ اپنی دانست میں دونوں کو پچکارتے ہوئے بولی۔

”میرے خیال میں ایک کپ چائے تو بنتی ہے۔“ انس کی اچانک انٹری اور بے محل فرمائش قطعاً دھیان دینے لائق نہیں تھی، مگر قندیل کے لیے مقام تعجب تھا کہ سندس نقاہت سے اٹھتی کچن کی طرف بڑھ گئی تھی، مجتبیٰ کا چونکنا اور اس کے پیچھے نظر دوڑانا

قدیل سے چھپانہ رہ سکا۔ مجتبیٰ کی نگاہوں کا نیا انداز اسے فکر مند کر گیا تھا۔



وقت کی گھٹن روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی مجتبیٰ کی شوخیوں کو نظر لگ گئی تھی تو سندس کی لاپرواہیاں اپنے عروج پر تھیں۔ اس کی گھر میں آمدورفت ضرورت سے زائد ہوتی جا رہی تھی تو مجتبیٰ کے ماتھے کے بل بھی بڑھتے جا رہے تھے۔ قدیل کی سات سالہ ازدواجی زندگی جمود کا شکار تھی۔ بھانگی دوڑتی وقت کی گاڑی کا ساتھ دینے کے چکر میں وہ بلکان ہو گئی تھی اس کی ذات سے حمل بے نیاز اشعر کو نہ وہ خوشیوں کے لمحات میں یاد رہتی تھی اور نہ وہ اس کے دکھ درد میں ساتھ دینے کو تیار تھا، مگر وہ اپنی تمام تر وفاؤں کے ساتھ محض نام کے رشتے کو نبھائے جا رہی تھی، مگر ذرا سی بات پر اتنا کچھ ہو جائے گا زندگی میں اتنی بڑی تبدیلی دور آئے گی اس نے کبھی سوچا نہ تھا۔ علی الصبح ناشتے کی میز پر اسے سر جھکائے بیٹھا دیکھ کر مجتبیٰ فکر مندی سے قریب چلا آیا تھا۔

”کیا ہوا قدی! تم اتنی صبح کیسے آئیں اور سر کیوں پکڑا ہوا ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ مجتبیٰ نے اسے یوں دیکھ کر پوچھا، اس کے اندر چاہے کتنے ہی طوفان ہوں وہ بظاہر ہشاش بشاش دکھائی دیتی تھی اس کے اندر کا دکھ اس کے چہرے سے عیاں نہ ہوتا تھا اس لیے اس کی غیر معمولی خاموشی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔

”میں رات میں ہی آگئی تھی تم اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔“ وہ پشیمردی سے گویا تھی اس نے کہا نہیں تھا، مگر صیاف ظاہر تھا کہ قدیل نے تمام رات اسی میز پر گزاری تھی۔

”قدی! چچی کو کس کے پاس چھوڑ کے آئی ہو؟“

”ان کا بیٹا آگیا ہے ان سے ملنے۔“ بظاہر مجتبیٰ نے لایعنی سوال کیا تھا، مگر قدیل کا استہزائیہ جواب سن کر چونک گیا۔

”شعر آیا ہے تو تم یہاں چلی آئیں کیوں؟“ وہ کم

ہی اس کے معاملات میں دخل اندازی کرتا تھا، مگر آج قدیل کی حالت زار اسے سوالات پر مجبور کر رہی تھی اور قدیل بھی شاید عاجز آچکی تھی خود کو خود میں مزید چھپانا اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا تب ہی اہل پڑی۔

”تو کیا کرتی؟ با نہیں پھیلا کر استقبال کرتی اس کا“ ڈیڑھ سال بعد ماں سے ملنے کے لیے بیوی بچوں سے جدا ہو کر آیا ہے، جب ماں سے مل لیتا ہے تو جاتے جاتے بیوی کا خیال آجاتا ہے، چند لمحے خیرات کی طرح جھولی میں ڈالنے والے کے لیے، پلکیں راہ میں بچھا دوں۔“ مجتبیٰ محض اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اسے لگا وہ بات کرنے سے اتنا عاجز پہلے کبھی نہ ہوا تھا ہر دم اس کے دکھ سکھ بانٹتی قدیل کی آنکھوں سے درد کی برسات رواں تھی اور وہ بس ایک ٹک اسے تگے جا رہا تھا۔

”رات کو آیا تھا اپنا حق وصول کرنے، مزید مہمان نہیں بن سکی، نہیں کر سکی خود پر جبر بیوی ہو کر یہ سب سہنا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے، میں لہو لہو ہو گئی ہوں مجتبیٰ۔“ وہ سسک رہی تھی اور مجتبیٰ سلگ رہا تھا۔ قدرت کو کچھ اور کھیل دکھانا تھا کہ اشعر کی غیر متوقع آمد

پر وہ چونک اٹھے۔

”مجتبیٰ اسے بتاؤ شوہر کے کیا حقوق ہیں اسلام میں، ساری رات شوہر ناراض رہے تو فرشتے کتنی لعنت بھیجتے ہیں اسے بتاؤ۔“ اشعر تن فن کر تاسیدھا مجتبیٰ سے مخاطب ہوا۔

”تمہیں معلوم ہے بیوی کے کیا حقوق ہیں اسلام میں، تم نے سارے فرائض پورے کر لیے ہیں!“

مجتبیٰ پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا ایک دم سے چلا اٹھا۔ اس کی چٹکھاڑتی آواز پر سب گھر والے کمروں سے نکل آئے۔

”کیا کمی کی ہے میں نے، ہر مہینے خرچا بھیجتا ہوں اور۔“

”اور خرچا بھیج کر تم احسان عظیم کر دیتے ہو اس پر۔“ اشعر کی بات کو کٹ کر وہ اتنی تیزی سے کرسی

خدمت گزار سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھا جبکہ مجتبیٰ کے اندر کیا غبار اٹھا تھا کہ وہ اب اور رعایت دینے کو تیار نہ تھا گھر بھر کی حمایت بھی اس کے چند لفظوں نے حاصل کر لی تھی۔

”آج قندی کی اس حالت کے ذمہ دار صرف اشعر نہیں ہم سب بھی ہیں۔ اگر وہ بھول گیا تھا کہ وہ ایک جیتی جاگتی انسان ہے تو فراموش تو ہم نے بھی کر دیا تھا کہ صرف موت زندگی اور اس کی خواہشات کی تابع ہے کوئی کمی یا عیب زندگی ختم نہیں کر سکتا۔

وہ صرف بچہ پیدا نہیں کر سکتی تھی، مگر اس کے اندر دل تو دھڑکتا تھا، چاہے جانے کی کشش اسے بھی تو کھینچتی تھی۔ بے اثر دن بے کیف راتیں وہ کیسے گزارتی تھی؟ اس کی زندہ تمنائیں، آرزو میں اس جرم کی یاداش میں مردہ ہو گئیں، جو اس نے کیا ہی نہیں تھا وہ خود کو خاک کرتی گئی اور ہم اسے داد دیتے رہے، اسے اپنے بارے میں سوچنا ہوگا، خود غرض، مفاد پرست انسان کے لیے قندیل کی انمول و فواللہ کی دی ہوئی نعمت کا زیاں ہے، اللہ کے کارخانے میں سب کھلونے ایک ہیئت کے نہیں تو ایک فطرت کے بھی نہیں ہوتے، ایک بد فطرت سے کنارہ کشی کرو، اللہ تمہیں تمہاری وفا کا طلب گار کوئی مخلص انسان نواز دے گا بنا دھاگے کے سوئی سے جتنی مہارت بھی ہو کشیدہ کاری کبھی نہیں ہو سکتی۔“

اور قندیل نے مخلص انسان کے لیے نہیں اپنی عزت نفس کے لیے اشعر سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ کیوں کہ وہ مزید اس کے گلے کا ڈھول نہیں بننا چاہتی تھی۔ ایثار و وفا کی کہانی بے حسی و تنگ نظری کی نذر ہو گئی۔



قندیل کی روٹین میں سوائے اس گلے کہ اس کے نام کے ساتھ اشعر کا نام نہ رہا تھا، کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی اس گھر میں بھی وہ اور دن بھر کے معمولات ہوتے تھے اور یہاں بھی وہی صبح ہوتی تھی،

سے اٹھا کہ گویا تو نہیں یا میں نہیں کا ارادہ ہو، قندیل ہونق ہو کر دونوں کے مابین تلخی کو دیکھ رہی تھی۔

”تمہارے ساتھ زندگی بھر کا بندھن باندھنے والی، تمہارے گھر اور عزت کی رکھوالی کرنے والی، تمہاری ماں کی خدمت گزار، تمہاری بلا معاوضہ نوکرانی، تمہیں اپنی مرضی سے تمہاری خواہش کی خاطر پانٹ دینے والی کے لیے تمہارے نوٹوں کے چند کاغذ کتنی بڑی نوازش ہے۔“

”ہاں تو اور کیا کروں میں، گلے بڑے ڈھول کو بجاتا رہوں۔“ اشعر کی بات تھی کہ کند چھری کا زخم۔ اسے لگا وہ زمین میں دھنس گئی ہو، زندگی بھر کی ریاضت، ایثار، خدمت و کوڑی کی ہو گئی تھی اور وہ خود شاید دو پیسے کی بھی نہ رہی تھی، اتنی اذیت شاید ہی کسی تیز دھار آلے کے لگے زخم سے ہو پائے۔

”تو کیوں باندھ کے رکھا ہوا ہے اسے اپنے ساتھ لے جا اپنی ماں کو اپنی لاڈلی بیوی کے پاس، آزاد کروے نا اس کو۔“ مجتبیٰ کو قندیل کی تکلیف نے اتنا جذباتی کیا کہ وہ اشعر کا گریبان پکڑے جانے کیا بول پڑا کس کس نے اس کے منہ پر ہاتھ نہ رکھا، کون کون ان دونوں کو دست و گریبان ہونے سے نہیں روک رہا تھا، اگر کوئی بے جان بت تھا تو وہ قندیل کا وجود تھا۔ دھندلا ہٹ پڑھتی جا رہی تھی اور آوازیں دور سے دور ہوتی جا رہی تھیں شاید اس نے کچھ تھامنے کی کوشش بھی کی تھی، مگر لا حاصل زندگی کی طرح یہ کوشش بھی رائیگاں گئی۔



وہ حواسوں میں آنا نہیں چاہتی تھی، مگر اپنوں کی دعائیں زیادہ پراثر تھیں۔ دبا کی آنکھ سے بہتے آنسوؤں نے اسے باور کرایا کہ سب سے مہلک درد وہ نہیں جو دوسرے ہمیں دیتے ہیں، جان لیوا تکلیف وہ ہے جو ہماری ذات سے اپنوں کو پہنچے اور وہ اس گناہ عظیم کی مرتکب نہیں ہونا چاہتی تھی، ماں سے لپٹ کر حسب عادت اپنے آنسو اپنے اندر گرانے لگی۔

مجتبیٰ کے اشتعال دلانے کے باوجود اشعر ”عظیم

WWW.PAKSOCIETY.COM
 قدیل وجہ افسردگی کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے گھر کر بولی تھی۔

”میکے اس لیے بھیجا تھا تاکہ وہ میری چاہت سے اکتانہ جائے، میری محبت اس کے لیے بوجھ نہ بن جائے مگر میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ آیا وہ میری وفا کے لائق ہے بھی یا نہیں۔“ مجتبیٰ کی اگر حالت مختلف تھی تو یہ الفاظ بھی اس کے منہ نہ لگتے تھے قدیل حق دق رہ گئی۔

”مجتبیٰ ذرا سی بات پر اتنا غصہ۔“

”قدی! چپ ہو جاؤ اس کی حمایت میں ایک لفظ بھی مت کہنا جس نے میرے اعتماد کی دھجیاں اڑا دیں۔“

مجتبیٰ کیا کہہ رہا تھا وہ کچھ بھی اخذ کرنے سے قاصر تھی اس کی چھٹی حس اشارہ ضرور کر رہی تھی کہ بات کچھ ایسی تھی جو مجتبیٰ کی برداشت سے باہر تھی۔
 ”مجتبیٰ ہوا کیا ہے کچھ بتاؤ تو سہی؟“

اس کی زبان سے تو سوال بھی انتہائی وقت سے ادا ہوا تھا، دو روز قبل سندس کو میکے چھوڑنے کے لیے مجتبیٰ خود گیا تھا اور سندس کی پیکنگ تو خود قدیل نے اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔ وہ کچھ دن رہنے کے ارادے سے گئی تھی اور آج صبح ہی مجتبیٰ نے اسے واپس لانے

کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا۔ جس کا زبا سمیت سب نے خیر مقدم کیا تھا، مگر شام کو مجتبیٰ کا یہ رویہ بے حد پریشان کن تھا۔

”اس نے کہا تھا کہ اس کے والد کی ناسازی طبع کے باعث وہ کچھ دن میکے میں رہے گی میں نے اسے گھر کے دروازے پر ڈراپ کیا تھا اس نے اندر آنے کی آفر نہیں کی وقت میرے پاس بھی نہیں تھا اس لیے آفس چلا گیا، دو دن سے اس سے فون پر مستقل رابطہ رہا ہے، کل رات کو ہم نے کافی دیر بات کی تھی اور آج میں اسے کال کر کے واپسی کا پروگرام طے کرنا چاہتا تھا میری کال کرنے سے قبل اس کے والد کی کال آگئی میں سمجھا سندس نے ان کے سیل سے کال کی ہے مگر اس

شام ہوتی تھی فرق تھا تو صرف یہ کہ اب وہ پل پل اپنی ناقدری پر مرنی نہیں تھی اپنوں کی شفقت تلے زندگی جینا قدرے آسان ہو گیا تھا۔

لیکن پرسکون وہ اب بھی نہیں تھی۔ مجتبیٰ کی شادی شدہ زندگی ڈولتی سنبھلتی ناؤ اسے بے چین کر دیتی تھی۔ مجتبیٰ کی عشقی دیوانگیوں سے کاش وہ واقف نہ ہوتی تو یقیناً اسے مجھوتہ کی زندگی گزارنے کی تلقین ضرور کرتی۔

سندس کے لیے اپنی چاہت، سوچ، سرمایہ سب کچھ وقف کر دینے والے مجتبیٰ سے سندس کے معمولات روزمرہ محض ٹیچ ہوتے تھے ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا تو خواب و خیال کی بھی بات لگتی تھی قدیل کے صبر کی تو ہر کوئی داودیتا تھا، مگر قدیل کے نزدیک آفرین تھی مجتبیٰ کے کردار کو کہ وہ سندس کے بارے میں حرف شکایت تو کیا ہی زبان پر لاتا اس کے لیے ناروا سوچنا بھی مجال سمجھتا تھا ہاں تقاضائے فطرت کے تحت طلب عشق کی تشنگی اس کے شکستہ وجود سے عیاں رہتی تھی اب اس سے بڑھ کر وہ اپنے ضبط و تحمل کی کیا مثال دیتا کہ قریبی ذرائع سے ملنے والی خبر کے تحت سندس نے تین ماہ کے حمل کو خود گرا دیا تھا وہ کمال ضبط

سے برداشت کر گیا تھا اور سندس کی ایک نرم مسکراہٹ سے کی گئی سوری پر اپنی وفا کو آزما گیا تھا۔

تقدیر لکھنا اپنے اختیار میں ہوتا تو وہ دکھ سکھ کی پگڈنڈیوں پر زندگی کی گاڑی گھیٹ ہی لیتے۔ مگر کاتب تقدیر کی منشا کچھ اور ہی تھی پل پل محبوب کی قصیدہ گوئی کرتی زبان سے ایسے کلمات ادا ہوں گے یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

مضحل قدموں کی چال تو مجتبیٰ کی کئی ماہ سے تھی مگر اس قدر شکستگی گویا کندھوں پر کئی من بوجھ لا دے ہو وہ ندھال سا عظیم سامع کے سامنے آن گرا تھا۔

”مجتبیٰ! سندس کو میکے بھیجتے ہی کیوں ہو؟ جو تمہاری ایسی حالت ہو جاتی ہے بالکل غافل ہو جاتے ہو خود سے۔“

مجتبیٰ کے استفہام پر قدیل اسے دیکھ کر رہ گئی اپنے تئیں وہ اسے سمجھانے کے لیے آئی تھی مگر مجتبیٰ نے اس کے محض ایک جملے پر کہ سندس کو ایک موقع اور دو جس کرب سے دو لفظ ادا کیے تھے وہ دل چیرنے کو کافی تھے۔

”قدی اب بھی تم کہتی ہو اسے ایک موقع اور دوں وہ میرے اخلاص کو پاؤں تلے روندے کسی اوپر چاہت لٹاتی رہی، میرے بچوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرتی رہی اور میں ایک سوری سے بہکتا رہا اور تم کہتی ہو ایک موقع اور دوں، سب سے تو رہا تھا اول دن سے اس کی بے پروائیاں، بد تمیزیاں، منافقت سب کو انکور کر رہا تھا، مگر وہ میری وفا کو یوفائی کے دلکش کاغذ میں لپیٹ کر کسی اور کی دہلیز پر چھوڑ آئی اور میں آنکھوں پر غفلت کی ٹی چڑھائے عشق کی پتنگ اڑاتا رہا۔ ڈور کی طرح اس کے ہاتھوں میں الجھتا رہا وہ بوجھ کی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ منتقل کرتی رہی، سینے پر گولی مار دیتی تو معاف کر دیتا مگر پیٹھ پر بے وفائی کا تیرپوست ہو تو معاف کرنا روح قبض ہونے سے زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔“



سلگتی تلخ باتوں سے
بڑے بے درد ہاتھوں سے
لو دیکھو! ہاروی تم نے

محبت
ماروی تم نے

اس نے محبت کیا ہاری تھی؟ لگتا تھا زندگی ہاروی تھی، حسرتوں کے سائے تلے زندگی رواں تھی، جمود عم سے نجات کے لیے اور والدین کی بوڑھی امید بھری نگاہوں کی خاطر اس نے ایک نئے بندھن کی ہامی بھری تھی ویسے بھی جب اپنے لیے جینا دشوار ہو جائے تو اپنوں کے لیے جینا سہل ہو جاتا ہے۔

اک نئی مہم کا آغاز ہو گیا تھا، دن بھر تصویروں کا تبادلہ ہوتا تو کہیں فون پر معاملات طے کیے جاتے، کبھی

کے والد نے فون پر جو کہا اس نے میرے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی ہے۔“

مجتبیٰ یہ سب بتاتے ہوئے قدرے بہتر حالت میں تھا مگر آگے کی بات کہنے کے لیے اسے خود پر کئی گنا جبر کرنا پڑا تھا، قدیل کو لگا کہ شاید وہ آج کے بعد کبھی بول بھی نہیں پائے گا اور جو اس نے کہا اس نے قدیل پر بھی آسمان گرا دیا تھا۔

”قدی! تین دن سے سندس میرے گھر سے دور اپنے میکے میں ہے مگر آج اس کے والد نے فون کر کے کہا کہ سندس کو ان سے ملوانے لے آؤں، کئی دنوں سے اس کی صورت نہیں دیکھی۔“

قدیل ہی نہیں مجتبیٰ کے الفاظ سماعت کرتے اس والدین اور دیا کی بھی حالت مجتبیٰ سے یکسر مختلف نہ تھی اور سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا کہ سندس میکے نہیں گئی تھی تو تین دن سے کہاں تھی؟



کسی کی چاہت کامن لیے دل بھاتی نرم مسکراہٹ چہرے پر سجائے، آنکھوں میں رخ کا شمار لیے سندس لوٹ آئی تھی، مگر اس کی انتہا پسندی کو طفلانہ سوچ قرار دے کر انکور کرنے والے اس پر اپنی جنونی چاہت

لٹانے والے کی ضبط کی صراحی چھلک چکی تھی، طرف کا ظروف مزید ناقدری سہنے کو تیار نہ تھا۔ مجتبیٰ کی نگاہیں جن قدموں پر صدقے واری جاتی تھیں ان کی بے راہ روی پر شعلے برسائے لگیں نہ سندس کی تلویحات و وضاحتیں اسے مطمئن کر سکیں نہ دونوں کے والدین کی کوششیں بار آور ہو میں دل کا شیشہ بل آنے سے زنگ آلود ہو گیا، عشق کا مجنوں، فیصلہ کرنے میں بھی جنونی ثابت ہوا۔ اور چاہت کے دھاگوں میں پرو کے انتہائے شوق سے استوار ہوا بندھن، بے وفائی کے چھینٹوں سے داغ دوار ہو گیا۔

”ایک موقع اور۔“

احساس کا وفا کا اعتبار کا۔

مجتبیٰ کی نگاہوں میں کیا تھا وہ کیا مانگ رہا تھا؟ اس سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ وفا کی بے قدری اس نے بھی سہی تھی اور انمول وفا کو مٹی ہوتا مجتبیٰ بھی دیکھ چکا تھا واقف غم تھے قدرت نمکسار بنانا چاہتی تھی۔

”جذبائی ہو کر فیصلہ مت کرو میں بے شمر شہنی تمہیں کیا دے پاؤں گی؟“

”وفا تو دو گی نال۔“

قدیل کی جانب ہاتھ بڑھائے وہ کیا طلب کر رہا تھا اولاد سے بڑھ کر وفا قرار پائی تھی یہ کون سے دیس کی بولی تھی دادی نانی کی کہانیوں میں ایسا کبھی نہ ہوا تھا یہ الف لیلیٰ کس نے کہی تھی۔

”ایک کھوکھلے بندھن اور بے حس شخص کے لیے اپنی وفائٹا سکتی ہو ایک کمزور رشتے کے کچے دھاگے میں انتظار کے موتی پرو سکتی ہو تو یہ دولت میرے کا سے میں کیوں نہیں ڈال سکتیں۔ میں مجبور نہیں بنوں گا وفا میں چور بھی نہیں ہوں گا محبت ہار چکا ہوں چاہتے مار چکا ہوں مگر قدر وفا زندہ ہے طلب ستائش بھر پور ہے۔ آغوش الفت چاہیے ساری دنیا چھان لی صرف تمہارے وجود کی سیپ میں وفا کا موتی پایا ہے بے شرم نہیں ہو محروم وہ ہیں جو تمہارے فیض نہاں کو نہ پاسکے تم پرستان الفت کی ایک رنگین سنی ہو۔ میں کارگاہ عشق کا خاک نشین ہوں وفا کے دریا میں اتر جائیں گے رنگ زندگی کا پاجا میں گے تیار ہو!“

وہ لفظ لفظ بولتا تھا، تخیل کے تاج محل بنا تھا قدیل ایثار کا سنگھار تھی مانگنے والے نے مانگا تو صرف اعتبار وفا اور عطا کرنے والے نے صرف ایک نعمت نہ دی تھی باقی تو نعمتوں کی انتہا کی تھی وہ کس کی ناشکری کرتی دینے والے کی یا مانگنے والے کی۔



کوئی رشتہ جڑوانے والی خالہ تشریف فرما ہوتیں تو کبھی نین نقوش پر سیر حاصل تبصرے ہوتے پہلی بار میں مجتبیٰ نے رشتہ کروانے کی درد سری سے والدین کو نجات دے دی تھی مگر اس بار اس کی لاپرواہی اور خاموش تماشائی جیسی صورت نے اپنوں کو جو کھم میں ڈال دیا تھا قدیل کی بھرپور حمایت و مدد کے زیر اثر یہ مہم جاری تھی۔

تقریباً سال بھر کی محنت کے بعد جب سب معاملات طے ہونے کے قریب تھے والدین نے اپنی دانست میں اولاد کے لیے ہیرا تلاش کر لیا تھا بندھن جڑ جانے کے قریب تھا کہ مجتبیٰ کے فیصلے نے جامد زندگی میں ارتعاش پیدا کر دیا ہر ایک کو اپنے فیصلے سے مطمئن کراتا بالآخر وہ لمحہ آن پہنچا جس کا اسے انتظار تھا۔

قدیل اس کے رویہ تھی آنکھوں میں حیرت کا رنگ کیے وہ بے درپے انہونی کا ایک عرصے سے سامنا کرتی آئی تھی مگر یہ غیر متوقع امر کی حد تھی یا اس کے تصور سے کہیں بڑھ کر بات تھی جو وہ یقین کی دنیا میں لوٹنے کو تیار نہ تھی۔ اس سے تصدیق کرانے آئی تھی مگر خاموش نگاہوں سے نکلتی رہی زبان تو کچھ بھی نہ کہنے کی قسم کھا بیٹھی تھی۔

”قدی ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟ اتنی بے یقین کیوں ہو“ مجتبیٰ نے بنا اس کے پوچھے جواب دینا شروع کیا۔

وہ جانتا تھا مدتوں سے امید سے ناتا توڑنے والی کو یقین آتے بھی مدتیں ہی لگتا تھیں۔

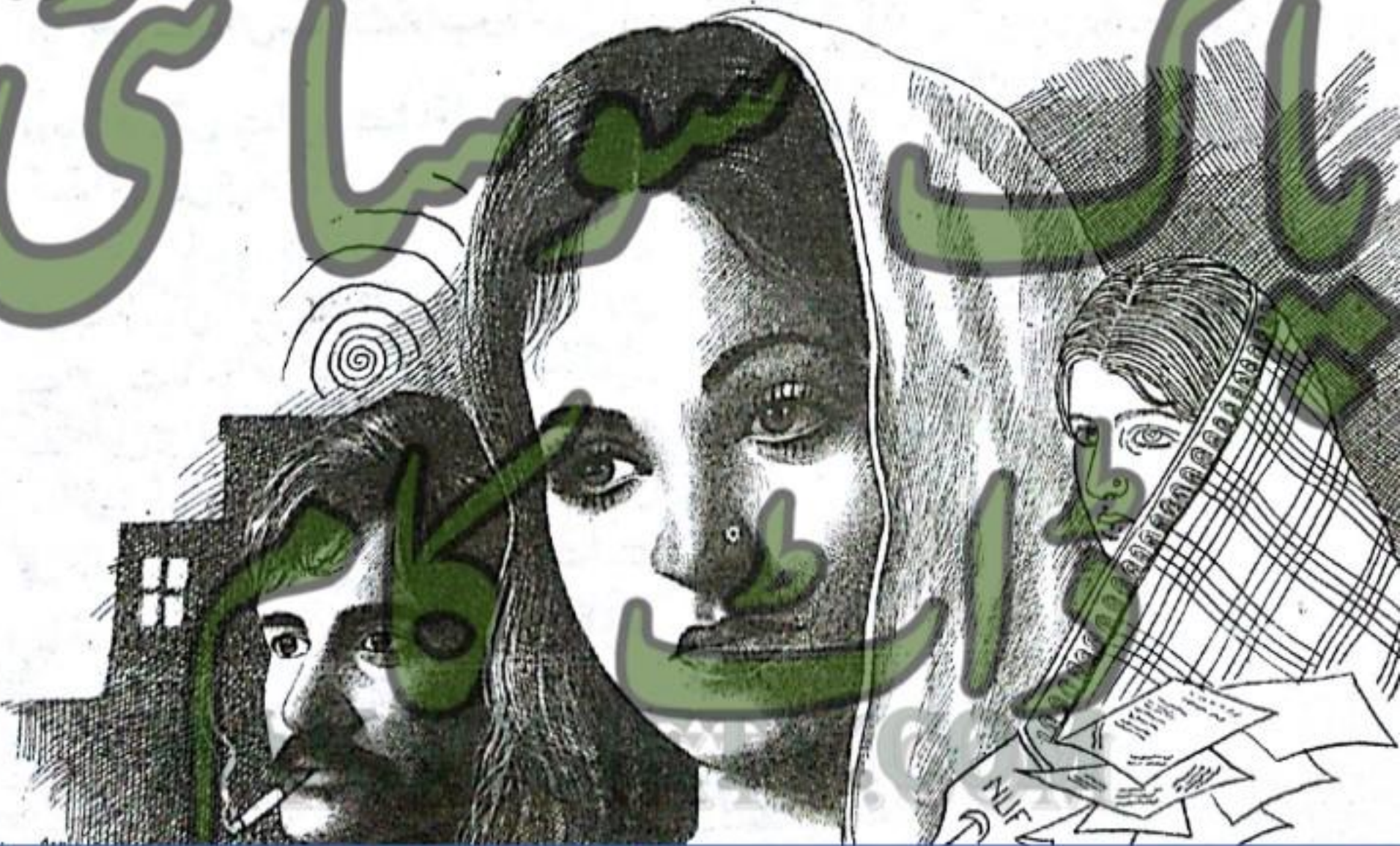
”مجتبیٰ ایک بار پھر غلط فیصلہ کر رہے ہو خوش نصیب ہو زندگی تمہیں صینے کا ایک موقع اور دے رہی ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ گھائے کا سودا نہ کرو۔“ قدیل کے لفظوں میں اس کی بیٹی زندگی کا عکس تھا۔

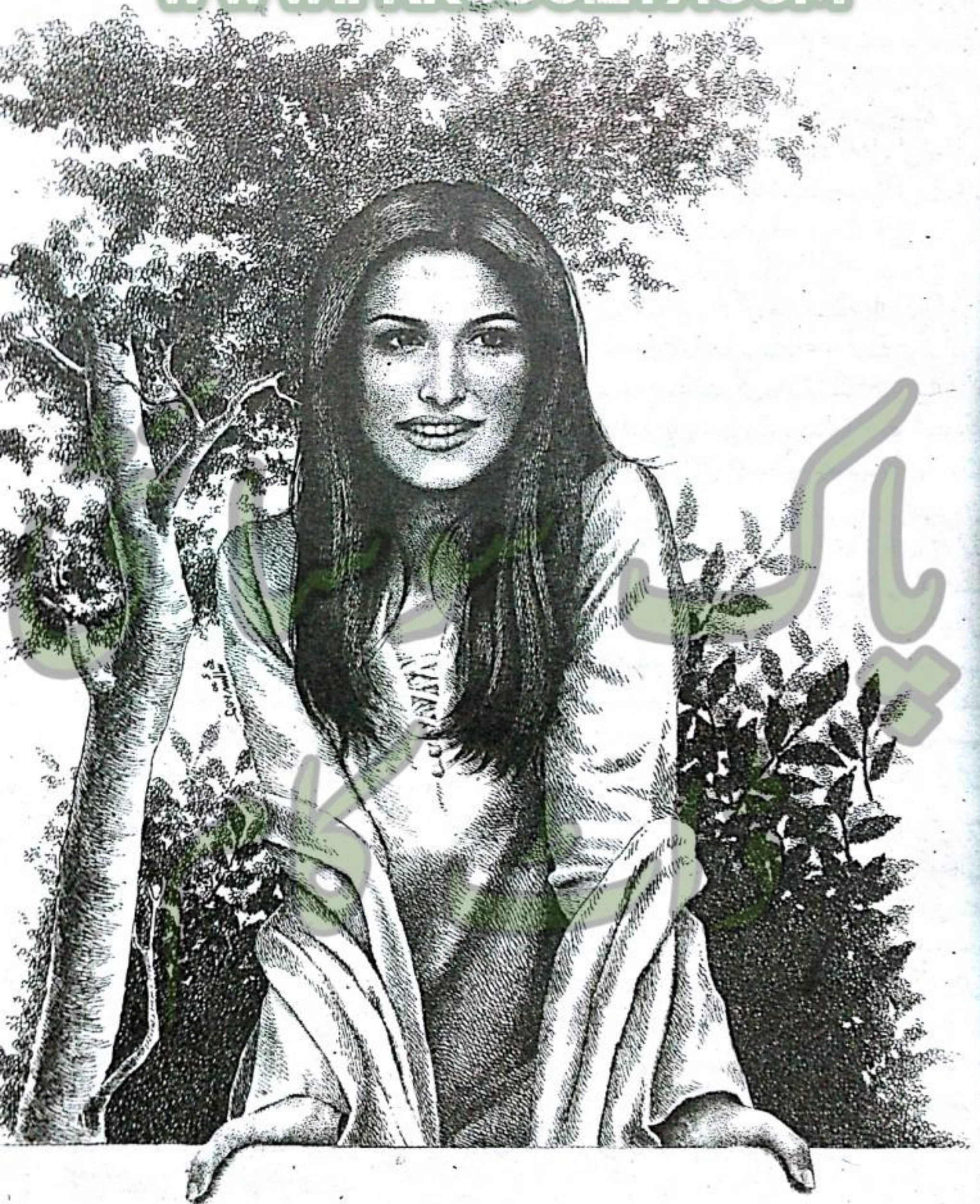
”قدی! دل کی ماننے والا ہوں دل ہی سے سوچوں گا۔ خواہ ہر بار دل دھوکا ہی کیوں نہ دے پہلے اسے اپنایا تھا جس کے لیے دل دھڑکتا تھا اب اس کا ہاتھ تھامنا چاہتا ہوں جس کے سینے میں دل دھڑکتا ہے

بین ما کی دنیا

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معین، زارا اور ایزد۔ صالحہ، امتیاز احمد کی بچپن کی منگیت تھی مگر اس سے شادی نہ ہو سکی تھی۔ صالحہ دراصل ایک شوخ، الٹھی لڑکی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند تھی مگر اس کے خاندان کا روایتی ماحول امتیاز احمد سے اس کی بے تکلفی کی اجازت نہیں دیتا۔ امتیاز احمد بھی شرافت اور اقدار کی پاس داری کرتے ہیں، مگر صالحہ ان کی مصلحت پسندی، نرم طبیعت اور احتیاط کو ان کی بزدلی سمجھتی تھی۔ نتیجتاً "صالحہ نے امتیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان ہو کر اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے گزن مراد صدیقی کی طرف مائل ہو کر امتیاز احمد سے شادی سے انکار کر دیا۔ امتیاز احمد نے اس کے انکار پر دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کر کے صالحہ کا راستہ صاف کر دیا تھا مگر سفینہ کو لگتا تھا جیسے ابھی بھی صالحہ، امتیاز احمد کے دل میں بستی ہے۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھا دیتا ہے۔ وہ جواری ہوتا ہے اور صالحہ کو غلط کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ صالحہ اپنی بیٹی ابیہا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہے مگر ایک روز جوئے کے اڈے پر ہنگامے کی وجہ سے مراد کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کر لیتی ہے۔ اس کی سہیلی زیادہ تنخواہ پر دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے جو اتفاق سے امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ اس کی سہیلی صالحہ کو امتیاز احمد کا وزیٹنگ کارڈ لاکر دیتی ہے جسے وہ اپنے پاس محفوظ کر لیتی ہے۔ ابیہا میٹرک میں ہوتی ہے۔ جب مراد رہا ہو کر آجاتا ہے اور بڑانے دھندے شروع کر دیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ابیہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ فوراً "آجاتے ہیں اور ابیہا سے نکاح کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا بیٹا معین احمد باپ کے اس راز میں شریک ہوتا ہے۔ صالحہ مر جاتی ہے۔ امتیاز احمد، ابیہا کو کالج میں داخلہ دلا کر بائبل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ وہاں جتنا سے اس کی





دوستی ہے جو اس کی روم میٹ بھی ہوتی ہے مگر وہ ایک خراب لڑکی ہوتی ہے۔ معینز احمد اپنے باپ سے ابیہا کے رشتے پر ناخوش ہوتا ہے۔ زار اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معینز اسے بے عزت کر کے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زار کی نند رباب ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ وہ تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کر کے ان سے پیسے بنور کر ہلا گلا کرنے والا مزاج رکھتی ہے اور اپنی سہیلیوں کے مقابلے اپنی خوب صورتی کی وجہ سے زیادہ تر ٹارگیٹ جیت لیا کرتی ہے۔ رباب معینز احمد میں بھی دلچسپی لینے لگتی ہے۔ ابیہا کا ایک سیڈنٹ ہو جاتا ہے مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معینز احمد کی گاڑی سے ٹکرانی بھی کیونکہ معینز اپنے دوست عون کو آگے کر دیتا ہے۔ ایک سیڈنٹ کے دوران ابیہا کا پیرس کہیں گر جاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا کر پاتی ہے۔ نہ ایگزامز کی فیس۔ بہت مجبور ہو کر وہ امتیاز احمد کو فون کرتی ہے مگر وہ دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ابیہا کو بحالت مجبوری ہاسٹل اور ایگزامز چھوڑ کر حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔ وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ماما جو کہ اصل میں ”میم“ ہوتی ہیں زور زبردستی کر کے ابیہا کو بھی غلط راستے پر چلانے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا بہت سر پختی ہے مگر میم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امتیاز احمد دوران بیماری معینز سے اصرار کرتے ہیں کہ ابیہا کو گھر لے آئے مگر سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز احمد کا انتقال ہو جاتا ہے۔ مرنے سے قبل وہ ابیہا کے نام پچاس لاکھ گھر میں حصہ اور ماہانہ دس ہزار کر جاتے ہیں۔ اس بات پر سفینہ مزید تیخ پا ہوتی ہیں۔ معینز ابیہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے مگر ابیہا کا کچھ پتا نہیں ملتا۔ وہ چونکہ رباب کے کالج میں پڑھتی تھی۔ اس لیے معینز باتوں باتوں میں رباب سے پوچھتا ہے مگر وہ لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔

عون معینز احمد کا دوست ہے۔ ثانیہ اس کی منکوحہ ہے۔ مگر پہلی مرتبہ بہت عام سے گھریلو حلیمے میں دیکھ کر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتا ہے۔ جبکہ ثانیہ ایک پڑھی لکھی ذہین اور با اعتماد لڑکی ہوتی ہے۔ وہ عون کے اس طرح انکار کرنے پر شدید ناراض ہوتی ہے۔ پھر عون پر ثانیہ کی قابلیت کھلتی ہے تو وہ اس سے محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے مگر اب ثانیہ اس سے شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ دونوں کے درمیان خوب ٹکراؤ چل رہی ہے۔

میم ابیہا کو سیفی کے حوالے کر دیتی ہیں جو ایک عیاش آدمی ہوتا ہے۔ ابیہا اس کے دفتر میں جا ب کرنے پر مجبور کر دی جاتی ہے۔ سیفی اسے ایک پارٹی میں زبردستی لے کر جاتا ہے جہاں معینز اور عون بھی آئے ہوتے ہیں مگر وہ ابیہا کے یکسر مختلف انداز حلیمے پر اسے پہچان نہیں پاتے تاہم اس کی گھبراہٹ کو محسوس ضرور کر لیتے ہیں۔ ابیہا پارٹی میں

ایک ادھیڑ عمر آدمی کو بلا وجہ بے تکلف ہونے پر تھپڑ مار دیتی ہے۔ جو اب ”سیفی“ بھی اسی وقت ابیہا کو ایک زوردار تھپڑ جڑ دیتا ہے۔ عون اور معینز کو اس لڑکی کی تذلیل پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ گھر آ کر سیفی میم کی اجازت کے بعد ابیہا کو خوب تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اسپتال پہنچ جاتی ہے۔ جہاں عون اسے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا معینز کی گاڑی سے ایک سیڈنٹ ہوا تھا۔ عون کی زبانی یہ بات جان کر معینز سخت حیران اور بے چین ہوتا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں سیفی سے میٹنگ کرتا ہے۔ مگر اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ ثانیہ کی مدد سے وہ ابیہا کو آفس میں موبائل بھجواتا ہے۔ ابیہا بمشکل موقع ملتے ہی ہاتھ روم میں بند ہو کر اس سے رابطہ کرتی ہے، مگر اسی وقت دروازے پر کسی کی دستک ہوتی ہے۔ حنا کے آبلنے سے لے اپنی بات ادھوری چھوڑنی پڑتی ہے۔ پھر بہت مشکل سے ابیہا کا رابطہ ثانیہ اور معینز احمد سے ہو جاتا ہے۔ وہ انہیں بتاتی ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ میم اس کا سودا کرنے والی ہیں لہذا اسے جلد از جلد یہاں سے نکال لیا جائے۔ معینز احمد ثانیہ اور عون کے ساتھ مل کر اسے وہاں سے نکالنے کی پلاننگ کرتا ہے اور یہیں اسے اپنا پرانا راز کھولنا پڑتا ہے۔

وہ بتا رہا ہے کہ ابیہا اس کے نکاح میں ہے مگر وہ پہلے اس نکاح پر راضی تھا نہ اب پھر ثانیہ کے آئیڈیا پر عمل کرتے ہوئے وہ اور عون میڈم رعنا کے گھر جاتے ہیں۔ میڈم ابیہا کا سودا معینز احمد سے طے کر دیتی ہے، مگر معینز کی ابیہا سے ملاقات نہیں ہو پاتی کیونکہ وہ ڈرائیور کے ساتھ بیوی پار لرنی ہوتی ہے۔ وہاں موقع ملنے پر ابیہا ثانیہ کو فون کر دیتی ہے۔ ثانیہ بیوی پار لرنی بھیج جاتی ہے۔ دوسری طرف تاخیر ہونے پر میڈم حنا کو بیوی پار لرنی بھیج دیتی ہے مگر ثانیہ ابیہا کو وہاں سے

نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ثانیہ کے گھر سے معیذ اسے اپنے گھر انیکسی میں لے جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر سفینہ بیگم بری طرح بھڑک اٹھتی ہیں، مگر معیذ سمیت زارا اور ایزدا نہیں سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معیذ احمد اپنے باپ کی وصیت کے مطابق ابیہا کو گھر لے تو آتا ہے، مگر اس کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر ثانیہ کو فون کرتی ہے۔ وہ اس سے ملنے چلی آتی ہے اور حیران رہ جاتی ہے۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہیں ہوتا۔ وہ عون کو فون کر کے شرمندہ کرتی ہے۔ عون نادام ہو کر کچھ اشیائے خوردنوش لے آتا ہے۔ معیذ احمد بزنس کے بعد اپنا زیادہ تر وقت رباب کے ساتھ گزارنے لگتا ہے۔

www.paksociety.com

سفینہ بیگم اب تک یہ ہی سمجھ رہی ہیں کہ ابیہا مرحوم امتیاز احمد کے نکاح میں تھی مگر جب انہیں پتا چلتا ہے کہ وہ معیذ کی منکوحہ ہے تو ان کے غصے اور نفرت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ اسے اٹھتے بیٹھتے بری طرح نارچہ کرتی ہیں اور اسے بے عزت کرنے کے لیے اسے نذیراں کے ساتھ گھر کے کام کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا ناچار گھر کے کام کرنے لگتی ہے۔ معیذ کو برا لگتا ہے، مگر وہ اس کی حمایت میں کچھ نہیں بولتا۔ یہ بات ابیہا کو مزید تکلیف میں مبتلا کرتی ہے۔ وہ اس پر تشدد بھی کرتی ہیں۔

رانے شکوے شکایتیں دور کرنے کی خاطر عون کے ابا عون اور ثانیہ کو اسلام آباد نازیہ کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے بھیجتے ہیں۔ جہاں ارم ان دونوں کے درمیان آنے کی کوششیں کرتی ہے اور ثانیہ اپنی بے وقوفی کے باعث عون سے شکوے اور ناراضیاں رکھ کر ارم کو موقع دیتی ہے۔ عون صورت حال کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر ثانیہ اس کے ساتھ بھی زیادتی کر جاتی ہے۔ ارم کی بہن سلیم ایک اچھی لڑکی ہے، وہ ثانیہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ اگر عون نے پہلے شادی سے انکار کر کے اس کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی تھی تو اب اپنی عزت نفس اور انا کو چھوڑ کر آپ کو منانے کے لیے جتن بھی کر رہا ہے۔ عزت کریں عون کی اور دوسروں کو اپنے درمیان آنے کا موقع نہ دیں۔ ثانیہ کچھ کچھ مان لیتی ہے۔ تاہم ہندی میں کی گئی ثانیہ کی بد تمیزی پر عون دل میں اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔

رباب، سفینہ بیگم کے گھر آتی ہے تو ابیہا کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ پھر سفینہ بیگم کی زبانی ساری تفصیل سن کر اس کی تضحیک کرتی ہے۔ ابیہا بہت برداشت کرتی ہے مگر دوسرے دن کام کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ سفینہ بیگم کو شدید غصہ آتا ہے۔ وہ انیکسی جا کر اس سے لڑتی ہیں۔ اسے تھپڑ مارتی ہیں، جس سے وہ گر جاتی ہے۔ اس کا سر پھٹ جاتا ہے اور جب وہ اسے حرام خون کی گالی دیتی ہیں تو ابیہا پھٹ پڑتی ہے۔ معیذ آکر سفینہ کو لے جاتا ہے اور واپس آکر اس کی مینڈج کرتا ہے۔ ابیہا کہتی ہے کہ وہ پڑھنا چاہتی ہے۔ معیذ کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ سفینہ بیگم ایک بار پھر معیذ سے ابیہا کو طلاق دینے کا پوچھتی ہیں تو وہ صاف انکار کر دیتا ہے۔

www.paksociety.com اکیسویں قسط www.paksociety.com

بیٹھے بیٹھے دعائیں کرتے جانے کتنی دیر ہو گئی تھی۔ دعا کرتی زارا کے آنسو تھمنے میں نہیں آتے تھے۔ ابیہا کی اس سے جھجک فطری تھی۔ جو رشتہ اور جو حالات ان کے درمیان تھے، وہ اسے آگے بڑھنے سے روکتے تھے، مگر پھر ایک مماثلت ان کے مابین پل بنی۔ ماں۔ ابیہا اپنی ماں کا دکھ جھیل چکی تھی، جبکہ زارا اس تکلیف سے گزر رہی تھی۔ وہ زارا کا ہاتھ تھام کر پیار سے سہلاتی اسے دوسرا ہٹ کا احساس دلارہی تھی۔ ایسے میں معیذ کی کال آتا اور اس کی بات سن کر ابیہا کا رنگ اڑتا۔ زارا کے دل کو جیسے کسی نے شکنجے میں کس لیا ہو۔ اسے اگلے ہی لمحے سانس لینے میں دشواری ہوئی۔

www.paksociety.com

”ماما۔ کیا ہوا؟ ماما کو۔۔۔ کس کا فون ہے؟“ وہ متوحش سی سرسراتی آواز میں پوچھ رہی تھی۔ معیذ لائن کاٹ چکا تھا مگر ابیہا کے کندھوں پر ایک بھاری ذمہ داری کا بوجھ رکھ کر۔

197 جولائی 2015

”زارا کو مت بتانا اس کے کانوں میں معیذ کی تھکی صدے سے جو جھل آواز ابھی تازہ تھی۔
ایسہا نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور زارا کی طرف اعتماد سے دیکھنے کی کوشش کی۔
”وہ... آئی سی یو میں ہیں چیک اپ ہو رہا ہے۔ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔“ زارا نے بے اعتباری سے
اسے دیکھا۔ جس کی رنگت ابھی بھی اپنا اصل رنگ کھوئے ہوئے تھی۔
”آمین۔“ زارا نے شدت جذبات سے بھرپور انداز میں کہا۔ وہ ایسہا کی بات پہ دل سے یقین کرنا چاہتی
تھی۔ چاہے یہ سچ تھا یا جھوٹ۔ مگر وہ اسی پہ اعتبار کر کے جینا چاہتی تھی کہ سفینہ زندہ ہیں۔ ڈاکٹرز کی ٹیم ان کا
تفصیلی چیک اپ کر رہی ہے اور وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ خاموشی ان دونوں کے درمیان بکل مار کے بیٹھ گئی۔
زارا مسلسل زیر لب ورد کرتی دونوں بھائیوں میں سے کسی کو بھی فون نہ کر رہی تھی۔
جانے کس فریب کے حصار میں گھری رہنا چاہتی تھی؟



عمون بھاگم بھاگ اسپتال پہنچا تو عمر اور ایراز سمیت معیذ کا حال بھی دگرگوں تھا۔ سفینہ بیگم ابھی تک آئی سی یو
میں تھیں۔ اور ڈاکٹرز کوئی بھی نسلی بخش جواب نہیں دے رہے تھے۔ معیذ نے ایسہا کو فون کر کے سفینہ بیگم کی
خرابی طبع۔ اور دعا کرنے کا کہہ دیا اور ساتھ ہی تاکید بھی کہ زارا کو ”سب ٹھیک ہے“ کی رپورٹ ہی دے۔
”یہ سب ہوا کیسے۔“ عمون دکھ کی کیفیت میں تھا۔
”بس ایک دم سے بی پی شوٹ کر گیا۔ وہ تو زارا نے دیکھ لیا اور نہ تو اسپتال بھی ٹائم نہ پہنچاتے۔“
معیذ خود کو بہت ضبط سے سنبھال رہا تھا۔ وگرنہ ایراز تو باقاعدہ عمر کے گلے لگ کے روچکا تھا۔
انگلے چار گھنٹے اسی ٹینشن اور شدید پریشانی میں گزرے ڈاکٹرز اور اسٹاف پوچھنے پر بھی فی الحال مریض کی حالت
نہیں بتا رہے تھے۔

اور پھر سینئر ڈاکٹر فاروق جلال نے بالآخر معیذ کو اپنے کمرے میں بلایا تو وہ افتاب و خیزاں ان کے کمرے میں پہنچے
تو ان کے فق چروں کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر فاروق نے تمہید پاندھی۔
”دیکھیں ہر کام میں اللہ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ زندگی دینے والا وہ ہے تو موت پر بھی اسی کو قدرت
حاصل ہے۔ ہم لوگ تو بس اپنی سی کوشش کر سکتے ہیں۔ کسی کی سانسوں کو بحال کرنے کی۔ اصل ڈاکٹر جو زندگی
اور موت کا فیصلہ کرتا ہے وہ اوپر بیٹھا ہے۔“
انہوں نے انگشت شہادت سے آسمان کی جانب اشارہ کیا تو معیذ نے متوحش انداز میں پوچھا۔
”ڈاکٹر صاحب کیا بات ہے۔ ماما ٹھیک تو ہیں نا!“ ڈاکٹر فاروق نے تھکے ہوئے انداز میں اپنی کرسی سے پشت
لگائی۔

”وہ اللہ ہے ہر شے پر قادر۔ چاہے تو زندگی دے اور چاہے تو موت۔ مگر ایک تیسری کنڈیشن بھی ہے۔“ وہ
کہتے ہوئے لمحہ بھر کو تھمے۔ چار فق چروں کو دیکھا پھر بولے۔
”چاہے تو زندگی اور موت کے درمیان معلق کر دے۔“
”یو مین۔ کیا ہے؟“

عمر نے بے یقینی سے ایک دم پوچھا تو معیذ اور ایراز وحشت زدہ سے ڈاکٹر کو دیکھنے لگے۔ پھر ڈاکٹر کا اثبات میں
ہلتا سرد دیکھ کر دکھ سے اپنی جگہ گڑ گئے۔

”یہ کیفیت دو دن کی بھی ہو سکتی ہے، دو سال کی بھی یا پھر سالوں تک کی بھی۔“
ڈاکٹر فاروق انہیں تفصیلی بریفنگ دے رہے تھے، جوان کی سائیں سائیں کرتی سماعتوں سے ٹکراتو رہی تھی، مگر وہ اور غم کی شدت فی الحال اور کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھوئے ہوئے تھی۔



دکھ اور تکلیف کی ایک شدید لہر تھی جو اس گھرانے سے پوری طاقت کے ساتھ ٹکرائی۔ اور ان کا رد عمل بھی وہی تھا جو کسی بھی تکلیف کے آنے پہ ہوتا ہے۔ پوری طاقت سے خوف زدہ سا ہو کر چیخنا چلانا اور آہستہ آہستہ اس تکلیف کی حقیقت کو قبول کرتے ہوئے اس کے ساتھ زندگی گزارنے پر خود کو مجبور پانا۔ مگر اس تکلیف کا احساس کبھی ساتھ نہ چھوڑتا تھا۔ بالکل ایڑی کے کانٹے کی طرح ہر قدم پہ تکلیف۔ آج ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ اور سفینہ بیگم ہاسپٹل میں کومے کی کیفیت میں تھیں۔ زارا کی آہ و بکا اور رونا کرلانا بھی ان کی بند پلکوں میں جنبش نہ لاپایا تھا اور نہ ہی جوان بیٹوں کے ہاتھوں کا بے بسی بھرا لمس اور دہلی سسکیاں۔ مگر وہ مرد تھے جیسے تیسے خود کو سنبھال کر بظاہر مضبوطی سے کھڑے ہو گئے مگر زارا۔۔۔ ماں کی لاڈلی ان کے بغیر ایک پل نہ رہنے والی۔ سارا دن ماں کا ہاتھ تھامے بیٹھی رہتی۔ سفیر احسن اور ان کی پوری فیملی فوری طور پر ہاسپٹل پہنچی۔ زارا کی حالت دگرگوں تھی۔ معینز اور عمر کے لاکھ... سمجھانے پر بھی وہ گھر جانے کو تیار نہیں تھی۔ اسے دیکھ کر سفیر کا دل دکھ سے بھر گیا۔ ایسی ملاقات کا خواب تو ان دونوں میں سے بھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ سفیر نے زارا کے سر پہ ہاتھ رکھا تو اس میں ہمدردی، محبت اور دوسراہٹ کا احساس تھا۔ زارا، سفیر کی امی کے گلے لگ کے بلک اٹھی۔ سب ہی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

یا خدا۔۔۔ یہ کیسی زندگی تھی، موت نہ ہوتے ہوئے بھی موت جیسی۔ سفیر کی امی کے سمجھانے پر وہ بمشکل گھر آنے پر راضی ہوئی۔ واپسی پہ باب اس کے ساتھ گھر آئی۔ عمر اور ایراز نے معینز کو بھی تھوڑی دیر آرام کے لیے ان کے ساتھ ہی بھجوا دیا۔ ایک ہفتے سے وہ مسلسل سفینہ بیگم کے سرہانے بیٹھا تھا۔ ”نارمل ہو جاؤ معینز! اللہ سے احتجاج باندھ کے مت بیٹھو۔ تم جانتے ہو کہ تمہارے یوں ڈاکٹرز کے پیچھے بھاگنے اور راتوں کو مسلسل جاگتے رہنے سے کچھ نہیں ہونے والا۔ بلکہ تم اپنی بھی صحت خراب کر رہے ہو۔ مریض کی دیکھ بھال ایک مریض نہیں بلکہ ایک صحت مند انسان ہی کر سکتا ہے۔“ اس کے احتجاج پر عمر نے اس کے شانوں پہ دونوں ہاتھ جماتے ہوئے تادیبی انداز میں سمجھایا تو وہ چپ سا ہو گیا۔

عمر اور ایراز باری باری آرام کر لیا کرتے تھے، لیکن معینز نے تو گویا قسم ہی کھالی تھی کہ جب تک سفینہ بیگم آنکھ نہ کھولیں گی وہ ان کے سرہانے سے نہیں اٹھے گا۔ اندرونی دروازہ ایسہا نے کھولا تو باب کے اندر سے ناگواری کی ایک لہر اٹھی۔ اور بے یقینی کا احساس۔ معینز نے زارا کے شانے پر بازو پھیلائے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ اسے اندر لے آیا۔ لاؤنج میں صوفے پہ اسے بٹھایا تو وہ نڈھال سی تھی۔

”تم کیا کھڑی تماشا دیکھ رہی ہو۔ جا کے ٹھنڈے پانی کی بوتل لاؤ۔۔۔ نان سینس۔“

رباب نے مضطربانہ ہاتھوں کی انگلیاں مسلتی ایسہا کو اس قدر اچانک اور بگڑے ہوئے انداز میں مخاطب کیا تھا کہ وہ سن ہی رہ گئی۔ معیذ نے چونک کر ایسہا کو دیکھا۔ وہ بہ سرعت کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔ معیذ کو رباب کا انداز اچھا نہیں لگا تھا۔

”اس اوکے رباب۔“ معیذ نے ملکہ سے اسے ٹوکا۔

”کیا اوکے ہے؟ دیکھ نہیں رہی۔ اتنی گرمی میں باہر سے آئے ہیں۔ سر پہ چڑھ کے تماشا دیکھ رہی ہے بس۔ آنے والوں کو پانی ہی پوچھ لیتے ہیں۔ زارا کو دیکھو، کیسے عذہال ہو رہی ہے۔“ رباب نے تیز لہجے میں کہا۔ جو ایسہا نے بخوبی سنا۔

اس نے بوتل سے گلاس میں پانی اٹڈیلا اور صوفیہ نکلتے ہوئے زارا کو تھمایا۔ جو وہ گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

”کھانا تیار ہے۔ آپ لوگ فریش ہو جائیں تو میں لگا دیتی ہوں۔“

ایسہا نے صاف آواز میں زارا سے کہا۔ تو وہ گلاس ایسہا کے ہاتھ میں تھامی پلیٹ میں رکھتے ہوئے اپنی کتئیاں دبانے لگی۔

”مجھے بالکل بھوک نہیں۔ میں بس تھوڑی دیر کے لیے گھر آئی ہوں۔ پھر ہاسپٹل چلی جاؤں گی ماما کے پاس۔“

”تھوڑا ساریٹ کر لو۔ کھانا کھاؤ گی تو طاقت آئے گی نا، تبھی ماما کی دیکھ بھال کر سکو گی۔“

ایسہا نے اسی پیار سے کہا جس کا برتاؤ وہ زارا کے ساتھ پچھلے ایک ہفتے سے کر رہی تھی۔ عمریا ایراز میں سے جو بھی رات کو گھر آتا وہ زارا کو زبردستی ساتھ لے آتا۔ تب ایسہا ہی تھی جو اس کے آنسو پوچھتی، تسلیاں اور دلا سے دیتی اور اس کے ساتھ سوتی۔

”تم جاؤ۔ جا کے کھانا وانا گرم کرو۔ میں دیکھتی ہوں زارا کو۔“ رباب کا وہی تحکمانہ انداز تھا۔ گویا ایسہا نوکرانی ہو۔ وہ خاموشی سے اٹھ گئی۔

معیذ نے رباب کی سرد مہری کو اچھی طرح محسوس کیا اور اس سرد مہری کا محرک بھی اسے اچھی طرح سمجھ میں آ رہا تھا۔

”جب سے ماما کی طبیعت خراب ہوئی ہے ایسہا ہی گھر کے معاملات دیکھ رہی ہے۔“ معیذ نے وہ بے لفظوں جیسے رباب کو ”باز“ رہنے کی تشبیہ کی۔

”سو اٹ۔ نوکروں کا اور کام ہی کیا ہوتا ہے۔“ رباب نے تنقیر سے شانے جھٹکے۔

کچن سے سالن کا ڈونگا لے جانی ایسہا کے قدم من من کے ہوئے۔

”وہ نوکر نہیں ہے اس گھر کی رباب۔“

معیذ نے اس بار قدرے سخت لہجے میں تصحیح کی تھی۔ رباب نے اسے ہلکا سا گھورا اور جتاتے ہوئے انداز میں بولی۔

”فرد بھی نہیں ہے معیذ احمد۔“

”ایسہا اس گھر کا فرد ہی ہے رباب۔“ زارا نے کھڑے ہوتے ہوئے سنجیدگی سے کہا اور معیذ پر ایک غلط نگاہ ڈالی جو ساکت سا کھڑا رہ گیا تھا۔

”میں نے شاید اس کا پورا تعارف نہیں کرایا تم سے۔ ایسہا ابو کی کزن کی بیٹی ہے۔ اصل میں ہمارے تعلقات اس کی بیٹی سے اچھے نہیں تھے اس لیے۔ آئم سوری، مگر اب اس نے اپنے اچھے اخلاق سے میرا اس مشکل وقت میں اتنا ساتھ دیا ہے کہ میں اعتراف کیے بنا رہ نہیں سکتی۔“

”تم نے تو کہا تھا کہ وہ... نوکروں کو سپروائز کرتی ہے۔“ رباب نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا مگر زارا کے سکون میں کمی نہیں آئی تھی۔

”اسی کے لیے سوری کہہ رہی ہوں۔ دراصل ہم لوگ ایسہا کو اس کی اصل جگہ دینے کو تیار نہیں تھے۔ مگر اب خیال آیا کہ جن کے رشتہ داری کے تنازعات تھے وہ تو مر گئے۔ پھر ہم کون سی دشمنی نبھا رہے ہیں۔“

زارا کے لب و لہجے سے دکھ جھلک رہا تھا اور معیذ گنگ کھڑا تھا۔ منٹوں میں زارا نے لفظوں کے شیشوں سے سالوں کی دشمنی کی فصیلیں گرا دی تھیں۔

وہ فریش ہو کے کھانے کی میز پر آیا بھی تو فریش نہ تھا۔ طبیعت مضحل سی تھی۔ ایک عجیب سا بو جھلپن۔ رباب تو بس زارا کی طبیعت اور موقع کی نزاکت دیکھ کے چپ رہ گئی تھی ورنہ تو زارا کو خوب سناتی۔ اس نے اسے تو قطعاً ”مطمئن نہ کیا تھا۔ مزید تب تلملائی جب زارا نے کھانا لگا کے جاتی ایسہا کا ہاتھ تھام لیا۔

”تم بھی بیٹھ کے کھانا کھا لو۔ صبح سے کچن میں لگی ہوگی۔“ وہ ہلکا سا مسکرا دی۔

”آپ لوگ شروع کریں۔ میں ہسپتال کے لیے لفن بنا رہی ہوں۔ ابھی ڈرائیور کے ہاتھ کھانا بھیجنا ہے۔“

نرمی سے کہا اور ہاتھ چھڑا کے کچن میں چلی گئی۔

زارا کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ تو وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھ گئی۔

یونہی... خیال سا آیا۔ کس کی آمد۔ کس کا صبر ان کے لیے آزمائش بن گیا تھا؟

ساتھ بیٹھے معیذ نے تشویش سے اس کے شانے کو چھوا۔ تو وہ چونکی۔

”شروع کرو۔“ معیذ نے کھانے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

رباب کا تودل گھبرا گیا اتنی دکھی صورت حال دیکھ کر اسے زارا اور معیذ کے ساتھ گھر آنے کے فیصلے پر افسوس ہونے لگا۔

(اس سے تو اچھا تھا نئی مووی دیکھ لیتی گھر پہ)

وہ کڑھتے ہوئے اپنی پلیٹ میں سالن نکال رہی تھی۔ ڈرائیور کے ہاتھ اسپتال، عمر اور اراز کے لیے کھانا بھجوانے کے بعد ایسہا نے کچن ہی میں بیٹھ کے تھوڑا سا کھانا کھا لیا۔ اس کا رباب جیسی کم طرف کے سامنے جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ کھانے کے بعد معیذ نے زارا کو تھوڑی دیر آرام کرنے کا مشورہ دیا تو رباب کا دل گھبرانے لگا۔

وہ اس ”دکھی چہرہ“ زارا کے ساتھ جا کے آرام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم آرام کرو۔ میری وجہ سے ڈسٹرب ہوگی۔ میں پھر آؤں گی۔“

بڑے پیار سے زارا کو لپٹاتے ہوئے وہ چھوٹے بھائی کو کال ملا رہی تھی۔ جو بائیک پہ آ کے اسے ساتھ لے جاتا۔

”تم رکونا زارا کے پاس۔ شام کو میں ہاسپتال جاتے ہوئے تمہیں ڈراپ کروں گا۔“

اس کے ساتھ باہر تک آتے معیذ نے آفر بھی کی۔

”نہیں معیذ۔ زارا کو آرام کی ضرورت ہے، میری وجہ سے وہ ڈسٹرب ہوگی۔“

اس نے طریقے سے انکار کر دیا۔ رباب کو رخصت کر کے وہ چائے کی طلب لیے کچن میں آیا تو ایسہا کو دل جمعی اور پھرنی کے ساتھ برتنوں کی دھلائی میں مگن پایا۔ وہ چونکہ چائے بنانے کا سوچ کر ہی کچن میں آیا تھا، سو ایسہا کو متوجہ کیے بغیر ساس پین چولہے پر رکھا۔ کھٹکے کی آواز پر ایسہا نے بے اختیار گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ فریج میں سے دودھ کا پیکٹ نکال رہا تھا۔

PAKSOCIETY.COM

جولائی 2015

ایسہا نے جلدی سے ہاتھ دھوئے اور اس کی طرف پلٹی۔

”چائے چاہیے۔۔۔؟ میں بنا دیتی ہوں۔“

اس کے اندر کی پیدائشی عورت نے گوارا نہ کیا تھا کہ ایک مرد کو اپنی موجودگی میں چائے بنانے دیتی۔

معیز نے خاموشی سے دودھ کا پیک کاؤنٹر پر رکھا اور کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا۔

چولہا جلا کر قہوہ بناتے اور پھر دودھ ڈال کے دم پہ رکھتے معیز نے بے دھیانی میں اسے دیکھا۔ ایک ہفتہ پہلے معیز نے اسے کال کر کے بلایا تھا اور پچھلے ایک ہفتے ہی سے وہ سارے گھر کا نظام ایسے سنبھالے ہوئے تھی جیسے

برسوں سے سنبھال رہی ہو۔

وہ تینوں اسپتال میں کھانا، ناشتہ کھاتے یا نہیں، مگر وہ ڈرائیور کے ہاتھ تینوں کے لیے باقاعدگی سے کھانا بھجواتی تھی۔

اس نے ریک میں سے مگ لیا اور اس میں چائے چھان کے ڈالنے لگی۔

اس نے مگ معیز کے سامنے رکھا۔

”تھینکس۔۔۔“

”اب آنٹی کی طبیعت کیسی ہے؟“

ایسہا نے بار بار لبوں تک آنا سوال پوچھ ہی لیا۔ تو ایک تکلیف کا احساس معیز کے اندر پھر سے جاگنے لگا۔

”کسی ہی۔۔۔ جیسی اول روز سے ہے۔“ وہ پھیکے لہجے میں بولا۔ ایسہا اس کے سامنے والی کرسی پہ ٹک گئی۔

”وہ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔“ اس نے پورے خلوص سے کہا۔ تو ایک دم سے معیز کی زبان تلخی سے

پھسلی۔

”ہاں۔ اگر تم انہیں بددعا میں دینا ختم کر دو گی تو۔“ ایسہا کے سر پہ جیسے کسی نے ہتھوڑا دے مارا ہو۔ معیز وہ

آخری شخص تھا جس سے وہ اس الزام کی توقع رکھتی تھی، مگر وہ ”پہلا“ بن گیا۔

بعض اوقات، ہم توقعات کے کارپٹ پہ بہت بری طرح پھسلتے ہیں۔

ایسہا کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا تھا۔ اس نے بے یقینی سے معیز کو دیکھا وہ بات کرتے ہوئے اسی کی

طرف متوجہ تھا۔ ایسہا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”مطلب۔۔۔ آپ میرے بارے میں۔۔۔ اتنا برا سوچتے ہیں؟“ اس سے بولنا مشکل ہوا۔

”دیکھو۔۔۔ ڈراما مت کرنا یہاں۔ اس دنیا میں تمہارے سوا ہمارا کسی سے کوئی اختلاف نہیں ہے، سوصاف اور

سیدھی بات ہے جو میں نے کہہ دی۔“

وہ بڑی رکھائی سے اس کے آنسوؤں کو ڈراما کہہ گیا تھا۔ ایسہا کے آنسو تو کیا حواس بھی ٹھہر گئے۔

اتنے دنوں سے وہ کتنی ایمان داری سے ان لوگوں کے ساتھ چل رہی تھی۔ سفینہ بیگم کا نام اس کی نمازوں کی

دعاؤں کا باقاعدہ حصہ بن گیا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ اسے سفینہ بیگم سے بہت محبت تھی بلکہ اس لیے کہ۔۔۔ معیز کو ان سے شدید محبت تھی۔

وہ مزید کوئی بات کیے بنا وہی بدگمانی لیے مگ اٹھائے چلا گیا تو وہ یونہی ساکت بیٹھی اسے جاتا دیکھتی رہی۔

رباب کی باتوں پہ ایسہا کا دل دکھتا تھا۔۔۔ تو معیز کی باتوں کا وہ کیا کرتی؟ وہ تو دیکھتے دل کو چیر ہی گیا تھا۔ وہ رونا نہیں

چاہتی تھی۔۔۔ اس کا تو دکھ بھی ڈراما بن گیا تھا۔

ان دنوں زار ابا قاعدگی ہے پانچوں نمازیں بڑھ رہی تھی۔ معیذ اور ایراز تو خیر شروع ہی سے پابند نماز تھے۔ معیذ فجر پڑھنے گیا تو لاؤنج میں صوفے پہ لیٹی ایسہا کی آنکھ کھل گئی۔ فجر پڑھنے کے بعد مسنون دعا میں پڑھ کے پوری نیک نیتی سے سفینہ بیگم کے لیے دعائے صحت کرنے کے بعد وہ زارا کے کمرے کی طرف آئی۔ اس نے ہلکا سا کھٹکھٹانے کے بعد دروازہ کھول کے دیکھا تو زارا جاگ رہی تھی۔

”میں آجاؤں۔۔۔؟“ ایسہا نے اجازت طلب کی تو وہ جو تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی اٹھ بیٹھی۔ دوپٹہ ابھی تک نماز کے اشاکل میں لپیٹا ہوا تھا۔ اثبات میں سر ہلایا۔

”آجاؤ۔۔۔“ ایسہا جھجکتی ہوئی اندر آگئی۔

”بیٹھو۔۔۔“ زارا نے اپنے بیڈ پہ اشارہ کیا تو وہ کنارے پہ ٹک گئی۔ ایسہا نے چند لمحے جیسے لفظوں کا جوڑ توڑ کیا ہو۔ پھر سر اٹھا کر زارا کو دیکھا۔

”اللہ جانتا ہے زارا۔ میں نے کبھی بھی آنٹی کے لیے کچھ برا نہیں سوچا اور نہ ہی انہیں بددعا دی ہے۔“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ زارا نے ہاتھ بڑھا کر بے اختیار ہی اس کا ہاتھ تھپکا۔

”وہ آپ لوگوں کی ماں ہیں اور میں جانتی ہوں کہ ماں جیسی دولت کا کھونا کیسا ہے۔۔۔ آپ پوری دنیا کھو بیٹھتے ہیں۔“

ایسہا کے آنسو ٹپ بننے لگے اور ساتھ ہی زارا کے بھی۔

”وے لیتیں بددعا ایسہا۔ تمہارا صبر ہی بڑ گیا ہے شاید۔“ زارا روتے ہوئے دکھ سے بوجھل لہجے میں بولی۔ تو کچھ بولنے کی کوشش میں ناکام ہو کر ایسہا نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”ہم میں سے کسی نے بھی تمہیں انصاف نہیں دلایا۔ اور تم پھر بھی صبر کرتی رہیں۔۔۔“

زارا یہ گزرے دنوں میں بہت کچھ وارو ہوا تھا۔ ٹھوکر لگے تو آنکھیں کھل ہی جایا کرتی ہیں۔ پھر آگے پیچھے بہت کچھ دکھائی دیتا ہے۔

”ہم سب حالات کا شکار ہیں زارا۔ آنٹی کا کیا قصور۔۔۔ میں ان چاہا فیصلہ ہوں جو ان پر تھوپا گیا تھا۔ اور مسلط کر دیے جانے والے فیصلوں پر کوئی بھی خوش نہیں ہوا کرتا۔“ ایسہا نے پل بھر میں سب کو بری کر دیا تھا۔

”میری طرف سے دل میں میل مت لاؤ زارا۔ میں تو اس گھر کے ہر فرد کے لیے دل سے دعا کرتی ہوں۔ تو اس ماں کے لیے کیوں نہ کروں گی جس کے بیٹے نے ایک لڑکی کو بازار میں بکنے سے بچایا تھا۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں زارا۔“

وہ بری طرح رو رہی تھی۔

اور زارا نے جیسے اتنے عرصے میں پہلی بار اس کے دکھ کی شدت کو محسوس کیا اور اسے خود سے لپٹا لیا۔ یہ اس کے یقین کا اظہار تھا۔ ایسہا کے دل میں ٹھنڈک سی اترنے لگی۔



بے کیف سے دن بوجھل راتیں۔ ہر کوئی اپنی جگہ بے سکونی کی کیفیت میں تھا۔ عون اسپتال سے گھر آیا تو امی بھابی نے سفینہ بیگم کی بابت پوچھا۔ وہ انہیں تفصیل بتا کے کمرے میں آیا تو طبیعت مضحل سی تھی۔ معیذ سے ظاہری نہیں دلی دوستی تھی۔ اس کا دکھ عون کو بھی دکھی کرتا تھا۔

ثانیہ سونے کے لیے لیٹ چکی تھی۔ عون کو اندر آتا دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ وہ اسے نظر انداز کرتا اپنے رات کے کپڑے لیے واش روم میں چلا گیا باہر نکلا تو وہ ابھی بھی یونہی منتظر سی بیٹھی

”کیسی طبیعت ہے اب آئی کی۔؟“

وہ اسے سونے پہ ”تلا“ دیکھ کر نرمی سے بولی۔

”ہوں۔ ویسی ہی ہے۔“

سر ہلا کر مختصراً ”جواب دیا اور بتی بجھا کر اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔ ثانیہ عجیب سی کیفیت کا شکار ہونے لگی۔ جن دنوں وہ متوجہ رہتا تھا تب بھی وہ حتمی بنائی ہوئی رہتی تھی اور اب اس کا ”غیر متوجہ“ انداز بھی دل پر آرے چلا رہا تھا۔ وہ اب کڑھنے لگی۔

اس کی تو شاید نزدیک کی نظر بھی کمزور ہے۔ اتنی خوب صورت بیوی بھی دکھائی نہیں دیتی۔۔۔ چلو قبول صورت ہی سہی۔

”عون۔۔۔ تمہیں نہیں لگتا کہ ہم کچھ عجیب سے ہو گئے ہیں۔“ وہ بلا ارادہ بے اختیار ہی کہہ گئی۔ پھر دانتوں تلے زبان دبا کر اسے سزا بھی دی۔ دم سادھ کے پڑ گئی۔ جانے وہ کیا سمجھے عون کی آواز لمحہ بھر کے وقفے سے اندھیرے میں ابھری۔

”تم شاید غیر فطری کہنا چاہ رہی ہو۔“

ثانیہ پر تو گھڑوں پانی پھرا۔۔۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے اپنی سانس بند ہوتی محسوس کی۔ وہ کروٹ بدل کے ثانیہ کے بالکل پاس آ گیا تھا۔

”میں تو فطرت سے پیار کرنے والوں میں سے ہوں۔“ وہیما جذب سے بھرپور لہجہ۔ ثانیہ کے بالکل کان میں گنگنایا تھا۔ اور وہ حواس باختہ سی اسے اجنبیت کی تمام دیواریں توڑتے دیکھتی رہ گئی۔



وہ آئینے کے سامنے کھڑی کان میں بندہ پہن رہی تھی جب وہ مکمل تیار شدہ حالت میں بڑا مصروف سا اس طرف آیا اور پرفیوم اٹھانے کے لیے جھکا۔

نگاہ آئینے میں۔۔۔ ثانیہ کی نظر سے نکرائی تو ہونٹوں پر شرارتی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس مسکراہٹ نے ثانیہ کے چہرے پر جیسے شعلوں کی لپٹیں دوڑا دیں۔ وہ محبوب سی ہاتھوں سے پھسلتا بندہ سنبھالنے لگی۔

”اوفوہ۔۔۔ میری پرنسز کس ابجھن میں پڑ گئی ہے۔“ وہ پرفیوم واپس رکھتا سیدھا ہوا اور مسکرا کر کہتے ہوئے بندہ اس کے ہاتھ سے لے کر خود پہنانے لگا۔ پھر ہلکا سا کھنکھارا۔

”تمہیں پتا ہے میاں بیوی کے رشتے میں جب محبت ہو تو وہاں انا نہیں ہوا کرتی۔۔۔ صرف مان ہوتا ہے۔“ بے حد نرمی سے کہا اور وہ جو بندہ پہناتے اس کے ہاتھوں کے لمس ہی سے مسمریز تھی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

دفعتا ”وہ گھٹنے کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا اور دونوں بازو دائیں بائیں پھیلا کر ذرا سا سر جھکایا اور گویا اعتراف کرنے لگا۔

”مجھے تم سے محبت ہے ثانیہ عون عباس۔ تم دس ہزار بار مجھ سے روٹھو گی تو ہر بار میں ہی تمہیں مناؤں گا، کیونکہ میری محبت میں انا نام کا کوئی دشمن نہیں ہے۔“ ثانیہ لمحہ بھر میں ہلکی پھلکی ہو گئی۔

سارے خود ساختہ خوف اور فضول سوچیں۔۔۔ وہ کہے گا۔۔۔ طعنے دے گا۔ سب اڑنچھو ہو گئے۔ میاں بیوی میں محبت ہو تو ”انا“ نہیں ہوا کرتی۔ محبت کرنے والے خود ہی دوسرے کی عزت نفس کا خیال کرتے ہیں ثانیہ کو یہ

سبق بڑے اچھے سے سمجھ میں آیا تھا۔
وہ پلٹی اور ڈرننگ ٹیبل پر سے عون کا پرفیوم اٹھایا۔ پہلے ہلکا سا فضا میں اسپرے کیا اور لمبی سی سانس اندر کھینچ کر خوشبو کو محسوس کیا۔

عون دراز قد اس کے سامنے کھڑا ہوا، ٹانیہ نے دل کی پوری رضا کے ساتھ اس کے پاس آتے ہوئے اس کے ملبوس پر اسپرے کیا پھر بڑے اطمینان کے ساتھ بولی۔

”یہ خوش فہمی تم بھول جاؤ کہ میں دس ہزار بار تم سے روٹھوں گی۔ ہاں مگر۔۔۔“ اس نے تنبیہی انداز میں انگلی اٹھا کر گویا وارننگ دی۔

”تمہارے خراٹوں کی وجہ سے ہر بار لڑائی ہوا کرے گی۔“

”تو تم میرے منہ پہ تکیہ رکھ دینا۔“

عون نے معصوم سا منہ بنایا۔ ٹانیہ نے منہ لٹکالیا۔

”یہی تو نہیں کر سکتی۔۔۔ پانے کے بعد کھونا بہت مشکل ہے۔“ افسانہ اعترافِ محبت۔

عون کا دل بہت ترنگ میں دھڑکا۔ کھینچ کر اسے اپنی گرفت میں لیا۔

”بہت گندی جان ہو۔۔۔ اتنے دن تنگ کیا مجھے۔“ ٹانیہ ہنسی۔

”آئی لو یو۔۔۔“ کان میں گنگلتا تا عون کا دھیمسا لہجہ اور ٹانیہ کا مدہم سا اعتراف۔

”می ٹو۔۔۔“

”دو بے وقوفوں کی کہانی کی بنیاد ”محبت“ تھی۔ سو محبت بھرے انداز میں محبت کے اعتراف پہ ہی ختم ہوئی۔ ہر

اختلاف ہر لڑائی۔



ڈراما۔۔۔ ڈراما یونگ کرتے معیذ کا ذہن وہیں اڑکا ہوا تھا۔

سفینہ بیگم کا ایسہا سے رویہ سب کے سامنے تھا اور ایسے میں ایسہا کا اس قدر مثبت رویہ۔۔۔

معیذ نے سر جھٹکتے ہوئے موبائل سے رباب کو کال ملائی۔

”ریڈی ہو تو راستے میں سے تمہیں پک کر لوں۔۔۔؟“

”اوہو۔۔۔ کہاں کا پروگرام ہے؟“

رباب نے کھٹکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”شکر ہے اس سڑے بھسے فیر سے نکلے سب۔“

معیذ نے احتیاط سے موڑ کاٹا۔ اس کا دھیان رباب کے انداز کی طرف نہیں تھا۔

”اسپتال جا رہا ہوں۔ سوچا تمہیں بھی لے چلوں۔“ وہ بولا۔ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

”رباب۔۔۔ کہاں ہو یا۔۔۔؟“ معیذ کو شک ہوا۔ شاید لائن ڈراپ ہو گئی تھی۔

”زارا ابھی ساتھ ہے؟“ رباب نے پوچھا تو معیذ نے اس کی بھی تفصیل بتا ڈالی۔ رباب کا تو سر کے بال نوچنے کو

جی چاہا۔

دونوں بہن بھائی ہی مجذوب بنے بیٹھے تھے۔ بھئی۔ کیا دنیا بیمار نہیں پڑتی۔۔۔

”آتم سوری معیذ۔۔۔ میں کچھ بہتر محسوس نہیں کر رہی ایک جو نیلی مجھے اسپتال کے ماحول سے وحشت ہوتی

وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی تو معیذ کی پیشانی پر ہلکی سی شکن پڑی۔

”اوکے۔ اللہ حافظ۔“

اس نے مختصراً ”کہہ کر لائن ڈراپ کرتے ہوئے موبائل ڈیش بورڈ پہ ڈال دیا۔

ذہن ایک بار پھر ایسہا مراد کی طرف پلٹنے لگا۔

وہ کس نیت سے یہ سب کر رہی تھی؟ گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر کے وہ اسپتال میں داخل ہوا تب اس کے موبائل پر ایراز کی کال آنے لگی تھی۔

اس نے صرف ”ایراز کالنگ“ جگمگاتے ہوئے دیکھا تو دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ وہ یونہی موبائل مضبوطی سے تھامے اندر کی جانب دوڑا۔ وہ یہ کال نہیں سننا چاہتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دیا موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ وہ پھولی سانسوں کے ساتھ سفینہ بیگم کے کمرے تک پہنچا۔ اس نے اندر سے دو ڈاکٹرز اور نرسوں کو نکلتے دیکھا اور ساتھ ایراز۔ معیذ کی ٹانگوں کی جان گویا نکلنے لگی۔

تب ہی ایراز کی نظر اس پر پڑ گئی تو وہ بھاگنے کے سے انداز میں معیذ کی طرف آیا۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ وہ پیاس آگے جوشیلے انداز میں بولا۔

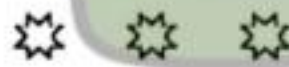
”ماما کو ہوش آگیا ہے بھائی۔ ابھی ڈاکٹر زچیک کر کے گئے ہیں۔ وہ بول نہیں رہیں، مگر وہ بالکل ٹھیک ہیں۔“ اور معیذ۔ پھر سے جی اٹھا۔

وہ تیزی سے کمرے میں بھاگا تھا۔

سفینہ بیگم چت کیٹی تھیں، مگر اتنے دنوں سے بند آنکھیں اب مسلسل کھلی تھیں اور چہت کو دیکھ رہی تھیں۔ ”ماما۔۔۔ ماما۔۔۔“ فرط جذبات سے وہ انہیں پکارتا ان کے قریب چلا آیا۔ تو انہوں نے چہرہ گھما کر دیکھا۔ ایراز اس کے پیچھے تھا۔ سفینہ بیگم کا کمزور سا لہجہ ابھرا۔

”تم لوگ کون ہو۔۔۔؟“

ان کے انداز میں اس قدر اجنبیت تھی کہ دونوں بھائی اپنی جگہ گڑے رہ گئے۔ انجکشنز لے کے آتا عمر بھی ساکت سا تھا۔



دعائیں رنگ لائی تھیں سفینہ بیگم کو مے سے باہر آگئیں، مگر شدید نروس بریک ڈاؤن کی وجہ سے ان کی دماغی کیفیت متاثر ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے فی الحال وہ کسی کو پہچان نہیں پارہی تھی، مگر ان کے لیے تو یہی خوشی بہت تھی کہ ماں زندہ جیستی جاگتی حالت میں سامنے تھی۔ وہ زارا کو لینے آیا۔ تو خوشی کی خبر سن کر وہ رونے لگی۔

”روومت زارا۔ پہلے اللہ کا شکر ادا کرو۔“ ایسہا نے نرمی سے ٹوکا تو معیذ نے بے اختیار اسے دیکھا۔

”مبارک ہو۔“ وہ کچھ جتانے والے انداز میں بولی تو معیذ عجیب سی کیفیت کا شکار ہوا۔

”میں بس شکرانے کے دو نفل پڑھ لوں۔ پھر ہاسپٹل چلتی ہوں۔“ زارا ہنستی روتی کیفیت میں تھی، مگر پہلے وہ

اس اللہ کا سجدہ شکر ادا کرنا چاہتی تھی جس نے ہاتھ اٹھاتے ہی اسے نوازا دیا تھا۔

زارا کے جانے کے بعد معیذ نے دیکھا ایسہا لاؤنج میں صوفے پر جا بیٹھی تھی اور اپنی مسنون دعاؤں والی

کتاب بند کر کے دعا مانگ رہی تھی۔
وہ کچھ سوچ کر اس کی طرف آیا۔ اس نے ایسہا کی دعا مکمل ہونے اور آمین کہہ کر چہرے پر ہاتھ پھیرنے کا
انتظار کیا وہ اٹھنے لگی تو 'معین کو کھڑے پا کر چونک گئی۔

”آتم سوری!“ وہ راستے میں کھڑا تھا۔ ایسہا وہاں سے جانے لگی تھی جب وہ صاف آواز میں بولا۔
وہ ٹھنک گئی۔ بے حد حیرت سے معین کو دیکھا۔

”میں نے ٹینشن میں آکر وہ فضول بکواس کر دی تھی۔ اس کے لیے سوری۔“
”میں ہر شخص کو معاف کرنے میں جلدی کرتی ہوں۔ آپ کو بھی اسی وقت کر دیا تھا۔ اس سے دل صاف رہتا
ہے۔“

وہ پرسکون انداز میں کہتی معین کو بے سکون کر گئی۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ وہاں سے جا چکی تھی۔
زارا اچھی طرح دوپٹہ لپیٹتی کھلے چہرے کے ساتھ آئی تو وہ چونکا۔

”ایسہا سے پوچھ لو۔ وہ جائے گی؟“

وہ کہنا کچھ چاہتا تھا اور منہ سے کچھ اور ہی نکل گیا۔ زارا کو بھلا کیا اعتراض تھا۔ فوراً اسے لے آئی۔ ان دونوں
کے ساتھ باہر نکلتے معین کو احساس ہوا کہ زارا نے بالکل ایسہا کے طریقے سے دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔
”تو کیا زارا۔۔ ایسہا کو قبول کرنے لگی ہے؟“
معین کے ذہن میں پھانس سی اٹکنے لگی تھی۔



سینہ بیگم کے سنبھلنے تک زارا کی شادی آگے کر دی گئی تھی۔ وہ تیزی سے رو بہ صحت تھیں اور ہاسپٹل سے
گھر شفٹ کر دی گئی تھیں۔ ہاں مگر ذہنی کیفیت کسی وقت بالکل غائب دماغ سی ہو جاتی تو وہ عجیب بہکی بہکی سی باتیں
کرتیں۔ کسی کو بھی نہ پہچانتیں یا پھر اگر اپنی کسی بات پہ اڑ جاتیں، خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ تو وہ بحث سننا پسند نہ
کرتی تھیں۔ زور زور سے چیختی چلاتیں اور ڈاکٹر نے انہیں سختی سے ٹینشن فری رکھنے اور بیمار اور عقل مندی سے
کنٹرول کرنے کی ہدایت کی تھی۔ زارا کے ذمہ ان کی مستقل دیکھ بھال آگئی تو وہیں سارے گھر کا نظام ایسہا کا محتاج
ہو گیا نذیراں واپس آچکی تھی۔ اس کے ساتھ مل کے ایسہا گھر کے ہر کونے کو سنوارتی۔

”مجھے اس لڑکی کی شکل سے ہی چڑ ہے ورنہ میں اسے مستقل نوکرانی بنانا پسند کرتی۔“

رباب نے ایک بار با آواز بلند ایسہا کو سناتے ہوئے مذاقاً ”معین سے کہا تو وہ سنائے میں آگیا۔
”شٹ اپ رباب۔“ وہ ناگواری سے بولا تو رباب نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

”تمہارا بہت دل دکھتا ہے اس کے خلاف سن کر۔“

”وہ تمہارے خلاف یہ سب کہتی تو میں پونہی اعتراض کرتا۔“ معین نے کہا تو وہ تلملا اٹھی۔

”یعنی تمہارے نزدیک مجھ میں اور اس تھرڈ کلاس میں کوئی فرق ہی نہیں ہے؟“

”وہی تو میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ تم اپنے اور اس کے درمیان موجود فرق باقی رہنے دو۔ جو رباب ہے وہ ایسہا
کبھی نہیں ہو سکتی۔“ معین نے ٹھنڈے لہجے میں کہا تھا۔

اور یہ سب اپنے کانوں سے سنتی ایسہا مراد کے ہونٹوں پہ چپ کا تالا تھا۔ اسے لگتا تھا وہ معین کے سامنے اپنے
حق کی آواز اٹھا کر شاید خود کو بے مول کر بیٹھی ہے اب وہ دوبارہ کچھ نہیں کہنا چاہتی تھی۔ اسے خدا کے فیصلے کا
انتظار تھا۔

سفینہ بیگم کے سامنے جانا ایسہا کے لیے کڑا امتحان ثابت ہوا۔ مگر ہاں زارا کی فراست کام آئی۔

”آپ چاہتی تھیں نا یہ اس گھر کے کام کرے تو جب سے آپ بیمار ہوئی ہیں نذیراں کے ساتھ مل کر یہ سارا گھر سنبھال رہی ہے۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا۔“

اور سفینہ بیگم اچھی طرح سمجھ گئی۔ البتہ شدید بیماری نے بھی ایسہا سے ان کی نفرت اور بدگمانی کو ختم نہیں کیا تھا۔ وہ ایسہا کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتیں جیسا کسی نوکرانی کے ساتھ۔ اور دوپہر کے کھانے تک تو حد ہی ہو گئی۔ شدید گرمی سے پریشان زارا شاہور لے کر فریش ہونے گئی تب سفینہ بیگم کے کھانے کا ٹائم ہو گیا تو ایسہا بڑی نفاست سے سلاد اور رائتے کی باؤلز سمیت کھانا ٹرے میں سجائے ان کے کمرے میں آگئی۔ انہوں نے اسے دیکھ کر منہ بنایا۔

”تم پھر آگئیں۔ نذیراں کہاں مر گئی ہے؟“

ایسہا نے بڑے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔ ایک برتن میں ان کے ہاتھ دھلوائے۔

”بہت ڈھیٹ ہو۔ بالکل اپنی ماں کی طرح۔“ وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔

”نذیراں سارا کام ختم کر کے گئی ہے۔ یہ ذمہ داری تو میری ہے نا۔“ وہ نرمی سے بولی اور ہاتھ خشک کرنے کے لیے نیپکن انہیں تھمایا۔

”تم کون ہوتی ہو میرے گھر کی ذمہ داری اٹھانے والی۔ ہنہ۔۔۔“ انہوں نے نیپکن بیڈ پر پھینکا۔

”میری بیماری کا بہانہ بنا کر قبضہ کرنا چاہتی ہو تم۔“ وہ تلملائیں۔ ایسہا نے نفی میں سر ہلایا۔

”آپ ٹھیک ہو جائیں تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ آپ بے فکر رہیں۔“

”اور اس گھر کا حصہ جہی چھوڑ دو گی؟“

وہ تنفر سے بولیں تو انداز جارحانہ تھا۔ ذہنی دورے کے تحت وہ ایسے ہی ایک بات پہ اڑ جاتی تھیں۔ ایسہا سے تو خیر ویسے بھی انہیں برخاش تھی۔

”جی۔۔۔ چھوڑ دوں گی۔“

معیز کے قدم کمرے کے دروازے ہی میں ٹھنک گئے۔ وہ کھانے کی ٹرے سفینہ بیگم کے سامنے رکھ رہی تھی۔

”اور میرے معیز کو بھی۔۔۔“

انہوں نے اسی حقارت بھرے انداز میں گویا کانٹوں بھرا کوڑا سے رسید کیا تھا۔ وہ بلبلائی روح تک تڑپی مگر منہ

سے ایک لفظ نہیں بولا تھا۔

”کھانا کھالیں آپ۔۔۔“

”نہیں۔ پہلے تم کہو کہ تم میرے بیٹے کا پیچھا چھوڑ دو گی۔“ وہ بضد ہوئیں اور اب یقیناً ”کتنی ہی دیر وہ اسی بات پہ

اڑی رہنے والی تھیں۔“

”میرا ان سے کیا تعلق۔۔۔ جب میں چلی جاؤں گی تو سب کچھ خود بخود ختم ہو جائے گا۔“

وہ بڑی برداشت سے کام لیتے ہوئے بولی تو ناچاہتے ہوئے بھی آواز بھرا گئی۔

”ہوں۔۔۔ چلی جانا۔ اچھا۔۔۔ ورنہ میں نوکروں سے کہہ کر تمہیں خود باہر پھکوا دوں گی۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے

تسلی سے بولیں اور کھانا کھانے لگیں۔

”نذیراں کھانا اچھا بنانے لگی ہے۔۔۔ میرے پاس کھڑے کھڑے سیکھ گئی ہوگی۔“
 وہ یونہی بولتی رہتی تھیں۔ اور ایسہا ان کے کھانا کھانے کے دوران ایک طرف کرسی پہ بیٹھی سنتی رہتی۔ اب
 بھی ان کی بات پر تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ بنا تصحیح کیے کہ یہ کھانا ایسہا نے بنایا تھا۔ بلکہ اب تو کھانا پکتا ہی ایسہا
 کی مہربانی سے تھا۔ زارا تو ان کاموں میں نکمی تھی۔
 معیذ گہری سانس بھرتا اندر آیا۔ ایسہا کی قوت برداشت واقعی کمال کی تھی؛ صحیح معنوں میں وہ ڈاکٹر کی ہدایت پر
 عمل کر رہی تھی۔

www.paksociety.com

”او معیذ۔۔۔ کھانا کھاؤ۔“

وہ معیذ کو دیکھ کر خوش ہوئیں۔ وہ لہج کرنے آفس سے گھر آیا تھا۔
 ”جی ماما آپ کھائیں۔ میں ابھی فریش ہوں گا۔ آپ کو دیکھنے آ گیا۔“ وہ مسکراتے ہوئے ان کے سامنے بیٹھ
 گیا۔

”اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

وہ بھی مسکرا میں۔ تو واقعی بالکل ٹھیک ہی لگیں۔

”اب میں نے سوچ لیا ہے کہ زارا کی شادی میں ہی تمہارے فرض سے بھی سبکدوش ہو جاؤں۔ بہولے آؤں
 گی میں، تو میری فکر کم ہوگی۔ بستر پہ بڑی ہوں سارا گھر اونڈھا سیدھا ہو گیا ہوگا۔“
 وہ مگن انداز میں مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ معیذ کی نگاہ بے اختیار ہی ایسہا کے سفید پڑتے چہرے کی
 طرف اٹھ گئی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایسہا کے سامنے کوئی ایسی بات کرے۔

خود چاہے وہ کوئی بھی فیصلہ کرنا چاہتا تھا، مگر یہ وہ جان گیا تھا کہ وہ ایک بے ضرر اچھی لڑکی ہے۔

سفینہ بیگم کی بات کا جواب اچانک دروازہ کھول کے اراز کے ساتھ اندر داخل ہوتے عمر نے دیا۔

”غلط فہمی ہے آپ کی پھوپھو جان سارا گھر اپنے قدموں پہ کھڑا ہے اور وہ بھی بڑی شان و شوکت کے ساتھ۔“

”اچھا۔۔۔ تمہیں بڑی خبر ہے۔“ وہ ہنسی ایسہا کو اپنا آپ وہاں مس فٹ لگا تو وہ اٹھنے کو پر تو لے لگی۔

”پھر بھی اگر آپ اپنے کسی بیٹے کی شادی کرانے پہ تلی ہی ہوئی ہیں تو میری کراویں۔“

اراز نے مسکین سامنے بنایا۔

”بلکہ مجھے گود لے کے بھی یہ فریضہ ادا کر سکتی ہیں۔“ عمر کے جملے کمال کے ہوتے تھے ایسہا کو ہنسی آنے لگی۔
 مگر عمر کے اگلے فقرے نے اسے تھرا دیا۔

”رہ گیا آپ کا گھر تو وہ آپ کی بڑی بہونے چکا کے رکھا ہوا ہے۔“

کمرے میں ایک دم خاموشی سے چھائی۔ ایسہا حواس باختہ سی کرسی سے اٹھی۔

”کیا بکو اس ہے یہ عمر۔؟“ وہ غصیل لہجے میں بولیں۔ ساتھ ہی ایسہا کو گھور کے دیکھا۔

”یہ کوڑے کے ڈھیر سے اٹھ کے آئی لڑکی۔۔۔ اسے تم میری بہو کہہ رہے ہو۔“

نفرت، حقارت، تنفر۔۔۔ خوف خدا ختم تھا یہاں جو عورت اپنے ٹھنڈے مزاج کے مثالی شوہر کے ساتھ

ساری زندگی طبل جنگ بجائے رہی تھی وہ کسی اور کو کیوں کر بخشتی ایسہا کا چہرہ اہانت کے مارے سرخ ہو گیا۔

”ہیرا کوڑے کے ڈھیر پہ پڑا ہو، تب بھی ہیرا ہی ہوتا ہے پھوپھو! اس کی قیمت اور قدر میں فرق نہیں آتا۔“

عمر سنجیدہ تھا، مگر اسے احساس نہیں تھا وہ کیا کر بیٹھا ہے۔ اگلے ہی پل سفینہ بیگم نے جیسے غصے سے بے قابو ہو

کر ہاتھ مار کے کھانے کی ٹرے پرے گرائی اور ایک پلیٹ اٹھا کے ایسہا کو دے ماری جو پوری قوت سے اس کے

بازو سے ٹکرائی اور نیچے گر گئی۔ واہی تباہی بکتی سفینہ بیگم نے گلاس اٹھایا تو اراز ان کے اور ایسہا کے درمیان آ

”کیا ہو گیا ہے۔ ما۔ ریلیکس۔“

اس نے نرمی سے آگے بڑھ کے ان کے ہاتھ سے گلاس لیا۔ اور ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ایسہانی الفور کمرے سے باہر نکل گئی۔ عمر اور ایراز سفینہ بیگم کو ٹھنڈا کر رہے تھے۔ معیذ اٹھ کر تیزی سے ایسہا کے پیچھے نکلا۔

ان دنوں اس کے پاس جائے پناہ صرف ایک ہی تھی، کچن۔ وہ دروازے پر ہی ٹھنک گیا۔

کچن میں کرسی پر بیٹھی میز پر بازو کے گھیرے میں سر نکالے وہ یقیناً ”رور ہی تھی۔“

تاسف اور دکھ کا احساس۔ اور سب سے بڑھ کر شرمندگی۔ معیذ کے قدم من بھر کے ہو گئے۔

آج تک وہ یہی سوچتا اور کڑھتا آیا تھا کہ زندگی نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ مگر آج پتا چلا کہ اس سے بھی زیادہ برا تو ایسہا کے ساتھ ہوا تھا۔ اور یہ ہونا ابھی جاری ہو ساری تھا۔

آگے آگے اس نے کرسی گھسیٹی اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ فوراً ”الرٹ ہوئی۔ جلدی سے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں پونچھ کے چہرہ اوپر اٹھایا تو سامنے معیذ کو پا کر اہانت کے احساس سے پھر آنکھیں نم ہو گئیں۔

معیذ کو ’سوری‘ جیسا لفظ بھی بے معنی لگنے لگا۔

بعض رویوں کا مداوا ”رویہ“ ہی ہوا کرتا ہے الفاظ نہیں۔ معیذ بھی اسی پوزیشن پر تھا مگر مشکل تو یہ تھی کہ رویے کے اظہار کے لیے رشتے کا لعین ضروری تھا۔

”ماما کی طرف سے میں معذرت چاہتا ہوں۔“ وہ درحقیقت شرمندہ تھا۔

لعنتیں، ملامتیں کھاتی یہ لڑکی مشکل وقت میں اس گھر کی صحیح معنوں میں مددگار اور مخلص ثابت ہوئی تھی۔

”ان کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں پتا نہیں ہے۔۔۔“

معیذ کو کہتے شرم آئی۔

(بھلا جب ذہنی کیفیت ٹھیک تھی تب کون سا وہ اسے پھولوں میں تول رہی تھیں)

”مجھے تو پتا ہے نا۔ میں ان کی وجہ سے نہیں رور ہی۔“ ایسہا نے انہیں بری الذمہ قرار دیا۔

”تو پھر کیوں رور ہی ہو۔؟“

رو کے گلابی ہوتی آنکھوں کے گرد سیاہ پلکوں کی گھنی باڑ تھی۔ معیذ نے اپنے سوال کے جواب میں آنکھوں کے گلابی تہہ والے کٹوروں کو پھر سے بھرتے دیکھا تو وہ مسخریز سا ہو گیا۔ کیا کسی کا رونا۔۔۔؟ رونا بھی جادو اثر ہو سکتا ہے؟ پھر وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”ایسے ہی۔۔۔ اپنی بد قسمتی پر یقین آ گیا آج۔ میں جتنی بھی صاف دلی سے کوشش کر لوں عزت اور محبت میرے نصیب میں نہیں ہیں۔ میں کبھی بھی کسی کو اپنا نہیں بنا سکتی۔ میرے باپ نے مجھے بیچ دیا، میری ماں مر گئی اور اس گھر نے مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ بس ایک مہربانی کیجیے گا۔ مجھے کسی قابل اعتبار دارالامان میں چھوڑ دیجیے گا۔“

وہ دکھ اور درد کی انتہا پر تھی۔ ایک آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کے رخسار پر لڑھک آیا۔ شدت ضبط سے سرخ پڑتی آنکھوں نے معیذ کو بیٹھے بٹھائے مار ہی تو ڈالا۔ وہ لمحوں میں خالی سینہ بیٹھا رہ گیا۔

کاگا، سب تن کھائیو
چن چن کھائیو ماس
دونہناں مت کھائیو
انہیں

پاملن کی آس وہ ایسہا مراد تھی۔ عزت اور محبت کے لیے روتی کر لاتی۔ اپنی بد قسمتی پہ آنسو بہاتی۔ جانتی نہیں تھی آج اس کی قسمت اونچ پر ہے اور اس کے بخت کا ستارہ معیذ احمد کی پیشانی پر چمکنے والا ہے۔ وہ دوپٹے سے بے دردی سے چہرہ گڑ رہی تھی۔

سرخ پڑتا چہرہ گھور سیاہ آنکھیں۔

معیذ کو جیسے آج پتا چلا کہ وہ کس قدر خوب صورت تھی اور یہ بھی کہ پاس بیٹھی لڑکی اس کی کیا لگتی تھی۔ وہ معیذ کے ساکت و جامد انداز پر گھبرا کر پریشانی سے بولی۔
”قسم سے میں آئی سے خفا نہیں ہوں اور کبھی بددعا نہیں کرتی۔ میں نے تو آج تک کبھی اپنے آپ کے لیے بھی برا لفظ نہیں کہا۔“

معیذ نے بے اختیار اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔ تو وہ گنگ سی ہو گئی۔

”میں جانتا ہوں۔ تم کسی کا برا چاہ ہی نہیں سکتیں۔“ ایک تند و تیز جھکڑ سا چلا۔ ایسہا نے حد درجہ بے یقینی سے معیذ کا چہرہ دیکھا۔

نرم سے تاثرات اور اس سے بھی بڑھ کے نرمی اس کے لب و لہجے سے چھلک رہی تھی۔

ایسہا نے جیسے کرنٹ کھا کر اپنا ہاتھ پیچھے کھینچا۔

معیذ کا انداز اپنی گرفت میں جکڑنے والا تھا۔ اس وقت وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھ لیتی تو کہیں اور دیکھ ہی نہ پاتی مگر اس نے مفر کی راہ اختیار کی، کرسی گھسیٹ کر فوراً اٹھ گئی۔

مگر معیذ موقع جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ بالکل تازہ تازہ دل پہ نیتنے والی واردات نے پل بھر میں ایک نیا معیذ احمد تعمیر کر ڈالا تھا۔

تویہ ”آسانی چیز“ اس پر نازل ہو ہی گئی تھی۔ جسے عرف عام میں محبت کہا جاتا ہے؟ کیا یہ واقعی تھی؟ اس نے ایسہا کا ہاتھ دوبارہ سے تھاما اسے جانے سے روکا اور خود بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں ایسہا۔“

بدلی نگاہ بدلا لب و لہجہ۔ وہ وحشت زدہ سی ہرنی کی مانند معیذ کو دیکھنے لگی۔

اور ان غزالی آنکھوں پر وہ فریفتہ ہی تو ہو گیا۔ دل تو چلا ہی گیا اب بس ایک جان ہی باقی رہ گئی تھی وارنے کو۔ (مگر جو فیصلہ میں نے کیا ہے اس کا کیا؟)

ایسہا نے خود کو یاد دلایا۔

اسی وقت زارا اسے پکارتے ہوئے ادھر ہی چلی آئی تو معیذ اس کا ہاتھ چھوڑ کر پلٹ گیا۔

تمتاتے چہرے کے ساتھ وہ اللہ کا شکر ادا کرتی زارا کو دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا۔ لگی تو نہیں تمہیں؟“ زارا کی پریشانی محبت بھری تھی۔ معیذ نے شدت سے محسوس کیا اور زارا کو

خوش قسمت بھی گردانا جو اس محبت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

وہ ایسہا کی آستین اوپر چڑھائے لال نشان دیکھ رہی تھی۔

”کریم مل دیتی ہوں۔ نیل پڑ جائے گا یہاں۔“

جب طعنے نشنے تھے تب بھی زندگی مشکل تھی۔ اب ایک دم سے یوں توجہ ملی تو ایسہا کا پھوٹ پھوٹ کے رونے

کو جی چاہا۔

اور دل چاہا اپنی پشت پہ کھڑے اس خوب صورت شخص کی بدلتی آنکھوں میں غور سے اپنا عکس دیکھے۔ اور پھر

بار بار دیکھے۔۔۔ آج تو معجزہ ہو گیا تھا۔
 معین کا دیکھنا۔۔۔ عام دیکھنے جیسا نہیں تھا۔ مگر وہ اسے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے اپنے دل کو کچلتا تھا۔ جو فیصلہ
 اس نے کیا تھا اس پر عمل کرنے کے لیے اس کا اس گھر اور اس کے لوگوں سے دور ہو جانا ہی بہتر تھا۔
 بس کچھ ہی گھنٹے تھے ایسہا کے ان سب کے ساتھ اس کا ایک بار پلٹ کر معین احمد کو دیکھنے کو جی چاہا، مگر وہ دل
 پہ پاؤں رکھے زارا کے ساتھ نکل گئی۔



وہ مرد تھا۔ اور اسے کوئی شرمندگی نہ تھی کہ ایسہا مراد آج اسے اچھی لگی۔ بلکہ اس وقت کے بعد تو وہ بار بار
 اسے دیکھتا اور سننا چاہ رہا تھا۔

اس کے پاس اپنی اس وارفتہ اور بے اختیارانہ کیفیت کا تجزیہ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ بس ایسہا کے سامنے
 جاتا اور سب حقیقت سامنے آجاتی۔ کیا یہ وارفتگی تب بھی باقی رہتی۔ یا محض ان چند لمحوں کا جادو تھا؟
 وہ ایسہا سے ملنے کو بے قرار تھا۔ مگر وہ تو جیسے اس سے چھپ ہی گئی تھی۔

تو یہ کیسے پتا چلے کہ ایسہا مراد اس کے لیے کیا بن گئی تھی۔ بنا اس کے سامنے پھر سے جائے؟
 وہ پورے گھر میں اسے ڈھونڈ چکا تھا۔ آخر میں لان میں مگر وہ ندارد اسے لگا شاید وہ زارا کے کمرے میں
 ہو۔ تب ہی سر اٹھا کے آسمان پہ چھائی سرمئی بدلیوں کو دیکھتے اس کی نگاہ میں ٹیرس پر لہراتا سرخ و سفید دوپٹا آگیا۔ وہ
 اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔

کیا قرار آیا تھا دل کو۔ جو مقصود تھا وہ پالیا ہو جیسے۔ وہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھا۔ سب اپنے کمروں میں تھے۔
 وہ سیڑھیاں پھلا نکلتا ٹیرس پہ آیا تو اسے اوپری سیڑھیوں پہ سر جھکائے بیٹھا پایا۔
 سکون کی ایک گہری سانس اس کے حلق سے آزاد ہوئی تھی۔ جو توں میں مقید پاؤں اس کی نگاہوں کے سامنے
 آکے ٹھہرے تو ایسہا نے ہڑبڑا کر چہرہ اٹھایا۔

سامنے ہی وہ دشمن جان کھڑا تھا۔ جو کبھی زیست کا حاصل ”تھا“
 یا شاید ”مگا کرتا تھا“

”کس سے چھپ رہی ہو۔؟“ معین دفعتاً برامان گیا۔ ہلکے سے چہن آئینہ انداز میں کہا۔
 ”میں کسی سے کیوں چھپوں گی۔ میں نے کسی کا کیا چرایا ہے۔“ اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہہ کر ٹھوڑی
 دوبارہ گھٹنوں پر رکھ لی۔

کیا پتا کچھ چراہی لیا ہو۔ ”وہ بے ساختہ بولا۔“ پھر اپنے لفظوں پر مسکرا دیا۔ اسے یہ سب کہنا اچھا لگ رہا تھا۔ کوئی
 جبر کوئی زبردستی نہ تھی۔

”تھوڑا ہی وقت ہے سب لوٹانے میں۔“ وہ ہلکے سے بدبڑائی۔
 ”ہوں۔ کیا کہا۔؟“

وہ واقعی اسے سننا چاہتا تھا، مگر وہ گہری سانس بھرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ سرخ و سفید پرنٹ کے لباس میں ان ہی
 دور نگوں کا دوپٹہ شانوں پہ ڈالے وہ معین احمد کو ایک نیا جہاں ایک نئی دنیا لگ رہی تھی جو اس نے آج ہی دریافت
 کی ہو۔

”میں تو بس یونہی۔ اچھا موسم دیکھ کے آگئی تھی۔“ اس نے نیچے جانے کا ارادہ باندھتے ہوئے ساوگی سے کہا۔
 معین کے بدلتے انداز پر اس کا دل دھڑکے جا رہا تھا۔

ایسہا کو زوروں کا رونا آیا۔

وہ کیا کرتی۔ اب اس کی سوچ اس کی منزل بدل چکی تھی۔ اسے ان نگاہوں اور اس لہجے کے جال میں نہیں آنا تھا۔

ایسہا نا سمجھی کا تاثر دیتے ہوئے اس کے پاس سے گزری تو معیذ کی پرسکون سی آواز نے اس کے جسم و جاں میں ہلچل سی مچادی۔

"کیا مجھے اپنے اب تک کے رویے کی معافی مل سکتی ہے؟"

جال کاٹ کاٹ کے مفر کے راستے ڈھونڈنے والا پرندہ خود بخود دل کی ڈال پر آ کے بیٹھ گیا تھا۔ اس کی جان لرز نے لگی۔ وہ چاہ کے بھی اس سے دوری اختیار کرنے والا ایک قدم بھی نہیں اٹھاپائی تھی۔ شدت سے رو دی۔

دنیا کی بھیڑ میں کھوئے ہوئے کو اچانک کوئی اپنا مل جائے۔ کچھ ایسی ہی حالت ایسہا کی بھی ہوئی تھی۔

معیذ نے اس کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے نرمی سے اسے تھام کر گلے سے لگایا تھا۔ جیسے اسے سہارا دیا ہو۔ اور بس۔ ایسہا کو اپنے اللہ کے جبر و قہر۔ اس کی رحمانیت جاوی ہونے کے دعوے پہ پختہ یقین ہو گیا۔ آج اس کا صبر اس کا شکر اس کی تمام دعائیں اور بے بسی رنگ لے آئی تھی۔

پھر جانے کیا ہوا۔ وہ اس کے حصار کو ایک جھٹکے سے توڑ کر اس سے نظر ملانے بغیر سرپٹ سیرٹھیوں کی طرف بھاگ لی۔

"ایسہا۔ ایسہا۔!" وہ سیرٹھیوں کے کنارے تک اسے بے تابی سے پکارتا آیا تھا۔

مگر اس کے پیچھے تو جیسے جن بھوت لگ گئے تھے۔ معیذ کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

وہ اپنی شکست تسلیم کر رہا تھا۔ اور وہ تو پہلے ہی اس کی زندگی سے نہ جانے کا مصمم ارادہ ظاہر کر چکی تھی پھر یہ کیا ہوا کہ شاید مجھے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف ٹھیک سے کرنا نہیں آیا۔

(مجھے تو ہاتھ جوڑ کے معافی ملے گی۔ یا شاید اٹھک۔ بیٹھک کرنی پڑے)

سیرٹھیاں اترتے ہوئے سوچتا وہ ایک ہلکے سے سرور آمیز حصار میں گھرا ہوا تھا۔



وہ پچھلے کئی دنوں سے اس گھر کی نگرانی کر رہا تھا۔ جہاں سے اس نے ایسہا مراد کو نکلتے اور پھر وہیں واپس آتے

دیکھا تھا۔ وہ معیذ احمد اور ایک دوسری لڑکی کے ساتھ گاڑی میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک جاگی۔

یہ لڑکی۔ جادو کا چراغ تھی اس کے لیے۔ تحویل میں آجاتی دوبارہ تو وہ بہت کچھ حاصل کر سکتا تھا۔ تب ہی وہ اس گھر کے باہر تاک میں بیٹھ گیا۔ صرف کھانا کھانے جاتا اور پھر وہیں سڑک پر آکر جم جاتا۔ وہ ایسہا مراد کے گھر سے اکیلے نکلنے کی امید میں تھا۔

اور قسمت اس کا ساتھ دینے کی کھل تیاری کر چکی تھی۔



روتے ہوئے اس نے اپنے کپڑوں کا بیگ پیک کیا۔ جو وہ انیکسی سے یہیں لے آئی تھی۔

بس۔ اس گھر اور گھر والوں کے ساتھ اس کا اتنا ہی ساتھ تھا۔ معیذ احمد کا لمس یاد آتا۔ اس کا ہارا ہوا ہگر پیارا

انداز تو جان ٹوٹنے لگتی۔

سب جا میں بھاڑ میں، مگر پھر خیال آتا اس عہد کا جو اس نے خود سے کیا تھا۔

وہ دنگ تھی قسمت کے اس موڑ پر۔ جب اس نے اپنا دل بدلا تو معیذ احمد کا دل بھی بدل دیا گیا۔
 اگر وہ تھوڑی سی خود غرضی دکھاتی تو اس کی زندگی پر بہا رہی ہو سکتی تھی مگر۔
 اس نے موبائل اٹھا کر ٹائم دیکھا۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ سب یقیناً سو رہے تھے۔
 چھوٹا گیٹ تو کھلا ہی ہوتا ہے۔ صرف ہینڈ لاک ہے جو گھمانے پہ کھل جائے گا۔ اور مین روڈ پہ نکلتے ہی کنویں
 بھی مل جاتی ہے۔

وہ سب حساب کتاب لگا چکی تھی۔

رونا، رونا۔ شدت کا رونا۔ مگر وہ جانتی تھی اس کا اس گھر سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔
 وہ زارا کے کمرے میں تھی۔ اور زارا، سفینہ بیگم کے پاس تھی۔ وہ اپنا بیگ اٹھائے خاموشی سے باہر نکلی تو دل و
 دماغ عجیب سن حالت میں تھے۔ وہ اب مزید کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی۔

یہاں سے سیدھی ثانیہ کے پاس جاؤں گی اور پھر اس سے کہوں گی مجھے کسی بہتر مشورے سے نوازے۔
 اس نے اندھیری سڑک پر چلتے ہوئے اپنے دل کو قابو کرنا چاہا جو خوف کے مارے بے ترتیبی سے دھڑک رہا
 تھا۔ تب ہی اس کے پیچھے چلتے سائے نے ایک دم سامنے آکر اس کا راستہ روکا تو بے ساختہ اس کی چیخ نکل گئی۔

”ایسہا!“ سفاک، سرد مہر سالجہ اور سب کچھ پالنے والی فاتحانہ مسکراہٹ۔

یہ چہرہ۔ یہ مکروہ چہرہ اور اس کے گندے عزائم ایسہا کیسے بھول سکتی تھی۔ اس کی ٹانگوں کی جان نکلتے لگی۔
 کندھے پہ لٹکا چار جوڑوں والا بیگ منوں برابر لگنے لگا۔

”کب سے ڈھونڈ رہا تھا تمہیں۔ میری سونے کی چڑیا۔“

اسے مارے خوف اور دہشت کے عش آگیا۔ زبان اکڑ کے چمڑا بنی تالو کے ساتھ چپک گئی تھی۔ بنا آواز نکالے
 وہ تیور کے گری تو اس شخص نے اسے سنبھالتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا اور حواس کھوٹی ایسہا کو بوری کی طرح
 کندھے پر لاد کر سڑک کنارے قریبی درختوں کے جھنڈ کی طرف پرہا۔ جہاں کتنے ہی دنوں سے وہ اپنی گاڑی اسی
 نیت پر کھڑی کرتا تھا۔ آج اس سنسان سڑک پر وہ بیش قیمتی موقع اس کے ہاتھ لگ ہی گیا تھا۔ چند لمحوں میں
 اندھیری سڑک پر محض گاڑی کی پچھلی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔



”یہ کیا بے وقوفی ہے۔؟“

موبائل پہ کوئی مہسیج پڑھتے ہوئے ثانیہ نے خود کلامی کی۔ عوں رات گئے ریسٹورنٹ سے لوٹا تھا۔ ابھی
 فریش ہو کے آیا تھا۔ تو لیے سے بال رگڑتے اس کے ہاتھ ٹھٹکے۔

”کیوں۔ سب ہی لوگ تو لیے ہی سے بال خشک کرتے ہیں۔“

ثانیہ کو ہنسی آئی۔

”تمہیں نہیں کہہ رہی۔“

پھر الجھن آمیز لہجے میں بولی۔

”تم کہہ رہے تھے ایسہا ان دنوں معیذ بھائی کے گھر ہے۔ ابھی مجھے اس کا مہسیج آیا ہے کہ وہ ہمارے گھر
 آ رہی ہے۔“ عوں چونکا۔

”معینز لے ساتھ۔ یا اکیلے؟“

”مذاق کر رہی ہوگی۔ اتنی رات کو۔ کوئی بات نہ ہو گئی ہو۔“

ثانیہ نے کئی قیام لگائے۔ اسی اثناء میں ثانیہ اس کا نمبر ملا چکی تھی۔ ایک بار دو بار سہ بار۔ مگر کال اٹینڈ نہیں کی گئی۔

”تم ذرا معینز بھائی سے پوچھو۔ ایسہا کال اٹینڈ نہیں کر رہی۔“

عون نے سر ہلاتے ہوئے اپنا موبائل اٹھا کر معینز کو کال کی تو کسی کے گمان میں بھی وہ قیامت نہ تھی جو گزر چکی تھی۔

www.paksociety.com



عون کی کال بند ہوتے ہی معینز تیزی سے زارا کے کمرے کی طرف بڑھا تو اسے اندھیرا اور خالی پایا۔ اس کے بعد سارے گھر کی لائٹس آن کر کے دیکھ لیا۔ ماما کے کمرے میں جھانک آیا جہاں ماما اور زارا بے خبر سو رہی تھیں۔ وہ خدشات سے بو جھل دل لیے باہر کی طرف بھاگا۔ لاؤنج کا انٹرنس ڈور (داخلی دروازہ) کھلا تھا۔ گیٹ پہ آ کے اس کے بدترین خدشات کی تصحیح ہو گئی۔ بڑا گیٹ بدستور تالے سے بند تھا۔ مگر چھوٹے گیٹ کی کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ البتہ آٹومینٹ لاک کسی کے باہر جا کے دروازہ بند کرنے پر اندر سے خود بخود لگ جاتا تھا۔ معینز نے دروازہ کھول کے سرک۔ ادھر ادھر نگاہ ڈالی دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ وہ بے بسی سے مٹھیاں پھینچے لٹی پی کیفیت میں کھڑا تھا۔

(اختتام کی طرف گامزن باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ساری بھول
ہماری تھی



راحت جبیں

قیمت - 300 روپے

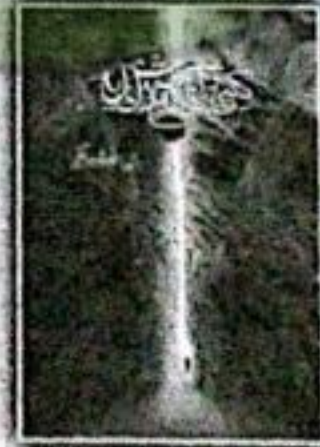
شریک سفر



زہرہ ممتاز

قیمت - 550 روپے

کسی راستے کی
تلاش میں



میمونہ خورشید علی

قیمت - 350 روپے

میرے خواب
لوٹا دو



نگہت عبداللہ

قیمت - 400 روپے

فون نمبر:
32735021

منعوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

217 جولائی 2015

منی حیات لکھنؤ

بٹی کے چہرے کو گھورا، مگر وہاں کوئی پروا نہیں تھی۔ سینٹرل نیبل سے گلاس اٹھایا، چھوٹے کولر کے پاس جا کر پانی بھرا اور جلدی جلدی چڑھا کر وہ کمرے کی طرف مڑی۔

”مہک۔۔۔ مہک۔۔۔!“ فریدہ پیچھے سے بولتی ہی رہ گئیں۔

”بس بیٹا! وہ زمانے گئے جب بیٹیوں میں تمیز، اخلاق اور سلیقے والی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ما میں صرف ابرو کا اشارہ کرتیں اور بیٹی فوراً سے پیشترماں کی نظروں کا مفہوم جان جاتی۔ ادب و آداب تو اس دور کی فضاؤں تک میں رچا بسا تھا، مگر اللہ سمجھے اس انگریزی تعلیم کو جس نے لڑکیوں میں لڑکوں جیسی فضول اکڑ ڈال دی۔ تہذیب، سلیقہ چھو کر نہ گزرا۔۔۔“

دادی کو موقع مل گیا۔

”اماں! کلج سے ابھی تھکی ہوئی آئی ہے۔ آج گرمی بھی تو بہت ہے۔“ فریدہ نے ماں ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے نادریدہ پسینہ ماتھے سے صاف کیا۔

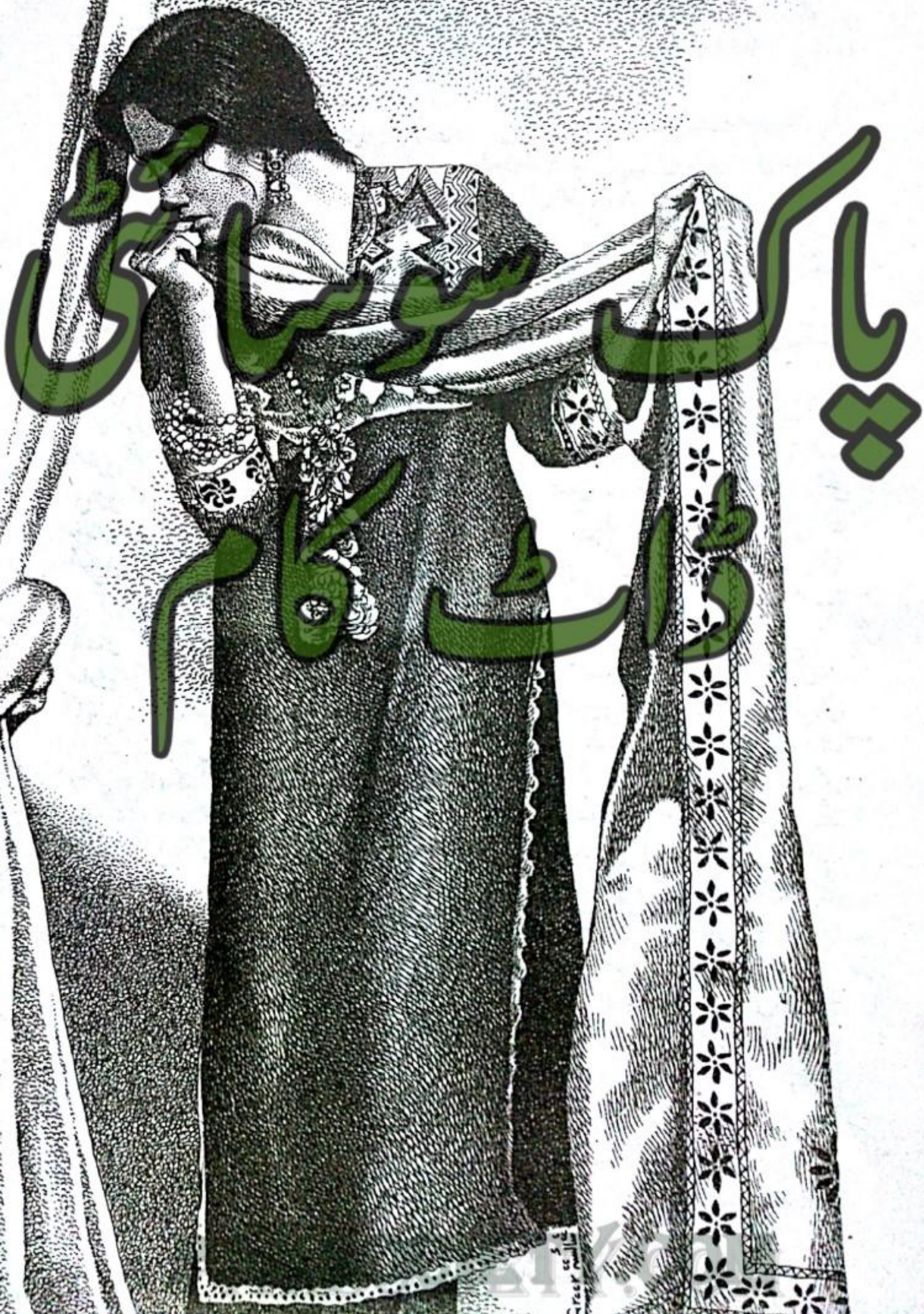
”ہاں، بس ایسی ہی مائیں ہوتی ہیں، جو پردے ڈال ڈال کے بیٹیوں کی عادتوں کو مزید پکارنگ چڑھاتی ہیں۔ پھر جب یہی بیٹیاں اگلے گھروں میں جا کر بد تمیزی کرتی ہیں تو ساس اور نندوں سے منہ کی کھاتی ہیں۔ پھر ایسی ہی مائیں، بیٹیوں کے پیچھے ریں ریں کرتی پھرتی ہیں۔ پہلے چولی سے پکڑ کر ٹھیک کرنا نہ آیا تو بعد میں رونے کا فائدہ؟“

دادی کے ہاتھوں اماں کی درگت بنتے دیکھ کر کچن سے چکن منچورین کا ڈونگا اٹھائے باہر آتی عازنہ نے ترچھی نظروں سے ملک جلال کو دیکھا جو کبھی ہونٹ

گرمی سے یا غصے سے، کوئی عکس واضح نہیں ہو پارہا تھا۔ بس ایک تہمتا تا چہرہ کمرے میں داخل ہوا۔ آنکھوں میں نظر آتی درستی اور ایک تفاخر سے یا غصے سے آنچل کو کندھے پر یوں ڈالا جیسے کوئی برانا قرض چکانا تھا۔ پھر وہ بک کر کے خود کو صوفے پر گرایا گیا، بد مقابل بے شک اجبسی نہ تھا، نظر انداز کرنے کا شامل مکمل اجنبیت کو ظاہر کر رہا تھا۔ فریدہ نے خائف نظروں سے

ناولٹ





بیٹھ کر پورے اہتمام سے کھا رہی تھیں۔
 ”تم اتنا مثبت کیسے سوچ لیتی ہو؟“ مہک کبھی کبھی اتنی معصومیت سے بعض سوالات پوچھتی کہ عائرہ کو بہن پر پیار آجاتا۔

”کیوں کہ مجھے مثبت سوچنے سے سکون ملتا ہے اور زندگی میں واحد ”سکون“ ایک ایسی عیاشی ہے جس پر انسان کا اپنا اختیار ہوتا ہے۔“

”مگر میرا دل بعض چیزوں پر راضی نہیں ہوتا۔“ وہ مالٹوں کی پھانکیں علیحدہ علیحدہ کر کے ان پر نمک چھڑکتے ہوئے بولی۔

”مجھے پتا ہے تمہارا اشارہ کس طرف ہے۔ تم ملک دلاور کے رشتے پر راضی نہیں ہو۔“

”راضی ہا کیا تیج میں مجھے تو ان کے نام تک نہیں پسند۔ ملک دلاور۔ ملک جلال۔ اونہوں پرانے زمانے کے ناولوں کے ہیرو۔ تیج میں پرانے زمانے کی تان دادی نے اتنی دفعہ لگائی ہے مجھے ہر پرانی چیز سے نفرت سی ہونے لگی ہے۔ پرانا دور۔ پرانی روایات۔ پرانی تہذیب۔ ہمارا کیا قصور جو ہم نئے ہو گئے۔“

مہک کے تبصرے پر عائرہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔
 ”بہن۔ میری پیاری بہن۔ ہر بندے کو پرانی چیزوں کا حصہ بننا ہے۔ ہر دور مستقبل کی طرف بڑھتے ہوئے ضرور ماضی میں جاگرتا ہے۔ ہم سب بھی ماضی ہو جائیں گے تو پچھلے دور، پچھلی روایات سے انسانی محبت ایک قدرتی عمل ہے جس دور میں آپ جی رہے ہوتے، سو اس دور میں آپ جو پہناوے پہنتے ہیں جو چیزیں کھاتے ہیں جن روایات کی پاس داری کرتے ہیں ان سے محبت ہو جاتی ہے۔ دادی بھی اسی محبت کی وجہ سے اپنا دور یاد کرتی ہیں۔ وہ اس دور کو اپنا نہیں سمجھتیں، پر ایسا جان رہی ہیں اسی لیے تنقید کر جاتی ہیں۔ کل کو ہم مستقبل میں جا کر اپنا ماضی اور اپنے دور کی روایات کی یادیں اسی طرح سینے میں بسا کر یونہی کہا کریں گے۔ یہ دور نہیں اچھا، پچھلا اچھا تھا۔“
 ”ہوں۔ ٹھیک کہتی ہو شاید تم۔“ وہ قدرے

سکوڑ رہا تھا۔ کبھی کسی بات پر مسکرا رہا تھا۔
 ”اماں! اب ایسی بھی بات نہیں۔ مائیں بیٹیوں کو اچھی ہی تربیت دیتی ہیں۔ اچھی ہی بات سکھاتی ہیں اور اگر بیٹیاں کبھی بد تہذیبی کا مظاہرہ کریں تو ماؤں کو پتا ہوتا ہے۔ بس وہ دوسروں کے سامنے بیٹیوں کی عزت افزائی کرنے سے پرہیز کرتی ہیں۔“ ملک جلال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا گیا۔

”بس اس پڑھی لکھی پوت کے پاس دلائل کے انبار ہوتے ہیں۔ مجھ بڑھیا کو ان سے مقابلہ کرنا کہاں آئے گا۔ پچھلے دور میں تو ہم لوگ بڑوں کی باتوں کے سامنے بحث کرنا گناہ سمجھتے تھے۔“ دادی کی ”پچھلے دور“ کی کہانی پھر شروع ہو گئی تھی۔

عائرہ کو غصہ سا آنے لگا۔ ”دادی! اگر پچھلے دور میں اصغری تھی تو اس کی بڑی بہن اکبری بھی پچھلے دور کی ہی لڑکی تھی اور ہم نے ”پچھلے دور“ کو اچھی طرح سے بڑھا ہوا ہے ہر دور میں ہر دور اسی موجود ہوتی ہے۔“ وہ ”پچھلے دور“ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

فریدہ نے عائرہ کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ دادی کی بات کی مسلسل نفی ایک نئی جنگ چھیڑ سکتی تھی اور وہ ساری عمر مصلحتوں پر چلنے والی خاتون اب جوان بیٹیوں کی وجہ سے ایسے خطرات مول نہیں لے سکتی تھیں۔
 ”عائرہ! کچن میں قہے کو دیکھ لو۔ اب وہ تھوڑا بواٹل ہو چکا ہوگا۔“ انہوں نے اسے سامنے سے ہٹانا چاہا۔ دادی کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ ملک جلال بھی صورت حال کی نزاکت کو سمجھ کر اب جانے کے لیے پر تول رہا تھا جبکہ خود وہ جلتی بھنتی کچن کی طرف مڑ گئی۔



”انسان جس چیز سے ڈرتا ہے وہی اس کے سامنے آتی ہے۔“
 ”غلط ڈیر! انسان کے لیے اللہ۔ جو بہتر سمجھتا ہے۔ وہی اس کے سامنے لاتا ہے۔“ وہ کینو چھیل کر مہک کو پکڑاتے ہوئے بولی۔ دونوں بہنیں مالٹوں کی دیوانی تھیں۔ اس لیے سینٹریل ٹیبل کے گرد کرسیوں پر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

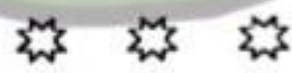
مطمئن ہو گئی عائرہ فی الحال اسے پرسکون ہی کرنا چاہ رہی تھی، پچھلے کچھ دنوں سے وہ کافی آپ سیٹھی تھی۔
”مریم آئی کی کال آئی؟“

”نہیں، آج صبح سے میری ان سے بات نہیں ہوئی۔“

”یار یہاں اسکا پ۔ ٹھیک سے نہیں چلتا۔ تم ”imo“ کی اپیلی کیشن انسٹال کروالو۔“ مہک نے اسے مشورہ دیا۔

”ہوں۔ چلو تم میرے موبائل پر کروینا۔ جب فری ہو۔ اچھا اب میں کھانا بنا لوں۔ ویسے پائی داوے تمہیں پتا ہوتا چاہیے آج ابو نے تیا ابو اور دونوں ملکوں کو بلایا ہے۔“ وہ کچن کی طرف جاتے ہوئے شرارت سے بولی۔

”پھو آف ملک (ملکوں کا جوڑا)“ اس نے غصے سے ملک دلاور اور ملک جلال کو ”پھو آف ملک“ کا نام دیا۔



کھیتوں میں دھان کی فصل کی بوائی کا کام جاری تھا۔ اب بیلوں کی گردن میں ڈالی جانے والی گھٹیوں کی جگہ ٹریکٹروں کی آوازوں نے لے لی تھی۔ نرم پورا احت والی فضاؤں نے ناگواری سے ٹریکٹروں سے اٹھتے ہوئے دھوس کو دیکھا۔ کائنات کی ساری نزاکتیں ماحولیاتی آلودگی نے ختم کر دی تھیں۔

سنہری پھول۔ سورج سے ناراض ہوئے چلے جا رہے تھے۔ فضا میں ناراضی کا عنصر زیادہ نمایاں تھا۔ وہ سورج سے رخ پھیرے بیٹھے تھے۔ کئی پھولوں کی کلیاں بن کھلے ہی مرجھار ہی گئیں۔ چڑیا چوچ میں دانہ ڈال کر اپنے بچوں کے سامنے قدرے برہمی سے پھینکنے لگی۔ کتنی ہی دفعہ وہ چوچ میں پانی بھر کر چھوٹے بچے کے منہ میں ڈالتی پر نجانے کون سی ایسی پیاس تھی، جو سمجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

سرنگاں گاؤں پنجاب کے جنوبی حصے میں پڑتا تھا۔ سرنگاں۔ سرنگ سے ماخوذ تھا یا پھر اسی کو بگاڑ کر رکھا

گیا تھا اس چھوٹے سے گاؤں میں ذات کے ملک مکین تھے۔ جن کی چودھراہٹ ماضی کا حصہ بن گئی۔ اب سب پڑھ لکھ گئے تھے۔ تعلیم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے، یہ غلامانہ ذہنیت اور غلامی کے درمیان باریک سے فرق کو بھی پہچان لیتی ہے۔ تعلیم نے اس گاؤں کے لوگوں میں عزت نفس اور خودداری کی فصل بوئی تھی، جو کہ آنے والی نسلوں کے لیے خوش آئند بات تھی۔ اب ملکوں کو لوگ اپنی بیٹھکوں میں دوستوں کی طرح شادی بیاہ پر دعوت دیتے۔ جو ذرا ناک ابھی تک اونچی رکھے ہوئے تھے۔ وہ کمی کمین جان کر ناک بھوں چڑھا کر گھروں میں ہی بیٹھے رہتے۔ لوگ پروا بھی نہ کرتے۔

ہر زمانے میں کچھ اچھی باتیں بھی پنپتی ہیں۔ لوگوں نے احساس کمتری کو ختم کر لیا تھا۔ بدلی بدلی ہواؤں۔ رویوں۔ کو ملکوں نے کیسے قبول کیا یہ ایک الگ داستان امیر حمزہ تھی۔ پر اب وہ شادیوں میں جانے لگے تھے۔ درختوں کے نیچے عام طبقے کے لوگوں کے درمیان بیٹھ کر دکھ سکھ میں شریک بھی ہونے لگے تھے۔ جتنے اونچے اور کے مکان ان کے تھے۔ اب باقی لوگوں نے بھی بنا لیے کسی کا بیٹا کویت میں انجینئر تھا تو کسی کا کراچی میں کشم میں بھرتی ہو گیا تھا۔ تعلیم نے شخصیت نکھار دی رویوں میں خلوص اترنے لگا، پر ایک اچھی چیز اتر رہی تھی اور ایک بری چیز بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ دکھاوا۔ نمود و نمائش بڑھ گیا۔ فطرت میں ”دکھاوے“ کا عنصر زیادہ ہو گیا تھا۔

ملک دلاور اور ملک جلال نے بھی ایم اے کر لیا۔ وہ شہر کی طرف بھاگے جہاں ملک صفدر نے اپنی دونوں بھتیجیوں کے لیے رشتہ ڈال دیا۔ مہک کے لیے چھوٹے دلاور کا اور عائرہ کے لیے جلال کا۔ ملک ایاز کے لیے صورت حال پریشان کن تھی۔ ان کی بیٹیاں کانونٹ کی پڑھی ہوئی تھیں۔ سوچوں اور نظریات میں اختلاف تھا۔ پھر ماحول یکسر مختلف۔ فریدہ نے یہ رشتہ نہ کرنے کی درخواست کر دی۔ دادی نے تو گھر میں کھرام برپا کر دیا۔ ملک ایاز ماں اور بھائی کو زیادہ دیر تک

تاراض نہ رکھ سکے اور رشتہ طے کر دیا۔ ایک چھوٹی سی تقریب میں روتی ہوئی مہک اور قدرے سنجیدہ سی عائرہ نے انگوٹھیاں پہن لیں۔

فریدہ اس رات بیٹیوں کے سر پر ہاتھ رکھ کر دوا دی سے چھپ کر کتنی ہی دیر روتی رہیں۔ شکر ہے مریم کا جوڑ ہی نہ تھا۔ وہ تو ایان خرم سے شادی کر کے کینیڈا میں بیٹھی تھی۔ وہ اور اس کا شوہر دونوں کینیڈا میں ڈاکٹرز تھے اور بڑی اچھی فیملی لائف گزار رہے تھے۔ فریدہ کا اپنا خاندان پڑھا لکھا سلجھا ہوا تھا۔ انہوں نے کبھی زندگی میں بھی نہ سوچا تھا کہ بیٹیوں کو اس خاندان میں بیاہیں گی۔ پر ملک ایاز اور سسرال کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھیں۔

اس نے سفید کرتا پہنا ہوا تھا جس کے اوپر میرون بٹن لگے ہوئے تھے۔ گھلے بالوں کو شانوں کے پیچھے لہراتے میرون پٹی والے سفید دوپٹے کو جھلاتے وہ کاریڈور سے باہر لان کی طرف آگئی۔

مما معمول سے کچھ زیادہ ہی چپ رہنے لگی تھیں۔ گھر کی فضا میں عجیب سی اداسی نے ڈرہ جما لیا تھا۔ لان کے دائیں طرف کناروں پر لگی بیل گی کٹنگ کا جائزہ لیتے ہوئے وہ سیدھی ماما کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

”میں نے پاستا بنالیا ہے۔ آج خالہ آرہی ہیں۔“ عائرہ نے ماں کی توجہ بٹانا چاہی۔

”آں۔ ہاں!“ وہ خیالوں سے چونکیں۔ ”مجھے لگتا ہے۔ ہم لوگوں سے تم دونوں بہنوں کے معاملے میں زیادتی ہو گئی ہے۔ میں نے اپنی بیٹیوں کے لیے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا۔“

”افوہ ماما! میں جانتی ہوں آپ اور بابا جان کبھی ہمارے لیے برا نہیں سوچ سکتے اور مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔ میں خوش ہوں۔“

عائرہ نے مطمئن نظر آنے کی پوری کوشش کی۔ فریدہ بیگم بس اس کو دیکھتی ہی رہ گئیں۔ بلاشبہ وہ بے حد سعادت مند بیٹھی تھی۔

”پر مہک۔ مہک تو بہت پریشان سی ہو گئی ہے۔ مجھ سے بھی خفا۔ پھر کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہیں کھا

رہی ہے۔“ فریدہ بیگم کی پریشانی بجاتی تھی۔ ”مما! اسے وقت چاہیے اس ساری صورت حال کو سمجھنے کے لیے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ انسان کی خواہشات کے برعکس کوئی کام ہو تو وہ بونہی پریشان سا ہو جاتا ہے۔“

”چلیں اچھیں۔۔۔ کچن میں چلتے ہیں۔“

وہ ان کا دھیان بٹانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔



اسے اپنے گھر کا یہ کونا بے حد پسند تھا جہاں پرانے زمانے کی طرح دیواروں میں جھروکے سے بنے ہوئے تھے۔ وہ انہیں بک شیلف کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایرانی لوک کہانیوں کا مجموعہ تھا۔ گزرے وقتوں کی داستاںیں پڑھ کر اسے خوب مزا آتا۔ پرانے لوگوں کے مزاج۔ لباس۔ انداز و اطوار۔ رہن سہن۔ خواہشات۔ سب کو پڑھ کر اسے ایک اندازہ ضرور ہوا تھا کہ پرانے وقتوں اور نئے ادوار میں موجود ہر چیز ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ صرف ”خواہش“ وہ واحد چیز تھی جو دونوں ادوار میں مشترک تھی۔ انسانی خواہشات۔ خیالات۔ تفکرات کا ہجوم لگ بھگ ایک جیسا ہی تھا۔ یہاں بیٹھ کر وہ تاریخ کے اوراق کھنگالا کرتی اور خود بھی ماضی کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔

”تم ادھر بیٹھی ہو۔ مجھے پہلے ہی پتا تھا۔ تمہیں ڈھونڈتے ہوئے سیدھا ادھر ہی آگئی ہوں۔“ مہک نے پھولی سانسوں کے ساتھ کہا۔ ”یہ لو“ اس نے پن ڈرائیو اس کی طرف بڑھائی۔ ”اس میں faerwell Baghdad والی مووی محفوظ کروا آئی ہوں۔“

”او، بہت شکریہ۔ میری پیاری بہن۔“ عائرہ خوش ہو کر بولی۔

”ہاں جی۔ مجھ سے تو کام نکلوا لیا، مگر میرا کام ہوتا نہیں۔“ وہ منہ پھلا کر بولی۔

”مہک! ماما بہت پریشان ہیں۔ تم پلیز تھوڑا انتظار

گزارنے کے لیے جو معیار تمہارے ذہن میں ہے کیا تمہیں یقین ہے کہ وہی سب کچھ ہے۔ ”وہ حیرت سے اس کی سوچ پر بصرہ کرتے ہوئے بولی۔

”عائزہ! میری فرینڈ کے فیانسی کوئی لہز سے پڑھا ہے۔ کوئی فاسٹ سے انجینئرنگ کر رہا ہے۔ کوئی کیمرج یونیورسٹی سے۔ کیا ان کی ڈرینگ ہے بالکل ہیرو والی پرسنالٹی۔ وہ جب ان کی باتیں کر رہی ہوتی ہیں تو ان کا لہجہ فخریہ ہوتا ہے۔ اصل چیز ذہنی ہم آہنگی ہے۔ وہ ماڈرن دور کے مطابق تو ہیں نا۔ ذہنی طور پر ایک دوسرے کو سمجھنے والے یہ تو نہیں کہ ایک مرسیڈیز کی بات کر رہا ہو، دوسرا بھینسوں کے لیے کون سا چارہ بہتر رہے گا۔ ایک نئے پلائس اور پلازہ کی بات کر رہا ہو، جبکہ دوسرا کھیتوں میں کون سی فصل بونی جائے اس پر تبصرہ کرنے بیٹھ گیا۔ نہ جی۔ نہ زندگی ایک دفعہ ملتی ہے اور وہ بھی من چاہی۔ میں ان لڑکیوں میں سے بھی نہیں جو کھوپڑیاں پر زندگیاں گزار دیں۔ ایسا ہوتا ہوگا، لیکن پچھلے زمانے میں۔“ دادی کا پچھلا زمانہ اس کے لہجے میں بھی آگیا تھا۔

”مہک! تم۔!“

”عائزہ! پلیز نو لیکچر۔“ وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا موڈ سخت آف ہو گیا تھا۔

”میں اس کو نہیں سمجھا سکتی۔“ عائزہ نے بے بسی سے جھوکوں میں آکر بیٹھ جانے والی چیزوں کی چوں چوں میں پریشان ذہن کو الجھاتے ہوئے سوچا۔

”عائزہ! میں سوچ رہی ہوں کہ صوفے کے کور بدل دیں۔ تم میرے ساتھ مارکیٹ چلنا۔“

وہ ریک میں اپنی کتابوں کی سیٹنگ میں مصروف تھی جب ممانے آکر اس سے کہا۔

تب ہی ٹی وی لاؤنج کے سینٹرل ٹیبل پر پرافون زور زور سے بجنے لگا۔

”عائزہ! ٹیل تو اچھی لگایا کرو۔“ تازہ تازہ فیشنل کروائے مہک بھی وہیں آگئی۔ جاتی سردیوں کی مدھم مدھم سی دھوپ تھوڑی تھوڑی لاؤنج کے کارپٹ پر بھی اپنی جھپ دکھا رہی تھی۔ سرخ کارپٹ پر سنہری

کرو۔ یہ آسان کام نہیں ہے۔ کتنے لوگ اس پر ناراض ہوں گے۔ بابا، دادی۔ تاپا ابو۔ پھر خاص طور پر میرا رشتہ بھی شامل ہو گیا ہے۔“

”تو تم اس پر راضی ہو؟“ مہک نے حیرت سے آنکھیں نکالیں۔

”ہاں مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔“

”اف مائی گاڈ! اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی کنویں میں چھلانگ لگواؤ گی۔“ مہک سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

عائزہ کو اس کی بات پر افسوس ہوا تھا۔

”تمہیں مسئلہ کیا ہے آخر؟“ وہ تھک کر بولی۔

”ملک دلاور۔ زمانہ قدیم کا نام بندہ کوئی ماڈرن نام رکھے اب گاؤں بھی شہر بن گئے ہیں۔ شلوار قمیص کی جان ہی نہیں چھوڑتا۔ پینٹ شرٹ نہیں پہن سکتا کیا؟ پورا منہ کھول کر ہنستا ہے حلق کا کوا بھی اس کے ہاتھوں تنگ ہے۔ میں جو بات کہوں چاہے وہ گھر کے بکے سالن کے متعلق ہی کیوں نہ ہو اپنی دلچسپی سے سنتا ہے کہ جیسے پتا نہیں کون سی دیومالائی داستان سنانے بیٹھ گئی ہوں۔ میں اگر کہوں کہ میں نے دریا میں کودنے جانا ہے تو بخوشی تیار ہو جائے گا۔ میں نے کہا مجھے چکن وڈ چیز والے برگر پسند ہیں تو فوراً“ سے ہی کہہ دیا کہ مجھے بھی پسند ہیں۔ آئی ڈونٹ نو (میں نہیں جانتی) کہ وہ کیا چیز ہے؟“ اپنے کٹے بالوں میں انگلیاں پھیرتے اس نے خاصے مضحکہ خیز انداز سے ملک دلاور کا نقشہ کھینچا۔

”پتھ پتھ۔ کتنے افسوس کی بات ہے! بہت ہی بری بات ہے مہک! ایسے نہیں کہتے کسی کے بارے میں اتنا مذاق اڑانے والا لہجہ۔“ ابھی وہ کچھ اور کہتی مگر اس نے اسے وہیں روک دیا۔

”یہ دیکھو۔“ اس نے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑے۔ ”یہ پینڈو پروڈکشن“ تمہیں ہی سوٹ کرتی ہے۔ برائے مہربانی ممانے سے بات کر کے میری اس مصیبت سے جان چھڑاؤ۔“

عائزہ نے افسوس بھری نظروں سے مہک کو دیکھا۔ ”کیا تمہیں اس میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی؟ زندگی

پھول دھوپ کے ساتھ چمک کر مزید ابھر رہے تھے۔
 ”اللہ یہ نمبر مجھے کتنے دنوں سے تنگ کر رہا ہے۔“
 عائرہ نے سیل ہاتھ میں پکڑے تفکر سے کہا۔ ”لاؤ“
 مجھے دکھاؤ۔“ مہک نے سیل اپنے ہاتھوں میں لیتے
 کہا۔ اتنے میں پھر نیل ہونے لگی۔

”ہیلو! آپ کی آواز بہت پیاری ہے۔ میں آپ
 سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ رائنگ نمبر شروع ہو گیا۔
 ”تو سی کون۔۔۔“ وہ ٹھیٹھ پنجالی میں بولی۔ ماما اور
 عائرہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پنک کیونکس لگے
 نیلز کو بالوں میں چلاتے وہ صوفے پر اطمینان سے بیٹھ
 گئی۔

”میں۔۔۔ میں تان عذرا دی بین صغری بولنی پئی آں
 جندے کار چکھلے ہفتے ڈاکہ پیاسی (میں عذرا کی بہن
 صغری بول رہی ہوں جس کے گھر چکھلے ہفتے ڈاکہ پڑا
 تھا)“

مہک نے اتنے مزے دار لہجے میں کہا۔ عائرہ اور ماما
 کے لیے ہنسی کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا۔ ”لو۔۔۔ فون ہی
 بند کر دیا۔۔۔“

اندر آتے ملک دلاور نے پنجالی لب و لہجے میں ایسا
 مزے دار جملہ سنا تو اس کی طبیعت صاف ہو گئی۔ عائرہ
 اور ماما مسلسل ہنس رہی تھیں جبکہ مہک جو خود ہنستے
 ہنستے دہری ہو رہی تھی ملک دلاور کو دیکھتے ہی ہونق سی
 بن گئی۔ اسے لگا کہ شدید ٹھنڈ میں کسی نے اس پر
 ٹھنڈا کھڑے کا پانی ڈال دیا ہو۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔
 ہمیشہ مسکرانے والی عائرہ قمقمے پر قہقہہ لگا رہی تھی۔
 خود وہ اندر کی طرف بھاگی۔

”ملک دلاور کی کھنی مونچھوں کے نیچے مسکراتے لب
 اس نے چڑ کر مونچھوں کو دیکھا۔“

”فضول۔۔۔“ دل میں اسے مخاطب کر کے وہ اپنے
 آپ کو کوسنے لگی۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر بیٹھا اور کب
 گیا وہ سو گئی تھی۔

شام میں عائرہ نے آکر اسے اٹھایا آنکھیں مسلتے
 اس نے ٹائم دیکھا۔ مغرب کا وقت گزر چکا تھا۔

”لو۔۔۔ میری نماز رہ گئی۔“ وہ فکر مندی سے بولی۔

ممانے دنوں کو نماز کا پابند بنایا ہوا تھا۔

”تمہیں اس وقت سونا ہی نہیں چاہیے تھا۔ واوی
 کہتی ہیں عصر اور مغرب کے درمیان نہیں سوتے۔“

وہ مہک کے کپڑوں کو تہہ کرنے لگی جو فضول
 بکھرے ہوئے تھے، حالانکہ وہ صبح میں تہہ کر کے گئی
 تھی، مگر مہک کی عادت تھی ایک دوپٹا بھی نکالتی تو

سارے کپڑے پھر سے پھیلا دیتی۔ وہ کتنے ہی سالوں
 سے بہت تحمل سے ہر دفعہ اس کا پھیلاوا سمیٹتی۔ عائرہ

میں عجیب سی برداشت اور صبر تھا۔ مہک کو اپنی اس
 بہن پر بڑا رشک آتا۔ نہ کوئی خواہش۔۔۔ نہ خواب۔۔۔

ہر بات جلدی مان جاتی۔۔۔ ہر بات پر جلدی راضی
 ہو جاتی۔ وہ مسلسل عائرہ کو گھورتے سوچے گئی۔

”ویسے آج دوپہر میں بڑا مزہ آیا، مجھے اندازہ نہیں تھا
 کہ تم اتنی پیاری پنجالی بھی بول لیتی ہو۔“ وہ جو بات

بھولے ہوئے تھی ایک دم شرمندہ سی ہو گئی۔
 ”ملک دلاور نے بھی بڑا انجوائے کیا، اپنی ہونے والی

منکوہ کے منہ سے ایسے الفاظ سن کر۔۔۔“
 ”جی نہیں، وہ رائنگ نمبر والے کے لیے ایسا بولا

تھا۔ ان سے سریلی آواز اور تیز دار لہجے میں بات کرو تو
 مزید پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ وہ وضاحتی لہجے میں بولی۔

”ویسے اس کے بعد اس کی کال نہیں آئی۔ اسے پتا
 تھا کہ صغریٰ اس کے پیچھے پڑ جائے گی۔“

عائرہ اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔
 ”تمہیں ملک دلاور کا نام نہیں پسند تو تم مہک سے

صغریٰ نام رکھ لو۔ پھر ٹھیک رہے گا۔ دونوں کے اولڈ
 نیم۔۔۔ پھر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔“

”میں تو ملک دلاور سے دس قدم دور ہی ٹھیک
 ہوں۔ آئی ڈونٹ لائیک ہم۔“ (میں اسے پسند نہیں

کرتی) ایک بے زاری اور متکبرانہ سی ٹون تھی اس
 کی۔

”مگتیر نہیں تسلیم کرتیں تو۔۔۔ تو تاپا زاد تو ہے ہی
 نا۔۔۔ تھوڑی شرم کر لو۔“ عائرہ نے افسوس سے سر

ہلاتے کہا۔
 ”جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم۔“

ڈانہلاگ مارتے ہوئے کچھ پیٹ پوجا کرنے کے لیے کچن کی طرف بڑھی۔ جبکہ عائرہ کتنی ہی دیر فکر مندی سے وہیں پر کھڑی بت بنی سوچتی رہی۔ خاندان کا رویہ ایسا تھا کہ اس بات کو بہت بڑا بنا دیا جاتا اور دلوں میں دراڑیں پڑنے کا اندیشہ گہرا ہو جاتا۔ اس نے رات میں ماما کے ساتھ ڈسکس کیا۔

”میں نے کبھی تم تینوں بہنوں کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کیا۔ نہ تم لوگوں کی تربیت میں کوئی کمی چھوڑی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا مہک کیوں اس رشتے کو قبول نہیں کر پارہی۔ میں اپنی بچی کے ساتھ زبردستی کے حق میں بھی نہیں ہوں۔ میں اسٹینڈ لے سکتی ہوں۔ ہاں تمہارے ملک جلال سے جڑے رشتے نے میرے ہاتھ باندھ دیے ہیں۔“

”مما! کیا ایسا ممکن نہیں کہ آپ میرا رشتہ بھی توڑ دیں۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو؟ کیا ہو گیا ہے تم دونوں بہنوں کو؟ کیا تمہیں بھی ملک جلال نہیں پسند۔“

”مما! بات پسند کی نہیں۔ میری وجہ سے مہک کی زندگی کیوں خراب ہو۔ ویسے مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے ملک جلال سلجھا ہوا انسان لگتا ہے۔“ تصور میں اس کی مسکرائی روشن آنکھیں آئی تھیں۔ جن میں احترام کا عنصر ہمیشہ غالب رہتا۔

”پھر تم ایسا مت کہو۔ ہمارے معاشرے میں بیٹیوں کے رشتے جُرد کر ٹوٹ جانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ میں اپنی پھول سی بچیوں پر کیوں کوئی حرف آنے دوں۔ مہک ایک فینٹسی کی دنیا کو ارد گرد بسائے ہوئے ہے۔ وہ معاشرتی تقاضوں اور حالات کی گردشوں کو نہیں سمجھ پا رہی۔ امید ہے کہ سمجھ جائے۔ میں بس اسی انتظار میں ہوں کہ اللہ میری دعا سن لے اور مہک کا معاملہ حل ہو جائے۔ میرے لیے تمہارے باپ سے بھی بات کرنا دشوار ہے۔ وہ شاید ہی مانیں اور بات طول پکڑ جائے۔ تمہارے تایا ابو اور دادی۔ کس کس کے سامنے مجھے صفائیاں دینی پڑیں گی۔“ دونوں ماں بیٹی کے چہروں پر تفکرات کے سائے

مریم آپی نے پاکستان آنے کا عندیہ دیا تھا۔ بابا کے حصے سے تایا ابو نے چاول، گندم اور گڑ گاؤں سے بھیجا۔ کچھ ترکاریاں اور پھل بھی آئے تھے۔ ملک دلاور اور ملک جلال دونوں گاڑی پر سب چیزیں لے کر آئے۔ عائرہ نے دھانی رنگوں سے مزین جوڑا پہن رکھا تھا۔ وہ کچن میں کھانے کی تیاریوں میں لگ گئی۔ جبکہ مہک نے اوپری منزل کی کھڑکی سے ہی ان دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ آف موڈ کے ساتھ اوپر ہی رہ گئی۔ پھر تجسس سے دوبارہ کھڑکی کے قریب آکر نیچے دیکھنے لگی۔ ملک دلاور نے کریم کلر کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ کسی بات پر مسکرا رہا تھا اور مسکراتے ہوئے اس کے شفاف دانت اور روشن آنکھیں بڑی نمایاں سی لگ رہی تھیں۔ بلاشبہ وہ پرکشش شخصیت کا مالک تھا، پر تھا تو گاؤں کا رہائشی۔ مطلب پینڈو۔ اور یہ ذرا پینٹ شرٹ پہن لے تو کلاس کی برسالتی لگے۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے اس کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی ڈرسنگ سوچنے لگی۔ اگر اس کو ملیک۔ لائٹ گرین۔ اور فان کلرز میں شرٹس زیب تن کروادی جائیں تو یہ بالکل ٹھیک ٹھاک لگے گا۔ گھورنے کا عمل جب بھی شروع کیا جائے متقابل کی حس ضرور جاگ جایا کرتی ہے۔ انسانی فطرت میں چونک جانے کا عنصر بھی اتنا ہی موجود ہوتا ہے جتنا تجسس کا مادہ۔ گھورتی آنکھوں میں مقناطیسی کشش ہوتی ہے۔ جس کی لہریں قابو میں کر لیتی ہیں۔ وہ بھی کسی احساس کے تحت اس کی طرف مڑا اور جب نظریں ٹکرائیں تو دو آنکھوں میں خجالت تھی اور سٹیٹا کر پلٹ جانے کی کیفیت، جبکہ دو سری دو آنکھوں میں شوق کا ایک جہاں آباد تھا۔ سٹیٹائی آنکھوں کے پلٹ جانے پر وہ آنکھیں اداس سی ہو گئیں۔

”مہک! مریم آپی کی کال ہے۔“ نیچے سے عائرہ نے آواز دی۔ وہ اکثر ہیکج کروا کر عائرہ کے نمبر پر کال کرتی، پھر سب سے بات ہو جاتی۔ وہ بالوں کو کھچو میں باندھ کر لاپرواٹوں کو یوں ہی بکھرائے۔ دو ہٹا قدرے تمیز

”نہیں ہوتی عائرہ راضی ہے تو ملک جلال سے اس کی شادی کروا دیتے ہیں۔ اگر تم نہیں راضی۔۔۔ تو تم پر کوئی زبردستی نہیں ہونی چاہیے۔ وہ زمانے گئے جب لڑکیوں پر اپنے فیصلے تھوپ دیکھتے تھے۔ تم فکر نہیں کرو۔ میں خود پایا ابو پایا اور ملک دلاور سے بات کرتی ہوں۔ اگر ہمارے گھروں کے مرد با شعور ہوئے تو یقیناً اس کو انا کا مسئلہ نہیں بنائیں گے۔“ مریم کے امید افزا لہجے پر مہک کا دل قدرے ہلکا ہوا۔ کتنے عرصے بعد اطمینان کی سانس لی تھی۔ ورنہ ہر شام ملگجے سایوں میں وہ اپنی شیوخ و چچیل زندگی کو اندھیروں کے سپرد ہوتا دیکھتی تھی۔ وہ مہک ملک تھی، کانونٹ کی پڑھی۔ انگریزی ادب۔ انگریزی لب و لہجے کی دلدادہ۔ کچھ خود پر دی جانے والی توجہ نے اسے دونوں بہنوں میں سب سے زیادہ منفرد بنا دیا تھا۔ وہ کلچر سے بھی زیادہ نازک مزاج تھی۔ مگر فریڈہ کی تربیت کا بھی اثر تھا۔ جو مزاج ابھی تک اتنے بھی آسمانوں کو نہیں چھوئے تھے عائرہ نے آج اسے بھی ساتھ لگایا ہوا تھا۔ مہک کا پسینے سے برا حشر ہو رہا تھا۔ دونوں نے پہلے گوڈی کی۔ اب گملوں پر رنگ کرنے کا کام ہو رہا تھا۔ عائرہ کی فطرت میں بننا سنورنا۔۔۔ سجانا بنانا بڑی حد تک شامل تھا۔ کبھی مہک کو ساتھ لگا کر کپڑوں کی ڈیزائننگ پر طبع آزمائی کی جاتی، کبھی گھر کا کوئی کونا پکڑ کر اس کو سجایا جاتا۔ درحقیقت گھر میں وہ چلتی پھرتی پروفیشنل انٹیریئر ڈیکوریٹر تھی۔ ہمیشہ وہ مہک کے کتنے ہی کام بن کئے کر دیا کرتی۔ ناچار مہک کو بھی اس کی سرگرمیوں میں اس کا ساتھ نبھانا پڑتا۔ ایسے میں کبھی وہ ساتھ برنی کو سنتی یا فوک گانوں کے انگلش ورژن لگاتی۔ جبکہ عائرہ اس کے ساتھ ہمیشہ ایک معاہدہ کرتی کہ کام کے دوران ایک اس کی پسند کا ایک عائرہ کی پسند کا گانا سنا جائے گا۔ وہ کلاسک۔ نیم کلاسیک کی دلدادہ تھی۔ مہک کو اس کی پسند پر نیند سی آنے لگ جاتی۔ اب گانے اور گرمی سے بھی نیند آنے لگی تھی۔ وہ سارا کام وہیں چھوڑ کر نیم کے نیچے آکر بیٹھ گئی۔

”ارے۔۔۔ یہ دو تین گیلے رہ گئے ہیں۔ چلو ادھر

سے سر پر اوڑھے نیچے آگئی۔ ملک جلال کو احتراماً“ سلام جھاڑا جبکہ ملک دلاور کو نظر انداز کر دیا گیا۔ داوی ساتھ ہی آئی تھیں۔

”آئے ہائے۔۔۔ لڑکی۔۔۔ مت تو نہیں ماری گئی تیری۔ نہ داوی کو سلام نہ ہونے والے مجازی خدا کا خیال۔“

اف داوی کی صاف گوئی۔ مجازی خدا پر سب ہی مسکرا دیے، جبکہ وہ جو ملک دلاور کی گھورتی نظروں سے پناہ مانگتے مڑ کر جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔ جلدی میں تخت پر بیٹھی داوی کو بھی نہ دیکھ سکی۔ جس کی وجہ سے اتنی سننے کو مل گئی تھیں۔ داوی کے پاس جا کر سلام جھاڑا گیا اور بمشکل مسکراتے ہوئے یہ ہی احسان ملک دلاور پر بھی کیا گیا۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ تھوڑی دیر پہلے والی افسردگی اڑن چھو ہو گئی تھی۔

مریم آپنی سے حال احوال پوچھا۔ ان کی بچوں کی سرگرمیاں جانی، پھر دل میں بڑھتی افسردگی کو لبوں تک لے ہی آئی۔

”آپ لوگ خیر سے چھوٹی عید کے بعد آرہے ہیں۔“

”ہاں۔۔۔ ارادہ تو یہ ہی ہے۔۔۔ ماما کہہ رہی تھیں کہ عائرہ اور تمہاری شادی کرنی ہے۔ تو اس فرض سے فارغ ہو کر وہ پہلے عمرہ کرنے جائیں گی۔ پھر میرے پاس کینیڈا آئیں گی۔“

”مریم آپنی! کیا قسمت پائی ہے آپ نے۔۔۔ من چاہا شہر۔۔۔ درود پورا۔۔۔ شوہر۔۔۔ زندگی۔۔۔“

اس کے ٹوٹے لہجے میں نہاں معنی کو سمجھتے ہوئے مریم چونک سی گئی۔ ”مہک! تم ابھی تک راضی نہیں ہوئیں۔ حالانکہ چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ دیکھو زبردستی کے رشتے عمر بھر کا طوق بن جاتے ہیں۔ تمہیں حق ہے۔ اگر تمہارا دل نہیں مانتا تو میں پایا جان سے بات کر لیتی ہوں۔“ مریم کو دور بیٹھے چھوٹی بہن کی فکر سی ہونے لگی۔

”پھر عائرہ کے ساتھ زیادتی ہوگی۔“ وہ مدہم آواز میں بولی۔

آؤ۔۔۔ عائرہ نے اسے واپس مڑتے دیکھ کر کہا۔
 ”نہ جی نہ اب نہیں اتنا اسٹیمننا (برداشت)
 تھوڑی دیر بعد دیکھو گی اگر اٹھا گیا تو کروں گی۔“
 وہ وہیں چارپائی پر ڈھیر ہوتے بولی۔ آنکھ ہلکی ہلکی ہوا
 کے جلنے پر کھلی تھی۔ غالباً ”عائرہ کام مکمل کر کے اندر
 چلی گئی تھی اور اسے سونے دیا تھا۔ مغرب کا وقت
 ہونے والا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ کام والی نے
 لان کی باقی ماندہ صفائی بھی کر دی تھی۔ اس لیے لان ذرا
 صاف صاف اور پیارا سا لگ رہا تھا۔ سرسراتی ہوا
 شدت پکڑ رہی تھی۔ دورانق پر آندھی آنے کے آثار
 نمایاں ہونے لگے۔ ڈوبتے سورج کے جاتے رنگ
 سارے کے سارے اس کی آنکھوں میں تو اتر سے
 اترنے لگے۔

بابا کا بولتے بولتے چہرہ لال ہو گیا۔ وہ بلڈ پریشر کے
 مریض بھی تھے۔ عائرہ اور ممانے مہک کی طرف
 دیکھا۔ ایک تنبیہ اور شرم دلانے والا احساس تھا۔ وہ
 وہاں سے واک آؤٹ کر گئی۔
 کمرے میں آکر وہ بے تحاشا روئی تھی۔ ”جب
 والدین کو یہ ہی سب کرنا ہے تو اولاد کو اتنا
 exposure (آسائش و لوازمات کی دنیا) کیوں
 دیتے ہیں؟ نہ بڑھائیں اعلا اداروں میں۔ کروا دیتے
 کسی عام سے انسٹی ٹیوٹ میں۔“ عائرہ اس کے پیچھے
 آئی تھی۔

”لے دے کر ہیلری کی ہمسائی بنانے کا طعنہ دے
 دیا۔ وہ اوبامہ کو ہی سوٹ کرتی ہے۔“
 ”اوبامہ کی بیوی کا نام مشعل ہے۔“ عائرہ نے تصحیح
 کی۔

”میں نے کیا کرنا ہے۔ اس کا اچار ڈالنا ہے۔“ اس
 وقت اس کی تصحیح ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔
 ”بابا نے جو آخری الفاظ کہے ہیں۔ میرا دل کر رہا
 تھا کہ زمین پھٹے اور میں اندر سما جاؤں۔ میں سوچ بھی
 نہیں سکتی تھی کہ وہ اس طرح بھی بول سکتے ہیں۔“ وہ
 غصے ورنج کی شدت سے بولی۔

”کیا کہہ دیا ہے بابا نے۔“ عائرہ نے اس کی برستی
 آنکھوں اور بہتی ٹانگ کو دیکھا۔
 ”بابا کا غصہ ممان پر نکل رہا تھا۔“ اس ساری صورت
 حال میں اسے ممان کی فکر ہو رہی تھی اور مہک اور مریم
 آپنی پر غصہ آرہا تھا۔ ”تمہارے سامنے نہیں کہا۔
 ”ولایتی بی بی دسی چیکاں“ (ولایتی بی بی دسی چینی) وہ
 روتے ہوئے بولی۔ عائرہ نے بمشکل ہنسی کنٹرول کی۔

”تو ٹھیک کہانا بابا نے۔ تم نے بھی ایسے ہی ہوا بنایا
 ہوا ہے ملک دلاور کو۔ اچھا خاصا ڈیشننگ پڑھا لکھا لڑکا
 ہے۔ تمہارے فضول سے اعتراض کی نذر ہو رہا ہے۔
 بابا نے پھر ایسے ہی کہنا تھا۔“ اس کے منہ کے بگڑتے
 زاویوں کو دیکھ کر اس نے اندھا دھند چلتی گاڑی کے
 یک دم موڑ بدلنے کی طرح بات کا رخ بدلتے ہوئے
 جلدی سے کہا۔ ”یا تو تمہیں کوئی اور پسند ہو تو بات ہے

”مہک۔۔۔ مہک۔۔۔“ عائرہ نے لان کی طرف والا
 دروازہ کھول کر اسے آواز دی۔ عائرہ کی آواز میں نہ
 جانے کیا بات تھی وہ اندر کودوڑی۔ ممان سر پکڑے بیٹھی
 تھیں اور بابا فون پر کسی سے غصے ہو رہے تھے۔

”تم نے مریم آپنی سے کچھ کہا تھا۔“ عائرہ نے
 سرگوشی میں کہا۔

مہک کا ماتھا ٹھنکا۔ یقیناً ”انہوں نے بات کر دی
 تھی۔ فریدہ بیگم نے گھور کر مہک کی شکل دیکھی۔ جس
 کا اپنا رنگ اڑ چکا تھا۔ بابا کو صرف ایک دفعہ غصہ آیا
 کرنا تھا۔ جس کے بعد کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہ
 رہتی۔

”کیوں کیا اس کے کان ٹیڑھے ہیں؟ کیا وہ ان پڑھ
 جاہل ہے۔ میں کون سا بیٹیاں لے کر امریکا میں رہ رہا
 ہوں۔ میں بھی تو منڈی احمد آباد کارہائشی ہوں۔ ساری
 دنیا کی طرح میں نے بیٹیوں کو اچھے پرائیویٹ اداروں
 سے پڑھا دیا ہے تو کون سا تیر مار لیا ہے اور یہ کون سی
 ہیلری کلنٹن کی ہمسائی ہے جو ملک دلاور میں اسے
 پینڈو شخصیت نظر آرہی ہے۔ گھر کے بچے دیکھے
 بھالے۔ پتا نہیں کیا ہو رہا ہے؟ اور کیا ہونے جا رہا
 ہے؟ تم ماں بیٹیوں کی وجہ سے میں اپنی ماں اور بھائی
 سے کنارہ کشی کر کے بیٹھ جاؤں؟“

نات۔ پھر جو باپ پسند کر کے دے رہا ہے اسی پر راضی ہو جاؤ۔“ عائرہ نے کن اکھیوں سے اس کے بسورتے چہرے کا جائزہ لیا۔

جبکہ اس وقت اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ بس یہاں سے چلی جائے۔ ”مجھے دو منٹ کے لیے اکیلے چھوڑنے کا احسان کیا جائے گا۔“

وہ روڈ ہوئی۔ ”بالکل۔۔ میں اتنی دیر میں کھانا تیار کرتی ہوں۔ پھر مل کر کھائیں گے۔ اتنی دیر تم ذرا اپنا غم ہلکا کرو۔“

www.paksociety.com وہ برامانے بغیر بشارت اور قدرے لاپرواہی سے بولی۔

عائرہ کا رویہ اسے مزید دکھی کر گیا۔ یہ بہن کم دوست زیادہ تھی۔ اگر اسے ہی کچھ احساس نہیں تو وہ کسی کو کیا سمجھائے۔ شاید ملک جلال کی خاطر بہن کی زندگی کو نہ سوچ رہی ہو۔ ایک کھینی سی سوچ جاگی۔

دادی کا کولیسٹروول لیول بڑھ گیا تھا۔ بابا نے تایا ابو سے کہہ کر انہیں گاؤں سے شہر بلوایا۔ ڈاکٹر نے ادویات کے ساتھ مکمل پریزاور تھوڑی واک کا کہہ دیا۔ دادی کے دسی گھی میں یکے سالن اور پراٹھے

چھوٹ گئے۔ وہ چڑچڑی سی ہو گئی تھیں۔ من پسند چیز ہاتھ سے نکل جائے تو مزاجوں میں عجیب سی کھلبلی مچ جاتی ہے۔ پھر ہر اچھی چیز بھی بری لگنے لگتی ہے۔ بابا نے دادی کا خاص خیال رکھنے کا کہا۔ عائرہ نے ان کے لیے بطور خاص زیتون کے تیل میں پکے کھانے بنائے

اور مہک نے روزانہ ان کی پنڈلیوں کی مالش کی ذمہ داری لے لی۔ تھوڑی کڑوے مزاج کی دادی۔ بیمار ہونے پر اور پوتیوں کی خدمت گزار یوں کو دیکھتے ہوئے تھوڑی نرم سی ہو گئیں۔ فریدہ کو سبزی بنانی ہوتی یا سہ

پہر کی چائے پینی ہوتی۔ وہ اماں جی کے پاس آکر بیٹھ جاتیں۔

”اماں جی! میں سوچ رہی ہوں دو مشینی رضائیاں اور دو ہاتھ کی بنی ہوئی کرلوں۔“ فریدہ جان بوجھ کر انہیں باتوں میں الجھائیں۔ دادی انہیں اپنے مشوروں سے نوازتیں۔ عائرہ اور مہک کی شادیوں کی تیاریاں

شروع کر دی گئی تھیں۔ مریم آئی نے فروری میں آنا تھا اور اسی عرصے میں تاریخ پکی کرنی تھی۔

مہک کی بے چینی۔ بے زاری۔ اب عجیب سی افسردگی میں ڈھلنے لگی۔ وہ ادا اس گانے اور غزلیں سنتی جو کبھی عائرہ کی پسند ہوا کرتی تھی۔ ساری شوخی سنجیدگی کی چادر میں چھپی جا رہی تھی۔ گھر میں ہر وقت اس کی چچھائیں کہیں کھوسی گئیں۔ زیرک نگاہوں نے ادا اسی کے عنوان پڑھ لیے تھے۔

”فریدہ! اگر مہک راضی نہیں تو تم لوگ زبردستی نہ کرو۔ صفر کو میں سمجھا لوں گی۔ میری پھول سی پنچی چپ ہی ہو گئی ہے۔ بہر حال عمر بھر کا بندھن ہے اور عمر بھر کے فیصلے دلی رضا مندی سے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔“

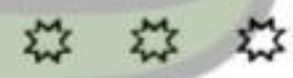
دادی کے لیے وہ کالی مرچوں والا چکن بنا کر لائی تھی جب انہوں نے بنا لگی لپٹی کے سیدھی سیدھی بات کہہ ڈالی۔ فریدہ کی تو مانوں ساری انگلیاں تھپی میں۔ وہ بھی کافی عرصے سے یہی بات کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، مگر ہمت ہی نہ ہو پارہی تھی۔ اب اماں نے خود ہی کہہ دیا۔

مہک کو لگا کتنے عرصے کی بے آرامی اور بے کلی کے بعد یک دم سکون کی لہر سی دل کے اندر تک چلی تھی۔ وہ عائرہ کو بتانے دوڑی۔ عائرہ کے تاثرات اس کی توقع سے یکسر مختلف تھے۔

”بہر حال جو بھی ہوا، ٹھیک نہیں ہوا، تم ایک بہت اچھے انسان کو ٹھکرا رہی ہو۔“ وہ دل گرفتگی سے گویا ہوئی۔

”اب کوئی منحوس بات نہ منہ سے نکالنا۔“ اسے اس وقت عائرہ کی یہ افسردگی ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔ دادی نے رات میں ابو سے بات کی۔ گھر میں سکوت کے آثار نمایاں تھے۔ عائرہ ہاتھ میں ”سکوں میں زندگی“ تھامے مطالعے میں غرق تھی۔ امی کچن میں بلاوجہ مسالوں کے ڈبوں کی صفائی میں لگ گئیں۔ ہر بندہ مصروف ہو گیا تھا یا مصروف نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ اطمینان سے بے آواز سیرٹھیاں چڑھ گئی۔ مگن کا چاند اسے کبھی مسکراتا نظر آتا کبھی اداس۔ اسے کوئی پسند نہ تھا۔ دل شفاف آئینہ تھا ابھی تک جہاں کسی کا عکس نہ سمایا تھا۔ اپنی عمر کی لڑکیوں کی طرح اس نے بھی خوابوں کے کندھوں پر سوار ہو کر عمر رفتہ کی منازل طے کی تھی۔ وہی پھول۔ خوشبو۔ ہوا۔ بادل۔ چاندنی۔ اسے بھی بھاتے۔ آنکھوں کی وہیلز میں خوابوں اور خواہشات کا ایک جہاں آباد تھا۔ وہ سوچوں میں مگن تھی جب دو چمکتی آنکھیں تصور میں آکر اسے تھوڑا بے کل کر گئیں۔ کیا میں زیادتی کرنے جا رہی ہوں؟ خود سے سوال کیا گیا۔ کبھی وہ آنکھیں محبت سے لبریز ہو جاتیں۔ کبھی عزت براجمان ہوتی، کبھی مایوسی۔ کبھی حسرت۔ بس زوم ہو کر پر وہ اسکرین پر اس کے تصور کو بے چین کیے جا رہی تھیں۔ وہ تھک کر نیچے اتر آئی۔



اباچپ سے ہو گئے تھے۔ عازنہ کی شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئیں پتا نہیں دادی، تایا اور ابا کے درمیان کیا خاموش معاہدہ طے پایا تھا۔ مریم نے آنے کی تاریخ بتادی۔ گھر شادی والا بن گیا۔ شاپنگ شروع ہو گئی۔ ابا نے گھر کی مرمت کا کام بھی شروع کرادیا۔ کاموں کے گھن چکر میں کچھ دن پہلے والی انہونی بھلائی جا چکی تھی۔ ہاں ملک دلاور اور ملک جلال نے یہاں آنا چھوڑ دیا۔ ملک جلال تو چلو۔ شادی تک کے لیے رسم و رواج کے مطابق اب نہ آسکتا تھا، ملک دلاور بھی نہ آتا۔ حالانکہ دونوں بہنیں ہر ہفتے ان کا دیدار کرتیں، کبھی گاؤں سے ترکاری، کبھی نئے موسم کے پھل، کبھی تائی اماں کے ہاتھ کے بنے لوازمات تو کبھی کپڑے ان کے لیے آتے۔ مریم آئی تو گھر میں رونق کا سماں تھا۔ اس کے دونوں بیٹے عماد اور حماد۔ ماشاء اللہ گھلو اور خوب صورتی۔ عازنہ اور مہک تو بھانجوں کے پیچھے ہی پاگل ہو رہی تھیں۔ ڈاکٹر خرم تو جب سے آئے تھے آرام

ہی کر رہے تھے۔ ”پتا نہیں خرم بھائی کینیڈا میں مریضوں کا علاج کرتے ہیں یا انہیں گھر سے لانے لے جانے کی اضافی سروس بھی دیتے ہیں۔ جب سے آئے ہیں نیندیں ہی نہیں پوری ہو رہیں۔“ مہک بے زاری سے بولی۔ ”اوپر سے مریم آپ کو دیکھا ہے۔ ادھر مت جاؤ۔ خرم سو رہے ہیں۔ خرم یہ سلا دکھائیں گے، اس ٹائم جاگنگ پر جائیں گے۔ بندہ بات کرنے کو ہی ترس جائے۔ بابا بے چارے ہارٹ کے مریض کیا کچھ کریں۔“ عازنہ بھی بڑبڑانے لگی۔ فریدہ اور ملک ایاز کو بھی بڑے داماد کے آنے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ الٹا اضافی بوجھ۔ رات کو اکثر ملک ایاز کو کھانسی آیا کرتی تھی۔

اس رات بھی انہیں شدید کھانسی آئی۔ فریدہ پریشان سی ہوئیں، کھانسی کے ہمراہ خون بھی آنے لگا۔ مہک خرم بھائی کو اٹھانے کے لیے بھاگی۔ ”مریم آپ! ابو کی طبیعت نہیں ٹھیک۔ خرم بھائی کو کہیں ذرا آکر چیک کر لیں۔“ وہ حواس باختہ سی ہو رہی تھی۔ ”خرم! انھیں۔ ابو کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے انہیں۔“ وہ پریشان سی بولی۔ ”What the hell (کیا مصیبت ہے؟)“ وہ غصے سے بڑبڑاتے اٹھے، مہک ان کے فقرے پر گنگ رہ گئی۔ داماد نہ سہی ڈاکٹر ہونے کا تو حق ادا کریں۔ وہ افسردگی سے سوچتی رہ گئی۔ ابا کو دل کا عارضہ لاحق ہو گیا۔

خرم بھائی کی بروقت طبی امداد سے جان تو بچی۔ پر ابو کو اسپتال ایڈمٹ کرادیا گیا۔ شادی والا گھر افسردگی میں ڈھل گیا۔ گاؤں سے تایا ابو بھی گھبرائے ہوئے بیٹوں کے ہمراہ آگئے۔ ملک صفدر کے لیے چھوٹے بھائی ملک ایاز کو اس طرح سے دیکھنا سخت تکلیف میں مبتلا کر رہا تھا۔ دادی علیحدہ گھر میں رو رو کر دعائیں مانگ رہی تھیں۔ عازنہ اور مہک بھی بابا پر اتر جانے والی اس اچانک افتاد پر آنسو برس رہی تھیں۔ نوافل ادا کیے

گئے، دعائیں مانگی گئیں۔ ابا کی حالت خطرے سے باہر ہو گئی۔ ڈاکٹر خرم وقت کے پابند سب چھوڑ چھاڑ کر گھر آکر لیٹ گئے۔ ان کے آرام کرنے کا وقت تھا، جبکہ ملک جلال اور ملک دلاور نے دن رات ایک کر دیا۔ مریم خود ڈاکٹر تھی، مگر ابا کو اس حال میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ابا کو انتہائی نگہداشت کی ضرورت تھی خود تو وہ تینوں بہنیں ہی تھیں، مگر تایا ابو اور دونوں بیٹے سایہ بنے بیٹھے تھے۔

مہک اور عائرہ ابا کو دیکھنے اسپتال آئیں۔ وہاں ملک دلاور سے آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ پہلے سے کمزور اور سنجیدہ ہو گیا تھا۔ عائرہ کے دل کو کچھ ہوا، مگر مہک نے لا پروا نظر آنے کی پوری کوشش کی تھی۔

مریم آبی نے رات کا ڈنر تیار کیا۔ ملک جلال گھر سے کھانا لینے آیا۔ ڈاکٹر خرم لیپ ٹاپ پر بیٹھے اپنے ہیشنٹ فیکو زچیک کر رہے تھے۔ مہک۔ عائرہ اور فریدہ کے لیے ڈاکٹر خرم کی شخصیت کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ مریم شادی کے فوراً بعد کینیڈا شفٹ ہو گئی تھی۔ اسی لیے اتنا زیادہ پتانا چل سکا۔ ہاں وہ لوگ یہ ضرور جانتی تھیں کہ نک چڑھے اور مغرور سے ہیں۔

اس رات تینوں بہنیں اکٹھی ہو کر بری کے کپڑے ٹانگنے لگیں تو عائرہ نے سوال کر دیا۔

”مریم آبی آپ خوش ہیں؟“ تینوں بے دلی سے کپڑے ٹانگ رہی تھیں۔ ابا کی طبیعت نے ساری خوشی بھلا دی۔ بس کارڈ بٹ چکے تھے تو یہ فریضہ بھی پٹانا تھا۔

”مجھے پتا ہے کہ تم لوگ کس حوالے سے پوچھ رہی ہو۔ میں جب یہاں آرہی تھی تب ہی مجھے اندازہ تھا کہ یہ بندہ تم لوگوں کے لیے نیا ہے۔ میں تو ایڈجسٹ کر رہی چکی ہوں۔ دیکھو عائرہ! جہاں تک خوشی کا تعلق ہے تو شادی کے بعد خوشی لڑکی اپنے لیے خود ہی پیدا کرتی ہے۔ زندگی اتنی بے یقین اور نہ سمجھ میں آنے والی بن جاتی ہے کہ کچھ پتا نہیں چلتا کہ کس سمت جانا ہے۔ خرم میں بظاہر کوئی بری عادت نہیں۔ میرے

حقوق پورے کرتے ہیں۔ میرے بچوں کے باپ ہیں۔ بحیثیت باپ سارے فرائض پورے کرتے ہیں، مشین سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ شروع شروع میں، میں اتنا روٹی اور پریشان بھی ہوتی تھی کہ یا اللہ یہ کیا آزمائش ڈال دی۔ یہ بندہ کیلکولیٹ کر کے کھاتا ہے۔۔۔ بولتا ہے۔۔۔ میرا دل لمبی لمبی باتیں۔۔۔ فرمائشیں کرنے کو چاہتا تو ان کی روٹین میں لمبی بات کی مجھے اجازت نہ تھی۔ کوئی فرمائش کرتی تو بلا حجت فوراً سے پوری کر دیتے، کبھی بھی روٹنے منانے والے سین ہی نہ آئے اور اس رشتے کا حسن اسی میں ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے روٹھو بھی مناؤ بھی۔۔۔ دل کی باتیں بھی کرو۔ یقین کرو انسان کے ساتھ اس کی برائیوں سمیت رہنا قدرے آسان ہے، بجائے اس کے کہ آپ ایک روبوٹ یا مشین کے ساتھ زندگی گزارو۔ کم از کم وہ رونے والی بات پر روتا تو ہے۔۔۔ ہنسنے والی بات پر ہنستا تو ہے۔۔۔ اچھے برے جو بھی جذبات ہوں ظاہر تو کرتا ہے۔“

مریم آبی کی آنکھوں میں نمی سی چھلکی۔

”مجھے کینیڈا میں الحمد للہ ہر چیز میسر ہے۔ میرا خیال بھی کرتے ہیں۔ پر میں مشین جیسی زندگی سے اوب گئی ہوں۔ میرا روبوٹ کے بجائے انسان کے ساتھ رہنے کو دل چاہتا ہے۔“

بھل بھل آنسو پلکوں کی پاڑ سے نکل کر گالوں کے کھیت کو سیراب کرنے لگے۔ عائرہ اور مہک کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

”اسی لیے میں کہہ رہی تھی جو مہک کی خواہش ہے اس کے مطابق اس کی شادی کی جائے۔ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔ اس کو نصیبوں کے سمندر میں نہیں جھونک دینا چاہیے۔ کچھ غلطیاں مقدر سمجھ کر کی جاتی ہیں، مگر کہیں نہ کہیں ہمارے غلط فیصلے بھی کار فرما ہوتے ہیں اور یہی غلط فیصلے کل کو مقدروں کی مار کھلاتے ہیں۔ مقدر زندگی کا آدھا حصہ بھرتے ہیں اور غلط اقدام غلط فیصلے پوری تصویر کو مرضی کے رنگ دے دیتے ہیں۔“

مہک کو عجیب سی گرانی محسوس ہونے لگی۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے وہ صبح سے کچھ نہیں کھا سکی تھی۔ وہ اٹھ کر کچن میں کھانے کے لیے چلی گئی۔ دونوں بہنیں اپنی اپنی سوچوں میں غرق اسے جاتا دیکھنے لگیں۔

روزانہ وہی سورج نکلتا تھا۔ جو وہ بچپن سے دیکھتی آئی، مگر اب کی بار سورج بھی ڈھیلا ڈھیلا سا لگتا اور اس کا اندر بھی عجیب سی آکسی سستی اس کی شخصیت کا خاصا بنی جا رہی تھی۔



مندى کا فنکشن آپہنچا۔ گھر کی لائٹنگ کروائی گئی۔ بابا اسپتال سے گھر شفٹ ہو گئے تھے۔ ملک دلاور اور ملک جلال دونوں ہی ابا کے ہمراہ گھر آئے۔ مہک نے کچن کی ونڈو سے دیکھا۔ ابا کا چہرہ مزید کمزور ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور دوسروں کے سہارے پر گھر آتا دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ وہ وہیں کچن کے ٹیبل پر بیٹھ کر رونے لگی۔ بیٹیوں کے لیے باپ کو اس حالت میں دیکھنا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے دیوار کے پار سے کوئی سایہ رفتہ رفتہ سرک رہا ہو۔

سایہ جیسے جیسے جگہ چھوڑتا جاتا ہے دل کی دھڑکنیں ویسے ویسے اندیشوں کی زد میں آتی چلی جاتی ہیں۔

”ابا کو کبھی کچھ نہ کرنا اللہ!“ ایک دعا بولوں پر آئی تھی۔

مریم شاید حماد کا فیڈر بنانے کچن میں آئی تھی۔ اس نے مہک کو اس حالت میں بیٹھے دیکھا تو چونک گئی۔

”مہک! کیا ہوا؟“

”آپی! ابا کو اس طرح سے دیکھ کر دل بھر سا آیا۔ ابا چلتے پھرتے۔ بھاگتے دوڑتے ہی اچھے لگتے ہیں۔ ایک تحفظ کا احساس سا ہوتا ہے۔“

مریم کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

”اللہ! ہمارے ابا کا سایہ ہم پر سلامت رکھے۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

”مہک! کبھی کبھی سامنے کی چیز بھی نظروں سے یوں پرے ہٹا دی جاتی ہے کہ وہ سیراب لگنے لگتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ساری عمر لوریاں دینے والے۔ محبت کے نغمے سنانے والے۔ عشقیہ افسانوی باتیں کرنے والے ہی زندگی کے سو دریاں میں آپ کا ساتھ دیں گے۔ بعض اوقات ساری عمر اکھڑے۔ چپ چاپ رہنے والے بھی محبت کی دہلیز پر سب سے آگے کھڑے ہوتے ہیں۔ محبت ہمیشہ پروا کرنے پر زیادہ سنورتی ہے محبت کی قدر نہ کی جائے تو یہ ادھ کھلی کلیوں کی طرح مرجھا سی جاتی ہے۔ اور اپنائیت اپنوں میں رچی بسی ہوتی ہے۔ اپنائیت کی چاشنی اتنا پرستی کے بت کو بھی مسمار کر دیتی ہے۔ مجھے رشک آتا ہے ان دونوں لڑکوں پر جنہوں نے رات دن ابا کے ہمراہ اسپتال میں گزارا۔ جنہیں میرے ابا کو اٹھاتے بٹھاتے۔ سنبھالتے ہوئے کچھ محسوس نہ ہوا۔ جنہوں نے اپنے ہونے کا حق ادا کر دیا۔“

وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے کیا کچھ سمجھا گئی تھی۔

وہ وہیں پتھر کا بت بنے منجمد ہو گئی۔ بہت سی سوچوں کے ہمراہ۔ چھا جانے والے بادلوں کی طرح سوچوں کا ایک ہجوم کوئی کنارہ نہ کوئی منزل۔ بس یونہی ایک بے سمت۔۔۔

وہ ابا کے لیے کچھڑی کا پیالہ لے کر آئی تھی۔ اندر کا سین یوں تھا کہ ابا کو جو انجکشن لگایا تھا اس سے ابا کے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی۔ ڈاکٹر خرم انجکشن لگا کر کرسی پر دھنس گئے۔ تایا ابو، ملک دلاور اور ملک جلال ابا کو دبانے لگے۔

”یہ دوایاں لے آؤ۔“ ڈاکٹر خرم نے پرچی پر کچھ لکھ کر جلال کو دیا۔ وہ دوایاں لینے بھاگا۔

”پتر! ادھر والی ٹانگ تو دبا دے۔۔۔ ایاز کانپے جا رہا ہے۔“ دادی نے فکر مندی سے ڈاکٹر خرم سے کہا۔

انہوں نے ہونق بن کر بات سنی اور ٹانگ کی عینک ٹھیک کرتے ہوئے بولے۔

”اماں جی مجھے دباننا نہیں آتا۔“

لیتا تو ہماری بیٹیوں کی بات چلا دیں۔ آج کل ویسے بھی اچھے رشتوں کا کال پڑا ہوا ہے۔ اونچا لمبا خوش شکل اور اب برس روزگار بھی ہے۔ کون چھوڑتا ہے ایسا رشتہ؟ خاص طور پر جس طرح ابا کی حالت تھی۔ ان کے لیے یہ دونوں بھائی بیساکھیاں بن گئے تھے۔ ایسے خدمت گزار داماد کے نہیں چاہئیں۔

”اور ملک دلاور کیا چاہتا ہے؟“ وہ ہلکی سی آواز میں بولی۔

”وہ تو جس کو چاہتا تھا۔۔۔ وہ قصہ اب قصہ پارینہ بن گیا۔“ عازنہ اس کی بات کو کس رنگ میں لے گئی تھی۔

وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ ابا کی دو سری ٹانگ پر دھرا اسے وہ دو سرا ہاتھ یاد آیا۔ وہ مضبوط ہاتھ عمر بھر کے تحفظ کے لیے کافی تھا وہ بڑی روشن سی آنکھیں اور محبت کی چمک سے لودیتا چہرہ۔ بہت سی باتیں وقفے وقفے سے یاد آئیں۔

”اگر تم ادھر ادھر نہ تلاش کرو اور اسی قصہ پارینہ کو دوبارہ سے قصہ حال بنا دو تو کیا خیال ہے!“

وہ بنا جھکے بولی۔ عازنہ کی تو مراد بر آئی۔ وہ خوشی سے شادی مرگ کی کیفیت میں چلی گئی۔

”کیا وہ راضی ہو جائے گا؟“ اس کی چپ پر وہ پریشان ہوتے بولی۔

”میں بات کر کے دیکھوں گی۔“ عازنہ بتانہ سکی کہ وہ تو دل و جان سے راضی ہو گا۔ پھر مہک کے چہرے پر پریشانی دیکھ کر بولی۔

”تم فکر نہ کرو وہ میری کوئی بات نہیں مانتا۔“

مہک ہلکی سی مسکراہٹ کے ہمراہ باہر چلی گئی جبکہ عازنہ کا دل خوشی سے قمقمے مارنے کو چاہ رہا تھا۔ صحیح چیزوں کو اور لوگوں کو جوڑنے کے لیے مصلحت آمیز جھوٹ کبھی کبھی بول لینے چاہئیں۔ وہ دبی مسکراہٹ سے سوچتی رہ گئی۔

www.paksociety.com



ان کی بات پر بہت ساری آنکھیں ان کی طرف اٹھیں۔ جن میں تنبیہ۔۔۔ غصہ۔۔۔ بے زاری اور سرد مہری عیاں تھی۔

ملک دلاور نے خود ہی دو سری ٹانگ پر اپنا دو سرا ہاتھ رکھ دیا۔ اب وہ کچھ یوں دبا رہا تھا۔ ایک ٹانگ پر ایک ہاتھ اور دو سری ٹانگ پر دو سرا ہاتھ تھا۔

وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔

مندى کا فنکشن ہی نارمل کیا ہونا تھا ساری شادی ہی نارمل ہوئی۔ ابا آہستہ آہستہ رو بہ صحت یاب ہونے لگے۔ ابا کی صحت مندى نے گھر کی چکارس واپس لوٹانی شروع کر دیں۔ اتنے دنوں سے وہ مسکرا بھی نہ پائی تھی۔ پر اب ایک علیحدہ ہی مسکان لبوں پر رہنے لگی۔

عازنہ نے شادی کے بعد دو سرے روز چکر لگایا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئی تھی۔ ملک جلال اور تائی اماں کی تعریفیں کرتے نہ کھکتی۔ ملک دلاور نے اب آنا چھوڑ دیا تھا۔

”کیا تم آج ہی واپس چلی جاؤ گی۔“ وہ حماد کو سلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

”ہاں“ اب میرا یہاں دل نہیں لگتا۔“ وہ اس کی طرح بولی۔ مہک کو پتا چل گیا کہ وہ اسی کی نقل اتار رہی ہے۔ جب وہ ہاسٹل سے پڑھ کر گھر آئی تھی تب وہ بھی ایسے ہی کہتی۔

”جلال بہت اچھا ہے؟“ مہک کے سوال پر اس نے بڑے خوب صورت سے احساس کے ساتھ اسے دیکھا۔

”پتا نہیں تم نے یہ بات کس سینیس میں کی ہے۔ البتہ میرے لیے اس کے ہمراہ زندگی گزارنا پھولوں کی سچ پر بیٹھنے کی طرح لگ رہا ہے۔“

”دلاور کو بھی جاب مل گئی ہے۔ اب اس کے لیے لڑکی دیکھوں گی۔“ عازنہ نے کن اکھیوں سے اس کا جائزہ لیا جس کا رنگ اڑ گیا تھا۔

”ماشاء اللہ شادی پر ہی دو تین رشتہ دار خواتین نے امی سے کہا تھا کہ اگر دلاور کا رشتہ آپ لوگوں نے نہیں



عمر شہزاد

نور محمد برطانیہ میں رہائش پذیر ہے اور لوٹن کی جامع مسجد میں موزن ہے۔ پیے والا اور خوب دل والا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جس کا ایک کمر ایک عربی طالب علم اپنے دوست کے ساتھ شیئر کرتا ہے جبکہ دوسرے کمرے میں اس کے ساتھ ایرانی زین العابدین رہتا ہے۔ اسے اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔ وہ برطانیہ میں اسٹڈی ویزے پر جا رہا ہے۔ سخت محنتی ہے مگر پاکستان میں موجود بارہ افراد کے گننے کی کفالت خوش اسلوبی سے نہیں کر پارہا۔

عمر شہزاد کا گزن ہے جو اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ وہ لوگ تین چار سال میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ عمر اکثر اکیلا بھی پاکستان آجاتا ہے۔ وہ کافی منہ پھٹ ہے۔ اسے شہزاد کی دوست امانہ اچھی لگتی ہے۔ شہزاد کی کوششوں سے ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر زارا شہزاد کی سادہ مزاج منگنی ہے۔ ان کی منگنی بھوں کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہے لیکن شہزاد کے کھنڈرے انداز کی بنا پر زارا کو اس کی محبت یقین نہیں ہے۔

اس کے والد نے اسے گھر پر پڑھایا ہے اور اب وہ اسے بڑی کلاس میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ سر شعیب انہیں منع کرتے ہیں کہ ان کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے چھوٹی کلاس میں ہی داخل کروائیں مگر وہ مصر رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بچے پر بہت محنت کی ہے۔ وہ بڑی کلاس میں داخلے کا مستحق ہے۔ سر شعیب اسے بچہ پر ظلم سمجھتے ہیں مگر اس کے باپ کے

مکمل ناول





WWW.PAKSOCIETY.COM

عقلمند
۲۰۱۵

اصرار پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ بچہ بڑی کلاس اور بڑے بچوں میں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتا۔ اس کا لرشپ حاصل کرنے والے اس بچے سے حیرت انگیز طور پر پیچرز اور فیلوز میں سے بیشتر ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے باپ کی طرف سے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر سخت مخالفت ہے۔

www.paksociety.com

وہ خواب میں ڈر جاتا ہے۔

73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔

بلی انڈیا میں اپنے گرینڈ پیرنس کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ برطانیہ کے رہنے والے تھے۔ گرینڈ پائپاں کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں آئے تھے۔ گرینی نے یہاں کوچنگ سینٹر کھول لیا تھا۔ میتارا او اس کے ہاں پڑھنے آتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ماس مچھی کھانے والے کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔ وہ وفادار نہیں ہو سکتے۔ گرینڈ پائپا کو بتایا۔ وہ اسے سمجھاتے ہیں کہ قدرت نے ہمیں بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور ہماری فطرت میں صرف محبت رکھی ہے۔ انسان کا اپنی ذات سے اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔

امامہ کے کسی رویے پر ناراض ہو کر عمر اس سے انگوٹھی واپس مانگ لیتا ہے۔ زارا شہروز کو بتاتی ہے۔ شہروز اور عمر کا جھگڑا ہو جاتا ہے۔

اس کی کلاس میں سلیمان حیدر سے دوستی ہو جاتی ہے۔ سلیمان حیدر بہت اچھا اور زندہ دل لڑکا ہے۔ سلیمان کے کہنے پر بڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی دلچسپی لینے لگتا۔ وہ اپنے گھر جا کر امی سے بیٹ کی فرمائش کرتا ہے تو اس کے والد یہ سن گیتے ہیں وہ اس کی بری طرح پٹائی کر دیتے ہیں۔ ماں بے بسی سے دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ پھر اس کے والد اسکول جا کر منع کر دیتے ہیں کہ سلیمان حیدر کے ساتھ نہ بٹھایا جائے۔ سلیمان حیدر اس سے ناراض ہو جاتا ہے اور اسے اینار مل کہتا ہے۔ جس سے اس کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

کلاس میں سلیمان حیدر پہلی پوزیشن لیتا ہے۔ پانچ نمبروں کے فرق سے اس کی سیکنڈ پوزیشن آتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے والد غصے سے پاگل ہو جاتے ہیں اور کمر بند کر کے اسے بری طرح مارتے ہیں۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ پینٹنگ نہیں کرے گا۔ صرف پڑھائی کرے گا۔

اس کے والد شہر کے سب سے خراب کالج میں اس کا ایڈمیشن کراتے ہیں۔ تاکہ کالج میں اس کی غیر حاضری پر کوئی کچھ نہ کہہ سکے اور اس سے کہتے ہیں کہ وہ گھر بیٹھ کر پڑھائی کرے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ نہ ہو۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

امامہ کی والدہ شہروز کو فون کرتی ہیں۔ شہروز کے سمجھانے پر عمر کو عقل آجاتی ہے اور وہ اپنے والد کو فون کرتا ہے جس کے بعد عمر کے والد امامہ کے والد کو فون کر کے کہتے ہیں کہ بچوں کا نکاح کر دیا جائے۔ دونوں کے والدین کی رضامندی سے عمر اور امامہ کا نکاح ہو جاتا ہے۔ نکاح کے چند دن بعد عمر لندن چلا جاتا ہے۔

نکاح کے تین سال بعد امامہ عمر کے اصرار پر اکیلے ہی رخصت ہو کر لندن چلی جاتی ہے۔ لندن پہنچنے پر عمر اور اس کے والدین امامہ کا خوشی خوشی استقبال کرتے ہیں۔

امامہ عمر کے ساتھ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آجاتی ہے جبکہ عمر کے والدین اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ امامہ عمر اتنے چھوٹے فلیٹ میں رہنے سے گھبراتی ہے اور عمر سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے عمر کے والدین کے گھر رہنے کو کہتی ہے جسے عمر یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ وہ اپنے والدین پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔

اس شخص کے شدید اصرار پر نور محمد اس سے ملنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے دوستی کی فرمائش کرتا ہے۔ نور محمد انکار کر دیتا ہے، لیکن وہ نور محمد کا بیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ نور محمد کی قرأت کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے نماز پڑھنا نور محمد سے سیکھا ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ اسے نور محمد کے پاس کسی نے بھیجا ہے۔ نور محمد کے پوچھنے پر کہتا ہے۔ خضر الہی نے بھیجا ہے۔

روپ نگر سے واپس برطانیہ آنے پر گرینڈ پائپا کا انتقال ہو جاتا ہے اور گرینی مسٹریک کی دوستی بڑھنے لگتی ہے۔ وہ بلی سے

میں خواتین ڈائجسٹ 236 جولائی 2015ء

کہتی ہیں کہ وہ اپنی ممی سے رابطہ کرے۔ وہ اسے اس کی ممی کے ساتھ بھجوانا چاہتی ہیں۔ بلی انکار کے باوجود وہ کوہو کو بلوائیتی ہیں اور اسے ان کے ساتھ روانہ کر دیتی ہیں۔
میری کالج میں طلحہ اور راشد سے واقفیت ہو جاتی ہے۔

عمر نے اسے پبلک لائبریری کا راستہ بتا دیا ہے۔ عمر کو آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن وہ امانہ کی خاطر دلچسپی لیتا۔ دونوں بہت خوش ہیں۔ لیکن امانہ وہاں کی معاشرت کو قبول نہیں کر پارہی۔ عمر کی دوست مارتھا کے شوہر نے امانہ کو گلے لگا کر مبارکباد دی تو اسے یہ بات بہت ناگہری گھڑا کر دو دنوں میں جھگڑا ہو گیا۔

گرینی کے انتقال کے بعد بلی کوہو کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ کوہو پہلے بھی گرینی سے اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتی رہی تھی۔ بلی کو اپنے پاس رکھنے کے معاملے پر کوہو نے مسٹرایرک سے جھگڑا کیا کیونکہ گرینی نے انہیں بلی کا نگران مقرر کیا تھا۔ پھر دونوں نے جھگڑنا کر لیا اور کوہو نے مسٹرایرک سے شادی کر لی۔

نور محمد احمد معروف کو اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا۔ احمد معروف کے اچھے اطوار، عمدہ خوشبو، نفیس گفتگو، اعلیٰ لباس کے باعث وہ سب اسے پسند کرنے لگے تھے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد اس سے کہتا ہے اسے دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس کے لیے اللہ کا دین کافی ہے۔ احمد معروف کہتا ہے۔ ”اللہ کا دین تو کیا دنیا اللہ کی نہیں ہے۔“ اسلام کی سب سے اچھی بات یہی ہے اس میں دنیا کا انکار نہیں ہے۔ آپ دنیا کے ساتھ وہ مت کریں جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔

صانورین کالج کی ذہین طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت چالاک بھی تھی۔ صبانے اس سے صرف نوٹس حاصل کرنے کے لیے دوستی کی تھی۔ اکیڈمی کے لڑکوں طلحہ اور راشد نے اسے دوسرا رنگ دے کر اس کا مذاق بنا لیا۔ اس مسئلہ پر لڑائی ہوئی اور نوٹ مار پیٹ تک آگئی۔

امانہ اور عمر میں دوستی ہو گئی لیکن دونوں کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کے خیالات بہت مختلف تھے۔ کوہو کبھی ساتھ رہتے ہوئے بھی زندگی کا محور صرف کتابیں اور اسکول تھا۔ ایک دوست کے ہاں پارٹی میں ایک عرصے بعد اس کی ملاقات بیتا راؤ سے ہوئی۔ وہ اب نیا کہلاتی تھی۔ اس کا تعلق ہندوستان کے ایک بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ وہ رقصہ کے طور پر اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی اس لیے گھر والوں کی مرضی کے خلاف یہاں چلی آئی تھی۔ احمد معروف کی باتوں سے نور محمد عجیب الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں سے گھبرا کر احمد معروف کو سوتے میں سے جگا دیتا ہے۔ نور محمد معروف کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے اور اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتانے لگتا ہے۔

اکیڈمی میں ہونے والی لڑائی کے بعد جنید اور طلحہ کے والدین کے ساتھ نور محمد کے والد کو بھی بلوایا گیا تھا۔ طلحہ اور جنید کے والدین اپنے بیٹوں کی غلطی ماننے کے بجائے نور محمد کو قصور وار ٹھراتے ہیں جبکہ نور محمد کے والد اس کو مورد الزام ٹھرا کر لا تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ اکیڈمی کے چیئر پرسن حمید کا دوانی جنید اور طلحہ کے ساتھ نور محمد کو بھی اکیڈمی سے فارغ کر دیتے ہیں۔ نور محمد اکیڈمی سے نکالے جانے سے زیادہ اپنے والد کے رویے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اسٹیشن کی طرف نکل جاتا ہے۔ ٹرین میں سفر کے دوران نور محمد کی ملاقات سلیم نامی جیب کترے سے ہو جاتی ہے۔ سلیم کو پکڑنے کے لیے پولیس چھاپہ مارتی ہے تو سلیم بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جبکہ نور محمد کو پکڑ کر پولیس تھانے لے آتی ہے اور پھر نور محمد کے والد پولیس کو رشوت دے کر اسے چھڑا کر گھر لے آتے ہیں۔

بھائی پھیرو سے لاہور تک کے پورے راستے میں نور محمد سے اس کے والد کوئی بات نہیں کرتے۔ لیکن گھر آ کر وہ اونچی آواز میں چلا کر غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہتے ہیں کہ ”وہ آج سے اس کے لیے مرچکے ہیں اور اس سے ان کا کوئی

تعلق نہیں ہے۔ ”پہلی بار اس کی ماں بھی کہہ اٹھتی ہیں کہ اس سے بہتر تھا کہ وہ مر جاتا۔ نور محمد احمد معروف کو اپنے بارے میں سب بتا دیتا ہے۔ جسے سن کر احمد معروف کا دل بو جھل ہو جاتا ہے اور اسے نور محمد کو سنبھالنا مشکل لگتا ہے۔ بلی ثیا کو بے حد چاہتا ہے، لیکن وہ انتہائی خود غرض، مطلب پرست اور چالاک لڑکی ہے۔ بلی کے گھر فیملی فرینڈ عوف بن سلمان آتا ہے۔ جس کا تعلق سعودی عرب سے ہے۔ عوف کو فوٹو گرافی کا جنون کی حد تک شوق ہوتا ہے۔ بلی عوف سے ثیا کو ملواتا ہے۔ ثیا عوف سے مل کر بہت خوش ہوتی ہے۔ عوف اپنے کیمرے سے رقص کرتی ثیا کی بہت سی خوب صورت تصویریں کھینچ لیتا ہے۔ عوف اور ثیا تصویروں کو فرانس میں ہونے والی کسی تصویری مقابلے میں بھیج رہے تھے۔ بلی ثیا کو ایسا کرنے سے روکنا چاہتا ہے۔ لیکن ثیا اس بات پہ بلی سے ناراض ہو جاتی ہے۔ عوف بتاتا ہے کہ وہ ثیا جیسی بناوٹی، خود پسند لڑکی کو بالکل پسند نہیں کرتا۔

بلی کو پتا چلتا ہے کہ اس کی ماں کو ہو کے عوف سے تعلقات ہیں، زارا کے والدین زارا اور شہروز کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتے ہیں، جبکہ شہروز ایک ڈیڑھ سال تک شادی نہیں کرنا چاہتا ہے، کیونکہ اس نے ایک مشہور اخبار کا چینل جوائن کر لیا ہے اور اسے اپنی جاب کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔ شہروز، زارا سے کہتا ہے کہ جب تک وہ اسے شادی کرنے کے لیے گرین سگنل نہیں دیتا اس وقت تک وہ پھپھو (یعنی اپنی والدہ) کو اس کے ڈیڈی سے شادی کی بات کرنے سے روک کر رکھے۔ زارا کے لیے یہ ساری صورت حال سخت اذیت کا باعث بن رہی ہے۔

امامہ، نور محمد کی بہن ہے۔ امامہ کی ماں نے اس کی شادی عمر سے اسی لیے کی تھی کہ وہ لندن جا کر بھائی کو ڈھونڈے۔ وہ عمر کے علم میں لائے بغیر بھائی کو ڈھونڈنے کی کوششیں کرتی ہے، مگر عمر کو پتا چل جاتا ہے۔ امامہ یہ جان کر حیران رہ جاتی ہے کہ عمر، نور محمد کو جانتا ہے۔ وہ اس کا ساتھ دیتا ہے۔ ثیا رفاہہ بن چکی ہے مگر غلط باتھوں میں چلی جاتی ہے اور اپنا بہت نقصان کر کے بلی کو ملتی ہے۔ بلی اس وقت تک ایک کامیاب ناول نگار بن چکا ہے۔ وہ دونوں شادی کر لیتے ہیں۔ ثیا کو بچوں کی خواہش ہوتی ہے۔ کافی علاج کے بعد انہیں خوش خبری ملتی ہے، مگر ثیا کے مس کیروج ہو جاتا ہے۔ ثیا خود کٹسی کرتی ہے۔ بلی کو کچھ لوگ مجبور کرتے ہیں کہ مسلمان دہشت گردوں کے خلاف ناول لکھے۔ وہ لوشن کی مسجد کے موزن کے خلاف بات کرتے ہیں کہ وہ مسلمان دہشت گرد ہے۔ بلی اس موضوع پر ناول لکھنے کی تیاری کرتا ہے اور اس سلسلے میں نور محمد سے ملتا ہے۔ نور محمد سے احمد معروف کے نام سے ملنے والا شخص بلس گرانٹ ہی ہے، مگر نور محمد سے مل کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے خلاف کی گئیں ساری باتیں غلط ہیں۔ وہ نور محمد سے متاثر ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ اسے اپنے سارے حالات بتا چکا ہوتا ہے کہ کس طرح اس کا باپ اس پر پڑھائی کے معاملے میں سختی کرتا تھا۔ کس طرح اکیڈمی سے نکالنے پر وہ دلبرداشتہ ہوا، پاگل ہوا۔ پھر اس کے ماموں اپنے ساتھ لندن لے آئے۔ وہاں انہوں نے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا اور اپنی بگڑی ہوئی بیٹی گڑیا سے شادی کر دی، جو پانچ ماہ بعد ہی ماں بن گئی۔ نور محمد نے سب کچھ سمجھنے کے باوجود اس بچی سے محبت کی۔ اسے پالنے لگا۔ مگر جب گڑیا نے بخار کی وجہ سے بچی کو برانڈی پلانے کی کوشش کی اور نور محمد کے منع کرنے کے باوجود یازنہ آئی تو پھپھو مار دیا۔ جس پر ماموں نے اسے خوب لعن طعن کی اور وہ ان کا گھر چھوڑ کر ہاں آ گیا۔ ماموں نے اس کے گھر والوں کو کہہ دیا کہ نور محمد ان کے گھر سے چوری کر کے بھاگ گیا ہے۔ تب سے نور محمد اور امامہ کی ماں پریشان ہیں اپنے شوہر سے بھی بائیکاٹ کر چکی ہیں۔ زارا کی زندگی میں اتفاق سے نیپونامی لڑکا آتا ہے۔ وہ بہت اچھا ہے۔ زارا اس پر بہت بھروسہ کرتی ہے۔ شہروز خوب ترقی کر رہا ہے۔ اس کی ملاقات عوف بن سلمان سے ہوتی ہے۔ وہ شہروز کو اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر دیتے ہیں۔ شہروز بہت خوش ہوتا ہے۔

سواہوں قسطوں

زارا کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ وہ اس سے کتنی بھی میں مذاق کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے اعتراف نے بے تکلف سہی، لیکن یہ معاملہ اور نوعیت کا تھا۔ اس زارا کے وجود کو مزید سرد کر دیا تھا۔ یہ سب جو ہو رہا تھا۔

لیکن میرے ماں باپ نے مجھے یہ ہی سب سکھا کر پروان چڑھایا ہے کہ انسان سے محبت کرو۔ بے غرض، بے لوٹ محبت۔ محبت ہماری خاندانی صفت ہے۔ نفع نقصان تو تجارت سے مشروط ہوتا ہے۔ ہمارے لیے محبت اس سے ذرا اوپر کی چیز ہے۔ میرے لیے محبت ایک درویشی سا جذبہ ہے۔ ہم ”محبت“ کو غلاظت کی عینک لگا کر نہیں دیکھتے۔“ وہ اسے بولنے کا موقع دیے بغیر اپنی طرف سے وضاحت دے رہا تھا۔

”آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ فرشتے ہیں۔ انسانوں سے بے غرض ہو کر محبت کرتے ہیں۔“ وہ شرمندہ تو ہوئی، مگر پھر بھی اس کے انداز سے مرعوب ہوئے بغیر بولی تھی۔ اب کی بار سلمان کو سخت برا لگا اور اس کے چہرے سے خفگی چھلکنے بھی لگی تھی۔ ”مجھے ایک بات بتاؤ، کیا فرشتے انسان سے محبت کرتے ہیں۔ کہیں پڑھا ہے تم نے ایسا۔ کسی کتاب میں۔ کسی حکایت میں۔؟ فرشتے انسان سے محبت نہیں کرتے، فرشتے صرف اللہ سے محبت کرتے ہیں، اللہ محبت کرتا ہے انسانوں سے۔ اور میں اللہ کی خاطر اس کے انسانوں سے محبت کرتا ہوں۔ یہ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق تھا اور میں بس اس کو فالو کرتا ہوں۔ میں نے کہا تھا نا میں جروا ہا ہوں۔ میں انسانوں کو ایک جگہ گلے میں متحد رکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور یہ کام محبت کے سوا کوئی دوسرا جذبہ نہیں کر سکتا۔ مجھ سے اس طرح بات کر کے مجھے میری نظر میں شرمندہ مت کرو۔ میری نیت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی، کبھی نہیں، مجھے نہیں پتا میرے کس انداز سے تمہیں میری نیت پر ایسا شک ہوا۔“

وہ تنک تنک کر بول رہا تھا۔ زار پر ٹھنڈے پانی کی بھری ہوئی بالٹی پڑنے والی صورت حال تھی۔ وہ چند لمحے سر جھکائے اپنی انگلیوں کو مروڑتی رہی۔

”میں نے آپ کی اور آنٹی کی سب باتیں سنیں۔ آمنہ والی۔ آنٹی مجھے آمنہ سمجھتی ہیں۔“ وہ شرمندہ

اس کے اعصاب کے لیے بہت بھاری تھا۔ ”آپ کو نہیں کرنی چاہیے تھی محبت مجھ سے۔ آپ جانتے تھے میں شہروز سے محبت کرتی ہوں اور میں اسی سے محبت کرتی رہوں گی۔ میری زندگی میں کسی اور کی گنجائش نہیں ہے اور نہ کبھی ہوگی۔ میں اگر شہروز کے متعلق آپ سے شکوے شکایات کرتی رہتی ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اپنے ذہن میں میرے متعلق کچھ بھی سوچتے رہیں۔“

وہ سخت برا مان کر بولی تھی۔ اب کی بار اس کا لہجہ دو ٹوک تھا۔ وہ دل ہی دل میں سخت پچھتا رہی تھی کہ وہ اس شخص سے شہروز کی شکایتیں کیوں کرتی رہی تھی۔ اسے نہیں کرنی چاہیے تھیں، جبکہ سلمان اس کے چہرے کے تاثرات کو پرکھتا ہوا سنبھلا تھا اور پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔

”یہ بات مجھے پتا ہے محترم۔ اس انکشاف کی کیا ضرورت پیش آگئی آپ کو اس وقت۔؟“ وہ بھی اب سنجیدہ ہو چلا تھا۔ زار نے اتنا سنجیدہ اسے پہلے کم ہی دیکھا تھا۔

”آپ مجھے پاگل مت بنائیں۔ آپ نے ابھی کہا کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ اور ابھی آپ اس بات سے انکار کر رہے ہیں۔“ وہ عادت کے مطابق چڑ کر بولی تھی۔

”انکار۔ انکار کس الو کے پٹھے نے کیا ہے۔ میں کہہ رہا ہوں، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ وہ اسی کے انداز میں بولا تھا، پھر اس کے لہجے ہوئے انداز سے خود بھی الجھتا ہوا بولا۔

”انسانوں کو پرکھنے میں جذباتیت کا شکار نہیں ہوتے زار ابی بی۔ مروا اگر بے تکلفی سے بات کرتا ہے تو یقین کرو، یہ اس کی محبت نہیں ہوتی۔ یہ اس کی عادت بھی ہو سکتی ہے۔ اور میں تو فطرتاً ”محبت کرنے

والا انسان ہوں۔ انسانوں سے محبت میری گھٹی میں ہے۔ محبت میری عادت ہے۔ یقین کرو، میں عادتاً ”محبت کرتا ہوں۔ نہیں جانتا اچھا کیا ہے، برا کیا ہے“

تھی۔ مگر اپنی غلطی کا برملا اعتراف کرنے سے بھی کترا رہی تھی۔

ملے تھے اور اس نے انہیں اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔



”یہ عہد الست کیا ہے؟“ یہ اس سے اگلے روز کی بات تھی۔ لندن کے ایک علاقے ایفرڈ کے ایک چھوٹے سے ریستورنٹ میں بیٹھے شہروز نے اپنے سامنے بیٹھے تعمیر نصاب سے پوچھا تھا۔

”میرے لیے یہ ایک مشہور ادیب کی آٹو بایو گرافی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔ یہ ایک مشہور شخص کی زندگی کی کہانی ہے جو اپنے آخری ایام میں کنورٹ (مذہب تبدیل کر لیا) ہو گیا ہے اور اب وہ چاہتا ہے کہ ہر شخص اس کی طرح کنورٹ ہو جائے۔ ان کا اسکول آف تھاٹ ہی ہے۔ ہر شخص کو اس دائرے میں طوعاً و کرہاً کھیچ کھانچ کر لے آتا۔ جسے یہ ”اسلام“ سمجھتے ہیں۔ اسی دائرے کو یہ دین کہتے ہیں اور اسے ہی یہ ”عہد الست“ کہتے ہیں۔“

اس نے سرسری انداز میں کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے سینڈویچ کا ایک بڑا سا لقمہ لیا تھا۔ وہ بہت بے ڈھنگے انداز میں کھا رہا تھا۔ بڑے بڑے لقمے اور عجلت بھر انداز شہروز کو سخت ناگوار گزر رہے تھے۔

شہروز نے عمر سے ہونے والی طویل بحث کے بعد رات کافی تاخیر سے اسے ٹیکسٹ کر کے ملنے کے لیے کہا تھا اور وہ اگلی ہی صبح بریج کرنے لوٹن سے ایفرڈ آ گیا تھا۔ وہ ”زین العابدین“ نہیں تھا۔ اسی لیے وہ پہلی ملاقات والے زین العابدین سے بہت مختلف تھا۔ لوٹن میں وہ ایک تھکا ہوا الاچار ضرورت مند آدمی نظر آتا تھا جبکہ اب شہروز کے سامنے وہ کارپوریٹ کلچر کے ایک نمائندہ کے روپ میں تھا۔ اس کا تعلق ترکی سے تھا اور وہ چند ایک چھوٹی موٹی جاب کے علاوہ ایک برطانوی شخص کے پاس فارسی مترجم کے طور پر کام کر رہا تھا۔ زبانوں پر اس کا عبور قابل رشک تھا۔ وہ ترکی، فارسی، ہندی اور عربی کے علاوہ فریج بھی بول سکتا

”واہ رے زارا بی بی! آپ کی پھرتیاں۔۔۔ لاجول والا۔ یعنی کہ حد ہو گئی۔ ماں بیٹے کی گفتگو چھپ کر سنی اور پھر بس سوچنے لگیں الٹا سیدھا۔ متنفر ہونے سے پہلے تصدیق تو کر لیتا ہے انسان۔۔۔“ وہ خفا تھا۔

”آئی ایم سوری! لیکن آپ آئی کو آمنہ سے ملوا دیں نا۔۔۔ وہ مجھے آمنہ سمجھتی ہیں۔“ شرمندگی اور خفت اس کے الفاظ پر بھی غالب تھی۔

”امی کی بات مت کرو۔ یہ بات ان سے چھپی ہوئی ہو سکتی ہے کہ تم انگھ جڈ ہو، لیکن میں تو جانتا ہوں۔“ وہ جھنجھلایا ہوا بول رہا تھا۔

”میں نے کبھی کسی سے نہیں چھپایا۔ یہ بات تو میں نے آپ کو سب سے پہلے بتائی تھی۔“ زارا نے عجلت بھرے انداز میں کہا تھا۔ سلمان نے اس کی جانب دیکھا پھر ناک چڑھا کر بولا۔

”میں بہت پہلے سے جانتا تھا کہ تم اور شہروز منور انگھ جڈ ہو۔“

”آپ شہروز کو پہلے سے جانتے تھے؟ آپ نے مجھے نہیں بتایا۔ کیسے کیسے جانتے تھے آپ شہروز کو۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ سلمان کے منہ سے شہروز کا سر نیم سن کر وہ مزید حیران ہوئی تھی۔ اس نے اس کا مکمل نام کبھی نہیں بتایا۔

”ہماری ایک دلچسپی مشترک ہے۔“ سلمان نے کہا تھا۔ زارا کی گردن پر چہرہ نہیں تھا، بلکہ ایک بڑا سا سوالیہ نشان ابھر آیا تھا۔

”معاف کیجئے گا۔۔۔ وہ آپ نہیں ہیں۔۔۔ اس لیے کسی خوش فہمی کا شکار ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ اس نے جتا کر کہا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”عہد الست“ سلمان نے سچ اگلنے کا تہیہ کر ہی لیا تھا۔ زارا نے استفہامیہ انداز میں اسے دیکھا۔ وہ حیران ہوئی تھی۔ اسے یاد تھا اس نے یہ لفظ ان کاغذات پر

لکھا دیکھا تھا جو ایک بار سلمان ہی کی گاڑی میں اسے

تھا، لیکن اس کی اصل جاب وہی تھی جو شہروز کی تھی۔ وہ مختلف بین الاقوامی چیپٹلز کے علاوہ عوف بن سلمان کے لیے بھی کام کرتا تھا اور فری لانس کرتا تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک فوٹو گرافر تھا۔ اور اسی لیے وہ بھی اس ڈاکومنٹری کا حصہ تھا۔ اس کے ساتھ چند منٹ گزار کر ہی شہروز مایوس ہوا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس شخص کی واحد خصوصیت اس کی مختلف زبانیں بولنے کی صلاحیت ہے، ورنہ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ جس ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے وہ چھوٹا سا کیفے ٹیریا ٹائب کینٹین تھی جہاں اکاؤنٹس فام ٹین ایجر طالب علم ہی نظر آ رہے تھے۔

تعمور نے خود ہی اس سے اردو میں بات شروع کی تھی۔ سو وہ بھی اردو میں ہی اس سے بات کرنے لگا تھا۔

”میں نور محمد صاحب کے ساتھ کافی مہینوں سے رہ رہا ہوں۔ اچھے انسان ہیں۔ اس سے بھی زیادہ اچھے رائٹر ہیں۔ قدرت نے انہیں الفاظ پر بے پناہ مہارت عطا کی ہے۔ الفاظ کی بنیاد پر ہی دوسروں کی سوچ تک بدل کر رکھ سکتے ہیں۔ وہ اپنے اسی ہنر کا سہارا لے کر مسلم دنیا میں اپنی جگہ بنانا چاہتے ہیں۔ نئے نئے کنورٹ ہوئے ہیں۔ اس لیے جوش بھی زیادہ ہے۔ میں نہیں کہتا کہ ان کی نیت میں کوئی کھوٹ ہے۔ یا وہ کوئی ڈبل گیم کھیل رہے ہیں۔ نہیں وہ ایسے انسان ہی نہیں ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ ٹوہ لینے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ میں نے ایک بار اپنے متعلق جو کہانی سنا دی کہ میں مجبور غریب انسان ہوں۔ جس کے پاس رہائش نہیں ہے۔ جس کا تعلق ایک غریب ملک سے ہے۔ جس کا خاندان بہت بڑا ہے۔ اسی پر یقین کر کے بیٹھے ہیں۔ کبھی بلاوجہ کے سوالات نہیں کرتے۔ کمرے کی یا میری چیزوں کی چیکنگ نہیں کرتے۔ مالی مدد بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو ایک اچھے انسان میں ہونی چاہئیں۔ اس لیے میں انہیں دل سے پسند کرتا ہوں۔ میرا ان سے کوئی ذاتی اختلاف

نہیں ہے۔ وہ اپنی دھن میں مگن مسلسل بول رہا تھا۔ شہروز کو اس کی وضاحت سے کوئی غرض نہیں تھی۔

”ہمارے درمیان اختلاف کا بس ایک ہی پہلو ہے۔ وہ ہر شخص کو ریڈیکلائز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ سب کی واڑھیاں رکھوا کر سر پر اماے بند ہوا دیں اور انہیں جہاد کے لیے بھیج دیں۔ عورتوں کو گھروں کی مخلوق قرار دے کر انہیں محصور کر کے ایسے رکھ دیں جیسے بالٹیاں ہاتھ روموں میں رکھی جاتی ہیں۔ یعنی اگر ڈرائنگ روم میں یا گھر کے کسی دوسرے حصے میں نظر آئیں تو اوڈ لگیں گی۔ نامناسب تحقیق آمیز۔ میں اس سوچ سے سخت چڑتا ہوں۔“ وہ مقام جب شہروز اسے پائے کہہ کر اٹھنا چاہتا تھا۔ اس نے بالاخر ایک کام کی بات کہہ ڈالی۔ ”ہمم۔۔۔ شہروز نے ہنکارا بھرا۔

”کیا واقعی۔۔۔ ان کی سوچ اس قدر ریڈیکلائزڈ ہے؟“ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔ اسے تعمور کی ہریات سے اتفاق نہیں تھا۔ اس کا ذاتی خیال تھا کہ نور محمد کنورٹ ہونے کے باوجود ابھی بھی کوئی ڈبل گیم کھیل رہے ہیں۔

”اس سے بڑھ کر۔۔۔ لیکن ان کی غلطی نہیں ہے۔ انہوں نے اسلام کی جو شکل دیکھی ہے وہ ایسی ہی ہے۔ وہ تبلیغیوں کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ ایسے لوگ جو اسلام کو پابندپوں کا مذہب سمجھتے ہیں۔ تنگ نظری ان کی سوچ ہی نہیں خون میں بھی رچی بسی ہوئی ہے۔ میوزک، الکحل، عورت، لباس، حرام حلال۔۔۔ ان کے یہاں ہر معاملہ تنگ نظری کا شکار ہے۔ وہ یہ بات نہیں سمجھتے کہ یہ سب چیزیں کچھل ویلیوز ہیں۔ ان کا تعلق مذہب سے ہے نہ ہو سکتا ہے۔ مذہب اسلام سے تو قطعاً نہیں ہو سکتا۔ میں الحمد للہ مسلمان ہوں۔ میرے ماں باپ مسلمان ہیں۔ میرا ماننا ہے اسلام جیسا جدید مذہب کوئی نہیں۔ یہاں تنگ نظری نہیں ہے۔ یہاں ہر معاملے میں لچک ہے۔ دواؤں میں ایک عنصر کے طور پر علاج کی غرض سے الکحل استعمال کی

والمے حتیٰ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ معاف کیجئے گا، لیکن پاکستانیوں کی سرگرمیاں ایسی ہیں کہ کوئی بھی انہیں شک کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے۔ افغانستان کے بعد یہ دوسری بڑی قوم ہے جو اپنی سوچ میں نہایت ریڈیکل ہے۔ کنزرویٹو ہے۔ ستر فیصد پاکستانیوں کی رائے ایک جیسی قدامت پسندانہ سوچ پر مبنی ہے۔ طالبانائزیشن اور ریڈیکلائزیشن ان کے لیے نیا فیئنا مینن نہیں۔ سو پاکستانی نور محمد کے بارے میں یہ بات حتمی ہے کہ اس کا کوئی نا کوئی تعلق کسی الٹی سیدھی سرگرمی سے رہا ہوگا۔

وہ شہروز کے چہرے کو دیکھ رہا تھا، جہاں ناپسندیدگی کے تاثرات تھے، مگر وہ اس کی بات کو رد بھی نہیں کر رہا تھا۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ اتنا غلط بھی نہیں کہہ رہا۔

”آپ نے کچھ زیادہ ہی سخت الفاظ استعمال کر لیے۔ یہ سب مغربی پروپیگنڈہ ہے اور کچھ نہیں، ورنہ ہم پاکستانی بہت مہذب اور لبرل قوم ہیں۔“ شہروز نے تصحیح کرنا ضروری سمجھا، لیکن اس کی آواز تاثیر سے عاری تھی۔

”نہیں۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ میرے الفاظ آپ کو سخت لگے، لیکن سچائی کی تلخی ہے۔ یقیناً“ چہچہے گی۔ آپ لوگ مغربی پروپیگنڈہ کے بعد مہذب ہوئے ہیں۔ اب واقعی صورت حال بہتر ہو رہی ہے۔ ورنہ کتنے ہی واقعات میں آپ کو یہاں بیٹھے بیٹھے انگلیوں پر گنوا سکتا ہوں، جب اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ”اسلام“ کے نام پر وہ قتل و غارت ہوا ہے کہ اللہ کی پناہ۔ دراصل آپ لوگوں نے خود کو اسلام کا ٹھیکے دار ہی سمجھ لیا ہے۔ رہی سہی کسر اٹھک پاور نے پوری کر دی۔ گویا قدرت نے گنچے کو ناخن دے دی، ہی ڈالے۔ اب کھجا کھجا کر لہولہان ہی ہو گا نا۔“ اس نے رک کر ایک بار پھر شہروز کی شکل دیکھی، پھر اس کی خفگی محسوس کر کے ہاتھ ہوا میں بلند کر کے بولا۔

”برامت مانہے برادر۔ میں کسی ملک یا اس کے شہریوں کے خلاف نہیں ہوں۔ بلکہ میں اس سوچ

ہو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ مسلمان مرد اہل کتاب غیر اسلامی عورت سے شادی بھی کر سکتا ہے۔ موسیقی بھی اگر طبیعت میں ہیجان پیدا نہیں کرتی تو اسے سننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ عورت اگر سر نہیں ڈھکتی، مگر مہذب لباس میں ہے تو پھر اس کو ٹوکنے کا کوئی جواز نہیں بنتا عورت جسم خوب صورتی ہے اور خوب صورتی کو قید کر کے رکھنا ظلم کے مترادف ہے۔ وہ اگر بغیر آستینوں کی قمیض پہنتی ہے یا گھٹنوں سے اونچا اسکرٹ پہن لیتی ہے تو یہ اس کی خوب صورتی کو اجاگر کرنے کے لیے ہے۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ وہ مرد کے سکون کے لیے پیدا کی گئی ہے، ناکہ پابندیوں میں جکڑ کر گھروں میں محصور رکھنے کے لیے۔ اس کا گھر سے باہر نکل کر مرد کی ذمہ داریاں بانٹنا بھی مرد کے لیے باعث رحمت اور باعث سکون ہی ہے۔ لیکن برادر نور محمد یہ سب نہیں مانتے اور قصور ان کا بھی نہیں ہے۔ انہیں لوگ ہی ایسے ملے ہیں جن کے عقائد نہایت فنڈ امینٹلسٹ ہیں۔ ہر معاملے میں تنگ نظری ان کا وتیرہ بن چکی ہے۔ آپ مل چکے ہیں ان سے۔ آپ جانتے ہیں وہ آپ کے جس رشتہ دار سے بے پناہ متاثر ہیں وہ کون ہے۔ وہ آج کل کہاں ہے۔ وہ سرٹیفائیڈ دہشت گرد ہے۔“

شہروز کو لفظ ”رشتہ دار“ دہشت گرد سے بھی زیادہ برا لگا۔

”کیا واقعی نور محمد ”المہاجرون“ کے لیے کام کرتا رہا ہے؟“ شہروز نے اپنی کیفیت چھپا کر اس کی جانب جھکتے ہوئے رازداری بھرے انداز میں سوال کیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، پھر استفہامیہ انداز میں بولا۔

”برٹش نور محمد۔“ شہروز نے بدقت منہ کا زاویہ برا بنانے سے خود کو روکا۔ اہتہنک بنیادوں کو یہاں بھول پانا آسان نہیں تھا۔

”پاکستانی نور محمد۔“ وہ لفظ پاکستانی پر زور دے کر بولا، تعمور نصار نے ناک چڑھائی۔

”پاکستانی کے بارے میں حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہہ سکتا میں۔ ان کے بارے میں تو ان کے گھر

کے خلاف ہوں جو اسلام کے نام پر وہاں پروان چڑھائی جا رہی ہے۔ میں افغانستان، سعودی عرب، ایران اور ان جیسے سب ہی ممالک پر تنقید کرتا ہوں۔

”آپ کر سکتے ہیں۔ میں مان لیتا ہوں، لیکن اب کام کی بات کریں اور نور محمد کے ناول پر روشنی ڈالیں۔ یہ زیادہ مناسب رہے گا۔“ شہروز نے اس کی باتوں سے اکتا کر ٹوکنا ضروری سمجھا تھا۔ اس نے ٹاک سیکڑ کر اور آنکھیں پھیلا کر شہروز کو دیکھا۔ پھر سر ہلایا۔ گویا سمجھ گیا ہو کہ اس کے سامنے بیٹھا شخص برامتا رہا ہے۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ جو آپ کو مناسب لگے۔ لیکن یہ سب بھی ڈسکس کرنا ضروری ہے۔ میری کوئی بات بری لگی ہو تو میں معذرت خواہ ہوں، لیکن حقیقت سنیں گے تو برداشت کرنا سیکھیں گے اور برداشت کرنا سیکھیں گے تو اس دنیا میں اپنے مقام کا تعین کیا میں گے۔ میں آپ کو صرف یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ نور محمد اور ان کا عہد الست ریڈیکلائزڈ سوچ پر مبنی ایک کاغذات کا پلندہ ہے۔ میری نظر میں اس لیے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ آپ بھی اس کی پروا نہ کریں۔ اور تعصب پسند ہوئے بغیر یکسوئی سے اپنے کام پر دھیان دیں۔“ اب کی بار وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ شہروز کو اس کی یہ بات بھی اچھی نہیں لگی، بلکہ یہ بات اسے سب سے زیادہ بری لگی۔

”میں اپنے کام پر ہی دھیان دے رہا ہوں، لیکن متضاد آرا کو سن کر ہی کسی نتیجے پر پہنچا جاسکتا ہے۔ میں آپ کی باتیں سن رہا ہوں۔ ان سے اتفاق کرنا یا نہ کرنا میری مرضی پر منحصر ہے۔ مگر میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ میں تعصب پسند نہیں ہوں، اس لیے میں اس بین الاقوامی چینل کے لیے میرٹ پر چنا گیا ہوں۔ میں بھی اس پراجیکٹ کو اپنا سو فیصد دینا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایسا نکتہ جس پر میری اپنی سوچ واضح نہ ہو اسے عوام کے سامنے پیش کر کے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے کی وجہ بنوں۔“

اس نے بہت ہی پیشہ وارانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی تھی اور اپنا موقف واضح کر دیا تھا۔ اسے اس لمحے ذہنی طاقت کی بہت ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ وہ اس امر کو ہمیشہ گلو کوز کی طرح استعمال کرتا تھا کہ وہ میرٹ پر چنا گیا ہے۔ اس کے لیے خود شناسی خواہمندی تھی۔

”ہم سب کی یہ ہی سوچ ہے۔ یہی مقصد ہے۔ ہمارا پروجیکٹ مسلمانوں کے خلاف نہیں ہے۔ پاکستان کے خلاف بھی نہیں ہے۔ میں ترکی میں بھی بسنے والے فنڈ امینٹسٹلٹ پر سخت تنقید کرتا ہوں۔ آزر کلنگ پر بہت کام کیا ہے میں نے۔ ہم تو مسلم دنیا کا وہ رخ پیش کرنے والے ہیں جو حقیقی معنی میں بے پناہ خوب صورت ہے۔ ہمارا کلچر ہماری ویلیوز ہمارے طور طریقے کس قدر جدید ہیں، کس قدر دل موہ لینے والے ہیں۔ یہ دو سری اقوام کو دکھانے اور باور کروانے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں اس چودہ سو سال پہلے والی دقیا نوسی سوچ سے نکلنا ہوگا۔ یہ وقت کا تقاضا ہے۔ ہمیں اپنے وہ اصول جو دو سری اقوام کے لیے ناقابل برداشت ہیں کو بدلنا ہوگا اور ان میں ترمیم کرنی ہوگی۔ اقوام عالم کے ساتھ تعلقات بنا کر چلنا ہے تو ان کے ساتھ ہم آہنگی کی خاطر ان کی عادات کو اپنانا ہوگا۔ میں نے اپنے مذہب سے یہ ہی سیکھا ہے کہ جمود معاشروں کو جوڑتا دیتا ہے اور یہ ہی میں اپنی آنے والی نئی نسلوں کو سکھاؤں گا۔ میں اس پروجیکٹ کے ساتھ اسی لیے منسلک ہوں کہ یہ وہ سب کرے گا جو میں بحیثیت مسلمان کرنا چاہتا ہوں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ ہماری نیت نیک ہے۔ اور کامیابی ہمیں ضرور ملے گی۔ اس لیے انہیں اپنا کام کرنے دیں اور آپ اپنا کام کریں۔ ہمیں اپنی ڈاکومنٹری ان کے ناول سے پہلے تیار کرنی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ اپنا کام مکمل نیک نیتی سے وقت پر کر لیں گے۔“

تعمور نصار نے کہا تھا۔ شہروز نے سر ہلایا۔ اب کی بار اس کے مستحکم لہجے نے شہروز کو متاثر کیا تھا۔ وہ اس کی سوچ کے ساتھ سو فیصد متفق تھا۔

”ان شاء اللہ۔“ اس نے بھی کہا تھا۔



پھر جب اس کی بہن صبا کی شادی ہائی اسکول کے بعد ہی طے کر دی گئی تب بھی اس نے خوب واویلا مچا کر اپنے ابو کی ناراضی مول لی تھی اور اسے اسی طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس نے انہیں واضح لفظوں میں کہا تھا کہ وہ صبا کی خواہش کے باوجود اسے مزید پڑھنے کی اجازت صرف اس لیے نہیں دے رہے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کی بیٹی اپنی مرضی سے شادی نہ کر لے۔ انہیں اللہ سے زیادہ لندن کے آزاد ماحول سے خوف آتا ہے اور اگر انہیں اتنے ہی خدشات ستاتے ہیں تو وہ پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے۔ اس طرح کی صورت حال میں ایسے ہمیشہ اپنے والدین کے دو غلے پن سے الجھن ہوتی تھی اور وہ واقعی جذباتیت کا شکار ہو جایا کرتا تھا۔

سواب بھی وہ اکیلا تھا، تنہا تھا، لیکن حق پر تھا۔

”عہد الست آپ کے لیے شاید ایک عام سناٹا ہے، جس میں آپ کے کسی رشتے دار کا ذکر ہے۔ کسی دوسرے شخص کے لیے یہ ایک مشہور شخص کی آٹو بائیو گرافی ہو سکتی ہے، لیکن میرے لیے یہ ایک عقیدہ ہے، ایک سوچ، زندگی گزارنے کا طریقہ، جسے میں نے ساری زندگی گزار لینے کے بعد سیکھا ہے اور میں اسی لیے اس پر زور دیتا ہوں اور اس سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں ہوں۔“ عمر نے دیکھا وہ شخص پہلے سے پر عزم دکھائی دیتا تھا۔

”میں نے اپنی زندگی میں پہلا اہم سبق یہ سیکھا تھا کہ اپنی فطرت سے غداری نہیں کرنی چاہیے۔ بہت چھوٹی عمر میں میرے گرینڈ پاپا نے مجھے یہ بات سمجھادی تھی کہ فطرت سے بغاوت بگاڑ کا باعث بنتا ہے اور میری زندگی کا آخری اہم سبق یہ تھا کہ انسان فطرت حنیف پر پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی دین حق کا اقرار اس کی فطرت ہے۔ انسان اس اقرار سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ انسان فطرت حنیف سے منہ موڑتا ہے تو کل انسانیت کے لیے بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ہی عہد الست ہے اور یہ ہی میری کہانی ہے۔ اس کہانی کی بظاہر آپ

”یہ عہد الست کیا ہے؟“ اسی روز اور تقریباً اسی وقت جب شہروز ایفرڈ کے ایک کیفے ٹیریا میں بیٹھا عہد الست کے متعلق بات کر رہا تھا۔

عمر نے اس سفید فام شخص کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا جس کا نام نور محمد تھا۔ اس کے پاس بہت سے سوالات تھے جن کے تسلی بخش جوابات جاننا اس کے لیے بہت ضروری تھا۔ اس لیے وہ لوٹن میں موجود تھا اور اس بار اس نے کسی کو تانے یا پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اس نے اپنے پاس سے تین گھنٹے کا بریک لیا تھا اور پھر یہاں آ گیا تھا۔ اسے کل رات ہونے والی ایک لمبی بحث نے سمجھا دیا تھا کہ وہ اگر اس سمندر میں کودے گا تو اکیلا ہی کودے گا۔ کوئی اس کا ساتھ نہیں دے گا اور وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ کود کر ہی دم لے گا۔ یہ ہی اس کی طبیعت کا وہ رنگ تھا جس کی بنا پر وہ سارے خاندان میں جذباتی مشہور تھا۔ وہ عموماً ہر بات پر بھی ضد میں نہیں آجایا کرتا تھا، لیکن جب اسے کسی معاملے میں اپنا آپ حق پر لگتا تھا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے اس کے فیصلوں سے ایک انچ بھی نہیں ہٹا پاتی تھی۔ اس کے ساتھ ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔

اس کے ابو نے جب اپنے بھائی کی معاونت سے لندن میں ہوزری کا بزنس شروع کیا اور پاکستان سے ہوزری کا سامان امپورٹ کرنا شروع کیا تو بہروز بھائی کے ایک جاننے والے کشم میں اچھی پوسٹ پر تھے۔ ان کی معاونت سے ایکسائز ڈیوٹی پر کافی چھوٹ ملنے لگی تب بھی عمر نے بہت شور ڈالا تھا۔ حالانکہ تب وہ پڑھ رہا تھا۔ لیکن اس نے اپنے ابو اور تایا ابو سے اس بات پر بہت بحث کی تھی کہ وہ ایک ال لیگل کام کر رہے ہیں جو ان کے اپنے ملک کے مفاد میں نہیں ہے اور وہ پاکستان کی خرابیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ سب خرابیاں پاکستانیوں کی خود کی پیداوار ہیں۔ تب بھی اسی طرح وہ ایک طرف رہ گیا تھا اور باقی سارا خاندان اسے جذباتی قرار دیتے ہوئے ایک



تقویٰ کو ہی فضیلت حاصل ہے۔ کیا کسی انسان کو جانچنے کا اس سے اچھا کوئی اور پیمانہ ہو سکتا ہے یا ہونا چاہیے۔۔۔؟“

وہ اس سے پوچھ رہے تھے اور عمر چپ کا چپ رہ گیا۔ اس کے پاس اتنا علم نہیں تھا کہ وہ ایسی باتوں کے جوابات فوراً دے پاتا۔ ہر عام مسلمان انسان کی طرح وہ تو خود کو ہی سب سے بڑا مسمیٰ سمجھتا تھا۔ اس کے لیے تو یہی سب سے بڑی خوبی تھی کہ اس نے کسی کا دل نہیں دکھایا تھا، کسی کا حق نہیں مارا تھا۔ وہ تو اس بات پر بھی اتراتا تھا کہ وہ نماز پڑھ لیتا ہے۔ روزے بھی رکھ لیتا ہے۔ اس کے لیے یہی فخر کم نہیں تھا کہ اس نے آزاد ماحول میں پرورش پانے کے باوجود وہاں کارتی برابر اثر قبول نہیں کیا تھا۔ اس سے کوئی پوچھتا تو وہ کہتا کہ ہاں میں ہی بہترین مسلمان ہوں۔۔۔ میرے دم سے آج تک کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔۔۔ میں اس سے زیادہ اور کبھی کیا سکتا ہوں؟“

”نور محمد ایک متقی انسان ہیں۔۔۔ اللہ کو متقی انسان سے بڑی محبت ہوتی ہے۔ میرے لیے بھی ان سے محبت کرنے کے لیے یہی خوبی کافی ہے۔“ وہ ایک بار پھر خاموش ہوئے تھے۔

”تقویٰ کیا ہے سر!“ عمر نے لاچار انداز میں سوال پوچھا تھا۔ اس کے سامنے بیٹھا شخص جو پہلی ملاقات میں ایک عام سا سفید فام بوڑھا تھا اب یکدم ایک عالم بن گیا تھا۔ اس کے کفظوں میں تاثیر تھی جو دل پر وار کرتی تھی۔ عمر خود کو اس کے سحر میں جکڑا محسوس کرتا تھا۔

”تقویٰ وہ سیڑھی ہے جو اکملیت کی طرف لے جاتی ہے۔۔۔ مجھے پتا ہے اب آپ پوچھیں گے کہ اکملیت کیا ہے، میں آپ کو اس سوال کا جواب بھی دوں گا۔ میری اہلیہ نے خود کشی کی تھی، میری دعا ہے کہ اللہ رب العزت اس کے ساتھ نرمی والا معاملہ روا رکھے کہ اس کے اچھے ہوئے سوالات نے ہمیشہ مجھے سنبھالی ہوئی راہ دکھائی۔ اس کی اپنی زندگی ایک سوال کے گرد گھومتی رہی۔“ اکملیت کیا ہے؟“ اس نے

کے لیے کوئی اہمیت نہیں ہے، لیکن آپ نور محمد کے رشتہ دار ہیں اور ان کے لیے یہ ناول بہت اہم ہے، کیونکہ یہ ان کی بے گناہی کو ثابت کر سکتا ہے۔ اسی لیے میری کہانی آپ کے لیے اہم ہو سکتی ہے۔“

”نور محمد سے اتنی محبت کیوں ہے آپ کو۔۔۔ ان سے آپ کی کوئی رشتہ داری تھی نہ کوئی گھرے مراسم۔۔۔ وہ آپ سے عمر، علم، تجربے میں بھی کم تھے۔ آپ کے ان کے تعلقات کی عمر بھی شاید ہی کچھ مہینے رہی ہوگی۔ اس کے باوجود آپ کے دل میں ان کے لیے اتنی عقیدت سننے میں عجیب سی لگتی ہے۔ ایسی بھی کیا خاص بات ہے ان میں؟“

عمر یہ سوال سب سے پہلے پوچھنا چاہتا تھا۔ یہ سوال اس کے دل میں بے حد کھلبلی مچا رہا تھا۔ فی زمانہ ایک شخص کا دہشت گرد قرار دیا جانا ہی اس سے لا تعلق ہو جانے کے لیے کافی تھا۔ وہ امامتہ کا رویہ ہی دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اپنے بھائی کے لیے اتنا بے چین رہنے والی امامتہ اب یکدم اس کے بارے میں جان کر تعلق جان کر کیسے لا تعلق ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی تھی تو ایسی کیا الفت تھی اس بوڑھے سفید فام کو اس ”نور محمد“ سے کہ جو اس کی خاطر ہر قدم اٹھانے کو تیار تھا۔ وہ کون سا جذبہ تھا جو اس سارے عمل کے پیچھے کار فرما تھا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کو مسلا اور پھر جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی۔

”یہ سوال پہلے بھی کسی نے پوچھا تھا اور اسی انداز میں پوچھا تھا۔۔۔ آپ لوگ اس بات پر حیران ہوتے ہیں کہ نور محمد ہی کیوں اور میں یہ پوچھتا ہوں کہ۔۔۔ نور محمد کیوں نہیں؟ وہ اگرچہ ایک عام سا انسان ہی ہے۔۔۔ لیکن ”خاص“ ہونے سے پہلے ہر انسان ”عام“ ہی ہوا کرتا ہے بظاہر دنیاوی لحاظ سے ان میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔ آپ لوگ کیا سمجھتے ہیں کہ آیا وہ پھونک مار کر ٹوپی میں سے خرگوش نکال سکتے تھے یا آبرا کا ڈابرا قسم کا کوئی منتر پڑھ کر انسان غائب کر سکتے تھے ایسا کچھ نہیں ہے میرے دوست۔۔۔ مجھے اس کا تقویٰ پسند ہے، کیا پیارے نبی کا پڑھایا ہوا آخری سب سے نہیں ہے کہ

بہت تھری لنگ زندگی گزار رہی تھی، لیکن اسے جس چیز کی تلاش تھی وہ اسے تازہ زندگی نہ ملی۔ وہ کہا کرتی تھی وہ لمحہ جب روح اور جسم ایک نقطہ پر پہنچ جاتے ہیں تو ابیدی سکون حاصل ہوتا ہے۔ اسے اس سکون کی تلاش تھی وہ سمجھتی تھی کہ یہ سکون اسے تب ملے گا جب وہ ”ماں“ بن جائے گی۔ اس نے فرض کر لیا تھا کہ ”اولاد کا حصول ہی ماں کے لیے“ اکملیت ہے۔ وہ سوچتی تھی کہ اولاد مل جانے سے زندگی مکمل اس کی ہو جائے گی، اس کی مطمح ہو جائے گی۔ اور اسے اس مقام پر ابیدی سکون حاصل ہو گا اور وہ ”اکمل“ ہو جائے گی۔ اس کے لیے اکملیت کے نہ جانے کیا معنی تھے، لیکن مجھے لگتا ہے ہر انسان اسی سوال کے تعاقب میں پورا جیون گزارتا ہے۔ نئی سے نئی راہیں تلاش کرتا ہے۔ اپنی خواہشات کے بے لگام گھوڑے پر بیٹھ کر سرپٹ دوڑتا چلا جاتا ہے۔ آرزو کو جنون پھر لگن اور پھر عشق بنا لیتا ہے۔ اور پھر اسی کے گرد طواف کرتا رہتا ہے۔ درد سے بے چین ہوتا ہے تو مرہم بنا لیتا ہے پھر تجسس اور تھری اور مہم جو فطرت سے بے قابو ہو کر درد میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ ہم سب ایسا کرتے ہیں ہماری ابیدی خواہش سکون ہے اور ہم اسے جنون میں تلاش کرتے کرتے لقمہ اجل بن جاتے ہیں، لیکن سمجھ نہیں پاتے کہ ہم چاہتے کیا تھے۔ ہمارا آخری سوال خود سے یہی ہوتا ہے کہ کیا ہم ”یہی“ چاہتے تھے جو ہم کرتے رہے اور پھر ہم میں سے بہت سے لوگ اس سوال کا جواب نفی میں ہی دیتے ہیں۔ یہ انسان کا ذاتی معاملہ نہیں ہے۔ یہ کل انسانیت کا تجسس ہے کہ آخر اسے چاہیے کیا۔ میں نے یہ سیکھا کہ وہ ”اکملیت“ کا مارا ہوا ہے۔ اسے ”اکملیت“ چاہیے اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ”اکملیت کیا ہے؟ میں اگر یہ کہوں گا کہ دن کی پیروی ہی اکملیت ہے تو آپ فوراً ”مجھ پر نہیں گے اور مجھے طالبان سمجھنے لگیں گے۔ یہی آج کل کے ماڈرن انسان کا المیہ ہے۔ آج کل کے سائنٹفک دور کے ہم سب انسانوں کے لیے دین مذہب سب پرانی باتیں ہیں۔ ہمیں ان میں دقیانوسیت نظر آتی

ہے۔ ہمیں وہ جواب چاہیے جو سائنسی بنیادوں پر رکھا جانا چاہیے۔ اکملیت روح اور جسم کا ایک نقطہ پر آجانا ہے۔ بنیادی طور پر جسم مادہ کثیف ہے اور روح مادہ لطیف۔ یہ دونوں ایک نقطہ پر آ نہیں سکتے، لیکن کچھ عوامل ایسے ہوتے ہیں جو یہ ناممکن کام ممکن کر دکھاتے ہیں۔ وہ لمحہ جب انسان بے پناہ پر جوش ہو کر خوش ہوتا ہے تو اسے سکون حاصل ہوتا ہے جو اسے ہلکا پھلکا کر دیتا ہے۔ اس وقت اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بالکل ہلکا پھلکا ہو چکا ہے اور ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔ وہ لمحہ جب آپ کسی چیز کو بہت لگن کے بعد حاصل کر لیتے ہیں بھوکے پیٹ کے لیے لقمہ حلال۔ انسان کی محبت میں مبتلا انسان کے لیے محبوب سے وصال کا لمحہ۔ کسی شوق کے جنون میں مبتلا انسان کے لیے انعام کی وصولی کا لمحہ۔ ہنر کی بے پناہ داؤد و تحسین کا لمحہ۔ درد زہ میں مبتلا ماں کے لیے بچے کی دنیا میں آمد۔ حالت نزع تڑپتے سکتے وجود کے لیے موت کی نوید۔ سب عوامل ہی ایسے ہیں جو اسے بے پناہ سکون دیتے ہیں۔ ڈرگز کیوں اپنی باپولر ہو گئی ہے مغرب میں۔ نئی نسل خود کونٹے میں گم کر کے آخر کیا تلاش کرتی رہتی ہے۔ وہ ”اکملیت“ ہی تلاش کرتی ہے۔ وہ پر سکون ہونا چاہتی ہے۔ بے چینی سے چڑھنے لگی ہے اسے۔ یہ لوگ ڈرگز میں بھی تو پہلے تھری پھر بے چینی اور پھر سکون تلاش کرتے ہیں وہ اپنے ہوش و حواس کو نلنے کے پاس رہن رکھ کے چند گھنٹوں کا سکون چاہتے ہیں۔ ابیدی سکون۔ انہیں کسی نے سکھایا ہی نہیں کہ سکون حاصل کرنے کی چند اور چیزیں بھی ہیں ایسی چیزیں جن میں انسان اپنے حواس کھوئے بغیر بھی پر سکون ہو سکتا ہے اور تقویٰ بھی سکون دینے کی چیز ہے یہ آپ کے جسم کو بھاری نہیں ہونے دیتا اسے روح کے ہم وزن رکھتا ہے۔ اسے آلائشوں سے بچا کر رکھتا ہے۔ یقین سلجھنے آلائشیں نہیں ہوتیں تو آزمائشیں بھی نہیں ہوتیں۔ وہ یہ سب بتاتے ہوئے بھی کس قدر پر سکون لگ رہے تھے جبکہ عمر کے چہرے پر ہی نہیں ہر عضو پر لاچار طاری

”آپ بہت مشکل باتیں کرتے ہیں سر!۔۔۔ میں بہت عام سا انسان ہوں۔۔۔ مجھے اتنی مشکل فلسفیانہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں میرے جیسے عام انسان کے لیے یہ سب بہت مشکل ہے۔ مادہ کثیف، مادہ لطیف، ان کا ایک مقام پر آنا۔“ وہ اپنی کم عقلی کا اتنا کھلا اعتراف کرتے ہوئے ہچکچایا نہیں تھا۔ نور محمد مسکرائے تھے۔

”سادہ اور آسان ترین بات یہ ہے کہ دنیا کو اپنی حاجت سمجھیں رغبت نہیں۔۔۔ دنیا صفر ہے اگر صرف خواہش ہے۔ اسے خواہش نہیں ضرورت سمجھیں۔ اسے جائے عمل سمجھیں۔ اسے ضرورت بنا لیں۔۔۔ اسے دین کی اکائی کے ساتھ ملا لیں۔ اسے دس بنا لیں۔“

نور محمد نے اسے سادہ ترین انداز میں اپنی بات سمجھانی شروع کی تھی۔



”آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ شہروز استعمال کیا جا رہا ہے۔۔۔ وہ اپنے پاسز کی بہت تعریف کرتا ہے اور اس نے تو ہم سے ذکر بھی نہیں کیا کہ وہ کسی سعودی ابن جی او کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ عوف بن سلمان کا تو نام بھی کبھی نہیں سنا میں نے اس کے منہ سے۔۔۔ کسی انٹرنیشنل چینل کے ساتھ کسی جوائنٹ ونیچر کا ذکر بھی کبھی نہیں کیا اس نے۔۔۔ میں نے تو اس کے منہ سے کبھی عمد الست کا لفظ تک نہیں سنا۔“ زار نے اس کی سب باتیں سن لینے کے بعد کہا تھا۔ وہ انکل آفاق، ان کے بیٹے نور محمد کے بارے میں سن کر افسردہ تو ہوئی تھی، لیکن اس کا تمام اضطراب اور پریشانی شہروز کے متعلق سن کر ظاہر ہوا تھا۔ سلمان کی باتوں نے اسے نا صرف حیران بلکہ پریشان بھی کر دیا تھا۔ وہ مشکوک نہیں تھی لیکن متذبذب ضرور تھی۔ سلمان حیدر پر اسرار تھا، لا پروا تھا اور اپنے متعلق کبھی کھل کر بات نہیں کرتا تھا، لیکن وہ جھوٹا بھی نہیں تھا اور زار کو اس

بات کا یقین تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ ”سیکرسی ان کی پہلی شرط ہوتی ہے۔ اس نے اگر اپنے گھر والوں سے بھی ذکر نہیں کیا تو یقیناً“ یہ اس کی جا ب کی شرائط میں سے ایک رہی ہوگی۔۔۔ یعنی اس کے ایگریمنٹ کا حصہ رہی ہوگی لیکن یہ فیلڈ کے لوگوں کے لیے اتنی ڈھکی چھپی بات بھی نہیں ہے۔ میرے کہنے کو مستند سمجھو۔۔۔ میرے پاس ان سب لوگوں کی لسٹ ہے جو اس پراجیکٹ میں شہروز کی معاونت کر رہے ہیں۔۔۔ وہ عوف بن سلمان کے ساتھ کام کر رہا ہے یہ بات میرے علاوہ بھی کچھ لوگ جانتے ہیں۔ شہروز کے پاس رضوان اکرم بھی ان میں سے ایک ہیں۔۔۔ ان کا نام تو سنا ہی ہو گا تم نے؟“

وہ کہہ رہا تھا۔ زار اچھ نہیں بولی۔ شہروز اپنی جا ب کے متعلق بات کم ہی کرتا تھا۔ وہ صرف کامیابیوں کے متعلق بات کرتا تھا۔ ایک ڈیڑھ سال سے تو وہ صرف ان باتوں پر دھیان دیتا تھا جن میں اس کی تعریف اور خود نمائی کا پہلو زیادہ نکلتا تھا۔ زار نے سر ہلایا۔ رضوان اکرم کا نام اس نے سن رکھا تھا۔

”در اصل شہروز سے پہلے یہ پراجیکٹ مجھے آفر کیا گیا تھا۔۔۔ میں پہلے سے ہی ایک ڈاکیومنٹری تیار کر رہا تھا جو ”نور محمد“ کے متعلق تھی، کچھ وجوہات کی بناء پر میں نے یہ پراجیکٹ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ رضوان اکرم مجھ سے بہت اصرار کرتے رہے ہیں کہ میں ان کے ساتھ مل کر کچھ نا کچھ ضرور کروں لیکن میرا دل جب کسی چیز سے اچاٹ ہو جاتا ہے تو پھر میں اسے نہیں کر پاتا۔۔۔ میں نے اپنا پراجیکٹ بھی ادھورا چھوڑ دیا تھا اور رضوان صاحب یہ بات جانتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میری اس موضوع پر کافی ریسرچ ہے۔ وہ میری ڈاکیومنٹری کے کاپی رائٹس مجھ سے لینا چاہتے تھے۔ میرے انکار کے کچھ عرصہ بعد عوف بن سلمان نامی ایک شخص نے تین پاکستانی جرنلسٹس کو کافی خطیر رقم پر ہار کیا تھا۔ شہروز ان تین لوگوں میں شامل ہے۔“ وہ اسے اس کے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اس کے باوجود یہ کیسے کہہ سکتے ہیں آپ کہ شہروز ٹریپ کیا جا رہا ہے۔۔۔ وہ اتنی محنت کرتا ہے اپنے کام کے لیے دن رات کافرق بھی نہیں دیکھتا۔ اس کے اندر کچھ پوٹینشل تو ہو گا نا کہ جو اسے اتنے لوگوں میں منتخب کیا گیا ہے۔“ وہ اب بے حد معتدل لہجے میں بات کر رہی تھی لیکن کنفیوژن ابھی بھی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔

”محنت کی بات مت کرو۔ محنت سب کر لیتے ہیں۔ شہروز کو اس بنیاد پر نہیں چنا گیا شہروز نے یہ سودا محنت یا روپے کی بنیاد پر نہیں کیا بلکہ اس کی خواہش ”شہرت“ ہے۔ اس کے خریدنے والوں نے یہ بات بھانپ لی تھی کہ وہ شہرت کی خاطر آنکھیں بند کر کے بہت دور تک جا سکتا ہے۔ اتنا دور کہ جہاں جھوٹ اور سچ کافرق ختم ہو جاتا ہے۔ انسان اپنے گھر والوں کو بھول سکتا ہے اپنی ترجیحات بدل سکتا ہے اور کسی کی اندھی پیروی بھی کر سکتا ہے۔ یہ بات تم بھی جانتی ہو کہ شہرت کے سامنے شہروز کو کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ کوئی بھی نہیں“

اس نے آخری تین لفظوں پر زور دیتے ہوئے جملہ مکمل کیا تھا۔ زارا کچھ نہیں بولی تھی۔ اس نے سلمان کی کسی بات کی تردید نہیں کی تھی۔ یہ خدشات تو اس کو بھی ڈراتے تھے کہ شہروز کے لیے ہر چیز، شخص اور جذبہ ”شہرت“ کے بعد آتا تھا۔

”آپ نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ شہرت کی خواہش کوئی گناہ تو نہیں ہے تو پھر یہ سب شہروز کے ساتھ ہی کیوں۔“ وہ عادت کے مطابق فوراً ہی بے دلی کا شکار ہونے لگی تھی۔

”شہرت کی خواہش واقعی گناہ نہیں ہے۔ ہم سب کے اندر یہ خواہش موجود ہوتی ہے۔ لیکن اس خواہش کی خاطر اتنا آگے چلے جانا کہ آپ کے اعصاب ہی مفلوج ہو جائیں۔ اچھے برے کافرق مٹ جائے گناہ ثواب کی تخصیص نہ رہے تو پھر یہ گناہ ہی ہے۔ میں تمہیں کنفیوژن نہیں کرنا چاہتا، لیکن اتنا جان لو زارا بی بی! کہ یہ ایک گورکھ دھندا ہے۔ اس کو سمجھنا اتنا آسان

نہیں ہے۔ میں نے بتایا نا کہ ایک برٹش نو مسلم ناولسٹ نور محمد ہیں جو ایک ناول ”عہد الست“ لکھ رہے ہیں جبکہ ایک فوٹو گرافر عوف بن سلمان ایک ڈاکیومنٹری ”عہد الست“ پر کام کر رہا ہے۔ دونوں کا مقصد تقریباً ایک ہی ہے۔ دونوں ہی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ دین اسلام ایک سچا مذہب ہے اور اسے دیا گیا دہشت گردی کا لیبل صرف بہتان ہے۔ لیکن دونوں کا طریقہ مختلف ہے۔ یہی میرا اور شہروز منور کا حال ہے۔ ہم کام ایک ہی کر رہے ہیں لیکن ہمارا طریقہ کار مختلف ہے۔“

”آپ دونوں میں غلط کون ہے؟“ زارا نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی تھی۔ سلمان نے اس کا چہرہ دیکھا۔

”اس کا فیصلہ تم کرو گی ڈاکٹر۔۔۔ ہر بات میں نہیں بتاؤں گا، لیکن ایک بات یاد رکھنا، اس بار دماغ سے فیصلہ کرنا قدرت بے وقوفوں کو بھی عقل مندی سے فیصلہ کرنے کا ایک موقع ضرور دیتی ہے، یہی موقع دنیا میں ان کے مقام کا تعین کرتا ہے۔ یہی موقع وہ فیصلہ ہوتا ہے جو کامیابی اور ناکامی کے درمیان ڈٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔“

زارا اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی۔ اسے فیصلہ کرنا آتا ہی کب تھا۔



”زارا کچھ کہہ رہی تھی؟“

وہ سہ پہر کا نکلا دوبارہ مغرب کے وقت گھر آیا تھا۔ گرمیاں تھیں سو مغرب بھی سات بجے کے قریب ہوتی تھی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا اور ساتھ ہی بجلی جا چکی تھی۔ امی انور ٹرپر چھوٹا سا بلب روشن کیے برآمدے میں بیٹھی ہاتھ میں تسبیح لیے نماز کے بعد والی تسبیحات پڑھ رہی تھیں۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا لیکن ان کا سوال بہت تاؤ دلانے والا تھا۔ وہ ان کے قریب ہی بیٹھ کر ٹی شرٹ کی آدھی آستینوں کو مزید اونچا کرنے لگا۔ امی نے بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ برہا کر

پیڈنٹل فین کا رخ اس کی جانب موڑا تھا۔
 ”اس نے کھانا کھا لیا تھا اسے شامی کیا پند آئے؟“ امی اس کے تاثرات دیکھ بھی چکی تھیں پھر بھی مسلسل سوال کر رہی تھیں۔ اس نے اکتا کر انہیں دیکھا۔

”وہ انتہائی چڑ کر بولا تھا۔“
 ”پھٹ جائے گا بیٹا جی۔“ امی مسکرائی تھیں۔ وہ دونوں بعض اوقات ایسے باتیں کرتے تھے جیسے ہم عمر دوست ہوں۔

”پھٹ ہی رہا ہے امی جی۔۔۔ آپ کی انٹلکچوئل باتیں سن سن کر۔“ وہ اسی انداز میں بولا۔
 ”اچھا اب نہیں بولوں گی۔ آؤ میں دبا دیتی ہوں سر۔“ وہ لاڈ سے بولی تھیں اور ایسے لاڈ کے مظاہرے بہت ہی کم آتے تھے اس کی زندگی میں۔ امی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی تھیں۔ چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ سنکھے کی گھر گھر کے علاوہ دور کسی کے گھر میں جنزیر چلنے کی آوازیں ماحول میں ارتعاش بکھیر رہی تھیں۔

”امی! کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے میں آپ کا بیٹا نہیں آپ کی بہو ہوں۔ جسے آپ ہر وقت کھچ کھچ کر کے زچ کیے رکھتی ہیں“ اس نے عادت کے مطابق ان کے گندم سوال کا چنا جواب دیا پھر اٹھ کر نپکھے کے سامنے اپنے لیے چارپائی بچھانے لگا۔ امی کچھ نہیں بولی تھیں بلکہ سکون سے سبج ختم کر کے انہوں نے اسے دروازے کے اوپر لگے کیل پر ٹانگ دیا پھر اس کے ساتھ اسی کی چارپائی کے قریب بیٹھنے آ گئیں۔ اس نے ان کے لیے سمٹ کر جگہ بنائی تھی۔ وہ آسمان کو تک رہا تھا اور امی اس کو تکتے میں مگن تھیں۔ وہ کچھ الجھا الجھا سا نظر آتا تھا۔

”مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میری کس بات سے آپ کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ ڈاکٹر زار اور اصل آمنہ ہے۔ میں آپ کو کئی بار بتا چکا ہوں کہ زارا آمنہ نہیں ہے۔“ اس نے تمہید باندھی تھی۔ امی اس کے بالوں کو سہلاتی رہی تھیں۔

”تم اتنی جلدی چڑنے کیوں لگے ہو۔۔۔ میں تو عادتاً ہی سوال کر رہی تھی۔ کیا کروں کوئی بیٹی نہیں ہے تو جو بھی اچھے سے بات کرتا ہے اسی سے لگاؤ ہو جاتا ہے۔ تمہیں پتا تو ہے میں فطرتاً ہی محبت کرنے والی انسان ہوں۔“ امی اسے مسکراتے ہوئے وضاحت دے رہی تھیں۔ سلمان نے انہیں چونک کر دیکھا۔ یہی وضاحت تو وہ بھی ابھی دے کر آیا تھا۔

”زارا انگہ جڈ ہے امی۔۔۔ آپ کو پتا ہے اس کا منگیتر کون ہے؟“ شہروز منور۔“ اس نے اپنی جانب سے انکشاف کیا تھا۔ امی کی انگلیاں لمحہ بھر کو تھمی تھیں۔ انہیں نہیں یاد آیا تھا کہ وہ کس کا ذکر کر رہا ہے۔
 ”شہروز منور۔۔۔“ انہوں نے سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

”مت کیا کریں امی۔۔۔ محبت کے مطلب نہیں بدلے انداز بدل گئے ہیں محبت اب حاجت نہیں عادت ہو گئی ہے۔۔۔ لوگ فطرتاً ہی محبت کرنے والے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔“

”یہ سب آفاق صاحب کی بیٹی کے سسرالی رشتے دار ہیں امی۔“ انکشاف اب مکمل ہوا تھا اور امی کے چہرے پر اصل حیرانی بھی اب ہی چمکی تھی۔
 ”شہروز منور وہی لڑکا ہے جسے رضوان صاحب نے میرے بعد اپروچ کیا تھا۔ میرا خیال ہے یہ بات میں نے آپ کو بتائی تھی۔“ وہ انہیں یاد کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔ امی نے سر ہلا دیا۔

”کوئی بات ہوئی ہے کیا؟ زارا نے کچھ کہا؟“ امی کی سوئی ابھی بھی زارا پر ہی اٹکی تھی۔
 ”اس نے آپ کی اور میری باتیں سن لی تھیں جب کھانا کھاتے ہوئے آپ آمنہ کی باتیں کر رہی تھیں، وہ کافی برا مان گئی۔“ امی نے اس کی بات کاٹی۔

”شاید۔۔۔ پتا نہیں۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکیں۔ زارا اور اس کے منگیتر کا ذکر انہیں باور کرا گیا تھا کہ ان کا انداز غلط تھا۔ اب سلمان سے یہ پوچھنا بھی بے کار تھا کہ وہ

”برا کیوں مان گئی۔ کیا وہ تمہیں ناپسند کرتی ہے؟“
 ”امی! وہاں سے کوئی چیز اٹھا میں اور میرے سر میں

تھی، لیکن ابھی وہ اس دکھ کا اظہار نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کے بیٹے کوئی الوقت ماں ایک سامع کے روپ میں چاہیے تھی، سو انہوں نے سلمان کی باتوں میں دلچسپی لینے کا فیصلہ کیا تھا۔

www.paksociety.com

”یا الہی میں واقعی تیری نعمتوں کو نہیں جھٹلا سکتا۔ تو مجھے وہاں وہاں سے نوازتا ہے، جہاں میری سوچ بھی نہیں پہنچ سکتی۔“

نور محمد اپنے دل میں تشکر کا ایک طوفان ابلتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے نماز عشاء سے فراغت کے بعد نوافل بھی ادا کر لیے تھے اور روٹین کی تسبیحات بھی پڑھی تھیں، لیکن جی نہیں بھرا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ مصلے پر بیٹھے رہیں اور رب کا شکر ادا کرتے جائیں۔ بہت دن کے بعد وہ اتنے پرسکون ہوئے تھے کہ ان کے وجود سے ان کی خوشی کا ہر رنگ چھلک رہا تھا۔ وہ اب واقعی چاہتے تھے کہ ان کا آخری ناول اشاعت کے مرحلے سے گزر کر پبلک تک پہنچ جائے۔ ایک طویل عرصے بعد وہ اس ناول کی اشاعت کے لیے اتنے ہی پر جوش تھے جتنا کہ اپنے پہلے ناول کے لیے تھے۔

سلمان حیدر نے اپنا سارا کام مکمل کر کے انہیں ای میل کر دی تھی۔ دوسری طرف نور محمد کے بہنوئی سے مل کر بھی وہ بہت خوش ہوئے تھے۔ وہ اچھا شخص تھا اور ان کی ہر ممکن مدد کر گیا تھا۔ ان لوگوں کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا جو ان کی مدد کے لیے مخلص اور پر جوش تھے۔ سلمان حیدر کے بعد عمر نے بھی ان کے دائرے میں داخل ہو کر ان کی طاقت میں اضافہ کیا تھا۔ وہ معاملات جو کچھ سال پہلے بنتے بنتے بگڑ گئے تھے بالآخر درست سمت میں چلنا شروع ہو گئے تھے۔ اسی لیے وہ کافی دن کے بعد کافی مسرور نظر آتے تھے۔

انہوں نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ ان کے روم میٹس کی واپسی کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا، لیکن یہ طے تھا کہ وہ سونے کی غرض سے رات کے کسی پہر

شہروز کو پہلے سے جانتا تھا یا زارا۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ ان کے بیٹے کی دلچسپی زارا میں تھی نہ شہروز میں، بلکہ اس کی دلچسپی ”عہد الست“ میں تھی۔

”امی۔ میں آپ کو کچھ باتیں تفصیل سے بتاتا ہوں۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“

سلمان اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب بہت دن ہو چلے تھے۔ امی سے بہت سی باتیں تھیں کرنے کے لیے۔ امی کو اس سارے معاملے کی تپ سے خبر تھی، جب وہ آفاق صاحب سے مل کر اور انہیں موصول ہونے والے پوسٹ کارڈز دیکھ کر آیا تھا۔ آفاق صاحب کے ساتھ اس کی شناسائی اس دن کے بعد سے دوستی میں بدل گئی تھی۔ وہ اکثر اوقات ان کو فون کر لیا کرتا تھا۔ صرف یہ جاننے پر کھنے کو کہ آیا نور محمد کی جانب سے دوبارہ کوئی رابطہ کیا گیا یا نہیں۔ اگرچہ دوبارہ ایسے کوئی کارڈز وغیرہ نہیں ملے تھے۔ لیکن ایک تجسس اور ہمدردی اسے اس خاندان سے جوڑے رکھتا تھا۔ آفاق صاحب بھی اسے کافی اہمیت دینے لگے تھے اور خود بھی اسے فون کرتے رہتے تھے۔ ان ہی دنوں امی کو اس نے یہ سب باتیں بتائی تھیں۔ اس لیے وہ بھی آفاق صاحب کی فیملی کے متعلق کافی تفصیل سے جانتی تھیں۔ جب امامتہ کی شادی ہوئی تھی۔ تب بھی بطور خاص آفاق صاحب نے اس کو امی سمیت مدعو کیا تھا، لیکن وہ تقریب میں جا نہیں پائی تھیں۔ مگر وہ جانتی تھیں کہ ان کا بیٹا پروفیسر آفاق صاحب کے ساتھ کافی گہرے مراسم رکھتا ہے۔ نور محمد، امامتہ اور آفاق صاحب وہ سب کو ناموں سمیت جانتی تھیں، لیکن ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ زارا جسے وہ ”آمنہ“ سمجھتی ہی نہیں تھیں، بلکہ پر یقین بھی تھیں کہ وہی ان کے بیٹے کی پسند ہے، دراصل وہ بھی ”عہد الست“ کا حصہ تھی۔ انہیں اپنے بیٹے کی سرگرمیوں پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا، لیکن بحیثیت ماں وہ واقعی چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا اب شادی کر لے، سو دل ہی دل میں انہیں اس بات پر دکھ تو ہوا کہ زارا بھی وہ لڑکی نہیں تھی جو مستقبل قریب میں ان کی بہو بن سکتی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

رہے تھے۔ ان کے رویہ میں خوش گوار تبدیلی آئی تھی۔

”برادر! میں تو دو گھنٹے بعد کارڈف کے لیے نکل رہا ہوں۔ میرے پاس نے مجھے اپنے وہاں کے آفس میں ٹرانسفر کر دیا ہے۔ میں ڈنر نہیں کر پاؤں گا۔ وقت کم ہے اور کام زیادہ۔ سامان بھی سمیٹنا ہے۔“ وہ تھکا ہوا لگتا تھا۔ نور محمد نے بغور اس کی جانب دیکھا۔

”کارڈف۔ ٹرانسفر۔ ایسے اچانک۔؟“ وہ حیران ہوئے تھے۔

”اچانک نہیں ہے۔ کافی دن سے پاس سے سیلری بڑھانے کی بات چل رہی تھی۔ وہ چاہتا ہے میں کارڈف چلا جاؤں تو وہ انکرمنٹ لگا دے گا۔ مجھے تو اسی سے غرض ہے۔ میں نے ہامی بھر لی۔“ وہ اسی انداز میں بولا۔

”آپ نے بتایا ہی نہیں پہلے۔“ نور محمد نے شکوہ نہیں کیا تھا، وہ فقط حیران تھے۔

”بتانے والی بات تھی ہی نہیں برادر۔ بس اب آپ کے وطن میں دل نہیں لگتا۔ میں جلد واپس چلا جاؤں گا۔ میرا رزق اتنا ہی تھا ادھر۔“ اس نے گردن موڑ کر ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے بتایا تھا۔

”میں کافی بتاتا ہوں۔ آپ اپنا سامان سمیٹ لیں۔“ نور محمد نے اس کی بات پر کوئی تاثر ظاہر کیے بنا کہا تھا۔ وہ کافی میکر کی طرف مڑے تھے اور زین العابدین سیڑھیوں کی جانب چل دیا تھا۔ کافی بننے میں چند منٹ ہی لگے تھے۔ وہ مک کے ہمراہ جب کمرے میں پہنچے تو زین اپنا بیگ تیار کر چکے تھے۔ انہیں اس سے اتنی پھرتی کی توقع نہیں تھی۔ اگرچہ اس کا سامان چند کپڑوں کے جوڑوں پر ہی مشتمل تھا، لیکن ان کو سمیٹنے میں بھی اس نے جس تیزی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ نور محمد کے لیے باعث حیرت تھی۔

”میں آپ کو اپنی زندگی میں ہمیشہ ایک محسن کے طور پر یاد رکھوں گا۔ میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔“ وہ فارمل انداز میں جملے بول رہا تھا۔ نور محمد پہلی

ہی سہی مگر واپس آتے ضرور تھے۔ ان کا دل چاہا کہ وہ سب کے لیے اچھے سے کھانے کا اہتمام کریں۔ انہوں نے جہ نماز کو تہ کر کے اس کی جگہ پر رکھا، پھر سیڑھیاں اتر کر پگن میں آگئے۔ اب مارکیٹ جانے کا وقت نہیں تھا کہ وہ کچھ لاپاتے، سو فریج میں جو بھی انہیں میسر تھا، انہوں نے اسے کاؤنٹر پر نکال کر رکھنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ سبزیاں تھیں۔ سفید چنے کاٹن موجود تھا۔ پنیر کے کیوبز تھے۔ سینڈویچ بریڈ بھی موجود تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا پکایا جائے۔ ان کے تینوں روم میٹ بلا کے خوش خوزاک تھے اور چکن مٹن کے دلدادہ بھی۔

ان کے لیے صرف سبزیاں پکانا انہیں سزا دینے کے مترادف تھا۔ انہوں نے کچھ دیر سوچ بچار کے بعد کارڈف لیس اٹھایا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ زین العابدین کو فون کر کے اس کی واپسی کا وقت پوچھ لیتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ آتے ہوئے ترکش قصاب سے حلال چکن لیتا آئے۔ وہ ابھی اس کا سیل نمبر ملا ہی رہے تھے کہ داخلی دروازے کا ففل کھلنے کی آواز آئی۔ انہوں نے گردن لمبی کر کے دروازے کی سمت دیکھا تھا۔

”لمبی عمر ہے آپ کی۔ میں آپ کو ہی فون کرنے والا تھا۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ زین العابدین اندر آ گیا تھا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے سینے پر ہاتھ رکھ کر انہیں سلام کیا تھا، پھر ہال میں پڑے کاؤچ پر گر گیا۔

”سن کر خوشی ہوئی کہ آپ مجھے یاد کر رہے تھے برادر۔ میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔“ وہ وہیں نیم دراز بولا تھا۔ نور محمد نے فون کو اس کی جگہ پر رکھ دیا تھا۔

”میں ڈنر تیار کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بہت دن ہوئے آپ لوگوں نے میرے ہاتھ کا کھانا نہیں کھایا۔ آپ کچھ مشورہ دیں، میں کیا بناؤں۔ میرے پاس یہ سبزیاں ہیں اور پنیر۔ پنیر ہے اور کچھ بریڈ سلانڈز بھی۔“ وہ اپنے دھیان میں مگن بول

بار مسکرائے۔ ”میں امید کرتا ہوں کہ جو آپ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہو۔“ ان کی بات پر زین نے ان کو بغور دیکھا، مگر منہ سے کچھ نہیں بولا تھا۔ وہ پہلے بھی ایک دوسرے کو کم ہی کریدتے تھے۔ ان دونوں نے خاموشی سے کافی ختم کی تھی۔ نور محمد اس کو خالی مگ میز پر رکھتا دیکھ کر اٹھے تھے پھر انہوں نے اپنی پاکٹ سے کچھ نکالا تھا۔

”آپ اتنے باخبر رہے تو آپ نے مجھے روکا کیوں نہیں۔“ تعمور کے لیے یہ سوال اہم تھا۔ ”میں چاہتا تھا کہ آپ جو کام کرنے آئے ہیں۔۔۔ اسے پوری ایمان داری سے کھلی آنکھوں اور ہوش مندی کے ساتھ انجام دیں۔ ہمارے راستے بے شک الگ ہوں، لیکن ہمارا مقصد ایک ہی تھا۔ میں بھی یہاں کچھ عرصہ پہلے اپنے اندر اٹھنے والے سوالات کا جواب ڈھونڈنے آیا تھا اور آپ بھی یہ ہی کرنے آئے تھے۔۔۔ مجھے کسی نے نہیں روکا تھا تو میرا بھی یہ فرض بنتا تھا کہ میں آپ کی معاونت کروں۔۔۔ وہ تعمور کے سامنے بیٹھ کر اسے بتانے لگے تھے۔

”شکریہ۔۔۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا سب۔ آپ اسلام کی اصل شکل سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ آپ ریڈیکلائزڈ ہو گئے ہیں۔۔۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ کی نیت غلط ہے، لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ آپ کا طریقہ درست نہیں ہے۔ آپ ”دین“ کو سمجھ نہیں پائے۔“ تاسف اس کے ہر لفظ سے ٹپکتا نظر آیا۔

”تعمور! اس کا فیصلہ اتنی عجلت میں مت کیجئے۔ آپ نے میرے ناول کا نام سنا ہے۔ اسے پڑھا نہیں ہے۔ ایک دفعہ اسے پڑھ کر دیکھ لیجئے۔ یہ کبھی سی ڈیو اٹس میرے تجربے کا نچوڑ ہے تعمور۔۔۔ یہ عہد الست ہے۔ آپ اگر واقعی میرے تجربے کے معترف ہیں تو آپ اس کے ایک ایک لفظ کا اعتراف بھی کریں گے۔ اس میں وہ سب مواد ہے جو میں اب تک اس موضوع پر جمع کرتا رہا ہوں۔۔۔ میں چاہتا ہوں آپ اسے اپنے ہمراہ لے جائیں اور فرصت سے اس کی جانچ کریں۔“

”یہ میری طرف سے آپ کے لیے ایک ہدیہ ہے۔“ انہوں نے زین کا ہاتھ پکڑ کر اسے کچھ دکھایا تھا۔ اس نے حیرانی سے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیا ہے؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ نور محمد نے اس کے ہاتھ پر ایک یو ایس بی ڈرائیو رکھ دی تھی۔

”یہ وہی چیز ہے جس نے آپ کو میرے جیسے خشک انسان کے ساتھ اتنا عرصہ باندھے رکھا“ تعمور نصار۔ ”وہ سادہ سے انداز میں اس کا مکمل نام لے کر بولے تھے۔ زین نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھا، اسے اپنی حیرانی چھپانے میں چند لمحے لگے تھے، لیکن بہر حال وہ بھی ایک کائیاں آدمی تھا۔ اس لیے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ نور محمد بھی اس کے اصل کو پاسکیں گے۔ نور محمد نے دل ہی دل میں سلمان کا شکریہ ادا کیا۔ جس نے انہیں عوف بن سلمان کے ساتھ کام کرنے والے لوگوں کی ایک لسٹ بھیجی تھی، اس لسٹ میں ہی انہیں تعمور نصار کی تصویر اور نام وغیرہ دیکھنے کو ملے تھے۔ اسی لیے وہ زین العابدین کی حقیقت پہلے سے جانتے تھے۔

”آپ جانتے تھے مجھے۔ یعنی میں خود کو بلاوجہ ایک اچھا اداکار سمجھتا رہا۔“ اس نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی تھی۔

”آپ ایک اچھے اداکار ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے تعمور۔ آپ بس ابھی نا تجربہ کار ہیں۔۔۔ اس لیے آپ نے میرے سفید بالوں کا ذمہ دار دھوپ کو سمجھ لیا۔۔۔ حالانکہ میرا دعوا ہے یہ تجربے کی دین ہیں۔“ نور محمد اسی کے انداز میں مسکرائے تھے۔

”بے شک۔۔۔ بے شک۔۔۔ میں مانتا ہوں آپ بے

تعمور نے ان کی بات پر ہاتھ پر رکھی ڈیوائس دیکھی پھر وہ مسکرایا۔ اس نے وہ ڈیوائس دوبارہ نور محمد کی ہتھیلی پر رکھ دی۔

”یقین کیجئے سر!“ میں آپ کی دل سے عزت کرتا ہوں، لیکن پروفیشنل معاملات میں نے ہمیشہ دماغ سے نپٹائے اور سلجھائے ہیں۔ یہ آپ اپنے پاس رکھیں۔ میں آپ کے پاس جس کام کے لیے آیا تھا۔ وہ کام میں بخوبی کرچکا ہوں۔ مجھے اس ”عہد الست“ کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے لیے آپ کے نظریات ریڈیکل تھے اور ریڈیکل ہی رہیں گے۔ ایسے نظریات دنیا کے لیے آؤٹ ڈیٹڈ ہو چکے ہیں۔ دنیا انہیں وائرس سمجھتی ہے۔ آپ بھی جیت کا خیال ترک کر دیجئے۔

وہ اب بالکل مختلف انسان کے روپ میں ڈھل کر ان کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک ایسا انسان جو شاطر تھا، ذہین تھا، کائیاں تھا، اس کے جملے میں ذومعنی اشارہ تھا۔ ”اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ آپ میرے مقابل ہیں۔ میں اپنی جیت کا دعویٰ نہیں کرتا۔ لیکن ایک بات یاد رکھیے گا، میں مرتے دم تک آپ کو بھی جیتنے نہیں دوں گا۔ لیکن میں ابھی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ آپ سفر کے لیے نکل رہے ہیں۔ آپ کو پریشان کر کے میں بھی پریشان رہوں گا۔“ نور محمد نے تجھی واقعی بال دھوپ میں سفید نہیں کیے تھے انہیں انسانوں کے ساتھ اپنے معاملات نپٹانے آتے تھے۔

”وقت فیصلہ کرچکا ہے سر۔ آپ یہ بازی ہار چکے ہیں۔ اب آپ کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہا۔ آپ جس شخص کی خاطر اتنا تردد کر رہے ہیں۔ وہ دنیا کے لیے ہی نہیں، اس کے خاندان والوں کے لیے بھی قابل قبول نہیں رہا۔ ایک دہشت گرد کی ضرورت کسی کو نہیں ہوتی۔ ایسے شخص کو دنیا بعد میں دھتکارتی ہے۔ گھر والے پہلے دھتکار کر دروازے بند کر لیتے ہیں۔ نور محمد کے لیے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اس لیے آپ اب اس ناول کو رومی کے بھاؤ بیچ ڈالیں۔ مجھے افسوس ہے آپ کی محنت ضائع ہونے پر۔“

اس کے لہجے میں اتنی استقامت تھی کہ نور محمد چپ رہ گئے تھے۔



”مجھے تم سے بات کرنی ہے عمر!“

شہروز نے تین روز بعد عمر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ماحول پر چھایا بدگمانی کا غبار کافی حد تک چھٹ چکا تھا۔ ان میں سے کسی کے درمیان بھی دوبارہ کوئی بحث نہیں ہوئی تھی۔ عمر بھی کافی پرسکون دکھتا تھا اور روٹین کے مطابق امامہ اور وہ ڈنر کرنے چاچو کے گھر پر ہی آرہے تھے۔ چاچو نے بھی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی اور چچی بھی امامہ کے پہلے کی طرح لاڈ اٹھا رہی تھیں اور اس کا خیال رکھ رہی تھیں۔ شہروز کی واپسی کے دن قریب تھے۔ اسے ایک ہفتے کے لیے آئرلینڈ بھی جانا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عمر سے حتمی بات کرنا ضروری ہے۔ اس کی ضدی طبیعت سے بخوبی واقف تھا وہ اور اسے اندازہ تھا کہ عمر کی خاموشی طوفان سے پہلے کی خاموشی ہے۔ وہ عمر کو ایک بچکانہ اور خطرناک قدم اٹھانے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہتا تھا۔

”کر لو بات۔۔۔ اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔“

عمر کو بھی جیسے اندازہ تھا کہ شہروز ایسے آسانی سے جان نہیں چھوڑے گا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ ڈنر کے بعد می اور ابو سنگ ہال میں بیٹھ کر عمر کی شادی کی مووی دیکھ رہے تھے۔ امامہ بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئی، جبکہ وہ دونوں بیڈروم میں آگئے تھے۔

”پہلے وعدہ کرو۔۔۔ جذباتی نہیں ہو گے۔“ شہروز نے اس کے خوش گوار مزاج کو دیکھتے ہوئے پہلے ہی شرط عائد کی تھی۔ وہ اس کے سامنے بیڈ کے قریب پڑے کاؤچ پر بیٹھ گیا تھا۔

”میں وعدہ نہیں کر سکتا۔ نہ جانے تم کیا بات کرنے والے ہو۔۔۔ کس کے متعلق کرنے والے ہو۔“ اس نے بھی اسی کے انداز میں جتا دیا تھا۔

”مجھے امامہ کے بھائی کے متعلق بات کرنی ہے

”تمہیں پتا ہے یہاں عورت کا سر ڈھلنا بھی ریڈیکلائزیشن میں شامل ہو گیا ہے۔ آفس اوقات میں گرل فرینڈ کو بیس منٹ کی کال کرنے پر کوئی نہیں ٹوکتا، لیکن نماز پڑھنے کے لیے دس منٹ کا بریک نہیں دے سکتے اور کچھ علاقوں میں مسلمان روزہ نہیں رکھ سکتے، کیونکہ باقی آبادی کے لیے وہ ریڈیکلائزیشن ہو جاتی ہے۔ واٹر ہی فیشن کے طور پر رکھ لو تو کوئی بات نہیں۔۔۔ اسے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام دینا ریڈیکلائزیشن ہے۔ آپ ویجی ٹیرین ہیں تو آپ پورک کو ناپسندیدہ قرار دے سکتے ہیں، لیکن اگر آپ مسلمان ہیں تو آپ اسے ”حرام“ نہیں کہہ سکتے۔ آپ اور گھینک چکن مانگ سکتے ہیں، لیکن اگر آپ یہ کہیں گے کہ آپ کو ”حلال“ چکن چاہیے تو آپ فنڈ امینٹلسٹ ”بنیاد پرست“ ہیں۔ اس دنیا کے دہرے معیار ہیں یہ سب اور کچھ نہیں اور خدارا کوئی بھی نئی ٹرم جب مسلمان کے لیے استعمال کی جانے لگتی ہے تو اس کے بارے میں احتجاج نہیں بھی کر سکتے تو نہ کرو، لیکن اسے استعمال بھی تو مت کرو، حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ یہ صرف یہاں نہیں ہو رہا، بلکہ پاکستان میں بھی ہو رہا ہے۔ وہاں یہاں سے بھی زیادہ فنڈ امینٹلسٹ (بنیاد پرست) کی گردان ہو رہی ہے۔ لوگ ہر دوسرے مذہبی شخص کو ریڈیکل قرار دینے پر تل گئے ہیں۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا تھا۔ شہروز نے گہری سانس بھری۔

”تم اتنے جذباتی کیوں ہو جاتے ہو۔ کبھی تو تحمل سے بات سن لیا کرو۔“ شہروز نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ بالآخر اسے وہ عمر نظر آ گیا تھا جو کہیں کھو گیا تھا۔ وہی جذباتیت، وہی ضد، وہی اندھا جوش۔

”یہ دیکھو میرے ہاتھ۔۔۔ جوڑتا ہوں میں تم سب کے آگے۔ تم لوگ مل جل کر میرے ماتھے پر لکھو اور کہ میں جذباتی ہوں۔ میں تو آج تک اس لفظ کا مطلب نہیں سمجھ پایا۔۔۔ اور یہ تو بالکل نہیں سمجھ پایا کہ مجھے یہ ٹائٹل دیا کیوں گیا ہے۔ میرا سچ بولنا جذباتیت

عمر! اس نے کہا۔“ واقعی۔۔۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ امامتہ کا کوئی بھائی ہے۔ اس بات کا یقین تو خود امامتہ صاحبہ کو بھی نہیں رہا۔ اب۔۔۔ وہ عام سے انداز میں بات کر رہا تھا، لیکن یہ ایک بھاری بھر کم طنز تھا۔ شہروز نے تحمل کا مظاہرہ کیا۔ یہ ان دونوں کی عادت تھی جب ایک طنزیہ انداز اپناتا تھا تو دوسرا تحمل سے کام لیا کرتا تھا۔

”میں نور محمد کی بات کر رہا ہوں عمر!“

”اچھا تو یوں کہو نا کہ تم ایک پاکستانی دہشت گرد کی بات کرنا چاہتے ہو۔۔۔ کر لو بھائی۔۔۔ اجازت ہے۔“ یہ دوسرا بھاری بھر کم طنز تھا۔ شہروز نے بمشکل اپنی خفگی کو ظاہر ہونے سے روکا۔

”تم کچھ بھی کہو۔ کسی بھی انداز سے کہو عمر! لیکن یہ ہی حقیقت ہے کہ نور محمد ایک دہشت گرد ہے۔۔۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس نے قتل کیے ہوں گے یا وہ دھماکوں وغیرہ میں ملوث ہوگا، لیکن وہ ان عناصر کے ساتھ رہا ہے جن کے مقاصد نہ صرف عالمی امن کے لیے خطرہ بلکہ اسلامی ممالک کے لیے بھی ناپسندیدہ ہیں۔۔۔ یہ لوگ ریڈیکلائزڈ سوچ رکھتے ہیں۔ ان کی فنڈ امینٹلسٹ (بنیاد پرست) سوچیں اسلامی اقدار کے منافی ہیں۔ یہ نا صرف اپنے اپنے ملک کی بدنامی کا باعث ہیں، بلکہ یہ اسلام کے اصولوں کے بھی خلاف چل رہے ہیں۔“ شہروز نے اپنی بات کی کھل کر وضاحت کی تھی۔

”مجھے تمہارے منہ سے یہ الفاظ سن کر دکھ ہو رہا ہے شہروز۔ فنڈ امینٹلزم کسے کہتے ہو تم۔۔۔؟ یہ ریڈیکلائزڈ سوچ کیا ہے؟“ وہ اسے تک رہا تھا۔ شہروز کو اس سے بحث برائے بحث نہیں کرنی تھی۔ اسے دل ہی دل میں عمر کے انداز سے چڑھونی تھی۔

”یہ ہی مسلمانوں کی بلا وجہ کی تنگ نظری، چھوٹی چھوٹی باتوں میں مذہب کی بلا وجہ کی مداخلت۔۔۔ اور کیا؟“ وہ ناک چڑھا کر بولا۔

”چھوٹی چھوٹی باتیں۔۔۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں لگتی ہیں تمہیں؟“ عمر کو حیرانی ہوئی تھی۔

لگتا ہے تم لوگوں کو۔ میرا حق کا ساتھ دینا جذباتیت لگتا ہے یا پھر غلط کو غلط کہنے کو جذباتیت کہتے ہو آپ لوگ۔ وہ تپا ہوا بول رہا تھا۔ ”دیکھا پھر ہو گئے جذباتی۔ بات تو سن لو میری۔ مجھے کچھ کہنے کا موقع تو ہے۔“ شہوز خلاف ضرورت اور توقع کافی تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”عمریات یہ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اسلام کی اصل شکل ہم سب نے مل جل کر مسخ کر دی ہے، ہم نے دنیا کو یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہم جنگجو ہیں۔ ہم تنگ نظر ہیں۔ ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں نہ باقی دنیا کو ترقی کرتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم مسجدیں بنا بنا کر ہلکان ہوئے جا رہے ہیں۔ فرقہ بنانا، فرقہ مٹانا ہمارا قومی کھیل بن چکا ہے۔ ہم اپنے ملک کی پچھن فیصد آبادی کو اسلام کے نام پر محصور کر کے اپنی کامیابی اور ترقی کا راستہ روک رہے ہیں۔ ہم عورتوں کو تعلیم نہ دلو اگر مذہب کے نام پر بلیک میل ہو رہے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ ہم باقی دنیا سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ ریڈیکلائزیشن چاٹ گئی ہے میرے ملک کو۔ ملائیت نے میرے ملک کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ طالبانائزیشن نے گھس کر رکھ دیا ہے اسے۔ مذہب کھا گیا ہے میرے پاکستان کو۔“ شہوز کے چہرے پر پاکستان کے لیے پریشانی چھلک رہی تھی جسے دیکھ کر عمر کو مزید تاؤ چڑھا۔

”مذہب نے نہیں کھلایا پاکستان کو۔ پاکستانیوں نے خود ہی کھلایا ہے پاکستان کو۔ ہر ادارہ اس میں شامل ہے۔ ملا سیاست دان، فوجی، بزنس مین۔ بیورو کریٹ۔ صرف مذہب کو الزام کیوں دیتے رہتے ہو تم لوگ۔ تم لوگوں نے خود مذہب کا دلیم بنا کر اسے چوراہے میں رکھ دیا ہے۔ سب مل جل کر اسی میں مسالا شامل کرتے جا رہے ہیں۔ جس کا بس چلتا ہے وہ مذہب کی نئی شکل بنا کر خود کو اسلام کا پیروکار ثابت کرنے پر مل جاتا ہے۔ ایک شخص کہیں سے بھی اٹھ کر آتا ہے اور اگر مذہب کے نام پر سب لوگوں کو بلیک میل کرنے لگتا ہے۔ باقی سب بھینٹیں بنے اس کے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ جو بتا رہے

ہو کہہ رہے ہو، قرآن و حدیث میں کہاں درج ہے اپنی اپنی آسانی کی خاطر سب نے مل جل کر ایک آسان ترین مذہب کو ایسی شکل دے دی ہے کہ باقی دنیا اسے ”ریڈیکلائزیشن“ کہنے لگی ہے اور اندھے لوگے، لنگڑے لوگ بھی مان چکے ہیں کہ ہاں اسلام تنگ نظری کا دوسرا نام ہے۔ اب یہ مت کہنا کہ مذہب کھا گیا اس ملک کو۔ اندھی تقلید کھا گئی ہے اس ملک کو شہونہ۔ یہ ہی سوچ تو بد لینی ہے۔ اندھی تقلید سے ہی تو نکالنا چاہتے ہیں، ہم۔ یہی تو سمجھانا چاہتے ہیں قوم کو کہ اسلام کی چودہ سو سال پہلے کی رائج چیزوں کو اکیسویں صدی میں رائج کریں گے تو ترقی کی راہ پر کبھی گامزن نہیں ہو سکیں گے۔ اسلام وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھلنے کی ضرورت قرار دیتا ہے اور تنگ نظری سے نکلنا ہماری ضرورت ہے۔ ہمیں ملائیت سے نکلنے کی ضرورت ہے۔ اس ملک کو انوسٹمنٹ چاہیے، کاروبار چاہیے، آزادی چاہیے؟“ وہ حتمی انداز میں بولا تھا۔

”یہ سب کچھ جو اس ملک کو چاہیے۔ کیا یہ سب اسلام کے دائرے سے نکل کر ملے گا؟“ عمر نے سابقہ انداز میں سوال کیا تھا۔

”دائرے سے نکلنے کو کون کم بخت کہہ رہا ہے۔ میں بھی الحمد للہ مسلمان ہوں اور اسلام کے دائرے سے نکلنے کا تو مر کر بھی نہیں سوچ سکتا۔“ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اسلام کو بدلنا ہو گا۔ پرانی دقتیا نو سیت سے جان چھڑوانی ہوگی۔ ریڈیکلائزیشن کا طوق گلے سے اتارنا ہو گا۔ اسلام کو ختم نہیں کرنا۔ اسے ٹھیک کرنا ہے۔“ شہوز اس کے انداز سے زچ ہو کر بولا۔

”یہ عجیب بات ہے۔ سب مسلمان مل کر اسلام کو ٹھیک کرنا چاہتے ہیں۔ مسلمان خود ٹھیک نہیں ہونا چاہتے۔“ عمر نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بہت سادہ سے انداز میں کہا تھا۔ اسے شہوز کی آخری باتوں سے بہت دکھ پہنچا تھا۔ شہوز اس کے سوال پر لمحہ بھر کے لیے چپ رہ گیا تھا، پھر اس نے دوبارہ سے ہمت پکڑی تھی۔

کون

ماہنامہ کون
جولائی 2015 کا شمارہ شائع ہو گیا

- ❖ "پہلا روزہ" شاہین رشید کا عید کے حوالے سے خصوصی سروے
- ❖ اداکار "فیروز خان" سے شاہین رشید کی ملاقات
- ❖ اداکارہ "صنم سعید" کہتی ہیں "میری بھی سنیے"
- ❖ اس ماہ "پرواکرن صدیقی" کے "مقابل ہے آئینہ"
- ❖ "رہنمزل" اس ماہ کی خصوصی پیشکش تزیلہ ریاض کا سلسلے دارناول
- ❖ "اک ساگر ہے زندگی" نسیہ سعید کے ناول کی آخری قسط
- ❖ "ردائے وفا" فرحین انظر کا سلسلے دارناول
- ❖ "میں گمان نہیں یقین ہوں" نیلا براج کا ناول
- ❖ "چاند رات" نایاب جیلانی کی عید کے لیے خوبصورت تحریر
- ❖ "شاید" قازم انصاری کا دلکش ناول
- ❖ "اعتبار کر دو کھو" یاسمین نشاط کا دلکش ناول
- ❖ "ہاری تو میں تیری" زرین آرزو کا ناول
- ❖ "خالا، سالہ اور اوپر والا" فاخرہ گل کی دلچسپ مزاحیہ تحریر کی آخری قسط
- ❖ راشدہ رفعت، صدف آصف، راجہ انصاری اور ندا حسنین کے افسانے اور مستقل سلسلے

ان شمارے کے ساتھ کون کتاب

کون کتاب

عید کے دن، کون کے سنگ

کون کے ہر شمارے کے ساتھ عید کے دن اور کون کے سنگ

"عمر! میں بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہیں صرف بتانا چاہتا ہوں کہ تم غلط ہو۔ تم نور محمد کا ساتھ دے کر غلطی کرو گے۔ وہ ایک وہشت گرد ہے۔ میرے پاس اس کے خلاف ثبوت ہیں۔ وہ واقعی گوانتا ناموے میں ہے۔ میں صرف ہوا میں تیر نہیں چلا رہا۔ میری کہی ایک ایک بات حقیقت پر مبنی ہے۔ میں بتانا تو نہیں چاہتا تھا لیکن کوئی اور چارہ بھی نہیں ہے۔ دراصل میں ایک این جی او کے ساتھ منسلک ہوں جو ایک ڈاکومنٹری پر کام کر رہی ہے۔ میں پرائیویٹلی ایک دوسرے خبر رساں ادارے کے ساتھ بھی کام کرتا ہوں۔ وہ بہت عرصے سے اس پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ اس ڈاکومنٹری کا بنیادی موضوع نور محمد اور اس جیسے لوگ ہیں جو دنیا کو ریڈیکلائزڈ کر رہے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کا نام بدنام کر رہے ہیں۔ ہماری ٹیم سب کام تقریباً مکمل کر چکی ہے۔ ہم ایک بین الاقوامی چینل کے ذریعے بہت جلد اسے آن ایر کر دیں گے۔ حقیقت سب کے سامنے آجائے گی۔ میں چاہتا ہوں تم میرا ساتھ دو عمر! اس سفید فام بوڑھے کی باتوں میں مت آؤ۔" اپنی طرف سے اس نے انکشاف کیا تھا۔

"میں کسی ادارے کے ساتھ منسلک نہیں ہوں شہروز، لیکن میرا دل کہتا ہے وہ سفید فام بوڑھا سچ کہتا ہے۔ ان کے الفاظ و انداز میں اس قدر تاثر ہے کہ میں دنگ رہ گیا ہوں۔ اللہ ایسی تاثیر کسی نیک نیت کو ہی دیا کرتے ہیں۔ ان کی نیت نیک ہے۔ وہ دین کو ہم سے بہتر سمجھ چکے ہیں۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہے۔ ان کے پاس بھی ثبوت ہیں۔ تم ڈاکومنٹری بنا رہے ہو جبکہ وہ ناول لکھ رہے ہیں۔ تم ایک دفعہ دوبارہ ان سے ملو۔ تم میری بات سے اتفاق کرو گے شہروز۔"

وہ اسے آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شہروز کو دل ہی دل میں بہت افسوس ہوا۔

"تم غلط کر رہے ہو عمر۔ تم جسے فرشتہ سمجھ رہے ہو۔ نہ وہ شخص بہرہیے سے بڑھ کر نہیں۔ یہ ناول جس کا وہ راگ الاپ رہے ہیں۔ یہ ناول انہوں نے یو پی ایل کی خطیر فنڈنگ سے لکھنا شروع کیا تھا۔ یو پی ایل

وہ تنظیم ہے جسے آج کی دنیا ای ڈی ایل کہتی ہے۔ تمہیں یہ باتیں جو آج پتا چل رہی ہیں نا۔ میں یہ باتیں بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ مجھے تو یہ شک بھی ہے کہ وہ بندہ مسلمان ہوا ہی نہیں ہے۔ وہ تمہیں مجھے اور ہم سب کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ ان کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔“ اسے عمر پر غصہ آ رہا تھا اور اب کی بار وہ اپنے کبجے کی خفگی کو چھپانا نہیں چاہتا تھا۔

”ان کے ارادے اچھے نہیں ہیں اور تمہاری نیت اچھی نہیں ہے۔“ عمر نے چڑکراتا ہی کہا تھا کہ شہروز نے اس کی بات کٹ دی۔

”ٹھیک ہے۔ تمہاری مرضی۔ میں اب تمہیں نہیں روکوں گا۔ لیکن ایک بات حتمی ہے آج سے تمہارا راستہ الگ اور میرا راستہ الگ۔“ اس نے بالآخر اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ عمر چند لمحے اس کے سپاٹ انداز پر غور کرتا رہا پھر اس نے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ سجائی تھی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”منظور ہے۔“ اس نے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا اسے دکھاتے ہوئے کہا تھا۔ ان کی باہمی محبت ان کے انفرادی مقاصد میں تقسیم ہو گئی تھی۔ وہ جدا جدا ہو رہے تھے۔ تفرقہ پھیلنے لگا تھا یا شاید بہت پہلے پھیل چکا تھا۔



”نور محمد کا پتا چل گیا ہے۔“ رافعہ بیگم نے اس سادہ سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے اپنے سامنے بیٹھے دو نفوس کو ان کی زندگی کی ایک بڑی خوش خبری دی تھی۔ مسز آفاق نے تڑپ کر ان کا چہرہ دیکھا۔ وہ اپنے سامنے بیٹھی رافعہ نامی اس خاتون سے پہلی بار مل رہی تھیں۔

”آپ میرے بیٹے کو جانتی ہیں۔ آپ مل چکی ہیں اس سے۔“ اندازے کے عین مطابق انہوں نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔ سر آفاق بھی اب مجسوس ہو کر ان کا چہرہ دیکھنے لگے تھے۔

”میں اسے جانتی ہوں نہ اس سے ملی ہوں، لیکن گزشتہ چند سالوں سے سلمان اس کا اتنا ذکر کرتا رہا ہے کہ لگتا ہے میں آپ کے بیٹے کو بہت قریب سے جانتی

”میری نیت اچھی نہیں ہے، میری۔ میں جو صرف ایک نیک مقصد کے لیے اس پروجیکٹ کے ساتھ اٹیچ ہوں۔ مجھے کیا فائدہ ہو گا اس سب سے۔ میں تو صرف دنیا کو اسلام کی ایک مثبت شکل کو دکھانا چاہتا ہوں۔ اسلام کا ایک روشن چہرہ دنیا کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔“ وہ تڑپ کر بولا تھا۔

”مثبت شکل۔ روشن چہرہ۔؟“ عمر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں۔

”تو کیا اسلام کی کوئی منفی شکل بھی ہے۔ کوئی تاریک رخ بھی ہے؟“ وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

”تم دنیا کو دکھانے سے پہلے خود کو دیکھیں دلاؤ شہروز کہ اسلام کا کوئی رخ ایسا نہیں ہے کہ جس کی وضاحت ہمیں دنیا کو اپنی پڑے۔ کوئی منفی شکل نہ کوئی تاریک چہرہ۔ اگر کوئی چیز منفی ہے تو وہ ہم مسلمان ہیں۔“ تم ہو، میں ہوں، بد لانا ہی ہے تو آؤ خود کو بدل کر دیکھتے ہیں۔ عہد الست کو سمجھ کر دیکھتے ہیں۔“ وہ اب التجائیہ انداز میں بولا تھا۔ شہروز نے اسے دیکھا پھر تاسف سے سر ہلایا۔ وہ اسے نہیں سمجھا سکتا تھا۔ وہ اسے کیسے سمجھا سکتا تھا جب وہ اسے ہی غلط قرار دے رہا تھا۔

”عمر اس میں کوئی درمیانی راستہ نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ یا اکیلے رہ جاؤ، کیونکہ امامہ اس کے والدین۔ چاچو۔ چچی کوئی تمہارا ساتھ نہیں دے گا۔ کوئی تمہاری طرح احمق نہیں ہے، پاگل پن مت کرو۔“ شہروز اسی کے انداز میں بولا تھا۔

رافعہ حیدر نے ان کی تڑپ کو محسوس کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ سلمان کے کہنے پر ان سے ملنے آئی تھیں۔ سلمان چاہتا تھا کہ اس سے پہلے سب معاملات ناول کے ذریعے پبلک تک پہنچیں۔ یہ بہت ضروری ہے کہ نور محمد کے گھر والے ان سب باتوں سے آگاہ ہوں۔ اسی لیے وہ یہاں موجود تھیں۔

”بات اس سے بھی زیادہ بڑی ہے سر۔ وہ زندہ ہے لیکن۔۔۔“ سلمان نے کہا پھر رک کر ان کا چہرہ دیکھا۔

”وہ گوانتانامو بے میں ہے سر۔“ اس نے بطور خاص مسز آفاق کا چہرہ بھی دیکھا تھا۔

”کہاں۔۔۔ گوانتانامو بے لیکن کیوں وہاں تو۔۔۔ وہاں تو۔۔۔ دہشت گرد رکھے جاتے ہیں۔ میرے معصوم بیٹے نے کیا گاڑا ہے کسی کا۔“ بات واقعی بیٹے کی مرگ سے بڑی تھی۔

”میں آپ کو تمام باتیں تفصیل سے بتاتا ہوں سر۔۔۔ یہ سازش بہت پہلے شروع ہوئی تھی جب نور محمد کے ماموں نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اپلائی کیا تھا۔۔۔“

سلمان نے کہنا شروع کیا تھا۔ وہاں سے جہاں سے یہ ساری سازش شروع ہوئی تھی۔ نور محمد کے چاہنے والے اسے ستانے والے۔۔۔ وہ ہر شخص کا تذکرہ کرتا رہا۔۔۔ صوفی سیف اللہ، استقلال بیگ، بل گرانٹ۔۔۔ وہ دونوں میاں بیوی تمام تر سماعتیں اس کی جانب مبذول کیے ایک ایک لفظ کو بغور سن رہے تھے۔

”2007ء میں وہ پولیس کی جانب سے مقتول قرار دیا گیا تھا، میں یہ بات جانتا تھا، لیکن میں نے جب آپ

”میرا بیٹا کہاں ہے؟“ آفاق صاحب نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے دوسرا سوال کیا تھا۔ نور محمد کا ذکر انہیں ہمیشہ لاچار کر دیا کرتا تھا۔ اتنے سال گزر چکے تھے اور اتنے سالوں میں ان کی امید روزمرتی تھی روز جیتی تھی۔ امائمہ کی شادی کے بعد سے تو وہ بیٹے کے غم سے مزید بے حال رہنے لگے تھے۔ دل کو چھتاوے ہی ستاتے رہتے تھے کہ انہوں نے اولاد کی قدر نہیں کی۔ ان کے اندر اب یہ آس دم توڑنے لگی تھی کہ وہ کبھی اپنی پہلو تھی کی اولاد سے مل پائیں گے۔ چند سال پہلے ملنے والے کارڈز کے علاوہ اس کی جانب سے کوئی رابطہ نہیں کیا گیا تھا۔ وہ تو اس حد تک مشکوک رہتے تھے کہ یہ کارڈز بھی نجانے اس نے خود بھیجے تھے بھی یا نہیں۔

”سر! آپ پلیز حوصلے سے کام لیجیے گا۔۔۔ خبر کچھ اچھی نہیں ہے۔“ یہ سلمان نے کہا تھا۔

”آپ حوصلے کی بات مت کیجیے بیٹا۔۔۔ پہاڑ جتنا حوصلہ ہے میرا۔۔۔ اعصاب ہچکولے کھا کھا کر اب اتنے پتھر دل ہو چکے ہیں کہ بڑی سے بڑی خبر سن بھی سکتے ہیں اور مسہمہ بھی سکتے ہیں۔“ یہ مسز آفاق نے کہا تھا۔ ان کا چہرہ اس لمحے اتنا سپاٹ تھا کہ رافعہ حیدر کو ان پر ترس آیا۔ وہ حوصلہ مندی سے سفاک نہیں نظر آتی تھیں۔ انہیں تھکن نے اس حال تک پہنچایا تھا۔

”آپ ہمیں ایسے مت دیکھیں۔ ہم ٹھیک ہیں۔۔۔ کچھ نہیں ہو گا ہمیں۔۔۔ ہم اب اس حال کو پہنچ چکے ہیں کہ کوئی اس کے مرنے کی خبر بھی دے گا تو ہم یہ سوچ کر مطمئن ہو جائیں گے کہ وہ اللہ کے پاس ہے۔ اللہ اسے مجھ سے زیادہ لاڈ اور توقیر سے رکھ رہا ہو گا۔ اللہ کے یہاں تو اس کی قدر ہو رہی ہو گی نا!“ سر آفاق

تمہاری اپنی لکھی کہانی

فرحت اشتیاق

قیمت - 300 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32735021

سب آپ کے ساتھ ہیں لیکن۔۔۔ اس نے ان دونوں کا چہرہ دیکھتے ہوئے توقف کیا یہ اپنی جانب سے انہیں حوصلہ دینے کی ایک ادنیٰ سی کوشش تھی۔ وہ دونوں ساری گفتگو سننے کے دوران ایک بار بھی رنجیدہ نہیں ہوئے تھے۔

www.paksociety.com

”اب آپ کو نور محمد کو قبول کرنے کی زیادہ بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔۔۔ لوگ بہت سوال کریں گے۔۔۔ انگلیاں پہلے سے زیادہ اٹھیں گی۔۔۔ بہتان پہلے سے زیادہ لگیں گے اور ہمت پہلے سے زیادہ درکار ہوگی۔۔۔ یہ آسان جنگ نہیں ہوگی“ رافعہ حیدر نے سلمان کی نامکمل بات کو مکمل کیا تھا۔ سر آفاق نے اپنی اہلیہ کی سمت دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں وہ حوصلہ چمکنے لگا تھا جسے دیکھنے کی سلمان اور اس کی والدہ کو امید دی تھی۔ وہ کچھ بولنا بھی چاہتے تھے لیکن ان کی اہلیہ ان سے بھی پہلے بول اٹھی تھیں۔

”میں نے جب اپنے بیٹے کو کھویا تھا اس دن سے میں صرف ایک بات کے لیے پچھتا رہی ہوں کہ میں نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اس پر بھروسا نہیں کیا۔۔۔ اس کا خیال تو رکھا۔۔۔ اسے محبت تو دی لیکن محبت کا مان نہیں دیا۔ ممتا کی طاقت نہیں بخشی یہ میری سنگین غلطی ہے جو مجھے نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں اب کوئی غلطی نہیں دوہراؤں گی۔ اب ساری دنیا ایک طرف ہو کر بھی کہے تاکہ میرا بیٹا ایسا ہے ویسا ہے۔ میں نہیں مانوں گی۔ میں کبھی نہیں مانوں گی۔“ رافعہ حیدر اپنی جگہ سے اٹھی تھیں اور انہوں نے مسز آفاق کو اپنے کندھے کے ساتھ لگایا تھا۔

”ہم بھی نہیں مانیں گے۔ ہم وہشت گرد نہیں ہیں نہ ہی ہمارے بیٹے اتنے سستے ہیں کہ وہشت گردی کے نام پر قربان ہوتے چلے جائیں۔“ سلمان نے اپنی امی کو دیکھا۔ وہ مسکرایا تھا۔ وہ بھی مسکرا رہی تھیں۔ ہاتھ سے ہاتھ مل رہا تھا۔ قدم سے قدم مل رہا تھا۔ منزل دور تھی لیکن راستہ نظر آنے لگا تھا۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

کو بتانے کی ہمت کی تب ہی آپ نے مجھے وہ پوسٹ کارڈ دکھادیے۔ جب آپ کو وہ پوسٹ کارڈ ملے تھے تب ہی میں حیران ہو گیا تھا کیونکہ میں نے خود اس فیونرل میں شرکت کی تھی جو نور محمد کے لیے پڑھایا گیا تھا۔ یہ ایک بے حد انوکھی بات تھی سر۔۔۔ آپ کو لوٹن سے کارڈ بھیجے گئے تھے پھر جب میں نے لوٹن کال کی اور نور محمد عرف بل گرانتھ سے بات کی تو انہوں نے بتایا کہ ان کو بھی کچھ کارڈ ملے ہیں جو پاکستان سے بھیجے گئے تھے۔ ابھی یہ ہی الجھن نہیں سلجھی تھی کہ میرے ایک مہربان۔۔۔ مہر اظہر نے مجھے کچھ تصاویر دکھائیں۔ یہ تصاویر ایک ڈاکیومنٹری کے اسکرین شوٹس تھے جس میں نور محمد کچھ قیدیوں کے ہمراہ زرد لباس پہنے نظر آ رہا تھا۔ ہم سب کو گمراہ کیا جا رہا تھا کہ ہم کنفیوز ہو جائیں

وہ سب کچھ بتا چکا تھا لیکن بہت کچھ ابھی بھی باقی تھا۔ ”سر! سازش اتنی بڑی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں ختم ہوئی۔۔۔ کون خیر خواہ ہے اور کون بد خواہ۔ آپ یقین کیجئے میں بہت سی چیزوں سے واقف ہوں لیکن میرا خود کا دماغ گھوم جاتا ہے جب کیا، کب، کیسے، کہاں، کس طرح والے سب سوال اٹھتے ہیں۔ بہت سے لوگ ہیں جو ایسی سازشوں کا شکار ہوئے ہیں۔ نور محمد ان میں سے ایک ہے۔۔۔ بہر حال ایک بات طے ہے وہ المہاجروں کے نام پر بدنام کیا گیا جبکہ اس کا کوئی تعلق اس تنظیم کے ساتھ تھا ہی نہیں۔ اس کی بے گناہی کے ثبوت بھی موجود ہیں۔۔۔ وہ لوٹن کی ایک جامع مسجد میں بے ضرر زندگی گزارتا رہا ہے۔ اس کی گواہی خود بل گرانتھ صاحب دیں گے جو اس کے ساتھ رہے ہیں اور اس کی نیک خصلت کی تعریف کرتے ہیں اور ان کا ناول ”عہد الست“ نور محمد کی زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ ہمارے پاس بہت سے حقائق ہیں۔ ثبوت ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ بہت حوصلہ مند ہیں اور یہ حوصلے کا ہی امتحان ہے۔ یہ اگر جنگ ہے تو مجھیں اپنے آخری مراحل میں ہے سر۔ اس جنگ میں ہم

گزارش،

لفظوں سے مت کھیلو جاناں
جاناں!

لفظوں سے مت کھیلو
لفظ ہیں گونگے، لفظ ہیں بہرے
اندر پتیل، رنگ سہرے
لفظ تو پھر الفاظ ہی ٹھہرے
لاکھوں ہی اوراق پہ ہردن
کتنے لفظ لکھے جاتے ہیں
لیکن کس کے کام آتے ہیں
ویسے تمہارے اپنے قلم سے
لکھے ہوئے الفاظ حسین ہیں
لیکن سچے درد کے رشتے
لفظوں کے محتاج نہیں ہیں!

اعتبار ساجد

غنیچہ دید کھلے، عید کے روز
کون فرقت کو ہے عید کے روز

وہ جو روٹھا ہوا ہے مدت سے
کاش وہ آن ملے عید کے روز

جھوٹی مسکان کے پس پردہ
اشک چپ چاپ ہے عید کے روز

میں نے کچھ خواب سے بُن رکھی ہیں
وہ ملاقات کرے عید کے روز

پابہ زنجیر دو دھڑکتے دل
کتنے بے حال رہے عید کے روز

منت شوق، رائیگاں ہی گئی
جلنے والے نہ رُکے عید کے روز

خالد معین

دلِ آباد کا برباد ہونا بھی ضروری ہے
جسے پانا ضروری ہے، اسے کھونا ضروری ہے

مکمل کس طرح ہوگا تماشا برق و باران کا
تراہننا ضروری ہے، مراد و نا ضروری ہے

بہت سی سُرخ آنکھیں شہر میں اچھی نہیں لگتیں
ترے جاگے ہوؤں کا دیر تک سونا ضروری ہے

کسی کی یاد سے اس عمر میں دل کی ملاقاتیں
مٹھرتی شام میں ایک دھوپ کا کونا ضروری ہے

یہ خود سر وقت لے جانے کہانی کو کہاں جلانے
مصنف کا کسی کردار میں ہونا ضروری ہے

جناب دل بہت نازاں نہ ہوں داغِ عجت ہے
یہ دنیا ہے یہاں یہ داغ بھی دھونا ضروری ہے

شعیب بن عزیز

www.paksociety.com

اداجعفری

ہر اک درپچہ کن کرن ہے جہاں سے گزرے بدھر گئے ہیں
ہم اک دیا آرزو کالے کز بطرہ شمس و قمر گئے ہیں

جو میری پلکوں سے تم نہ پلٹے وہ شبینیں مہرباں اُجالے
تمہاری آنکھوں میں آگئے تو تمام رستے نکھر گئے ہیں

وہ دُور کب تھا حریمِ جاں سے کہ لفظ و معانی کے ناز اٹھاتی
جو حرف ہونٹوں پہ آئے پائے، وہ بن کے خوشبو بکھر گئے ہیں

جو دردِ عینے نفس نہ ہوتا، تو دل پہ کیا اعتبار آتا
کچھ اور پیماں، کچھ اور بیجاں کہ زخمِ جتنے تھے بھر گئے ہیں

خزینے جاں کے لٹانے والے، دلوں میں بسنے کی آس لے کر
سنا ہے کچھ لوگ ایسے گزرے جو گھر سے آئے نہ گھر گئے ہیں

جب اک نگہ سے خراش آئی زلمنے بھر سے گلہ ہوا ہے
جو دل دکھا ہے تو رنجِ سارے بنجانے کس کس کے سر گئے ہیں

شکستِ دل تک نہ بات پہنچی مگر ادا کہہ سکو تو کہتا
کہ اے ساون دھنک سے سچل کے رنگ سارے اتر گئے ہیں



شب قدر کی فضیلت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جس شخص نے ایمان کے ساتھ ثواب کی نیت
سے شب قدر میں قیام کیا (اللہ کی عبادت کی) اس
کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جلتے ہیں۔“

(بخاری و مسلم)

فائدہ :-

قیام کا مطلب ہے اس رات کو اپنی طاقت کے
مطابق جاگ کر اللہ کی عبادت کی، نوافل پڑھے، توبہ و
استغفار اور دعا و مناجات کی۔ بالخصوص عشاء اور
 فجر کی نماز باجماعت ادا کی تو امید ہے کہ اس سے
انسان کو اس کی فضیلت حاصل ہو جائے گی۔

مشہور ادیب ابن مقفع کا قرآنی بلاغت کے سامنے اپنے عجز کا اظہار

ابن مقفع اپنے وقت کا ایک بلند پایہ ادیب گزرا
ہے۔ اس نے دعویٰ کیا کہ قرآن بے شک فصاحت و
بلاغت کی انتہا پر ہے لیکن میں اسی طرز کا کلام لکھ سکتا
ہوں۔ اس نے اپنی کافی عمر اسی خیال خام میں ضائع کی
اور اپنے خیال میں پھر اس طرح لکھا بھی۔

ایک روز اسے ایک مکتب کے پاس سے گزرنے
کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک لڑکا سورہ ہود کی یہ آیت
پڑھ رہا تھا۔

ترجمہ: ”اور حکم آیا اے زمین نکل جا اپنا پانی اور
اے آسمان تھم جا اور سکھا دیا گیا پانی اور ہو چکا کام اور
کشتی ٹھہری جو دی پہاڑ پر اور حکم ہوا اور ہو قوم
ظالم“
(سورہ ہود - آیت نمبر 44)

ابن مقفع سنتے ہی حیرت زدہ اور مدہوش ہو گیا۔
اور گھبرا کر اپنے سب لکھے ہوئے کو مٹا دیا۔ اور قسم کھا کر
کہا کہ اس کلام کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اور یہ کسی انسان
کا کلام نہیں ہے۔

علامہ سلیمان الجملی متوفی 1304ھ فرماتے ہیں۔
”یہ آیت کریمہ قرآن پاک کی انتہائی بلیغ آیت ہے۔“

کیونکہ یہ فن بدیع کی 21 اقسام پر مشتمل ہے جبکہ
اس آیت کے کل کلمات صرف (19) ہیں۔

کچھ باتیں

6 ، سڑک چاہے کالج کی کیوں نہ ہو، پیدل چلنے والوں
کو تھکا دیتی ہے۔

6 ، جو راستوں کے عشق میں گرفتار ہو جلتے ہیں، منزلیں
ان سے دُور ہوجاتی ہیں۔

6 ، اگر آپ سب کچھ کھو چکے ہیں تو مایوس ہونے کی
ضرورت نہیں، کیونکہ جو سب کچھ کھو دیتا ہے اس
کے پاس پالنے کے لیے پوری دنیا ہے۔

6 ، خون کے رشتے چاہے کتنے ہی اذیت ناک کیوں
نہ ہوں، تا دم آخر ہمارے احساسات کے ساتھ جڑے
رہتے ہیں۔

6 ، دریا پہاڑوں میں سے سمٹ کر گزرتا ہے اور
اور میدانوں میں سے پھیل کر گزرتا ہے۔ اپنے حالات
کے مطابق سفر کرنا چاہیے۔ انسان حالات سے باہر
ہو جائے تو بکھر کر رہ جاتا ہے۔

6 ، ٹھیک وہ نہیں ہوتا جو ہم چاہتے ہیں، بلکہ ٹھیک
وہ ہوتا ہے جو رہنے ہمارے لیے لکھ رکھا
ہے۔ اگر ہم چند جملوں پر مشتمل اس کلیے کو سمجھ لیں
تو زندگی آسان ہو جائے۔

شفیق شان شاہ - گوچرہ

شرم اور عزت والیاں، ہوتی ہیں نعت والیاں
 کس قوم کی بیٹی ہے تو، تقدیر کی بیٹی ہے تو
 رقص ہم گیا، رقصہ سر جھکانے نواب کے قدموں
 میں جا بیٹھی۔ حفیظ صاحب کے زور کلام کا اعجاز، محفل
 رقص و سرود مدہم بہم بہم ہو گئی۔

ہری مرچیں،

۱۔ آپ کے بچے کتنا آگے جاسکتے ہیں، اس کا انحصار
 اس بات پر ہے کہ آپ نے گاڑی میں کتنا
 پٹرول چھوڑا ہے۔
 ۲۔ آج کا کام کل پر چھوڑ دیجیے۔ ہو سکتا ہے کہ
 کل اس کام کو کرنے کے لیے مشین ایجاد ہو جائے۔
 ۳۔ ڈاکٹر نے خوبصورت مرینہ سے کہا: ”آپ کی
 خوراک ٹھیک نہیں ہے لہذا آج رات کا
 کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں۔“
 ۴۔ بلاشبہ محبت اندھی ہوتی ہے، لیکن وہ ہیرے
 اور معمولی نیکنے کی انگوٹھی میں فرق محسوس کر
 سکتی ہے۔
 مسرت الطاف احمد۔ کراچی

جھوٹا،

کو جوان گھوڑا تانگہ گلی میں چھوڑ کر سواری کا ٹرنک
 رکھنے اندر گیا تو قریب سے گزرتے ہوئے ایک آدمی
 کو دیکھ کر گھوڑے نے کہا۔
 ”السلام علیکم“
 آدمی پہلے تو ٹھٹکا پھر گردن موڑ کر آہستہ آہستہ چلنے
 لگا۔ گھوڑے نے گردن اٹھا کر قدم لے بلند آواز میں
 کہا۔
 ”میں نے کہا۔ السلام علیکم“
 آدمی اسی طرح ڈبڈبسا سہا سہا واپس لوٹا اور گھوڑے
 کے پاس آ کر بولا۔
 ”کیا تم نے السلام علیکم کہا تھا؟“
 ”کیوں کہیں؟“ گھوڑے نے محبت بھرے لہجے
 میں کہا۔ ”یہ تو تم مجھے اب اس پھوٹانگے میں جتا ہوا
 دیکھ رہے ہو ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں پچھلے سال

کس نے بیٹھ کر میرے ننھے سر کی حفاظت کی۔ جب
 میں اپنے پنکھوڑے میں سو رہی ہوتی تھی۔
 اور میرے اوپر پیار بھرے آنسو بہانے والی
 ہستی کون تھی۔ وہ (یقیناً) میری ماں تھی۔
 کون مجھے عمدہ اور خوش رنگ کپڑے پہنانا
 تھی اور مجھے شوق سے کھیلنا سکھاتی تھی اور جو کچھ بھی
 میں نے کہنا ہونا تھا وہ اس پر بھرپور توجہ دیتی تھی۔
 وہ یقیناً میری ماں (تھی)۔
 کون بھاگ کر میری مدد کو دوڑتی تھی۔ جب میں
 گر پڑتی تھی اور پھر مجھے خوبصورت کہانی سناتی تھی یا

مجھے تندہت کرنے کے لیے میری پیشانی چومتی تھی۔ وہ
 (یقیناً) میری ماں (تھی)۔
 کیا میں کبھی بھی آپ سے شفیق اور مہربان ہونے
 سے رُک سکتی ہوں۔ کیونکہ آپ بھی تو میرے ساتھ
 بہت زیادہ شفیق رہی ہیں۔ میری ماں۔
 جب آپ کمزور، بوڑھی اور سفید بالوں والی ہو
 جاؤ گی تو میرے صحت مند بازو آپ کا سہارا بنیں گے۔
 میں آپ کے دکھ درد کو آرام پہنچاؤں گی میری ماں۔
 شاعرہ این ٹیلر لاریب، ماہذیب، جونیل

رقاصہ،

۱۹۴۰ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہے۔ ابوالاثر
 حفیظ جالندھری ایک ریاست کے درباری شاعر تھے۔
 والی ریاست نے عین اس وقت جب اس کی منظور نظر
 رقصہ محو رقص تھی۔ حفیظ جالندھری کو رقصہ کی شان
 میں تعظیم کہنے کے لیے کہا۔ حفیظ صاحب نے ترنم سے
 یہ اشعار پڑھے۔
 ہاں ناچتی جا، گلے جا، نظروں سے دل بڑے جا
 تر پلٹے جا تر پائے جا او نیم عریاں ناز میں
 تیرا تھر کنا خوب ہے، تیری ادلیں دل نشیں
 لیکن پھر تو کون ہے او دشمن دنیاویں
 کیا مشرفی عورت ہے تو، سرگز نہیں سرگز نہیں
 تیری نظر چالاک ہے، تیری نظر بے باک ہے

اپنے حصے کا کام کیے بنا دُعا پہ بھروسہ کرنا حماقت ہے۔ اور اپنی محنت پہ بھروسہ کر کے دُعا سے گریز کرنا تکبر ہے۔
(شیخ سعدی)
اقصی ناصر۔ کراچی

اللہ تعالیٰ کی شان،

- ، عیب دل کی حفاظت کرتا ہے اور خون کو جھینے نہیں دیتا۔
- ، امر و نہی کو صاف کرتا ہے۔
- ، کیلا بڈ ہاں مضبوط کرتا ہے اور بلڈ پریشر کنٹرول کرتا ہے۔
- ، گاجر آنکھوں کی بینائی بہتر کرتی ہے اور کینسر نہیں ہونے دیتی۔
- ، لیموں بلڈ پریشر کنٹرول کرتا ہے اور چہرے کو صاف رکھتا ہے۔
- ، آم یادداشت کو اچھا کرتا ہے۔
- ، انگور گروے کی پتھری نہیں ہونے دیتا۔
- ، مالٹا جسم میں بیماری کے خلاف دفاعی نظام کو بہتر کرتا ہے۔
- ، آڑو کینسر نہیں ہونے دیتا۔ ہارٹ اٹیک کو روکتا ہے اور ہاضمے کو بہتر کرتا ہے۔
- ، تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

آسیہ فرید۔ ملتان

سینر کی ریس میں اول رہا تھا۔
گھوڑے نے ابھی یہ جملہ پورا ہی کیا تھا کہ اندر سے اس کا مالک برآمد ہوا۔ ایک غیر آدمی کو یوں اپنے تانگے کے پاس رکے دیکھ کر بولا۔

”اس گدھے نے آپ کو روکا ہوگا؟“
”بے شک“ آدمی نے اقرار کیا۔
”اور اس لیاڑھے نے یہ بھی کہا ہوگا۔ میں پچھلے سال سینر کی ریس میں اول رہا تھا۔“
”جی ہاں! کہہ تو رہا تھا۔“
”جھوٹا ہے سالا“ کو جھان نے چایک جھٹک کر کہا۔ ”دوم رہا تھا۔“
نمرہ، اقرأ۔ کراچی

ڈپریشن،

یشن حاصل اور خواہش کے درمیان فاصلے کا نام ہے۔ ڈپریشن انسان کو اس وقت ہوتا ہے جب وہ چاہتا کچھ اور ہے اور اسے ملتا کچھ اور ہے۔ اور جو کچھ ہے ملتا ہے۔ اس کو وہ پسند نہیں کرتا۔ ایثار کی تمنا ہو جائے تو ڈپریشن ختم ہو جائے گا۔
(واصف علی واصف)
نوال افضل گھمن۔ لاہور

دل آزاری،

ہر وہ کامیابی انسان کی ہار ہے۔ جس کا مقصد کسی کو نیچا دکھانا ہو۔ دنیا میں ہر چیز کی قضا ہے سوائے دل آزاری کے۔
طیبہ، سعدیہ، عطاریہ۔ کھٹیا سیالکوٹ

دعائے مغفرت

فریدہ اشفاق احمد کے بہنوئی حافظ محمد اقبال قضائے الہی سے اس دار فانی کو الوداع کہہ گئے۔
انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہم فریدہ اشفاق اور ان کی بہن کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں۔ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین
قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

سری گیت

کوثر جمال _____ نامعلوم شہر
وہ آئے نہ آئے یہ اس کی رضا ٹھہری
جس عید ہے ارم گھر کو سجا کر دیکھیں

اقصی خان _____ پتوکی
میں بھی ہوں اگر خاموش آج ہنسنا تو بھی نہیں
مجھ سے پچھڑ کے کسی سے ملا تو بھی نہیں

واجدہ خانم _____ نورث عباس
کوئی حرف و فسانہ حرف سادہ
میں خاموشی کو سننا چاہتی ہوں
میں پچھن کے کسی لمحے میں رک کر
کوئی جگنو پکڑنا چاہتی ہوں

خارا جوت _____ جاکووارہ
جن کی صداقتوں پہ کوئی شک نہ کر سکے
تم بھی کتاب دل کی انہی آیتوں میں ہو

انعم مرزا _____ سانکھڑ
شام ملک اس لیے دروازہ کھلا رکھیں گے
شاید تم کہنے آ جاؤ عید مبارک
ثمرہ احمد بیٹ _____ پتوکی

چند دن تو اگر میرے ساتھ رہے
کس قدر حسین پھر سفر حیات رہے
جہاں جا رہے تو چلا جا اے ہمسفر
کوئی منتظر ہے اتنا مگر یاد رہے

گل پری مرزا _____ لاہور
قاصد پیام شوق کو اتنا نہ کر طویل
کہنا فقط یہ ان سے آنکھیں ترس گئیں

شعبان فاطمہ _____ نامعلوم شہر
ہمیشہ کے لیے چہرے نقابوں میں نہیں رہتے
سبھی کر دلا کھلتے ہیں کہانی ختم ہونے پر

رقیہ اقبال _____ پتوکی
کسے نہ رہے چاند گرہاں میرے گھر سے
زنجیر فاصلوں کی ابھی حد پر پڑی ہے

نسیم حیدر _____ گوجرانوالہ
جب بھی اس کی صورت دیکھی
میں نے ہاتھ پہ رکھا چاند
جاتے کس کو ڈھونڈ رہا ہے
اک مدت سے تنہا چاند

صدف رفیق _____ جہلم
دیکھ کر ہلال عید کو جو مسکراتے تھے
اب وہ چاند چہرے ڈھونڈے سے نہیں ملتے

رابعہ اختر _____ میاں جنوں
اب گے برس کچھ ایسی تدبیر کرتے ہیں
مل کے اک شہر محبت تعمیر کرتے ہیں
خزاں کی اجاڑ شاہیں نہ آئیں اگلے سال
اس بہ سادگت کو زنجیر کرتے ہیں

غزل معراج _____ کھاریاں
نگاہوں میں تو خنی لبوں پہ تبسم
وہ چوڑی کھلتی تو جب عید ہوتی

صائمہ کنول _____ خالقہ شریف
مجھ کو اک خواب پریشاں سال کا عید کا چاند
میری نظروں میں ذرا بھی نہ چھا عید کا چاند
آنکھ نم کر گیا پچھڑے ہوئے لوگوں کا خیال
درد دل دسے کے ہمیں ڈوب گیا عید کا چاند



زبردست تھا ابا کے کردار نے کبھی سوچنے پر تو کبھی مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ ”نمل“ زمر کی فارس کے ساتھ لا تعلقی اب ختم بھی کر دیں۔

اوں ہوں میں تو بھول ہی گئی میری طرف سے خواتین ڈائجسٹ کی پوری ٹیم کو رمضان کی نعمتیں اور رحمتیں مبارک ہوں۔

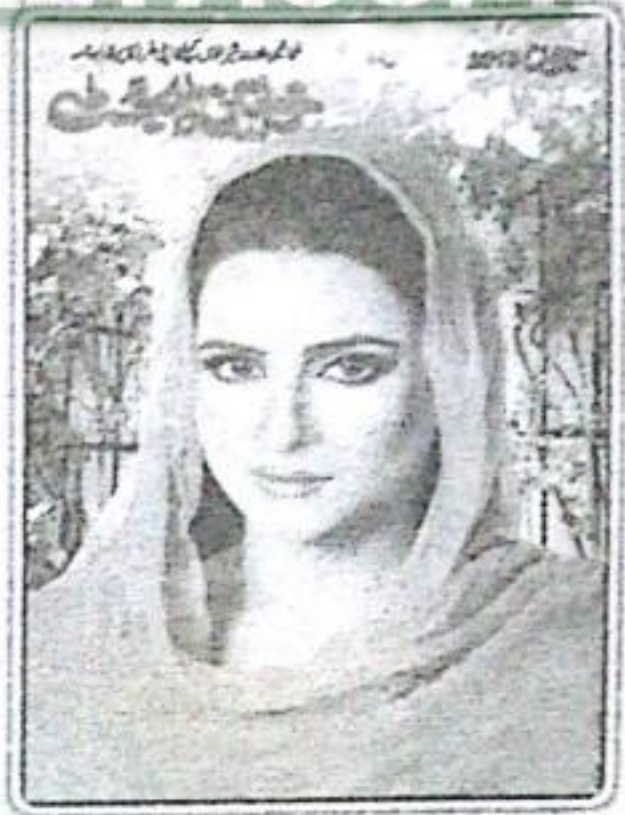
ج : پیاری مسرت! ایمر جنسی لائٹ کی روشنی میں آپ نے ہمیں خط لکھا، اس محبت کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں، تفصیلی تبصرہ۔ بہت اچھا اور جامع ہے لیکن یہ ہماری مجبوری ہے کہ ہم پورا تبصرہ شائع نہیں کر سکتے۔ ہم بہنوں کے تبصرے قطع و برید کر کے شائع کرتے ہیں اس کے باوجود بہت سارے خطوط شامل ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ ٹائٹل آپ کو پسند نہیں آیا، اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

سہانہ میری... جعفر روڈ اٹک

جیسے ہی رسالہ ملا سب سے پہلے بن مانگی دعا پڑھا (مگر یہ کیا) کچھ مزا ہی نہیں آیا پڑھ کر۔ پلیز معینز اور اہیہا کو جلد ملا دیں اور ثانیہ تو بہت بے وقوف ہے بہت برا کر رہی ہے۔ عون کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی اور یہ رباب کو تو سیفی کے حوالے کرنا چاہیے۔ مجھے تو اس کے قابل لگتی

ہے اہیہا اور معینز مجھے پسند ہیں لیکن اس بار کچھ خاص نہیں لگے۔ نمل تو بہت بہت زبردست ہے جی بہت ہی خوب۔ قرآن پاک کی تشریح پڑھتے ہوئے تو بہت مزہ آتا ہے اور سعدی کے ساتھ بہت برا ہوا۔ بڑھ کے بہت روٹی۔ رنگارنگ پھول، کہنی سنی بہت پسند آئے میرا باخبر، ہاں سیکھا ہے میں نے جینا، کملی دا ڈھولا بڑھ کے بہت مزہ آیا۔ میں سوچتی ہوں سب رائٹرز کس طرح اتنے خوب صورت اور طویل ناول لکھ لیتی ہیں لفظ لفظ موتی ہوتے ہیں۔

اور پلیز مجھے ان ڈشوں کی ترکیب بتادیں (ہنسنا نہیں ہے) دال ماش، سفید خنے، پالک، گوشتا، نہاری اور کشمیری یخنی جس کو دودھ والی یخنی یا سفید یخنی کہتے ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوگی اور پلیز عمران عباس آربے رضوان علی احمد کا انٹرویو لے لیں۔



نادۃ خاتون



خط بچوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

مسرت الطاف احمد۔ لیاری کراچی

جون کا شمارہ قابل تعریف تھا، ٹائٹل کچھ خاص دل کو نہیں بھایا۔ ”آب حیات“ کی یہ قسط دل کو چھوٹی ہوئی محسوس ہوئی۔ غلام فرید کی بے بس حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا ”بن مانگی دعا“ کی یہ قسط کافی ڈرامائی لگی۔ ثانیہ پر بہت زیادہ غصہ آیا۔ اتنی ہٹ دھرمی شادی کے بعد بھی اور یہ ٹسوے بہانے کا کیا فائدہ ”عبدالست“ کی یہ پوری قسط نور محمد کے ارد گرد ہی محسوس ہوئی لیکن پھر بھی یہ الجھنیں سلجھنے کا نام ہی نہیں لے رہیں زارا کا ٹیپو کے ساتھ ہی جوڑ بنے گا۔ شہروز نے زارا کو اپنی لا تعلقی سے تکلیف ہی دی ہے۔ ”سیکھا ہے جینا“ نبیلہ ابریرا جہ کا نام دیکھ کر ہی دل خوشی سے جھوم اٹھا نبیلہ جی کی تحریر کافی عرصہ بعد بڑھنے کو ملی۔ ناول بہت ہی زبردست تھا۔ ”حناکے رنگ“ ہستی مسکراتی رشتوں سے چڑی سوٹ سی اسٹوری مزہ دے گئی۔ ہر کردار قابل تعریف تھا۔ طرز تحریر بہت

ج : پیاری سمانہ! آپ کی فرمائشیں ٹوٹ کر لی ہیں، جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ رضوان احمد کون سے ایف ایم پر آتے ہیں۔

کہانیاں لکھنے کا شوق ہے تو ضرور لکھیں۔ تخلیقی صلاحیت قدرتی ہوتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہوتی ہے جسے اللہ عطا کرے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو ہر امتحان میں کامیابی عطا فرمائے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

عائشہ رباب۔۔ نامعلوم شہر

حسب عادت حسب معمول کہنی سنی سے پڑھنا شروع کیا ”کرن کرن روشنی“ پھر چلتے چلتے ”آب حیات“ پر رک گئے۔ مجھے رونے دھونے والی ہیروئین کبھی پسند نہیں آتیں لیکن میرے علاوہ میرے تمام گھر والوں کا کہنا ہے ”امامہ جس طرح کے حالات سے گزر کر آئی ہے۔ اس کا رونا کچھ انوکھا نہیں ہے۔“ خیر سالار کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ ”بن مانگی دعا“ بھی اچھا جا رہا ہے۔ برائے مہربانی رفتار بڑھا دیں۔ کہانی رکی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور پھر ”مکمل“ میرا پسندیدہ ناول۔ نمرہ احمد بہت بہترین لکھتی ہیں۔ ان کے ناول میں موجود ایک ایک کردار بہترین ہے۔ مجھے ہمیشہ سے نگینہ پوائنٹ زیادہ پسند آتا ہے۔ سچ کہوں تو اسی لیے مجھے ہاشم زیادہ پسند ہے۔ لیکن جواہرات مجھے کبھی پسند نہیں آئی۔ پتا نہیں کیوں اس کے علاوہ تمام ناولٹ اور افسانے پسند آئے ہیں۔ مستقل سلسلوں میں ”آپ کا باورچی خانہ“ بہت پسند ہے۔ پچھلے ماہ ”عہد الست“ کی قسط نہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا تھا۔ ”عہد الست“ میں حیران کن باتیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ بڑی بڑی باتوں کو بالکل غیر محسوس انداز میں بتاتی چلی جاتی ہیں، دلیلوں کے ساتھ حق و باطل کا موازنہ، بغیر کسی اختلاف کے یقین کرنے کو دل چاہتا ہے۔ بہت خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو ان موتیوں جیسے الفاظ کو پیرائے میں ڈھالنے کے ہنر سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اللہ ہماری مصنفین کو سدا سلامت رکھے آمین۔

ج : پیاری عائشہ! کرداروں پر آپ کا تبصرہ بہت دلچسپ ہے۔ تنزیلہ ریاض ہماری بہت اچھی مصنفہ ہیں اور عہد الست ان کی اب تک کی تمام تحریروں میں سب سے

ج : پیاری عائشہ! کرداروں پر آپ کا تبصرہ بہت دلچسپ ہے۔ تنزیلہ ریاض ہماری بہت اچھی مصنفہ ہیں اور عہد الست ان کی اب تک کی تمام تحریروں میں سب سے

افشاں شہزاد۔۔ کراچی

ٹائٹل سادہ مگر اچھا لگا۔ کرن کرن روشنی نے دل میں روشنی بکھیر دی۔ مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھے۔ علی رحمن اور نازی نصر سے ملاقات بھی اچھی رہی۔ سلسلے وار سب ہی ناول شان دار چل رہے ہیں۔ یہ بات کہنے کی نہیں مگر پھر بھی لکھ رہی ہوں۔ ہر قسط اگلی قسط کے انتظار پر مجبور کر دیتی ہے۔ نبیلہ ابر راجہ صاحبہ کا ناول بھی خوب صورت تھا۔ اچھا لگا۔ آسیہ رزاقی صاحبہ کا ناولٹ رنگ حنا بھی خوب صورت تھا۔ کہیں کہیں بڑھتے ہوئے لبوں پر مسکراہٹ بھی آگئی۔ جہاں شازیہ کا کردار خوب صورت تھا وہیں میاں جی بھی اچھے لگے۔ شازیہ جمال طارق نے خوب صورت موضوع کو خوب صورتی سے پیش کیا۔ کینز نور علی کا افسانہ بھی خوب صورت تھا۔ ”کملی دا ڈھولا“ اعتماد اور میرا باخبر، تینوں ہی بھرپور تھے۔ سب کو مبارک!

ج : پیاری افشاں! ہمیں افسوس ہے کہ پچھلی بار آپ کا خط شامل نہ ہو سکا۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

نمرہ کشور۔۔ مجلسی

”عہد الست“ تنزیلہ ریاض! آپ کتنا پیارا کتنا گریٹ سرمایہ ہیں ہمارا، ہمارے وطن کا! اللہ آپ کو شاد و آباد رکھے۔ نور محمد کا کردار کیسے لکھا ہے آپ نے! اس کے بچپن سے لے کر آخر تک کے واقعات کو پڑھتے ہوئے کبھی ایسا نہ ہوا کہ میرا دل نہ تڑپا ہو، میں نہ روئی ہوں، نہیں پتا آگے آپ کہانی کو کدھر موڑیں گی مگر نور محمد کی ڈیتھ نے بہت دکھ دیا۔ امامہ کیسے سنبھالے گی خود کو! اور سب سے بڑھ کے اپنی ماں کو کیا بتائے گی۔ ہمیں بالکل یقین نہیں تھا کہ نور محمد مرجائے گا۔ ناول کا ہر کردار منفرد ہے اور جن حقائق سے پردہ اٹھایا ہے اس لحاظ سے انتہائی شان دار اور یادگار تحریر ہے۔

حرف سادہ کو اعجاز کا رنگ ہماری مصنفات نے دیا اور انہوں نے اپنی تحریروں کے مختلف و منفرد رنگوں سے ہمارے اطراف میں اجالا کر دیا ہے۔ اقبال بانو آپلی میں آپ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک سال کے بیٹے محمد انس کی ماں بھی ہوں۔ فارغ نامہ میں پڑھنے کے باوجود میری فیملی کے کسی بھی فرد کو میرا ڈائجسٹ پڑھنا نہیں پسند۔ سب سے ڈانٹ کھا چکی ہوں۔ اپنی بیسٹ فرینڈ کے توسط سے یہ دونوں ڈائجسٹ پڑھتی ہوں کیونکہ میں ان کو پڑھے بنا رہی نہیں سکتی بہت کچھ سیکھا ہے میں نے ان سے اور میں انہیں اپنے حقیقی استاد کا درجہ دیتی ہوں۔ میری فیورٹ مصنفین میں نمرہ احمد، نگہت سیمہ، عمیرہ احمد، نبیلہ عزیز، سمیرا حمید اور فرحت اشتیاق صاحبہ شامل ہیں۔ از روئے عقیدت ان کے ہاتھوں کو چومنے کا جی کرتا ہے۔ آپ کے ڈائجسٹ کے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں اور میں کبھی ایک لائن بھی مس نہیں کرتی۔

ج: پیاری آسیہ! خواتین سے آپ کی محبت کا حال جان کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کا تعلق دیہی علاقے سے ہے لیکن اکثر شہروں میں بھی لڑکیوں کے رسالے پڑھنے پر روک ٹوک کی جاتی ہے جبکہ ان گھروں میں دن بھر ٹی وی دیکھنے کی آزادی ہوتی ہے اور انڈین پاکستانی ہر طرح کے چینل چلتے رہتے ہیں۔

آپ کی پسندیدہ مصنفین تک آپ کا اظہار عقیدت پہنچا رہے ہیں۔

عروہ حفیظ۔۔۔ میانوالی

میں جب آٹھویں کلاس میں تھی تو میں امی سے ڈائجسٹ چھپا چھپا کر پڑھتی تھی اب میں سیکنڈ ایئر میں آئی ہوں اور اب تک امی کو بھی پتا چل چکا ہے، میری کلاس کی لڑکیاں میرا مذاق اڑاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ عروہ تو ڈائجسٹ کو دیکھ کر ایسے خوش ہو جاتی ہے کہ جیسے اسے عیدی مل گئی ہو اور مزے کی بات یہ ہے کہ میں نے آج تک خود ڈائجسٹ نہیں منگوا یا کیونکہ مجھے کوئی لا کر نہیں دیتا۔ امی کہتی ہیں کہ پہلے اپنی اسٹڈی مکمل کرو پھر پڑھنا لیکن میں اپنی ایک سہیلی سے ڈائجسٹ منگوا کر پڑھتی ہوں۔ میں عمیرہ احمد کی بہت بڑی فین ہوں اور میں تمام رائٹرز کی شکر گزار ہوں کہ وہ ہمارے لیے اپنا قیمتی وقت نکال کر لکھتی ہیں۔ میں زندگی میں اتنی کبھی نہیں روئی ہوں گی جتنا میں ناول ”متاع جاں ہے تو“ پڑھ کر روئی تھی۔ ”بن مانگی دعا“ ”آب حیات“ ”عہد الست“ اور ”نمل“ یہ سب بہت زبردست ناول ہیں۔

کی فین ہوں البتہ کہانی آپ کی ایک نہیں پڑھی آج تک۔۔۔ مجھے کبھی ملی ہی نہیں، آپ لکھیں تب نا! لیکن سروے میں آپ کی شرکت، آپ کی باتیں، آپ سے مل کر بہت اچھا لگتا ہے، ہمیشہ ”میڈیا کی طرف رخ کر لینے والی رائٹرز کے نام آپ کا پیغام بہت اعلیٰ اور ہمارے دل کی آواز ہے۔

اب بات ہو جائے ”نمل“ کی نمرہ احمد کا ہرنیا ناول ان کا اپنا ہی بنایا ہوا پچھلا ریکارڈ توڑ دیتا ہے۔ زمر مجھے بہت پسند ہے اپنے بالوں سمیت۔ بال تو سب کے ہی منفرد ہیں سوائے تیرو کے۔ ہم پھٹے بالوں والا!۔۔۔ اور شو نا پالا ہمارا سعدی ”اتنا اچھا لگتا ہے نا! صبح کو قرآن پڑھنے والا“ سب سے زیادہ غیرت والا! جب ہاشم کی اصلیت اس پر کھلتی ہے تو سعدی کی حالت دل کی ویرانی، اس کی آنکھوں کی نمی بہت بہت دکھی کر دیتی ہے۔ حنین، سیم اور ”ندرت بہن“ کی نوک جھونک مزادتی ہے میرے اپنے ہی گھر کا منظر لگتا ہے۔ یا پھر۔۔۔ خیر یہ حنین! یا اللہ!۔۔۔ یہ کس مرض میں گرفتار ہے! اگر سعدی پھنسا لیا گیا تو مجبوراً ”حنہ کو خود سے کیا عہد توڑنا پڑے گا اور پھر وہ سعدی کی دی ہوئی فلیش کو کھولنے کی کوشش کرے اور تب ہی اس کے سر سے عشق کا بھوت اترے گا، ساڑھ رضا کا بلدیہ ٹاؤن کراچی سانحہ پر لکھا گیا افسانہ کب اور کس ڈائجسٹ میں شائع ہوا ہے؟ ضرور بتادیں! اور ہمیں شدید خواہش ہے کہ نمرہ احمد کو سروے میں پڑھیں، ہمیں پتا ہے آپ نے نمرہ کو بھی سوالنامہ بھیجا ہو گا لیکن پلیز پلیز انہیں جواب بھیجئے اور شمولیت پر بھی راضی کریں نا!

ج: نمرہ کشور! ہم نمرہ احمد تک سروے میں شرکت کے لیے آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔ ہم نے سوال نامہ تمام مصنفین کو بھجوایا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ساڑھ رضا کا بلدیہ ٹاؤن کراچی کے سانحہ پر افسانہ نومبر 2012 خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا۔

آسیہ فریدی۔۔۔ ملتان

ملتان کے دیہی علاقے سے تعلق رکھتی ہوں میں 8th کلاس سے شعاع اور خواتین ڈائجسٹ کی خاموش قاری ہوں۔ ایم اے (اردو) کے ساتھ ساتھ درس و تدریس سے وابستہ ہوں شادی شدہ ہوں اور اپنے ایک پیارے سے

ہوں۔ لیکن شرکت اس ماہ کر رہی ہوں۔ اس کی وجہ
 ”نمل“ ہے۔ آخر کار سعدی کو ہاشم کاردار کے خلاف ثبوت
 مل ہی گیا۔ ہاشم اور سعدی میرے فیورٹ کردار ہیں۔ پلیز
 پلیز ہاشم کاردار کو کہانی کے آخر میں کم سے کم سزا دلوائے
 گا۔ احمر شفیع کا کردار بھی لا جواب ہے۔ نوشیرواں کو ایسا
 نہیں کرنا چاہیے تھا۔ سعدی کے لیے بہت دکھ ہوا۔
 عمیرہ احمد کا ”آب حیات“ ویسے تو میرا فیورٹ ناول ہے
 پر اس بار کی قسط بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔ آخری خطبہ
 پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ مجھے سالار کا کردار بہت پسند ہے۔ کیا
 سالار سکندر جیسا انسان اصل زندگی میں ہوتا ہے۔ سب
 کہانیاں اچھی لگیں۔ پلیز زمر نام کا مطلب بتادیں۔
 سعدی کے ساتھ کچھ برامت کیجئے گا۔

ج : پیاری عروہ! پڑھائی پر توجہ دینا تو بہت ضروری ہے
 لیکن پڑھائی کے ساتھ ساتھ تفریح بھی ضروری ہے۔ اور
 اگر صاف ستھری تفریح کے ساتھ ساتھ کچھ سیکھنے کا بھی
 موقع ملے تو اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے۔ پڑھائی کے
 دوران ٹی وی بھی تو دیکھتے ہیں اس سے تو کوئی بھی منع نہیں
 کرتا۔ یہ بات حیران کن ہے کہ ڈائجسٹ پڑھنے سے گھر
 والے کیوں منع کرتے ہیں۔
 اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیابی
 دے۔ آمین

سائرہ نازش خان۔۔۔ سانگھڑ

2 سال سے خواتین شعاع پڑھ رہی ہوں خط لکھنے کی
 وجہ ہے ”نمل“ اور ”آب حیات“ نمل کا تو کوئی جواب
 ہی نہیں ہے۔ نمروہ باجی پلیز سعدی کو واپس اس کے گھر
 والوں سے ملوادیں۔ مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے سعدی اور
 ہاشم کا کردار تو میرا فیورٹ کردار ہے میں چاہتی ہوں ہاشم کو
 کوئی نقصان نہ پہنچے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ جو لاسٹ میں
 سعدی کو گولی لگنے سے پہلے کسی نے اس کی بات سنی تھی وہ
 احمر شفیع تھا اور اب وہی سب کو ہاشم کی اصلیت بتائے گا۔
 نوشیرواں کو تو کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے۔ بلکہ اسے تو
 ڈائریکٹ پھانسی پہ چڑھا دینا چاہیے۔ اس کی ہمت کیسے
 ہوئی سعدی کو مارنے کی جو اہرات کو تو مر ہی جانا چاہیے۔
 اب آتے ہیں ”آب حیات“ کی طرف تو عمیرہ باجی
 شروع کے تین چار ماہ تو آپ نے بہت زبردست کہانی لکھی
 اور اب کیا ہو گیا۔ سالار اور امامہ کے بیچ میں یہ غلام فرید کی
 کہانی کہاں سے آگئی ”اف“ اور اور مجھے نہیں لگتا کہ
 عفت باجی کا کوئی ارادہ ہے ”بن مانگی دعا“ ختم کرنے کا۔

زمر کے معنی گروہ یا گروپ کے ہیں۔

دعائے سحر۔۔۔ فیصل آباد

پہلی بار شعاع خواتین کرن کب پڑھا۔۔۔ شاید تب
 جب ابھی صرف الفاظ سے آگئی تھی۔ ان کے مفہوم سے
 نہیں۔ شاید نو یا دس سال کی تھی اور آج مجھے خواتین
 پڑھتے تقریباً دس سال ہونے کو آئے۔ وقت کیسے بیتا کچھ
 پتائی نہ چل سکا۔ مگر ہاں ایک لمحے کے لیے بھی خواتین
 میرے ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ بہت کچھ سیکھا میں نے اس
 سے۔ اور بہت کچھ سیکھ رہی ہوں۔ نجانے کیا جاوے اس
 نگری میں۔۔۔ جو بھی جائے مسحور ہو جائے۔۔۔ میری پریشانی
 غم ڈیپریشن سب کو یوں اپنے میں ضم کر لیتا ہے جیسے پاسی
 زمین بارش کے قطروں کو۔

ج : سحر! آپ کی والدہ کی وفات کا سن کر بہت افسوس

ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

واقعی مطالعہ سے اچھی عادت کوئی نہیں ہے۔ انسان
 جب مطالعہ کرتا ہے تو تھوڑی دیر کے لیے اس دنیا اور اس
 کے سارے غم بھول کر ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اور
 ہمارے پرچے توجینے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔

حنا گل۔۔۔ بنوں

(بی اے فائنل ایر کا ایگزام دے کے فارغ ہو گئے ہیں)
 سواب صورت حال ”فکر نہ فاقہ“ عیش کر کا کا ”اب کیا کیا

باقی سب کہانیاں بہت اچھی لگیں۔

ج : پیاری سائرہ! عمیرہ احمد کی تحریروں میں کوئی بھی
 چیز غیر ضروری اور بلاوجہ نہیں ہوتی۔ غلام فرید کی کہانی آئی
 ہے تو اس کا تعلق لازمی مرکزی کرداروں سے ہو گا۔ جو
 آگے چل کر آپ کو پتا چلے گا۔ ”بن مانگی دعا“ اب اختتامی
 مراحل میں ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

یسری کشف۔۔۔ سانگھڑ

میں خواتین و شعاع پچھلے ایک سال سے پڑھ رہی

جائے (اف بورنگ) بڑی معصومیت اور بے چارگی سے گنگنار ہے ہیں ”مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا“ نا بھئی نا، کیوں نہیں آتا کوئی کام تو جناب ہم نے سوچا کیوں چار پانچ سالوں سے التوا میں پڑے کام کو سہرا انجام دیا جائے۔
 نکھر نکھر اس ورق نکھر نکھر آتا اثر چھوڑ گیا۔ ”کرن کرن روشنی“ کے سامنے تمام کرنیں ماند ہیں زبردست! عفت سحر طاہر کا ”بن مانگی دعا“ لوجی ساس چلی گئی اب سب کچھ بیسی اینڈنگ ہو جائے گا۔ مشاہدہ ہے بھئی اور اب بات ہو جائے میری اس بہترین اور پسندیدہ ترین مصنفہ کی۔ نمبرہ احمد، کیا لکھوں اقبال سے معذرت کے ساتھ۔

زندگی مضمحل ہے تیری اعلیٰ تحریر میں سمجھ نہیں آتا کہ ان کی شخصیت پر کیا لکھوں اور اب آپ سے ایک نہایت عاجزانہ، فقیرانہ اور مؤدبانہ گزارش کی جاتی ہے کہ ہم پر یہ ظلم عظیم روکا جائے۔ بھئی دیکھیں نا ہماری موسٹ فیورٹ رائٹر نمبرہ احمد کا انٹرویو شائع نہ کرنا ہم پر ظلم ہی ہے نا۔ نمبرہ احمد کی تحریروں سے ہم نے قدم قدم پر اصلاح کشیدگی ہے اور یہ آپ کے قلم کا جہاد ہے۔

ہم انتظار میں ہیں کہ سعدی کی ہیروئین کب انٹری مارے گی، ویسے ندرت بہن (آپس کی بات ہے) ”سعدی کے لیے کوئی لڑکی شذکی ڈھونڈی ہے کیا؟“ (آج کی نسل تھوڑی زیادہ اسماٹ ہے) اور آخر میں نمبرہ احمد، ہمارے گل کی طرح کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے نا۔ کہ ”حنا گل تم سے بہت پیار کرتی ہے نمبرہ احمد!“
 ج : پیاری حنا! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکر یہ۔

شائستہ اکبر۔۔۔ گڈو کالونی

جون کا سرورق دوپٹہ پہنے سادہ سی ماڈل گرل کے ساتھ بہت ہی اچھا لگا (پہلی بار) پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں پڑھ کر دل کو سکون ملا۔ پلیز ہر ماہ انشاء جی کی کوئی نہ کوئی ایک غزل ضرور شائع کیا کریں۔

نمبرہ احمد کا ”نمل“ ناول اپنی خوب صورتی لیے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ عمیرہ احمد آپ بھی بہت زبردست جا رہی ہیں اور زوباریہ خالد کے خط کے جواب میں آپ نے جو فرحت اشتیاق کے ناول کے کردار مسعود اور ایمن کا ذکر کیا ہے وہ ”دل سے نکلے جو لفظ“ ناول کے کردار نہیں بلکہ

”میرے ہم دم میرے دوست“ ناول کے کردار ہیں مریم عزیز اور نبیلہ عزیز کہاں ہیں؟ ان سے بھی ناولز لکھو امیں۔
 ج : پیاری شائستہ! آپ نے تصحیح کی، بہت شکر یہ نبیلہ عزیز سے ہم بھی ناول لکھوانا چاہتے ہیں لیکن وہ کچھ پریشانیوں میں الجھی ہوئی ہیں اس لیے لکھ نہیں پا رہی ہیں۔ مریم عزیز نے ناول شروع کر رکھا ہے۔ اب دیکھیں وہ کب مکمل کرتی ہیں۔

اقراء اکرم۔۔۔ گاؤں سیلیماں شریف

کافی عرصے بعد خط لکھ رہی ہوں، وجہ پاکستان کے حالات ہیں ہم باڈر لائن پر رہتے ہیں۔ آئے دن فائرنگ گولہ باری کی وجہ سے ایسا گاؤں چھوڑ کر جانا پڑتا ہے لیکن ہم نے خواتین اور شعاع کو پڑھنا نہیں چھوڑا مجھے خواتین کے تمام سلسلے اچھے لگتے ہیں لیکن قسط وار ناول کے لیے پورا مہینہ انتظار کرنا پڑتا ہے میری دوستیں حافظہ پاکیزہ، نفیسہ، عظمتی اور سائرہ باقاعدگی سے پڑھتی ہیں۔

ج : اقراء اکرم! ہمیں اندازہ ہے کہ بارڈر پر رہنے والے لوگوں کو کن مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خصوصاً ”جب بڑوسی ملک انتہائی عیار اور مکار ہو۔ انہوں نے تو ہمارے شہروں کو نہیں چھوڑا تو بارڈر پر تو کارروائی کرنے میں کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری محب وطن افواج کو سلامت رکھے جو وطن کے دفاع کے لیے سرگرم عمل ہیں۔

رضوانہ پروین۔۔۔ سیالکوٹ

جون کا شمارہ دس تاریخ کو ملا۔ سرورق پسند آیا۔ اگر آنکھوں کا میک اپ تھوڑا اور اچھا ہوتا۔ سب سے پہلے مکمل ناول کی طرف آتے ہیں ”نمل“ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس دفعہ ”نمل“ پڑھ کر سعدی کی حالت پر رونا اور نوشیرواں پر غصہ آیا۔ پلیز سعدی کو اس کے گھر

والوں سے جلدی ملوایے گا اور زمر کا دل فارس کے لیے تھوڑا نرم کریں ”سیکھا ہے جینا“ بہت اچھا ناول لگا۔ مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی تھی کہ افراح تہجد کی نماز پڑھتی ہے لیکن اس کے لیے پہلے تھوڑی سی نیند کرنی پڑتی ہے پھر یہ نماز پڑھتے ہیں۔ ناول میں ”آب حیات“ پڑھا، مجھے تمام قسطوں میں سے یہ قسط سب سے زبردست لگی اب پڑھنے کا اور بھی مزہ آئے گا ”بن مانگی دعا“ بھی اچھا جا رہا ہے پلیز

ابیہا کے اچھے دن بھی لائیں افسانے "اعتاد" "کملی" "ڈھولا" میرا باخبر بہت پسند آئے باقی ڈائجسٹ پڑھنا ابھی باقی ہے۔ "رنگ حنا" آسیہ رزاقی کا نام ہی کافی ہے تمام کہانیوں پر ہم بہنیں (کشور، شبانہ) آپس میں تبادلہ خیال بھی کرتے ہیں (فون کے ذریعے) اس دفعہ کا ڈائجسٹ دیکھ اور پڑھ کر بہت مزہ آیا۔

ج : پیاری رضوانہ! آپ نے درست لکھا ہے۔ تہجد کی نماز پڑھنے کے لیے پہلے نیند لینا ضروری ہے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

ہماری طرف سے کشور اور شبانہ کو بھی شکریہ کہہ دیں۔

رضوانہ پروین۔۔۔ سیالکوٹ

تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ پلیز نمبر سعدی کے ساتھ کچھ برامت کیجئے گا کیونکہ سعدی میں مجھے اپنا بڑا بھائی نظر آتا ہے۔ جس طرح سب کو جوڑے رکھنا چاہتا ہے بالکل میرا بھائی بھی اسی طرح ہے۔ "آب حیات" کی اس دفعہ کی قسط زبردست تھی۔

ج : پیاری رضوانہ! آپ نے صرف ایک کہانی پر تبصرہ کیا۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔ اپنے بھائی اور بہن کا ہماری طرف سے شکریہ ادا کر دیں۔

فوزیہ ملک۔ ہارون آباد

مجھ سمیت تقریباً 25 افراد ہیں۔ جو میرے ساتھ یہ رسالے شیر کرتے ہیں۔

اسٹوڈنٹ لائف سے شادی اور اب چھوٹے چھوٹے بچوں کی اماں بن چکی ہوں۔ مگر ان رسائل سے تعلق دن بدن مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ اب ایک استاد کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دے رہی ہوں۔ ایم اے ایجوکیشن اور ایم اے اردو ہوں۔ میں خواتین 'شعاع' اور کرن تینوں

رسالے باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ صرف تین سال شادی کے بعد شوہر کے منع کرنے پر رکی۔ مگر جب جاب ہو گئی۔ تو دوبارہ سے سلسلہ جوڑ لیا اور آج تک قائم ہے۔

میری پسندیدہ مصنفین میں عمیرہ احمد، انیس سلیم، فرحت اشتیاق، نگہت سیما، سائرہ رضا (شعاع میں تارے

والی کہانی پڑھ کر میں بہت روئی) عنیزہ سید شامل ہیں۔ رومانٹک کہانیوں میں کینز نبوی در شمن پسند ہیں۔ مجھے سنجیدہ کہانیاں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ موجودہ مصنفین میں نمبر احمد، سمیرا احمد نے بہت متاثر کیا ہے۔ تنزیلہ آپ عہد الست لکھ کر بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھول رہی ہیں۔ بہترین کاوش ہے۔ عمیرہ احمد کے کیا کہنے آب حیات نسلی سے پڑھتی ہوں اور ایک ایک لفظ کو محسوس کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ باقی سب سلسلے بھی بہترین ہیں۔

پہلی دفعہ میں تنقید نہیں کروں گی۔ کبھی کبھی کچھ ناول اور افسانوں پر میں سوچتی ہوتی ہوں۔ انہیں شامل نہیں ہونا چاہیے تھا۔

ج : پیاری فوزیہ! بہت سلجھے ہوئے انداز میں آپ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں آئندہ خط لکھیں تو بلا جھجک خامیوں کی بھی نشان دہی کریں۔ ہمیں تنقید بری نہیں لگتی۔

محسنہ علاقہ چراٹ سے پٹھان خٹک

اللہ اس ادارے کو ہمیشہ قائم رکھے۔ نمبر احمد جس طرح لوگوں کو تعلیم دیتی ہے اس کی مثال نہیں میرے خیال میں یہ علماء سے بھی بہتر کام کر رہی ہیں کیونکہ میں نے خود عالمہ کا کورس اور ترجمہ تفسیر کا کورس بھی کیا ہمارا چھوٹا سا مدرسہ ہے اس میں ہم ترجمہ تفسیر صبح سے شام تک پڑھاتے ہیں لیکن ہم سے بڑھ کر کام نمبر احمد کر رہی ہیں۔ کیونکہ مدرسے میں ہر کوئی نہیں آتا۔ آپ کے رسالے ہر کوئی پڑھتے ہیں میں نے اس کے پڑھنے کی ترغیب دی اور ترجمہ تفسیر کی ترغیب دی۔ ہر کردار سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے۔

ایک بات قارئین سے کہوں گی کہ تنقید کرنا اچھی بات ہے جن سے لکھنے میں مزید نکھار آتا ہے لیکن نرم الفاظ اور خوب صورت طریقے سے کریں۔ ایسے سخت الفاظ نہ کریں جن سے تکلیف ہو کیونکہ مصنف حساس ہوتے

ہیں۔ یہ رسالے کزن کے شوہر لاتے ہیں نوشہرہ سے جو ہم سے بہت دور ہے باجی اس کے ملنے کا کوئی آسان حل بتائیں۔

ج : پیاری محسنہ رسالے ملنے میں دشواری ہوتی ہے تو

اس کا آسان حل یہ ہے کہ آپ سالانہ خریدار بن جائیں۔
آپ کو گھر بیٹھے پرچے ملتے رہیں گے۔
خواتین اور شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ج : پیاری عائشہ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ آپ کی
بینائی لوٹا دے قارئین سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

عائشہ صدیقہ۔۔۔ اٹک

ارم بشیر۔۔۔ اسلام آباد

جون کا شمار اڑھانا نائل بہت اچھا تھا اور بیچ اور گرین کا
امتزاج بہت دل کو بھایا کہانیاں سبھی ہی اچھی تھیں مگر
”سیکھا ہے جینا“ اور آسیہ رزاقی جی کارنگ حنا تو بہت دل
سے پسند آئی اور ایک چھوٹی سی بات نبیلہ ابر راجہ جی کے
لیے کہ اگر وہ افراح کے دونوں گالوں پہ ڈمپل بھی بنا دیتیں تو
وہ شاید زیادہ پیاری تصور ہوتی۔

ج : پیاری ارم! آپ کہانی کے بارے میں ہمیں فون
کر کے پتا کر لیں یا اپنا فون نمبر لکھ دیں ہم فون کر لیں گے۔
خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

آصفہ حمید، مریم حمید، نبیلہ ہسین، صائمہ اصغر، عزمی
ہسین۔۔۔ بدوگی گوسائیاں گوجرانوالہ کینٹ

اس ماہ کا مکمل ناول ”ہاں سیکھا ہے“ بہت زبردست رہا
افسانے سب ہی کمال کے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ
زبردست، ”کملی دا ڈھولا“ اور میرا باخبر رہا۔ پلیز ماہانہ ملک، کنیر
نبوی، فرحت استیاق، نبیلہ عزیز، سمیرا حمید سے گزارش
ہے کہ خواتین کے لیے اچھا سا ناول لکھیں۔

ج : آمنہ، مریم، نبیلہ، صائمہ اور عزمی! آپ کا پیغام
مصنفین تک پہنچایا جا رہا ہے۔



سرورق کی شخصیت

ماڈل ----- عینی
میک اپ ----- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر ----- موسیٰ رضا

میرا نمبر احمد سے ایک سوال ہے کہ آپ اس فیلڈ میں
اپنا استاد کے مانتی ہیں؟ اور آخر میں تمام قیٹھی میٹھی اور
پیاری بہنوں سے یہ درخواست ہے کہ میں 8th کلاس
بڑھ رہی تھی تو کالا موتیا آنے کی وجہ سے میری نظر چلی
گئی۔ اب میں مکمل بلا سنڈ ہوں۔ یہ خط میں کسی سے لکھوا

قارئین متوجہ ہوں!

- 1- خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں
بجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال
کریں۔
- 2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے
ہیں۔
- 3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی
دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
- 4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا
مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
- 5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت
کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔
- 6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی
کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
- 7- خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے
انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے
حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نیوی چینل پہ ڈراما ڈرامائی تشکیل
اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

حالی کی ڈاڑھی

بول اے شام سفر رنگ رہا بی کیا ہے
دل کو رکنا ہے کہ تادوں کو بھر جانا ہے
کون ابھرتے ہوئے مہتاب کا راستہ روکے
اس کو ہر طود سوئے دشتِ سحر جانا ہے
میں کھلا ہوں تو اسی خاک میں ملتا ہے مجھے
وہ تو خوب ہے، اسے اگلے نگر جانا ہے
وہ ترے حُسن کا جادو ہو کہ میرا عمِ دل
ہر مسافر کو کسی گھاٹ اتر جانا ہے

نوال افضل گھمن

میری ڈاڑھی میں تحریر جون ایلیا کا خوبصورت
انداز تمام قارئین بہنوں کے نام۔
مالت حال کے سبب، حالت حال ہی گئی
شوق میں کچھ نہیں گیا، شوق کی زندگی گئی
ایک ہی عادت تو ہے اور وہ یہ کہ آج تک
بات نہیں کہی گئی، بات نہیں سنی گئی
بعد بھی تیرے جانِ جاں دہا دل میں عجیب سہل
یاد ہی تیری۔ یہاں پھر یاد بھی تیری گئی
اس کی گلی سے اٹھ کر میں آن پڑا تھا پتھر
ایک گلی کی بات تھی اور گلی گلی گئی

www.paksociety.com

پرہ احمد

میری ڈاڑھی میں تحریر احمد فراز کی یہ خوبصورت
غزل آپ سب قارئین بہنوں کے نام۔
وادی عشق سے کوئی نہیں آیا جا کر
او آواز لگائیں سہرِ صحرا جا کر
بزمِ جاناں میں تو سب اہل طلب جاتے ہیں
کنجشِ مقتل میں بھی دکھلائیں تماشا جا کر
کن زمینوں پہ مری خاک لہو روئے گی
کس سمند میں گریں گے مرے دیا جا کر
ایک موہوم سی امید ہے تجھ سے ودیہ
آج تک آیا نہیں کوئی میسج جا کر
دیکھ یہ حوصلہ میرا مرے بزدل دشمن
تجھ کو لشکر میں پکارا تِن تنہا جا کر
اُس شہِ حُسن کے دہرے ہے خیر دل کا ہجوم
یار ہم بھی نہ کریں عرصہ نمتا جا کر
ہم تجھے منع تو کرتے نہیں جانے سے فراز
جا اس کے دہ پہ مگر ہاتھ نہ پھیلا جا کر

نوشاہ منظور

میری ڈاڑھی میں تحریر امجد اسلام امجد کی یہ
غزل آپ سب قارئین بہنوں کے لیے۔
دل کے دیا کو کسی روز اتر جانا ہے
اتنا بے سمت نہ چل، لوٹ کے گھر جانا ہے
اُس تک آتی ہے تو ہر چیز ٹھہر جاتی ہے
جیسے پانا ہی اُسے، اصل میں مر جانا ہے

خامشی کو بیابان

انت الصبور

مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ آج میں جو ہوں ان رسائل کی بدولت ہوں۔ آنھویں جماعت سے چھپ چھپ کر خواتین پھر شعاع پڑھنا شروع کیا مار، ڈانٹ سب سہا۔ مگر رسائل کا ساتھ نہ چھوڑا۔ میں سمجھتی ہوں جو کچھ میں نے ان رسائل سے سیکھا شاید میری ماں اور اساتذہ بھی نہ سکھاپاتے۔

4 فضول رسموں سے چڑھے۔ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ اللہ کی پسند میں خوش رہیں۔ سکون ملے گا۔

5 پسندیدہ شعر نہیں اشعار ہیں۔ دو لکھ سکتی ہوں ثانی الحال۔

فکر زمانہ میں ' نہ تلاش معاش میں
میں در بدر ہوا ہوں تو اپنی تلاش میں

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسوہ خواب ہیں ہم
6 ادنیٰ سی شاعرہ ہوں۔ شاید اپنی یہ کاوش۔

جی ذاتی ہے۔۔۔
کہانی تو بس یہی ہے۔۔۔
اسے مجھ سے محبت نہیں ہے۔۔۔



عاصمہ رمضان۔۔۔ سوک کلاں گجرات

1 میں کون؟ نہ موسیٰ نہ فرعون۔۔۔ آہم۔۔۔ نام
عاصمہ رمضان۔۔۔ گجرات کے ایک بڑے سے گاؤں
سوک کلاں کی باسی ہوں۔۔۔ ڈگری والی تعلیم بی ایس سی
ہے۔ گود سے گور تک والی ابھی جاری ہے۔۔۔ جون کی
پہلی دوپہر کو آخری پریکٹیکل دے کر، فرصت کے
دنوں کے سہانے خواب دیکھتے گھر آئی تو ایک فیصلہ منتظر
تھا۔ والد صاحب کے اسکول میں معلمہ کے فرائض ادا
کرنے کو کہا گیا۔ اور ہم ان خوابوں کو دل کے ٹرنک میں
بند کر کے اگلے روز اسکول۔۔۔ وہ دن آج کا دن نکل نہیں
پائے۔ اللہ کا شکر کہ مجھ سی ناچیز کو اس عظیم پیٹے سے
وابستہ کیا۔۔۔ بچوں سے سیکھتی ہوں سکھاتی ہوں۔۔۔
بہت پیار ہے اپنے تمام سٹوڈنٹس سے۔۔۔ بہت۔

2 خوبیاں اور خامیاں ' سب ہیں مجھ میں۔۔۔
خامیاں زیادہ ہیں۔۔۔ بہت جلد اعتبار کر لیتی ہوں اور
جب پاتال میں گرتی ہوں تب ہوش آتا مگر پھر وہی
عادت۔۔۔ بھول جانے کی بری عادت ہے نا چاہتے
ہوئے بھی غلط کر جاتی ہوں۔۔۔ ان پرست ہوں جھکتی
نہیں ٹوٹ جاتی ہوں۔ خولی کہیے یا خالی۔۔۔ بہت
حساس ہوں، گزرتی سرد ہوا بھی اداس کر جاتی ہے۔
دوستی کے معاملے میں بہت سنجیدہ ہوں۔۔۔ دوست
زندگی کا حصہ ہیں نا۔۔۔

3 کتابیں اور رسائل پڑھنا میرا شوق ہے۔۔۔
شاعری میرا جنون۔۔۔ نہیں تجھ میں گردش کرتا خون
۔۔۔ موقع پر شعر کہنا بہت پسند ہے۔۔۔ عمیرہ احمد
راحت جبیں اور نمرہ بہت اچھی راشر ہیں نمرہ موسٹ
فیورٹ ہے۔ نمرہ کی تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اگر آج
مصحف مجھ سے بات کرتا تو اس کا کریڈٹ نمرہ کو جاتا۔

عید کے پکوان

خالدہ جیلانی

ناریل (کدو کش کیا ہوا) 1/2 کپ
چینی 1 کپ
ترکیب :

ساس پین میں گھی گرم کر کے الپچی ڈال کر کڑکڑائیں، اس میں سویاں، بادام، پستہ، چھوہارے، کشمش اور ناریل ڈال کر ہلکی آنچ پر فرائی کریں۔
سویاں ہلکی سنہری ہو جائیں تو چینی ڈال کر مکس کریں اور آنچ ہلکی کر دیں۔
دیپچی میں دودھ ڈال کر اتار پکائیں کہ ایک کلو دودھ باقی بچ جائے اسے سوپوں میں شامل کر کے ہلکی آنچ پر 5 منٹ تک مزید پکائیں۔ کیوڑہ ڈال کر ملا لیں اور چولہے سے اتار لیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر سرو کریں۔

کھیروں پسند

ضروری اشیا :

دودھ 1 لیٹر
چینی 125 گرام
چاول (ابال کر چھان لیں) 3/4 کپ
کھویا 125 گرام
چھوہارے، بادام، پستہ گارنشنگ کے لیے

ترکیب :

پتیلی میں دودھ تیز آنچ پر گرم کریں۔ ابال آجائے تو درمیانی آنچ پر دودھ کے گاڑھے ہونے تک پکائیں۔
چاول چوپر میں ڈال کر پیس لیں اور دودھ میں شامل کر کے مسلسل چمچ چلاتے ہوئے پکائیں، چینی ڈالیں اور مزید 10 منٹ تک پکائیں۔

عید کے دن گھر کی صفائی سے لے کر سجاوٹ و آرائش کے ساتھ عید کی خصوصی ڈشز کی تیاری بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ عید پر بطور خاص خصوصی پکوان تیار کیے جاتے ہیں۔ انواع و اقسام کی نمکین ڈشز کے ساتھ ساتھ مختلف میٹھے اور مٹھائیاں مہرخوان کی زینت ہوتی ہیں۔ عید کی روایتی مٹھائیاں، سویاں، شیر خورما تو لازمی ہیں، لیکن ان روایتی کھانوں کے ساتھ اب جدت کے رنگ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ نہ صرف گھر والوں کے لیے بلکہ گھر آنے والے مہمانوں کی تواضع کے لیے بھی خاص اہتمام ضروری ہوتا ہے۔

عید کے برسرِ موقع کے لیے ہم تاپ کے لیے مزے دار خوش رنگ، خوش ذائقہ اور آسان، نمکین اور میٹھی ڈشز کا انتخاب کیا ہے۔ آپ انہیں اپنے ہاتھ سے بنائیں اور گھر والوں اور مہمانوں سے داد وصول کریں۔

سویوں کا شیر خورما

ضروری اشیا :

ماریک سویاں 1 کپ
گھی 1 کھانے کا چمچ
چھوٹی الپچی (کوٹ لیں) 4 عدد
دودھ ڈیڑھ لیٹر
کیوڑا 1 کھانے کا چمچ
بادام (سلائس کاٹ لیں) 10 عدد
پستہ (سلائس کاٹ لیں) 10 عدد
چھوہارے (سلائس کاٹ لیں) 8 عدد
کشمش 1/4 کپ

کھیر گاڑھی ہو جائے تو کھویا ڈال کر کس کریں اور سرونگ ڈش میں نکال کر چھوہارے، بادام اور پتے سے گارنش کریں، کھیر دل پسند تیار ہے ٹھنڈا کر کے سرو کریں۔

مینگو جیلی ٹرائفل

ضروری اجزا :

1/2 کلو (کیوب کاٹ لیں)

حسب ضرورت

(1 کلو دودھ سے تیار کریں)

1 پیکٹ

1 پیکٹ

1 کھانے کا چمچ

آم
مینگو کشرڈ

کریم
مینگو جیلی

بادام
(سلائس کیے ہوئے)

ترکیب :

ڈش میں تیار کشرڈ ڈال کر اس کے اوپر مینگو سلائس پھیلا میں۔ اب تیار جیلی کے کیوب ڈالیں۔ جیلی کے اوپر کریم ڈالیں۔ بادام سے گارنش کر کے ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

چکن تمپورا

ضروری اشیا :

انڈے

چکن

کارن فلور

میدہ

نمک

کالی مرچ پاؤڈر

لسن پیسٹ

تیل

ترکیب :

چکن کے 1/2 انچ چوڑے اسٹریپس کاٹ لیں۔ پیالے میں نمک، کالی مرچ پاؤڈر اور لسن ڈال کر

ملا میں اور اس میں چکن اسٹریپس ڈال کر 1/2 گھنٹے کے لیے میرہنیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ انڈوں کی سفیدی علیحدہ کر کے پھینٹ لیں۔ پیالے میں سفیدی، کارن فلور، میدہ اور نمک شامل کر کے آمیزہ تیار کریں۔

چکن اسٹریپس کو اس آمیزے میں ڈپ کر کے ڈیپ فرائی کریں۔

دونوں طرف سے سنہری ہو جائیں تو نکال کر کیچپ یا چلی گارلک ساس کے ساتھ سرو کریں۔

چکن کارن پکوڑے

ضروری اشیا :

چکن (بون لیس، چھوٹی بوٹی) 1 کپ

شملہ مرچ 1/2 کپ

(چھوٹے کیوبز کاٹ لیں)

ہرا دھنیا (باریک چوپ کریں) 1/2 کپ

ہری مرچیں (چوپ کریں) 2 عدد

انڈے 1-2 عدد

لال مرچیں (کٹی ہوئی) 1/2 چائے کا چمچ

زیرہ 1/2 چائے کا چمچ

بھٹے کے دانے (ابلے ہوئے) 1 کپ

پیاز (باریک چوپ کریں) 1/2 کپ

میدہ 3-4 کھانے کے چمچے

ڈبل روٹی کا چورا 1/2 کپ

نمک حسب ذائقہ

سویا ساس 1 چائے کا چمچ

ترکیب :

چکن، شملہ مرچ، ہرا دھنیا، ہری مرچوں کو ایک پلیٹ میں رکھیں۔ تمام مسالاجات ایک جگہ کریں۔

ایک پیالے میں چکن، پیاز، شملہ مرچ، بھٹے کے دانے، ہرا دھنیا، ہری مرچیں، نمک، کٹی ہوئی لال

مرچیں، زیرہ، میدہ، ڈبل روٹی کا چورا، سویا ساس اور انڈے کو اچھی طرح ملا کر تھوڑی دیر چھوڑ دیں۔

ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں اور چھوٹے پکوڑے ڈال کر فرائی کریں۔
پکوڑوں کو دہی کی چٹنی، کھچپ کے ساتھ سرو کریں۔

گوشت 1/2 کلو
باشستی چاول 1/2 کلو
(15 منٹ کے لیے بھگو دیں)

دہی 1/2 کپ
سفید زیرہ 1 چائے کا چمچ
ثابت گرم مسالا 1 چائے کا چمچ
اورک، لہسن پیسٹ 1 کھانے کا چمچ
پیاز (سلائس کاٹ لیں) 2 عدد
سونف پاؤڈر 1 چائے کا چمچ
دھنیا پاؤڈر 1 چائے کا چمچ
نمک حسب ذائقہ
گھی حسب ضرورت

ترکیب :

دیکھی میں گھی گرم کر کے پیاز کو سنہرا ہونے تک فرائی کر لیں اس کے بعد اس میں ثابت گرم مسالا، گوشت، اورک اور لہسن کا پیسٹ ڈال کر فرائی کر لیں، اور دہی بھی ڈال دیں اس کے بعد اس میں سونف پاؤڈر

دھنیا پاؤڈر اور نمک ڈال کر بھون لیں اور گوشت گلانے کے لیے پانی ڈال دیں جب گوشت گل جائے تو چاول ڈال کر 3 گلاس پانی شامل کر دیں۔ پانی خشک ہونے لگے تو دم پر رکھ دیں۔ پلاؤ کو 10-15 منٹ تک ہلکی آنچ پر دم دیں اور سرونگ ڈش میں نکال کر سرو کریں۔

گلاب جامن

اجزا :
خشک دودھ 1 پیالی
سوئی آدھی پیالی
میدہ آدھی پیالی
پھیکا کھویا آدھی پیالی
پیکنگ پاؤڈر چوتھائی چائے کا چمچ
تیل دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

ان سب چیزوں کو اچھی طرح ملا کر آٹے کی طرح گوندھ لیں اور پانچ منٹ کے لیے رکھ دیں۔ پھر چھوٹے چھوٹے پیڑے بنالیں۔

شیر بنانے کے لیے اجزا :

چٹنی دو پیالی
پانی 1 پیالی
چھوٹی الائچی آٹھ عدد
(دانے نکال کر باریک پیس لیں)

ترکیب :

چٹنی میں پانی ملا کر ہلکی آنچ میں شیرہ بنالیں۔ جب شیرہ بننے لگے تو الائچی ڈال کر اتار لیں۔ ایک کڑاہی میں گھی گرم کر لیں جب گھی تیز گرم ہو جائے تو ہلکی آنچ کر کے پیڑے تلنا شروع کریں۔ جب براؤن ہو جائیں تو نکال کر شیرے میں ڈال دیں۔ گلاب جامن شیرے میں ڈال کر ہلکی آنچ کر کے دم پر رکھ دیں۔

لاہوری پلاؤ

ضروری اشیا :

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

نصیحتیں

منہ احمد

ایک گلاباوری خانہ

مسرت سلیم

مسرت سلیم.... لاہور

ایک یاؤ
ایک ایک عدد

چکن بون لیس
بند گو بھی، آلو، گاجر
(کش کیے ہوئے)

آدھی پیالی
دو عدد (پھینٹ لیں)
ایک کپ

مٹر (ابلے ہوئے)
انڈے
دودھ

حسب ضرورت
حسب ضرورت
حسب ضرورت
آدھا چمچہ
حسب پسند
حسب پسند

بریڈ کرمز
آئل
نمک
کالی مرچ
چاٹ مصالحہ
سرخ مرچ
ترکیب :

چکن اہال کر ریشے ریشے کر لیں۔ اب اس میں کش کی ہوئی بند گو بھی، آلو، گاجر اور ابلے مٹر شامل کریں باقی کے تمام مسالا جات بھی شامل کر دیں اور دیکھی میں ایک چمچہ آئل ڈال کر ہلکا فرائی کر لیں تاکہ سبز یوں کا کچا پن ختم ہو جائے ایک کھلے برتن میں ایک کپ دودھ ڈال کر ڈبل روٹی کے سلائس کو دونوں طرف سے اس میں ہلکا ہلکا ڈپ کریں۔ اب ایک ہاتھ پر سلائس رکھیں دوسرے ہاتھ سے ہلکا ہلکا دبا کر زائد دودھ نچوڑ دیں۔ اس سلائس پر چکن کا مسالا رکھیں اور دونوں ہاتھوں سے دبا کر رول کی شہپ دے لیں اب اسے پھینٹے ہوئے انڈے میں ڈپ کر کے بریڈ کرمز لگائیں اور ٹپ فرائی کریں بے حد لذیذ رول تیار ہیں کہ چمپ کے ساتھ پیش کریں۔

3 میرا کچن چونکہ امریکن اسٹائل میں ہے (اوپن

1 میری روٹین بہت ٹف ہے کیونکہ میں ایک ٹیچر ہوں اس لیے گھر، اسکول کی جاب، بچے اور ان کی پڑھائی اور پھر اپنی پڑھائی ان سب میں سے کچن کے لیے ٹائم نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے بلکہ (کچن میں سے باقی مصروفیات کے لیے ٹائم نکالنا) اس لیے میں پسند و ناپسند کے علاوہ یہ خیال رکھتی ہوں کہ جو چیز جلدی اور آسانی سے بن جائے وہی بنا لوں۔ گھر میں کسی سے پوچھوں کہ آج کیا پکاوں؟ تو میاں صاحب کی آواز آتی ہے سبزی والے سے پوچھ لو کہ بھائی کون سی سبزی جلدی پکتی ہے وہ پکا لو اللہ اللہ خیر صلا۔
اس لیے میں کوشش کرتی ہوں کہ اتوار کو ایک دو کھانے بنا کر فریز کر دوں تاکہ آسانی رہے۔ (میں بھی خوش گھر والے بھی خوش)“

2 میری فیملی کو پتا ہے کہ یہ اپنی جاب کی وجہ سے گھر میں دستیاب نہیں ہوتی اس لیے زیادہ تر اطلاع دے کر ہی آتے ہیں۔ اگر (خدا نخواستہ) اچانک آ بھی جائیں تو پھر فریز کیا ہوا سالن، کباب زندہ باد یا پھر چکن اور قیمہ میں سے فٹ کچھ تیار کیا، چٹنی سلاو بنا کر مہمان بھگتا دیا جاتا ہے۔
وئے تو الحمد للہ سب ہی کھانے کی تعریف کرتے ہیں لیکن اس وقت رمضان کے حوالے سے اسپیشل بریڈ رول کی ترکیب لکھ رہی ہوں جس کی اکثر فرمائش کی جاتی ہے۔

چکن ویجی ٹیبل بریڈ رول

اجزا :

ڈبل روٹی (درمیانی) ایک عدد

کیونکہ موسم کے حساب سے نہ ہو تو میاں صاحب کا موسم خراب ہو جاتا ہے۔ گرمیوں میں شربت، جوس، ملک شیک، قیمہ کر لیے خاص طور پر پسند کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح سردیوں میں اکثر سری پائے سوپ اور خاص طور پر گاجر کا حلوہ بنا کر رکھتی ہوں اور بارش کا موسم ہو تو میرے بچے ہی مجھے نلکنے نہیں دیتے۔ لائن بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں احتجاج کرنے کہ آج بارش ہے، ہمیں تو میٹھے پڑے بنا کر دیں (ایک اور شوشہ) ورنہ آج کھانے پر دھرنا ہو گا (لوحی پھر دھرنا) اور میاں صاحب تو ہر موسم کو ثواب سمجھ کر مہلبریٹ کرتے ہیں، بھئی آج سخت گرمی ہے شام کو ابلے چاول اور دال اور ساتھ میں ملک شیک۔ سخت سردی ہے تو چائے، سوپ، یا کافی والی چائے کے ساتھ گاجر کا حلوہ تو لازمی ہے (ورنہ سخت گناہ ہو گا)

ہے) اس لیے اسے صاف رکھنا شوق بھی ہے اور مجبوری بھی، وہ اس طرح کہ ماشاء اللہ سے تین بیٹے ہیں (اور میں گھر کی اکلوتی لڑکی آہم) تو ایک اگر ایک گلاس میں پانی پیے گا تو دوسرا تیسرے گلاس میں پیے گا اور مجال ہے کہ کبھی گلاس کچن میں ملے اور میں بے چاری کبھی فریج میں پانی کی بوتلیں بھرنے یا گلاس پورے کرنے میں لگی رہتی ہوں اور کچن میں کام کرتے ہوئے میری کنسٹری ان پھوٹربچوں پر جاری رہتی ہے اور میرے کنسٹری کرنے پر میاں صاحب بچوں سمیت باجماعت تالیاں پیٹنے کا سین کرتے کرتے رہ جاتے ہیں (آخر کو اکلوتی بیگم کی گھوریوں میں بڑی طاقت ہوتی ہے)

4 (اندرون لاہور کے رہنے والے ہوں اور ناشتے میں اہتمام نہ ہو) جی یہ ہو سکتا ہے کیونکہ ٹائم نہیں ہوتا (اہتمام کرنے کا) زیادہ تر انڈہ، بریڈ، جام، مکھن پر رخصتی ہوں، چھٹی والے دن خاص اہتمام ہوتا ہے کبھی نان پنے (سردیوں میں سری پائے) بن مکھن، حلوہ پوری، مولیٰ کے پرائٹھے، مغز کا سالن اور پرائٹھے وغیرہ چلتے ہیں۔

5 لاہوریوں کا تو مہینے میں کم از کم ایک آدھ دفعہ باہر کھانا تو ثواب کا کام ہے اس لیے کبھی میاں کی جیب اور کبھی میری سیلری ملنے کے بہانے باہر چلے جاتے ہیں۔ یا گھر پر ہی بچے باہر سے کچھ منگوا کر پارٹی کرتے ہیں۔

6 کھانا موسم کے حساب سے ہی اچھا لگتا ہے

اور برسات میں پکوڑے، چپس، میٹھے پڑے یا گڑ والے چاول تو لازمی بنتے ہیں۔

7 جو کھانا محنت توجہ اور محبت سے بنے وہ دل ہی نہیں معدہ بھی جیت لیتا ہے اور کھانا ہمیشہ اچھے برتنوں میں پیش کریں (بقول میاں اس طرح کھانے کی ویلیو بڑھ جاتی ہے اور آخر میں ضروری انتباہ! ڈائجسٹ ہمیشہ مسالا بھوننے کے بعد پڑھیں اور پڑھتے وقت ہمیشہ ایک کیبنٹ یا دراز کھلی رکھیں تاکہ چھپانے میں آسانی رہے محکمہ رسالیات حکومت شوقستان۔

دعائے مغفرت

ہمارے ادارے کے دیرینہ کارکن، ہمارے ساتھی عابد صاحب کے بڑے بھائی محمد صدیق اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَاَنَا اِلَيْهِ رَاٰجِعُوْنَ۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ صاحب کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی خطاؤں کو درگزر کر کے ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔ اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

قارئین سے بھی دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

خبرگاہ ویرا

واصفہ سہیل

ہے، لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہماری بنیاد کیا ہے۔ (ویسے کیا ہے... نور صاحب؟) مجھے خوشی ہے کہ نئے فنکار موقع سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ (کب نہیں اٹھاتے؟) لیکن انہیں یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ جہاں بھی جاتے ہیں انہیں پاکستان کا سفیر سمجھا جاتا ہے۔ (اور سفیروں کو...) اس لیے اپنی حدود کا خیال رکھیں۔ (حدود کا تعین کون کرے گا نور صاحب!) ایک پاکستانی اداکار راتوں رات بولی ووڈ کا ستارہ بن سکتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک ہمارے شان کی شاہ رخ خان سے زیادہ عزت و اہمیت ہے۔ (جب تک شاہ رخ سامنے نہ آئے جب تک ہے نا؟)



افادیت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کو روزہ کھجور سے افطار کرنے کا کہا گیا ہے۔ تاہم اگر کھجور دستیاب نہ ہو تو پانی سے روزہ کھولیں۔ سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں کنگ سعود میڈیکل کے آئی سی یو اسپیشلسٹ محمد شمیم کا کہنا ہے کہ کھجور سے روزہ کھولنے میں سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ روزے کی حالت میں جسم - گلوکوز سے محروم ہو کر نڈھال ہو چکا ہوتا ہے۔ کھجور کھانے سے وہ گلوکوز جسم کو حاصل ہو جاتی ہے۔ افطار کے وقت کھجور کھانے سے معدہ فعال ہو جاتا ہے۔ کھجور میں حل پذیر ریشے کی مقدار بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے جو لوگ کھجور سے روزہ کھولتے ہیں انہیں قبض کی شکایت نہیں ہوتی، کھجور خون میں تیزابیت کے اثرات دور کر دیتی ہے۔

شکایت

معروف گلوکارہ منی بیگم کا کہنا ہے کہ ”پرائیڈ آف پرفارمنس“ ہے کیا چیز؟ تین لاکھ روپے اور پیتل کا ایک ٹکڑا بس... (اسی پیتل کے ایک ٹکڑے کو حاصل کرنے کے لیے بعض فنکار ساری زندگی محنت کرتے ہیں۔ پھر بھی...) تین لاکھ روپے تین دن میں



اہمیت

سید نور پاکستانی فنکاروں کے بھارتی فلموں میں کام کرنے کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ ایک اچھی تبدیلی

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے تسلی دیتے ہیں اور ان کی مسکراہٹ دیکھ کر میں اپنی ساری تکلیفیں بھول جاتی ہوں۔

خرچ ہو جاتے ہیں۔ (چاہیں تو تین منٹ میں ہی خرچ ہو سکتے ہیں، مگر یہ پاکستان ہے بھیا۔۔۔ یہاں۔۔۔) تین لاکھ میں ایک کمرہ یا ایک جھگی بھی نہیں آتی۔ (اس میں تو کوئی شک نہیں۔) پتا نہیں حکومت پرائیڈ آف پرفارمنس کیوں دیتی ہے۔ (زخموں پہ مرہم رکھنے کے لیے) انہوں نے مزید کہا کہ فن کاروں کو عزت اور مقام ملنا چاہیے، یہاں تو فن کاروں کے پاس قبر خریدنے کے پیسے بھی نہیں ہیں۔

منی بیگم کو پنجاب حکومت سے بھی شکایت ہے کہ انہوں نے فن کاروں کو بھکاری بنا دیا ہے۔ اس طرح ہر مہینے چند ہزار روپے دینے سے بہتر ہے کہ چند فنکاروں کو یکمشت اتنی رقم دے دی جائے کہ وہ اپنا گھر یا اپنے لیے زمین ہی خرید سکیں۔ (تجویز تو آپ کی بری نہیں ہے، لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جب یہ فنکار اپنے عروج پر ہوتے ہیں۔ اتنا کماتے ہیں انہیں تب گھریا زمین لینے کا خیال کیوں نہیں آتا جو۔)

غرور

صنم ماروی کہتی ہیں کہ عابدہ پروین کو میں اپنے ہر پروگرام میں یاد رکھتی ہوں۔ (ظاہر ہے آپ کے پاس گانے کو کچھ اور ہے ہی نہیں) وہ میرے لیے ایک خزانہ ہیں۔ ان کو سن سن کر میں نے گانا شروع کیا۔ (اور اب ان کو گا گا کر۔؟) میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی، میں نے چھوٹی عمر میں دنیا گھوم لی۔ (اف کم

عمری۔) اور یہ سب میرے بزرگوں کے کلام کی وجہ سے ہے۔ میں نے کبھی غرور کو اپنے نزدیک نہیں آنے دیا۔ (بھئی دوسروں کو گا کر غرور کیسا۔)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ امریکا بہادر نے پچھلے ایک برس سے ڈاکٹر عافیہ صدیقی پر فون پر رابطے کے بھی ذرائع بند کر رکھے ہیں۔ پچھلے برس فون پر بات ہوئی تھی تو عافیہ نے کہا تھا۔ امی سے کہیں افسردہ نہ ہوا کریں۔ مجھے خواب میں رسول

امریکی جیل کے حکام حیران ہیں کہ اس قدر سختی اور مظالم کے باوجود یہ لڑکی اس قدر پرسکون اور مطمئن کیوں ہے۔

(ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی بہن فوزیہ صدیقی کی بات چیت) ☆ کیا یہ اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے لیے ڈوب مرنے کا مقام نہیں ہے، جن کے گھر میں کھانے کے لیے ایک کھجور نہیں ہوتی تھی، لیکن دیوار پر 9 تلواریں اور 7 زہریں لٹک رہی ہوتی تھیں جو اس قدر پریکٹیکل تھے۔ زندگی میں 27 غزوات میں خود شریک ہوئے جو تاجر بھی تھے۔ معلم بھی تھے اور مبلغ بھی تھے۔ جنہوں نے زندگی میں ایک لمحہ ضائع نہیں کیا، جو گھوڑے سے اترتے تھے تو صفحہ کے اصحاب کو پڑھانے لگتے تھے۔ وہاں سے فارغ ہوتے تھے تو بیماروں کی عیادت کرتے تھے۔ وہاں سے نکلتے تھے تو بازار میں تاجروں کے مسائل سنتے تھے۔ وہاں سے نکلتے تھے تو مسجد آجاتے تھے۔ جو رات کے وقت اہل خانہ کی تربیت فرماتے تھے۔ اگر پھر بھی وقت بچ جاتا تو وہ اپنے جوتے گانٹھ لیتے تھے۔ لشکر کو بدر کے میدان میں لاتے تھے اور پھر اللہ سے نصرت کی دعا کرتے تھے۔

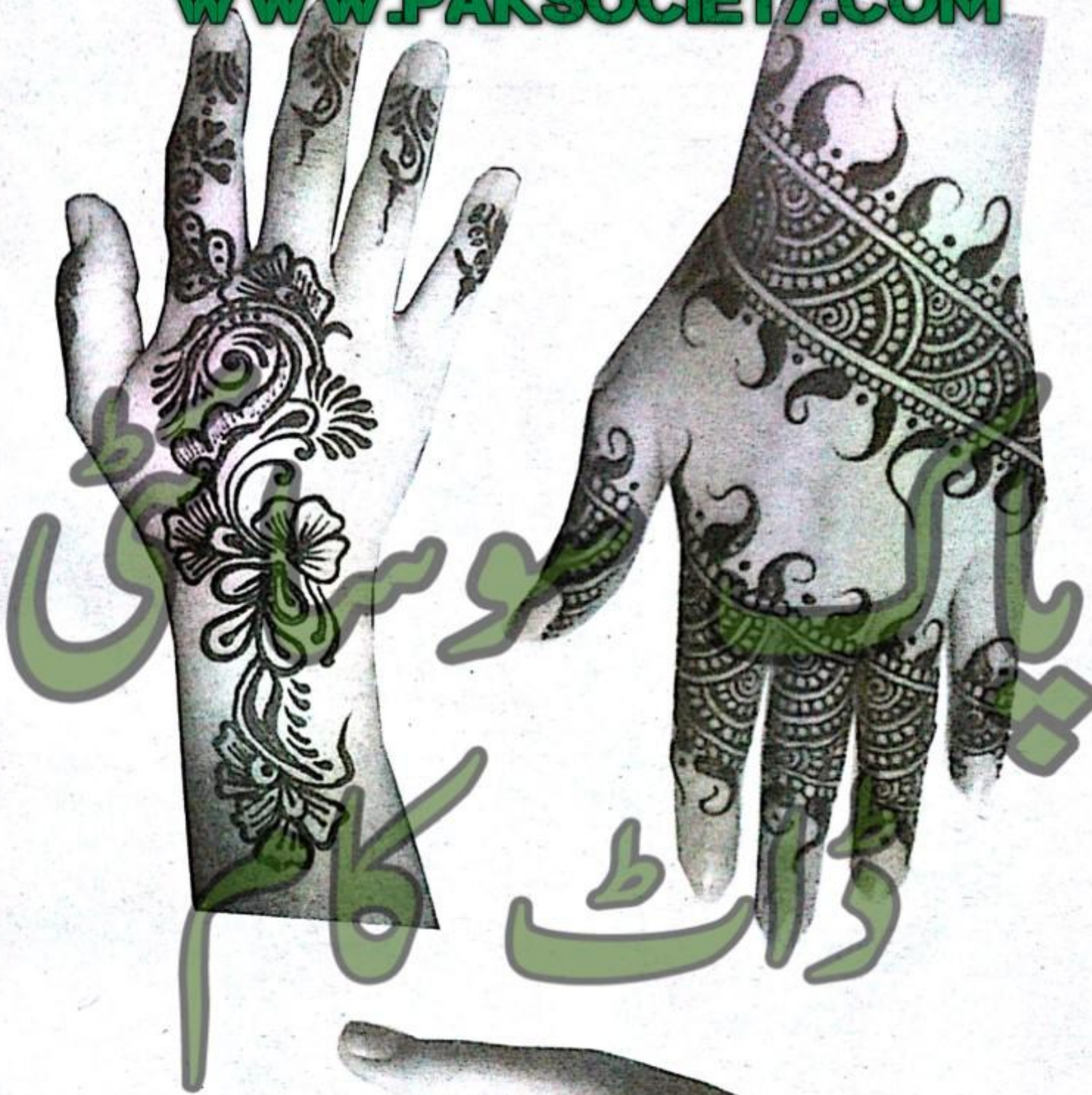
لیکن ہم علم اور عمل کے بغیر دعا کے ذریعے اپنے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ (جاوید چوہدری)



ادارہ



PAKSOCIETY.COM



پاکستان
 ڈاٹ کام
 سوسائٹی
 ڈاٹ کام

77 "اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟"
 "بہت بار.... بس کچھ لوگوں کے ہاتھ لگ جائے تو جان نہیں چھوڑتے تو بدلنا پڑتا ہے۔"
 78 "کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"
 "چار جر فون، والٹ اور پرفیوم اور پیسے۔"
 79 "شہرت نے مسئلہ کیا؟"
 "نہیں ہرگز نہیں۔ میں تو اب بھی وہی ہوں جیسی پہلے تھی اور اتنے بچپن سے کام کر رہی ہوں۔ اس لیے مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔"
 80 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"
 "بالکل جی.... بہت آسانی سے۔"
 81 "اپنی اچھی اور بُری عادت بتائیں؟"
 "برمی تو یہ کہ میں بولتی بہت ہوں۔ لوگوں کو کہنا پڑتا ہے چپ ہو جاؤ اور اچھی یہ کہ کبھی کسی کے بارے میں بُرا نہیں سوچا۔"
 82 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
 "کھانے پینے پہ غصہ نہیں اتارتی۔"
 83 "غصے میں پہلا لفظ کیا منہ سے نکلتا ہے؟"
 "لفظ کوئی نہیں نکلتا بلکہ میں ہی کمرے سے نکل جاتی ہوں۔"
 84 "مارنگ شو کیسے لگتے ہیں؟"
 "کوئی خاص نہیں۔"
 85 "کبھی سوچا کہ کاش میں اس فیلڈ میں نہ ہوتی؟"
 "نہیں نہیں ایسا کبھی نہیں سوچا۔ ہاں جب فیملی کو ٹائم نہیں دے پاتی تو کہتی ہوں کہ کاش میں تھوڑا کام لے لیتی۔"
 86 "نیند جلدی آتی ہے؟"
 "کوشش تو ہوتی ہے کہ تسبیح پڑھ کر سو جاؤں کیونکہ اس سے خواب بہت ملتا ہے، مگر مجھے نیند مشکل سے آتی ہے۔"
 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
 "اللہ نہ کرے جی۔"

65 "مستقبل کے لیے کیا سوچا؟"
 "کہ بہت بڑی ڈائریکٹر بنوں۔ بہت بڑی ڈی او پی بنوں اور اچھی تعلیم حاصل کر کے فلم انڈسٹری کو کچھ دوں۔"
 66 "کھانے کون سے پسند ہیں وہی یا بدہی؟"
 "مجھے وہی کھانے ہی پسند ہیں۔ بریانی، تگہ۔"
 67 "ایک کھانا جو آپ بہت اچھا پکالتی ہیں؟"
 "کڑاہی، چکن کی۔"
 68 "نرم دل کون ہوتا ہے؟"
 "مرد بھی کبھی کبھی بہت نرم دل کے ہو جاتے ہیں اور عورت تو خیر ہوتی ہی ہے۔"
 69 "ہاتھ میں ذائقہ کس کے ہوتا ہے۔ مرد یا عورت؟"
 "آج کل کے دور میں مرد ک زیادہ ہو گئے ہیں۔ تو دونوں کے ہاتھ میں ذائقہ ہوتا ہے۔"
 70 "بو تھیک یا درزی کیا پسند ہے؟"
 "ریڈی میڈ بھی لے لیتی ہوں اور امی بھی ڈیزائن بنا کر سلواتی ہیں۔"
 71 "کن کپڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
 "کپڑوں سے ڈر نہیں لگتا۔ البتہ چھپکلی سے ڈر لگتا ہے۔"
 72 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"
 "بالکل ہوتی ہے۔"
 73 "بہت تکلیف ہوتی ہے؟"
 "جب انسان غصے میں دل کی بات کر دے اور منہ سے نکلی بات کبھی واپس نہیں آتی، مگر دل کا حال تو معلوم ہو جاتا ہے۔"
 74 "مزاج میں نخرے ہیں؟"
 "بالکل نہیں خاص طور پر کھانے پینے کے معاملے میں تو بالکل نہیں ہیں۔"
 76 "پاکستان کی کس تاریخی شخصیت سے ملنا چاہتی ہیں؟"
 "قائد اعظم اور ہاں عمران خان سے بھی ملنا چاہتی ہیں۔"

گھٹیا لڑکی گھٹیا

س۔ع۔ ڈیرہ غازی خان

آپ کے بہنوئی شروع سے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ آپ کے والد کے دیے پیسوں سے وہ باہر گئے، لیکن وہاں بھی کوئی کام نہیں کیا۔

جب وہ ملک سے باہر تھے تو بہن نے کسی سے رائگ نمبر ربات کی۔ یہ بہن کی غلطی تھی۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن غلطی انسان سے ہوتی ہے اور غلطی کی معافی ہے۔ بشرطیکہ انسان سچے دل سے توبہ کر لے۔ جبکہ آپ کی بہن کے سرال والوں نے تو اسے مارا بھی ہے۔ اب بہن میکے میں ہے، بچے سرال والوں کے پاس ہیں اور بہنوئی اسے گھر لے جانے پر تیار نہیں ہے، جبکہ بہن شرمندہ ہے اور روتی رہتی ہے۔

آپ نے پوچھا ہے کیا اسے طلاق لے کر دوسری شادی کر لینا چاہیے؟

نی الحال نہیں اور اس صورت میں جبکہ وہ مزید بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے، دوسری شادی مسئلہ ہو سکتی ہے۔ دوسری شادی کی صورت میں اسے اپنے بچوں کی جدائی برداشت کرنا پڑے گی۔ پہلا شوہر بچے نہیں دے گا اور بالقرض دے بھی دے تو دوسرا شوہر بچوں کو قبول نہیں کرے گا۔

کورٹ میں جا کر بچے لینا بھی آسان نہیں ہے۔ کیونکہ بقول آپ کے گھر میں کوئی اس کے ساتھ کورٹ جانے پر رضامند نہیں ہوگا۔ پھر کورٹ کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے، جبکہ گھر میں کوئی تعاون کرنے کو تیار نہیں ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شوہر بچے دے دے گا تو آپ کی بہن بچوں کی پرورش کیسے کرے گی، جبکہ اس کی کوئی خاص تعلیم بھی نہیں ہے کہ وہ کوئی اچھی نوکری کر سکے۔

ان حالات میں صرف یہ ہی صورت بہتر نظر آتی ہے کہ آپ کی بہن کوئی ہنر سیکھ کر آمدنی کا ذریعہ پیدا کرنے کی کوشش کرے، کیونکہ شوہر کوئی کام نہیں کرتا، اس لیے امکان یہ ہی ہے کہ زیادہ دیر بچوں کو اپنے پاس نہیں رکھ سکے گا اور آپ کی بہن کے پاس چھوڑ جائے گا۔

دوسری شادی کے بارے میں فی الحال نہ سوچیں، ممکن ہے تھوڑا وقت اور گزرے تو کوئی صورت نکل آئے۔ آپ کے بھائیوں کا رویہ قابل مذمت ہے۔ انہیں بہن کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔

فارہ

کوئی بھی چیز جو حد سے بڑھ جائے نارمل نہیں رہتی۔ آپ کے والد کی حد سے بڑھی ہوئی کنجوسی بھی ایک قسم کی ذہنی بیماری ہے، لیکن اس کا علاج ممکن نہیں ہے، کیونکہ والد خود کو کبھی بھی بیمار تسلیم نہیں کریں گے۔ آپ نے لکھا ہے کہ یونیورسٹی میں داخلہ لے کر رشتہ ڈھونڈ لوں، اچھی بہن یونیورسٹی علم حاصل کرنے کی جگہ ہے، رشتہ کرنے کی نہیں اور یہ کوئی یقینی بات نہیں کہ آپ کو وہاں رشتہ مل جائے گا۔ پھر یونیورسٹی میں داخلہ ملنا اور وہاں کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے، کیونکہ آپ کے والد تو پیسہ خرچ کرنے کو تیار نہیں۔

آپ نے اپنی والدہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ کیا وہ بھی والد صاحب کے ساتھ ہیں؟ آپ ان سے بات کریں۔ ان حالات میں آپ کے لیے مشورہ یہ ہے کہ آپ کوئی کورس کر کے کہیں جاب کرنے کی کوشش کریں،

WWW.PAKSOCIETY.COM
تاکہ شادی کے اخراجات کے لیے کچھ رقم جمع کر سکیں۔ شاید اس صورت میں آپ کے والد آپ بہنوں کی

www.paksociety.com

شادیاں کر دیں۔

سارہ۔ کراچی

اچھی بہن کسی سے فون پر بات کر کے اس کے عشق میں مبتلا ہو جانا محبت نہیں حماقت ہے۔ آپٹی وی اور

فلمیں دیکھنا بند کر دیں۔ اس طرح کی چیزیں حقیقی زندگی میں نہیں ہوتیں۔ وقت گزاری کے لیے میٹھی میٹھی باتیں کرنا الگ بات ہے۔ شادی بالکل علیحدہ بات ہے اس کا شروع سے ہی شادی کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ آپ سے فون پر باتیں کرتا رہا۔ محبت کا اظہار کرتا رہا۔ شادی کا وقت آیا تو پیچھے ہٹ گیا اس کا صاف مطلب ہے کہ وہ وقت گزاری کر رہا تھا اور آپ اس پر یقین کر بیٹھیں، اپنی نہیں تو والدین کی عزت کا خیال کریں۔ جو شخص آپ سے ملنا ہی نہیں چاہتا اس کے پیچھے خوار ہونا یا گل پن ہے۔ جتنی جلد اس پر یا گل پن سے نکل جائیں آپ کے لیے بہتر ہے۔

سعدیہ۔ لاہور

آپ کی شادی کو صرف ایک ماہ گزرا ہے اور اتنے مسائل لھڑے ہو گئے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی مسئلہ بہت بڑا نہیں ہے۔ اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ شادی کے بعد فوراً ہی شوہر آپ کے اشاروں پر چلنے لگے گا تو یہ آپ کی بھول ہے۔ آپ بہت ساری باتیں شوہر سے منواسکتی ہیں لیکن پہلے آپ کو اس کا دل جیتنا ہوگا۔ خود کو اس کی مرضی کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔ جس ماحول سے آپ آئی ہیں۔ سسرال کا ماحول اس سے یکسر مختلف ہے، ان لوگوں میں کچھ خامیاں ہیں آپ ان لوگوں کو بدلنا چاہتی ہیں یہ کام اتنا آسان نہیں، ان کو بدلنے میں وقت لگ سکتا ہے۔ اگر آپ نے سچے دل سے اور خلوص سے کوشش کی تو یقیناً کامیاب ہوں گی۔ لیکن بہت محتاط انداز سے اور نرمی سے کوشش کرنا ہوگی۔ نوکری کے لیے شوہر اجازت دیں تو کر لیں۔ اسے انا کا مسئلہ نہ بنائیں۔ زندگی کا مضبوط بنیادوں پر استوار ہونا ضروری ہوتا ہے۔ حالات سے سمجھو تا کر کے ہی زندگی گزر سکتی ہے ورنہ تماشای بننا

ہے۔ روزینہ۔ کراچی

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے غصہ بہت جلدی آجاتا ہے۔ میں ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں شادی سے پہلے بھائیوں کی لاڈلی تھی اب بھی میرے بھائی مجھے بہت چاہتے ہیں خیال کرتے ہیں۔ میرے اندر حسد بھی بہت ہے میں اپنی نندوں جٹھانیوں اور بھانجیوں کو خوش دیکھتی ہوں میرے اندر آگ سی بھڑک جاتی ہے مجھے لگتا ہے کہ ان خوشیوں پر صرف میرا حق ہے۔ میں اپنے خود ساختہ دکھوں سے پریشان رہتی ہوں الحمد للہ میرے شوہر اور بچے بھی بہت اچھے ہیں۔

ج : یہ بہت اچھی بات ہے کہ آپ کو اپنی خامیوں کا اندازہ ہے انسان کو جب اپنی خامیوں کا ادراک ہو جائے تو انہیں دور کرنا مشکل نہیں ہوتا۔

غصہ جلد آنے اور حسد کی وجہ تو آپ نے خود لکھ دی ہے شادی سے پہلے آپ بھائیوں کی لاڈلی تھیں۔ اب بھی آپ کے بھائی آپ کو چاہتے ہیں لیکن آپ ان کی محبت پر بلا شرکت غیرے اپنا حق سمجھتی ہیں بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ آپ ہر چیز پر صرف اپنا حق سمجھتی ہیں۔ خواہ شوہر ہوں یا بھائی، آپ ان کی محبت میں کسی کی شراکت برداشت نہیں کر سکتیں۔ بھائیوں کے بیوی بچوں کو خوش دیکھ کر آپ کو جلن ہوتی ہے۔ نندوں جٹھانیوں کے ساتھ آپ کا رویہ یہی ہے۔ اس رویہ سے آپ دوسروں کو کم اور خود کو زیادہ نقصان پہنچا رہی ہیں، آپ نے اپنا رویہ نہ بدلا تو اپنی صحت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گی۔ جب بھی آپ کے دل میں جلن حسد کا جذبہ پیدا ہو لا حول پر دھیں اور شیطان سے پناہ مانگیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
پاکستان ڈائجسٹ 289 جولائی 2015ء

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

بالوں کو نمی فراہم کرتا ہے۔
 کچا دودھ
 تین کھانے کے چمچے
 کیا
 شہد
 ایک عدد
 ایک کھانے کا چمچ
 ایک کھانے کا چمچ
 زیتون کا تیل

ترکیب : ان تمام اشیاء کو بلینڈر میں ڈال کر پیسٹ بنالیں بلینڈر نہ ہو تو آپ کانٹے کی مدد سے بھی کیلے کو میس کر سکتی ہیں۔

اب اس پیسٹ کو بالوں میں لگا کر ایک گھنٹہ تک چھوڑ دیں۔ اس کے بعد پانی سے دھو کر صاف کر لیں اور پھر شیمپو استعمال کریں۔ آپ کے بال چمکیلے اور لچک دار ہو جائیں گے۔

س : میری بھنویں پہلے بہت گھنی اور اچھی تھیں، لیکن پتا نہیں کیا ہوا کہ ہلکی اور جھڑنا شروع ہو گئیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے انہیں شیب دینے کے لیے کئی بار تھریڈنگ اور پلکنگ کروائی تھی۔ اب مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں۔

ج : بھنویں کبھی کبھی وراثت کے اثرات کی وجہ سے بھی چھدری ہوتی ہیں، لیکن آپ کی پہلے گھنی تھیں اب جھڑنا شروع ہوئی ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے کچھ اس قسم کی کاسمیٹکس استعمال کی ہیں جن سے جلد کو نقصان پہنچا ہے۔ اگر آپ کوئی کاسمیٹکس استعمال کر رہی ہیں تو فوراً روک دیں۔ بہت زیادہ بال نوچنے سے بھی پھر بال نکلنا بند ہو جاتے ہیں تھریڈنگ کرانا بھی بند کر دیں۔

بھنویں کو موٹا اور گھنا بنانے کے لیے اپنی خوراک میں وٹامن سی اور وٹامن ای پر مشتمل غذائیں بڑھا دیں۔ جیسے کینو، لیموں، آج کل آموں کا موسم ہے۔ آم اور جامن زیادہ کھائیں۔ ڈاکٹر سے مشورہ کر کے وٹامن سی اور ای کی ٹیبلٹ بھی لے سکتی ہیں۔ یہ وٹامنز آپ کے سر کے بالوں اور چہرے کی جلد کے لیے بھی مفید ثابت ہوں گے۔

بھنویں کو سیاہ چمک دار اور موٹا بنانے کے لیے رات کو سوتے وقت بھنویں پر۔ کیسٹراٹل لگائیں۔ اس کے بہت اچھے نتائج حاصل ہوں گے۔

فی الحال آپ براؤن پمپل کی مدد سے اپنی پتلی اور چھدری بھنویں کو گھنا تاثر دے سکتی ہیں۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

امت الصبور بونیٹیکس

فائزہ علی۔۔۔ کیر والا

س : میرے بال بہت روکھے اور خشک ہیں، کئی شیمپو بدل کر دیکھے کوئی فائدہ نہیں ہوا، خشک ہونے کی بنا پر بال کھڑے رہتے ہیں۔ کتنی بار کنگھا کر لوں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تیل لگانے کے بعد لگتا ہے جیسے میلے ہوں کوئی چمک یا رونق نظر نہیں آتی۔

ج : سب سے پہلے تو آپ اپنا شیمپو تبدیل کریں، ایسا لگتا ہے کہ آپ جو شیمپو استعمال کر رہی ہیں وہ خشک بالوں (dry hair) کے لیے نہیں ہے۔

دوسری بات آپ اپنی غذا پر توجہ دیں۔ خصوصاً آئرن والی چیزیں کھائیں۔ جیسے پالک، کیلا، سیب وغیرہ، ممکن ہو تو ڈاکٹر کے مشورے سے کوئی آئرن ٹیبلٹ استعمال کریں۔

ایک ماسک لکھ رہی ہوں یہ بالوں پر لگائیں۔ یہ ماسک